تحقیقی مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ اُردو

شمالی پاکستان کے بارے اردو سفر ناموں کا تحقیقی و ثقافتی مطالعہ

(قیام پاکستان سے پہلے اور بعد)

محقق

آمنہ فرید

42-FLL/PHDURD/F13

نگران

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

شعبۂ اردو

کلیہ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

TH-27882

PhD
891.4398
7

اردو سفرنامے۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ
شمالی پاکستان۔ انیسویں صدی ۔ 197 سے
اردو ادب۔ سفرنامے

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Amna Farid**

Title of the Thesis: " شمالی پاکستان کے بارے میں اردو سفرناموں کا تحقیقی و ثقافتی مطالعہ (قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد) "

Registration No: 42-FLL/PHDURDU/F13

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Humaira Ishfaq
Chairperson
Department Of Urdu
Islamabad

External Examiner 1:

Dr. Bilal Sohail
Assistant Professor
F.G. Sir Syed College
Rawalpindi

External Examiner 2:

Dr. Yousaf Khushk
Chairman
Pakistan Academy of Letters
Islamabad

Internal Examiner:

Prof. Dr. Najeeba Arif
Professor / Dean FLL
Department of Urdu, IIU
Islamabad

Supervisor:

Dr. Humaira Ishfaq
Assistant Professor
Department of Urdu, IIU
Islamabad

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ آمنہ فرید رجسٹریشن نمبر 42-FLL/PHDURD/F13 نے پی۔ایچ۔ڈی اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے مقالہ بعنوان "شمالی پاکستان کے بارے اردو سفر ناموں کا تحقیقی وثقافتی مطالعہ (قیام پاکستان سے پہلے اور بعد)" میری نگرانی میں تحریر کیا ہے۔ یہ مقالہ سرقے سے پاک ہے اور اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا۔

نگران مقالہ

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر

Rupees 50 ۵۰ روپیہ

بیان حلفی

میں آمنہ فرید ولد محمد سرور چشتی رجسٹریشن نمبر 42-FLL/PHDURD/F-13
پی ایچ ڈی اردو اعلان کرتی ہوں کہ میں نے تحقیقی مقالہ بعنوان "شمالی پاکستان کے بارے میں اردو سفر
ناموں کا تحقیقی و ثقافتی مطالعہ (قیام پاکستان سے پہلے اور بعد)" برائے حصول سند پی ایچ
ڈی، ڈاکٹر حمیرا اشفاق کی زیرِ نگرانی مکمل کیا ہے۔ یہ مقالہ سرقے سے پاک ہے اور فردِ واحد
کی ذاتی محنت پر مبنی ہے۔ اس میں شامل تمام حوالہ جات کا استناد موجود ہے۔

بیان حلفیہ میرے علم و یقین کے مطابق بالکل درست ہے۔

الحالف: آمنہ فرید ------------

شناختی کارڈ نمبر 35201-132[illegible]080-6

گواہ: تنزیلہ بشیر ------------ Tanzeel

شناختی کارڈ نمبر 37405-0439990-2

Aftab Adv. High Court
No. 3342

05-8-19

پیش لفظ

شمال کا سحر انگیز خطہ تاریخی، تہذیبی، تمدنی اعتبار سے قبل از تاریخ سے اہم ہے۔ دنیا کے عظیم ترین پہاڑی سلسلوں، بلند ترین چوٹیوں، گلیشیروں، جھیلوں اور ان گنت اسرار رکھنے والا شمالی خطہ مختلف ادوار میں برصغیر میں آنے والے حملہ آوروں اور قدیم سیاحوں کی گزر گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کے درمیان تجارتی گزر گاہ رہا ہے۔ اس کی اہمیت تاریخ کے کسی دور میں کم نہیں ہوئی۔ پتھر کے دور سے آباد خطۂ شمال آج بھی اپنے آثار قدیمہ کی بدولت قدیم تہذیبوں کی بازیافت کا اہم ذریعہ ہے۔

جنت سے بے دخلی کے بعد سے انسان مسلسل سفر میں ہے۔ نامعلوم کی جستجو انسان کو سفر پر مائل رکھتی ہے۔ آج کے انسان کی قدیم دنیا سے شناسائی میں قدیم سفر ناموں کا بڑا ہاتھ ہے۔ سفر نامے سماجی، معاشرتی، تہذیبی، تمدنی، جغرافیائی اور عالمی حالات کو سمجھنے اور سمجھانے میں معاون ہیں۔ قدیم ہندوستان کی معاشرت کی تصویر ہمارے سامنے رکھنے والے قدیم سیاحوں نے بھی شمال کو اہم جانا اور دور جدید میں بھی شمالی خطہ سیاحوں کو متوجہ کرنے کا سبب ہے۔ اکیسویں صدی میں شمال کی سیاحت کے ساتھ شمال کے سفر ناموں کا رجحان بھی بڑھا ہے۔ شمال کے سفر نامے شمال کے بارے میں جاننے کی جستجو کے پیش نظر وجود میں آئے۔ تشنگی کم کرنے کے لیے لکھے جانے والے دلچسپ سفر نامے تشنگی اور بڑھانے کا سبب بھی بنتے ہیں۔ انھیں پڑھ کر سیاحوں کو نئی دنیاؤں میں جانے کی جانے کی تحریک ملتی ہے۔ شمال کے منفرد رسم و رواج، ان دیکھی وادیاں اور فطرت کی رعنائیاں سیاح کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے کی غرض سے سفر نامہ نگار اپنے سفر کے واقعات قلمبند کرتا ہے اور دوسروں کو اپنے تجربات میں شریک کرتا ہے۔

ایک طرز فکر، تخلیقی روایت اور طرز معاشرت کو ثقافت کا نام دیا جا سکتا ہے، سفر نامے اپنے عہد کی سماجی دستاویز ہونے کے ناطے کسی علاقے کی تہذیبی و ثقافتی معلومات کو اپنے اندر سموئے ہوتے ہیں۔ متنوع ثقافت کے حامل شمالی خطے کے سفر نامے بھی وہاں کی تہذیب و ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔ شمالی علاقہ جات کے طور پر جانے جانے والے گلگت بلتستان کے علاوہ صوبہ خیبر پختونخواہ کے علاقے چترال، سوات اور وادی کاغان سے "شمالی پاکستان" مراد لی گئی ہے۔ کالاش کے حوالے سے مشہور چترال ماضی میں گلگت سے منسلک رہا ہے۔ سوات بدھ مت کا اہم مرکز اور گندھارا آرٹ کے گہوارے کے طور پر جانا جاتا ہے۔ وادی کاغان درہ بابو سر کے ذریعے گلگت بلتستان کو کشمیر سے ملانے کی وجہ سے اہم ہے۔

شمالی پاکستان کے اردو سفر ناموں کے تحقیقی و ثقافتی مطالعے کی غرض سے اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں گلگت، غذر، ہنزہ، نگر، استور، چلاس، داریل و تانگیر پر مشتمل گلگت اور دیامر، سکردو، خپلو،

شگر پر مشتمل بلتستان، چترال، کالاش، سوات اور کاغان کی تاریخ اور جغرافیائی صورتحال کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے باب کے پہلے حصے میں تہذیب و ثقافت کے نظری مباحث کا جائزہ لیا گیا ہے جبکہ دوسرے حصہ میں سفر نامہ کی صنف کی ابتدا، سفر نامہ کے فنی لوازمات، قدیم و جدید سفر ناموں کا فرق اور سفر ناموں میں تہذیب و ثقافت کی ضرورت و اہمیت جیسے موضوعات شامل کیے گئے ہیں۔ تیسرے باب میں شمالی پاکستان کی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان علاقوں کی تہذیب و ثقافت کے مختلف گوشوں ، رہن سہن، خوراک ، لباس، اخلاق و عادات، پیشے، دستکاریوں، رسوم و رواج، کھیل تفریح، تعلیم و تربیت، عقائد و افکار، مذہبی رسوم، لوک ادب، شاعری، فن تعمیر اور لسانیات وغیرہ کا احاطہ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں شمال کے متعلق قیام پاکستان سے پہلے کے اردو سفر ناموں کا جائزہ لینا مطلوب تھا مگر متعلقہ علاقوں کے اردو سفر ناموں کی غیر موجودگی میں قدیم سفر ناموں اور برطانوی عہد کے دوران شائع ہونے والے غیر ملکی زبانوں کے سفر ناموں کے تراجم تک محدود رہنا پڑا۔ پانچویں باب میں شمالی خطے کی تہذیب و ثقافت کے مطالعے کی روشنی میں قیام پاکستان کے بعد شائع ہونے والے شمال کے اردو سفر ناموں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ آخر میں اس تحقیقی و ثقافتی مطالعے سے اخذ کردہ نتائج بیان کیے گئے ہیں۔

عطائے کریمی کا تو حق ادا نہیں ہو سکتا کہ رب کریم ناشکری اور ناقدری کے باوجود ہمیشہ میری استطاعت سے زیادہ مجھے نوازتا رہا ہے۔ اپنی نگران ڈاکٹر حمیرا اشفاق کا صدق دل سے شکریہ کہ انھوں نے اتنا عرصہ میری سستی اور لاپروائی کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ ان کی پر خلوص معاونت تحقیق کے ہر مرحلے پر میسر رہی۔ اب بھی اگر وہ کام مکمل کرنے پر زور نہ ڈالتیں تو یقیناً یہ ادھورا ہی رہ جاتا۔ بہترین استاد ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی کا شکریہ کہ انھوں نے اس جامعہ میں داخلے کا مشورہ دیا اور موضوع کے تعین میں رہنمائی کی۔ شعبہ اردو کی سربراہ ڈاکٹر نجیبہ عارف کا خصوصی شکریہ کہ انھوں نے اس موضوع کے ابتدائی نقوش ابھارنے میں مدد دی۔ ان کا گرمجوشی سے ملنا ہمیشہ بہت خوشی دیتا ہے۔ والدین کا شکریہ ادا کرنا ممکن نہیں کہ ان کی اولاد کے لیے کی گئی دعاؤں، کوششوں اور قربانیوں کا کوئی مول نہیں، کوئی بدل نہیں۔ میرے چاروں بھائیوں کا بھی بہت شکریہ کہ ان کا وجود نعمت ہے۔ جن لوگوں نے کسی بھی حوالے سے اس کام کے دوران میری معاونت کی اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر دے۔

آمنہ فرید

مندرجات

ابواب	موضوعات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	4
	فہرست ابواب	6
باب اول	**شمالی پاکستان: تاریخ اور جغرافیائی حقائق**	10
	گلگت، غذر	17
	ہنزہ، نگر	20
	دیامیر، استور	23
	بلتستان	26
	چترال	30
	سوات	35
	کاغان	39
باب دوم	**تہذیب وثقافت کے نظری مباحث اور سفرناموں میں اہمیت**	53
	تہذیب وثقافت کے نظری مباحث	53
	تہذیب وثقافت کی سفرناموں میں اہمیت	79
	سفرنامہ کیا ہے؟	80
	سفرنامہ کے فنی لوازمات	82
	قدیم وجدید سفرناموں کا فرق	85
	سفرناموں میں تہذیب وثقافت کی اہمیت	87
باب سوم	**شمالی پاکستان کی تہذیب وثقافت**	99
	گلگت	102
	دیامیر	112
	ہنزہ، نگر	114
	بلتستان	122

	چترال	134
	کالاش	141
	سوات	147
	کاغان	150
باب چہارم	**شمال کے اردو سفر نامے: قیام پاکستان سے قبل**	164
باب پنجم	**شمالی پاکستان کے اردو سفر نامے: قیام پاکستان کے بعد**	176
	ہنزہ داستان	176
	سفر شمال کے	182
	چترال داستان	187
	نانگا پربت بلتستان داستان	193
	کے ٹو کہانی	201
	یاک سرائے	206
	سنو لیک	211
	دیوسائی	216
	شمشال بے مثال	220
	برفیلی بلندیاں	227
	رتی گلی	234
	راکاپوشی نگر	238
	حراموش ناقابل فراموش	242
	یہ میرا بلتستان	247
	میرا گلگت وہنزہ	253
	میرا سندر چترال	258
	کیلاش کتھا	264
	برف دریاؤں کے سفر	268
	میرا سندھو سائیں	271

جہاں پریاں اترتی ہیں	275
کے ٹو برفانی وادیاں	278
پھول دیوسائی کے	283
پربتوں کا شیندور	286
لداخ سے وادی مہران تک	290
دو سفر	290
سینہ سنگ پر ریشم کا رستہ	292
سفر در سفر	293
سفر نصیب	294
کرن تتلی اور بگولے	298
لیڈی فنگر	299
نانگا پربت کے حضور	301
دھماکہ لیک سوات	306
سفر نامہ اسکردو	311
نانگا پربت کے سو چہرے	312
قراقرم کے برف زاروں سے	313
کے ٹو کہوں کہ چھگوری	316
دیوسائی میں ایک رات	318
برف کے شہر	326
سفر نامہ پاکستان	329
کافرستان اور چترال، دیر، سوات کی سیاحت	331
زنجبار سے پاکستان	334
ماحصل	358
کتابیات	376

باب اوّل

شمالی پاکستان: تاریخ اور جغرافیائی حقائق

باب اول

شمالی پاکستان: تاریخ اور جغرافیائی حقائق

مخصوص محل وقوع کے باعث شمالی پاکستان کے علاقے تاریخ کے ہر دور میں خصوصی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ اکیسویں صدی میں پاک چین اقتصادی راہداری، دیامیر بھاشاڈیم اور شاہراہ قراقرم کے حوالے سے اہم گردانے جانے والے علاقے ما قبل تاریخ میں بھی خاص مقام رکھتے تھے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں دردیسا، دردستان، بروزہا، گلگتا، بلور، بلورستان اور سرزمین پساچ[1] کے ناموں سے موسوم رہنے والے شمالی علاقہ جات کی حدود گھٹتی بڑھتی رہی ہیں۔ ماہرین ارضیات کے مطابق پانچ کروڑ سال قبل یہاں بحیرہ ٹیتھیز کے نام سے ایک سمندر موجزن تھا۔ پھر انڈین اور یوریشین پلیٹوں کے تصادم سے قراقرم، ہمالیہ اور ہندوکش کے پہاڑ ابھرے۔[2] قراقرم شمال مغرب میں افغان سرحد سے شروع ہوکر مشرق میں لداخ کے شمال میں دریائے شیوق تک 480 کلومیٹر لمبا ہے،[3] جبکہ کوہ ہمالیہ قراقرم کے جنوب میں بونجی سے شروع ہوکر مشرق میں آسام تک 2400 کلومیٹر طویل ہے۔ ان پہاڑوں میں موجود بے شمار دروں سے یہ علاقے تبت، چین، روس، افغانستان، ایران، لداخ، کشمیر، ہزارہ، سوات اور ہند کے اہم مراکز سے ملے تھے اور مختلف خطوں کی طرف آمد ورفت کا ذریعہ تھے۔ جنوبی روس اور وسط ایشیا سے حملہ آوروں کے علاوہ محفوظ پناہ گاہوں کی تلاش میں مختلف اقوام آریا، منگول، یوچی، ہن، ستھین، پارتھین، چینی، تبتی، یونانی انھی راستوں سے برصغیر آئے۔[4]

72496 مربع کلومیٹر پر محیط موجودہ گلگت بلتستان 35.6 تا 37 عرض بلد شمالی اور 72 تا 77.8 طول بلد مشرق کے درمیان واقع ہے۔ اس کے شمال میں چینی صوبہ سنکیانگ، شمال مغرب میں واخان، مغرب میں افغانستان اور خیبر پختونخواہ، جنوب مشرق میں مقبوضہ کشمیر اور جنوب میں آزاد کشمیر اور صوبہ خیبر پختونخواہ ہیں۔ اس کا بلند ترین مقام کے ٹو 8611 میٹر بلند اور پست ترین مقام چلاس 1260 میٹر بلند ہے۔[5] یہاں ساٹھ سے زائد چھوٹے بڑے گلیشئر ہیں جن کا شمار قطبین سے باہر بڑے برفانی ذخائر میں ہوتا ہے۔ گلیشئروں کا رقبہ مجموعی علاقائی رقبے کا 0.38 فیصد ہے۔[6] شمال کے بڑے بڑے گلیشئروں میں سیاچن، بلتورو، چھو غولو نگمہ، ربنگمہ، بیافو اور ہیسپر اہم ہیں۔ یہاں بابوسر، برزل، قمری، مستاغ چھوربٹ، زوجیلہ، سلتورو، تھلے عالم پی، غنذو، ہنگو، برالدو، باشہ، ہیبر، ارشاد، کلک منتکہ، خنجراب، شمشال، درکوٹ، بروغل، کرومبر اور شندور کے درے اہم جغرافیائی اہمیت کے حامل ہیں۔ اہم قدرتی جھیلوں میں کچورہ، صدپارہ، نلتر، شندور، دیوسائی، پھندر، راما، گدئی، سرکون، کتوال، گاسو، گل اختوری، بوریت اور عطا آباد ہیں۔ اہم دریاؤں میں سندھ، شیوق، شگر، استور، ہنزہ اور گلگت ہیں۔ یہاں کے موسموں کو مقامی طور پر یونو (سرما)، بزونو (بہار)، اوالو (گرما) اور شرو (خزاں) کہتے ہیں۔ یہاں قدرتی جنگلات کا رقبہ 1100 مربع میل ہے، جو یہاں کے کل رقبے کا چار فیصد

ہے۔[7] گلگت بلتستان کے اہم پہاڑوں میں کے ٹو، نانگا پربت، گشابروم، براڈپیک، مشہ بروم، راکاپوشی اور ترچ میر شامل ہیں۔[8]

ماہرین ارضیات کے مطابق شمالی علاقہ جات میں نانگا پربت اور حراموش کا سلسلہ ہائے کوہ بنیادی تقسیم کا کام کرتا ہے۔ جس کے شمال میں دریائے سندھ، گوندوگورو اور جنوب میں دریائے استور ہے۔ گوندوگورو کے مشرق میں بلتستان کے علاقے خپلو اور سکردو ہیں۔ جبکہ گوندوگورو کے مغرب میں گلگت کے شمالی اور جنوبی علاقے ہیں۔ شمالی گلگت میں بونجی دریائے گلگت اور دریائے سندھ کا ملحقہ علاقہ ہے جبکہ گلگت کے جنوب میں دیامیر ہے۔ دیامیر کے مرکز میں چلاس ہے پھر دریائے سندھ کے ایک کنارے کی طرف داریل تانگیر، سندھ کوہستان، بھاشا کا آغاز اور استور ہیں۔ یہ نانگا پربت اور حراموش کے مشرقی طرف ہیں۔[9] شمالی پاکستان کی منفرد تاریخی، جغرافیائی، تہذیبی، تمدنی، لسانی اہمیت مسلمہ ہے۔ شمالی پاکستان کی ذیل میں سیاحتی و ثقافتی اہمیت کے پیش نظر موجودہ گلگت بلتستان کے علاوہ صوبہ خیبر پختونخواہ کے علاقے چترال، وادئ سوات اور وادئ کاغان بھی شامل کیے گئے ہیں۔

پاکستان کی جغرافیائی تاریخ دنیا کی قدیم تاریخوں میں سے ایک ہے۔ وادئ سندھ میں زرعی تہذیب کے قیام کے شواہد سب سے پہلے شمالی علاقوں سے ملتے ہیں۔[10] انسانی تہذیب کا ابتدائی سفر جن علاقوں سے شروع ہوا ان میں یہ خطہ بھی شامل ہے۔[11] طوفان نوح کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا مرکز برصغیر پاک وہند میں تھا اور یہیں سے طوفانی ریلے اردگرد پھیلے۔

> "شمالی علاقہ جات کے اونچے سلسلہ ہائے کوہ یعنی کوہ قراقرم، کوہ ہندوکش اور نانگا پربت کی چٹانیں اور سلاسل اس بات کی مظہر ہیں کہ انھوں نے پانی میں ڈوبے رہنے کا مزہ چکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر طوفانی ریلوں کے نقوش ثبت ہیں۔"[12]

اس خطے کے پتھر کے زمانے میں بھی آباد رہنے کے شواہد ملے ہیں۔[13] جن کا تعلق پانچ ہزار قبل مسیح تک سے ہے۔[14] اگرچہ تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کو ملا کر بہت سی خالی جگہیں پر کرنے کے باوجود، بہت سی تہذیبیں دریافت ہونے کے باوجود انسان کی معلومات ماضی کے بارے میں تشنہ ہیں اور انسانی تاریخ کی ترتیب و تعمیر ابھی جاری ہے۔[15] زمانہ ما قبل از تاریخ کی بودوباش اور اس زمانے کے حالات جاننے کی غرض سے یہاں موجود بے شمار آثاریاتی شواہد سے ماہرین وسطی حجری دور سے فروغ اسلام تک کی گمشدہ کڑیاں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس خطے میں آنے والی بیشتر اقوام میں سے مختلف نے اپنے قیام کے نشان ثبت کیے ہیں کہ آج کا انسان ان کی مدد سے اس عہد کو جان سکے۔ ان سنگی نقوش کا مطالعہ جغرافیائی حقائق کے ساتھ پامیر سے پرے کے علاقوں لداخ، تبت، سائبیریا، کشمیر اور سوات کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ وسیع منطقہ پر پھیلے ان نقوش میں تاریخی ربط ہے۔ گلگت بلتستان میں فکر نگاری، تصویر نویسی اور صورت نویسی کے نادر سنگی نمونے چلاس، شیتل، نوپورہ، گلگت، تھلپن، رائے

کوٹ پل، ہنزہ، یاسین اور سکردو میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں کی قدیم ترین تاریخ غار نشین سماج اور سنگی فن پاروں کے آغاز سے شروع ہوتی ہے۔ماہرین کے مطابق 9500 سے 2600 قبل مسیح تک شدید بارشوں سے بہت ہریالی ہوئی۔ اس لیے شکاری ان خطوں کی طرف متوجہ ہوئے اور اس قیام کے دوران انھوں نے چٹانوں پر خمدار سینگوں والے بکروں اور نیلی بھیڑوں کی بھدی شکلیں کندہ کیں۔ اشکومن اور یاسین میں موجود گول پتھروں کی قبریں بھی اسی عہد سے متعلق ہیں جو ساڑھے تین ہزار قبل مسیح سے تعلق رکھتا ہے۔ یوریشیائی انداز کے جانوروں کی تصویریں سیتھین قبائل کی بنائی ہوئی ہیں جو ایک ہزار صدی قبل مسیح میں یہاں آئے۔ یہ بسولے سے بنائی گئی ہیں یعنی وہ دھاتی اوزاروں کے استعمال پر قادر تھے۔ شکاریوں کے بعد کلاں سنگی معماروں کا دور شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے مسقف رہائش اختیار کر لی اور زینہ نما کھیت بنا کر برفانی نالوں کے پانی سے کاشتکاری کا آغاز کیا۔[16]

احمد حسن دانی کے خیال میں راک آرٹ کے زمانے کے لوگوں کا تعلق شکاری دور سے تھا لیکن وہ مل کر شکار کرنے کے طریقے سے آگاہ تھے۔ بعد میں انھوں نے گلہ بانی کو بھی اپنا لیا اور محفوظ ٹھکانوں کو مسکن بنانے سے بھی آگاہ ہو گئے۔ کشتی کے استعمال سے ناواقف مگر دریائے سندھ کو پار کرنے کے لیے لکڑی کے شہتیر رافٹس استعمال کرتے تھے۔ ان کے سربراہ جانور کی کھال کو تن سے ڈھانپنے اور سردی سے بچاؤ کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یہ لوگ یہاں کے اصل باشندے ہیں۔[17] یہاں مختلف مقامات پر زیر زمین کھدائی سے کانسی اور لوہے کے زمانے کے لوگوں کے آثار بھی ملے ہیں۔ جن میں طبقاتی نظام تھا۔ عام لوگوں کی قبریں سادہ تھیں مگر سرداروں کا طریقہ تدفین مختلف تھا۔ ان کی قبریں بڑے بڑے پتھروں سے دائرے میں گول بنائی جاتی تھیں اور لاشوں کے ساتھ کانسی اور لوہے کی بنی اشیا، قیمتی پتھر، موتی اور دھات کے برتن ملے ہیں۔ یہ امر تعجب خیز ہے کیونکہ ابھی پچھلی صدی تک یہاں لکڑی کے برتنوں کا رواج تھا۔ ان کا تعلق زرعی دور سے ہے۔ زیر زمین آثار ظاہر کرتے ہیں کہ یہ لوگ چٹانوں پر کندہ آثار والے گروہ سے مختلف رہن سہن رکھتے تھے۔ مردوں کے ساتھ اشیا رکھنا موت کے بعد زندگی کے تصور پر ایمان کی علامت ہے۔ جبکہ پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر بکثرت آثار کا پایا جانا پہاڑوں کی پرستش کے امکان کو ظاہر کرتا ہے۔ گھوڑے کے مجسمے کی موجودگی جانوروں کی پوجا اور برتنوں پر ستاروں اور سورج کی علامتیں سورج کی پوجا کی مظہر ہیں۔ ایسے ہی آثار پامیر سے ملنا قدیم زمانے سے ان کے باہمی روابط کو ثابت کرتا ہے۔[18] مختلف ادوار کے آثار ما قبل تاریخ سے تاریخ کی طرف سفر کی عکاسی کرتے ہیں۔ ہاتھوں اور پاؤں کے نشانات کا تعلق مذہبی عقیدے سے ہے۔[19] لیکن رشید اختر ندوی ان نشانوں کی وجہ تسمیہ مذہب کی بجائے اجتماعی شکار کی علامت گردانتے ہیں۔[20] ان چٹانوں پر کندہ آثار اور تصویری رسم الخط کے ہڑپا اور موہنجوڈرو سے قدیم تر ہونے کی بنا پر وہ حتمی رائے قائم کرتے ہیں کہ یہ قدیم تصویری رسم الخط اسی دردہا یا سومیرا

قوم کا ہے جو کسی ایک وقت سومیر سے چل کر ہندوکش، پامیر اور قراقرم کے دروں کے ذریعہ یہاں شمالی خطے میں اتری۔[۲۱] رشید اختر سومیری قوم کو خطے کی پہلی آباد کار قوم قرار دیتے ہیں۔[۲۲]

> "جو قوم پامیر اور قراقرم کے نیچے کی سمت اتری اور چیر سون، پشکواک ارشد اور قرنبر کو بھی آزمایا اور درہ واخان کو بھی یہی وہ قوم تھی جو شمشال، بتورہ، بلتستان کی وادی خپلو، وادی شیگر اور کھرمنگ میں آریا کی آمد تک آباد رہی تھی۔ یہی وادی ہنزہ کی بھی پہلی آباد کار تھی اور گوجال اور گلمت کی بھی۔ یہی وادی نگر میں اوپر سے اتری تھی اسی نے گلگت کو بھی بسایا اور اس کے متصل دوسری وادیوں کو بھی۔ یہی سکردو کی جھیل سدپارہ کے عقب میں واقع دو سو میل لمبے میدان میں رکتی رکاتی کشمیر کی سمت نکل گئی۔ اسی نے درکوٹ اور شندور پور سے چترال اور سوات کا رخ کیا اور یہی وہ تھی جس نے آریوں کے ایک بڑے قبیلے کورو کو شکست دے کر پنجاب کی طرف دھکیل دیا تھا۔"[۲۳]

اتھرو وید میں بھی آریا کے مشہور قبیلے کورو کے گلگت چترال کے راستے شمال مغربی علاقوں میں داخلے کا تذکرہ ہے۔ کورو نے دردہا یا اشوریوں سے شکست کھائی اور پنجاب کی طرف گئے۔ دردہا یا سومیری قوم کے بعد دارا اول پھر سکھیکی، کشان اور ہن آئے۔ ہن آخری وقت اسلامی حکومتیں قائم ہونے تک یہاں موجود رہے اور انھوں نے ہی اسلام قبول کیا تھا۔[۲۴] آریا کی ہندوستان آمد سے قبل یہاں جن قدیم قوموں کا تذکرہ ملتا ہے ان میں کول، بھیل، گونڈ، منڈا، دراوڑ کے ساتھ منگول یا مگول قوم بھی شامل تھی۔ ہن قبائل منگولیا سے ہوتے ہوئے مختلف دروں کے ذریعے ہندوستان آئے۔ بعد میں ہنوں نے ہندومت کا مذہب اختیار کیا اور گوجر، جاٹ، راجپوتوں کی صورت میں تاریخی منظر عام پر آئے۔ یافث کی اولاد میں آرین اور منگول اہم قبیلے تھے۔ ہن، مغل، ترک ہم نسل ہیں جبکہ ستھین، پارتھی اور آریا ایک ماخذ سے تعلق رکھتے ہیں۔[۲۵]

چٹانی نقوش کا گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ آثار مختلف زمانوں کے ہیں۔ ستھین کے عہد کے نشانات چلاس میں دریائے سندھ کے کنارے نیچے کی طرف ہیں جبکہ پارتھیوں کے عہد کے نشان بالائی سطح پر ہیں۔ جبکہ اس کے بعد کشن کے دور میں چلاس کا سارا علاقہ کسی موسمیاتی تبدیلی کے باعث بالکل ترک ہوگیا۔ اس دور کے آثار ہنزہ اور گلگت میں دریاؤں کے کنارے چٹانوں پر ملے ہیں۔ ستھین، پارتھی ابتدائی صدی سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ کشن کا زمانہ پہلی سے تیسری صدی کے دوران ہے۔ اس کے بعد بدھ مت اور گندھارا کا عہد ہے۔ پانچوں سے چھٹی عیسوی کے دوران سفید ہن حملہ آور آئے اس کے بعد ساہی اور دردوں کا عہد رہا۔[۲۶]

شمالی علاقہ جات میں قدیم حکومتوں کے تاریخی ادوار کا تعین کرتے ہوئے پروفیسر عثمان علی کا کہنا ہے کہ یشکنوں کا دور حکومت 100 قبل مسیح سے 100 مسیح تک ہے۔ شینوں کی حکومت 100ء سے 1400ء تک رہی۔ پھر تراخان اور مغلوٹ حکومت 1400 سے 1822 تک رہی۔[۲۷] شین آریا ہیں جبکہ یشکن بروشو ہیں جو ہن ہیں اور تورانی الاصل ہیں۔[28] جبکہ کمین دراوڑوں اور آسٹرک کی اولاد ہیں اسی لیے انھیں در قوم کہنا چاہیے۔ ان کے بدیسی قوم ہونے

کا نظریہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔[29] منگول جو دراصل منگول تھے کا شمار آریاؤں سے پہلے یہاں کے قدیم باشندوں میں ہوتا ہے۔[30] شمالی خطے میں پتھروں پر کندہ نقوش میں جانوروں کے شکار کی تصاویر ہیں، سٹوپا ہیں، خروشتی، براہمی، سوگدین اور آخری گپتا دور کے رسم الخط میں تحریریں کندہ ہیں۔ قدیم چینی تحریریں بھی ہیں۔ جبکہ سوات اور اوڈی گرام سے بکثرت ملے بدھ مت کے آثار ظاہر کرتے ہیں کہ بدھ مت کے پیروکاروں نے اپنے مذہب کے پرچار کا ذریعہ آرٹ کو بنایا۔[31]

آریاؤں کی آمد کے ساتھ یہاں مذہب کا تصور آیا۔ 500 قبل مسیح میں یہ علاقے مجوسیت کی لپیٹ میں آئے اور زرتشستی مذہب کا نفوذ ہوا۔ اس لیے آتش پرستی کے آثار ملے ہیں۔ 257 میں یہاں بدھ مت نے رواج پایا۔[32] قدیم ہندوستان کے تمام آثار مذہبی نوعیت کے ہیں۔ ان کی تخلیق مذہبی مقاصد کے پیش نظر کی گئی۔[33] شمالی علاقہ جات کثیر المذاہب خطہ رہا ہے۔[34] اسلام کی آمد کا آغاز یہاں امیر کبیر سید علی ہمدانی کی آمد سے ہوا۔ اس کے بعد یہاں نوربخشی، شیعہ اور اسماعیلی مسالک کی تبلیغ ہوتی رہی۔ اسلام سے پہلے یہاں بون مت، بدھ مت، شیو مت، بون چھوس، مظاہر پرستی، ارواح پرستی، ارواح خبیثہ، فطرت پرستی، چٹان پرستی اور جانور پرستی عام تھی۔ اسلام نے لوگوں کو فکری یکجائی عطا کی۔[35] آریاؤں نے چراگاہیں تلاش کر کے کھیتی باڑی کا آغاز کیا۔ ان کی مذہبی کتاب رگ وید کے مطابق یہاں کے اصل باشندے دراوڑ تھے جنھیں یہ حقارت سے دیکھتے تھے۔ ہر قبیلے کا سردار موروثی راجہ ہوتا تھا۔ سپاہ پیادہ اور راجہ رتھ پر سوار ہوتا تھا۔ ان کا پیشہ شکار، کاشتکاری، مویشی پالنا اور برتن بنانا تھا۔[36] چوتھی صدی کے بعد یہاں موروثی حاکمیت شروع ہوئی اور سلطنت بلور یا پلولو تشکیل پا گئی۔ یہ مستحکم حکومت تھی۔ پھر 721ء میں تبتیوں نے بلتستان اور 737ء میں گلگت کو فتح کیا۔ دسویں صدی عیسویں کے بعد تبت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا تو گلگت بلتستان میں نئے نئے خاندان ظاہر ہوئے جن میں آل رئیسہ، آل تراخان، آل کٹور، آل مقپون، آل اماچہ اور آل بگو شامل ہیں۔ یہ دست نگر ریاستیں بڑی سلطنتوں کو تابعداری کی علامت کے طور پر خراج عطا کرتی تھیں۔[37]

بدخشاں سے آنے والے تاج مغل نے تیرھویں سے چودھویں صدی کے دوران چترال پر حکومت کی اور پنیال، یاسین، ہنزہ اور گلگت کو بھی اپنی حدود میں شامل کر لیا۔ اس کے حملوں کا مقصد اسماعیلی عقائد کی اشاعت تھی۔[38] مختلف وقتوں میں مختلف ریاستوں میں مختلف خاندان حکومت کرتے رہے۔ اوران کی سرحدوں کی حدود گھٹتی بڑھتی رہیں۔ کشمیر سے یہ حصہ ہمیشہ الگ رہا۔ 1586ء میں مغلوں نے کشمیر فتح کیا۔ شمالی حصہ تب بھی الگ رہا۔ برطانوی عہد میں کشمیر اور گلگت کی جڑی اصطلاح سننے کا سبب وسط ایشیا میں روسی برطانوی کھیل تھا۔ اس لیے 1844ء میں کشمیر کو ڈوگرہ راجہ کے ہاتھوں فروخت کیا گیا اور شمالی خطے پر براہ راست حکومت کی بجائے کشمیر کے راجہ کو ترغیب دلائی گئی کہ وہ برطانیہ کی مدد کرے اور باج گزاری کا نظام قائم کرے۔[39] مقامی حکمرانوں کی آپس کی چپقلشوں نے اس امر کو آسان

بنا دیا۔ بلتستان میں مقپون خاندان کی بنیاد 1200ء میں سکردو میں حکومت سے پڑی۔ 1840ء تک بلتستان کی مختلف وادیوں میں مقپون، اماچہ اور یبگو خاندان حکمران رہے۔ 1840ء میں مقپون حکمران احمد شاہ نے بڑے بیٹے کی بجائے چھوٹے بیٹے کو ولی عہد بنایا تو بڑے بیٹے محمد شاہ نے جموں جا کر مہاراجہ گلاب سنگھ سے اپنی ولی عہدی کی بحالی کے لیے فوجی امداد طلب کی۔ اس لیے ڈوگرہ افواج بلتستان میں داخل ہوئیں اور 1841ء میں مکاری سے بلتستان پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔[۴۰] گلگت میں بھی تراخان حکومت کے زوال سے عدم استحکام کے بعد یاسین کے گوہر امان کے ہاتھوں والئ گلگت سکندر خان کے قتل کے بعد سکھوں کے حملے کی راہ ہموار ہوئی۔[۴۱] کیونکہ مقتول کے بھائی نے مہاراجہ کشمیر سے مدد مانگی تھی۔[۴۲]

انیسویں صدی کے نصف سے گلگت بلتستان میں خالصہ دور اور اینگلو دور کا آغاز ہوا۔ اس کے پس پشت روس کے توسیع پسندانہ عزائم کے پیش نظر برطانیہ کی خطے پر بالواسطہ تسلط کی خواہش تھی۔ اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے روس اور برطانیہ شمالی علاقوں کو اپنے دائرہ کار میں لانے کے لیے محو کار تھے۔ افغانستان، روس، چین اور ہندوستان کے درمیان گلگت، ہنزہ اور چترال بہت سٹریٹجک اہمیت کے حامل تھے۔ تمام سرگرمیوں کا مرکز گلگت تھا۔ روس اور برطانیہ اپنی برتری کے لیے جو داؤ پیچ کھیل رہے تھے اسے گلگت گیم یا گریٹ گیم کا کوڈ نام دیا گیا۔[۴۳] گلگت کی اہمیت کے پیش نظر انگریز اس کا کنٹرول اپنے حلیفوں کے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے ان کی خواہش تھی کہ گلگت، چترال اور ہنزہ مہاراجہ کے زیر اقتدار رہیں، مگر مہاراجہ کی پشت پر وہ خود موجود تھے۔[۴۴] گلگت ایجنسی کا قیام، اینگلو بروشو جنگ اور چترال کو گلگت سے الگ کر کے مالاکنڈ ایجنسی کا حصہ بنانے جیسے اقدامات اسی لیے کیے گئے تھے۔ 1935ء میں ریاست کشمیر کا انتظام ساٹھ سال کے لیے پٹے پر انگریزوں کو دیا۔ یوں 1935ء سے 1947ء تک انگریز بلا شرکت غیرے گلگت پر حکمران رہے۔[۴۵] عوام نے ڈوگرہ راج کو کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ بلتستان میں پہلی بغاوت 1842ء میں ہوئی جو بالآخر 1947 اور 1948ء میں ڈوگروں سے آزادی پر منتج ہوئی۔

گلگت بلتستان کا پاکستان کے ساتھ الحاق تین مرحلوں میں مکمل ہوا۔ پہلے مرحلے میں 14 نومبر 1947ء کو گلگت پھر 19 نومبر 1947ء کو ہنزہ اور نگر اور 17 دسمبر 1951ء کو داریل و تانگیر اور چلاس کے علاقوں کا پاکستان کے ساتھ الحاق ہوا۔[۴۶] جبکہ بلتستان 14 اگست 1948ء کو آزادی کے بعد پاکستان کے ساتھ ملحق ہوا۔ الحاق کے بعد یہاں کا انتظامی ڈھانچہ گلگت سے ہی کنٹرول کیا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ ترقیاتی کام ہوئے مگر مالیہ نظام ڈوگرہ راج کی طرح جاری رہا۔ ایف سی آر کے قوانین بھی جاری رہے۔ 1957ء میں دیہات سدھار تھ کے نام سے ترقیاتی کاموں کا آغاز ہوا اور بنیادی جمہوریتوں کا نظام بھی شروع ہوا۔ 1970ء میں شمالی علاقہ جات کی مشاورتی کونسل کا قیام عمل میں آیا۔ 1971ء میں ایف سی آر کا خاتمہ ہوا۔ 1975ء میں مشاورتی کونسل کی تشکیل نو شمالی علاقہ جات کونسل کے نام سے ہوئی۔ 1977ء

میں ٹوٹنے کے بعد پھر 1979ء میں اس کی تشکیل نو ہوئی۔ بے نظیر دور حکومت میں یہاں سے نمائندگی کے لیے ایک وفاقی مشیر لیا گیا اور آئینی حیثیت کے تعین کے لیے کمیٹیاں بھی تشکیل دی گئیں۔ 1996ء میں شمالی علاقہ جات کونسل کے لیے نشستوں کے اضافے اور جماعتی بنیادوں پر انتخابات کا فیصلہ ہوا۔ خواتین کے لیے بھی نشستیں مخصوص ہوئیں۔ 1999ء میں اس کونسل کو پہلی بار قانون ساز کونسل قرار دیا گیا۔ مشرف دور میں یہاں سیاسی و انتظامی اصلاحات پر مبنی پیکج کے ذریعے لیگل فریم ورک آرڈر میں ترامیم کی گئیں اور منتخب نمائندوں کو فیصلوں کا اختیار ملا۔ 7 ستمبر 2009ء کو گلگت بلتستان امپاورمنٹ اینڈ سیلف گورننس آرڈر 2009 جاری کیا گیا۔ اس میں نیم صوبائی طرز حکومت، عدلیہ، کونسل، پبلک سروس کمشن، قانون اور اختیارات کے حوالے سے اہم دفعات شامل تھیں۔[۴۷]

گلگت بلتستان کو اقوام متحدہ کی قراردادوں میں مسئلہ کشمیر سے منسلک کیے جانے کے باعث یہ آئینی حیثیت سے محروم ہے۔ یہاں کے لوگوں کا بنیادی مسئلہ شناخت کا ہے۔ اہل گلگت بلتستان کی آئینی شناخت سے محرومی کے متعلق محمد قاسم کا کہنا ہے:

> ”ستم ظریفی یہ ہے کہ گلگت بلتستان میں موجود بلند و بالا چوٹیوں پر تو پاکستان کی ملکیت تسلیم کی جاتی ہے۔ یہاں کے گلیشیئرز اور بھاشا دیامیر سمیت دیگر ڈیموں کے سائٹس پر تو پاکستان کا دعویٰ ہے۔ لیکن انھی چوٹیوں اور گلیشئروں کے دامن میں آباد لاکھوں انسان جو خود پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہم پاکستانی ہیں لیکن انھیں پاکستانی تسلیم نہیں کیا جاتا۔“[۴۸]

شمالی خطے میں مختلف وادیاں تنہائی کا شکار رہی ہیں۔ ان علاقوں کو مرکزیت اور وحدت شاہراہ قراقرم کی تعمیر نے دی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک گلگت بلتستان زمین بند علاقے ہونے کے ناطے صرف گرمیوں میں دروں کے راستے بیرونی دنیا سے رابطوں میں ہوتے تھے۔ یہاں جدید سڑکوں کی تعمیر کے پس پردہ اینگلو روسیہ توسیع پسندانہ پالیسیوں کا عمل دخل رہا۔ روس اور برطانیہ کی کشمکش اور گریٹ گیم سے سڑکوں کی تعمیر کی سیاست شروع ہوئی۔ گلگت سری نگر سڑک کا اینگلو بروشو جنگ میں انگریزوں کی جیت میں نمایاں کردار رہا۔ اسی سڑک نے ان علاقوں کی تنہائی کا بھی خاتمہ کیا۔ 1893ء میں کاغان تک سڑک بنائی گئی۔ یہ گلگت سے چلاس اور چلاس سے ہزارہ تک موجود پگڈنڈی کو سڑک کی شکل دی گئی۔[۴۹] اب آمدورفت کے لیے شاہراہ قراقرم اور اندرون گلگت بلتستان بہت سی رابطہ سڑکیں موجود ہیں۔ آمدورفت کے دیگر ذرائع میں ہوائی اڈوں کی سہولت بھی میسر ہے۔ 1998ء کی مردم شماری کے مطابق شمالی علاقہ جات کی کل آبادی 870347 نفوس پر مشتمل تھی۔ 2017ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی تقریباً پندرہ لاکھ ہے۔ 1998ء سے 2017ء تک گلگت بلتستان کی آبادی میں 3.4 کی شرح سے اضافہ ہوا ہے۔[۵۰] 1998ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں گنجان آبادی کا تناسب اکیس افراد فی مربع میل تھا۔

1972ء میں یہاں تمام ریاستوں کی انفرادی حیثیت ختم کر کے انھیں نئے اضلاع کی شکل دی گئی۔ وقتاً فوقتاً ان اضلاع کی تعداد میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ اس مقالے میں گلگت بلتستان میں سے گلگت اور غذر الگ، ہنزہ اور نگر الگ، دیامیر، چلاس، داریل و تانگیر الگ اور بلتستان پر تاریخی و جغرافیائی حوالوں سے الگ بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ چترال، سوات اور وادیٔ کاغان کے تاریخی و جغرافیائی حقائق بھی بیان کیے گئے ہیں۔

گلگت، غذر

گلگت کو ہمیشہ سے شمالی علاقوں میں مرکزیت حاصل رہی ہے۔ اس کے پرانے ناموں کے بارے میں مورخین میں مختلف آراپائی جاتی ہیں۔ اسے پرانے وقتوں میں گری گت، گلگوت، کھل کھیت [۵۱]، سارگن اور گلیت [۵۲] کہا جاتا تھا۔ مقامی لوگ آج بھی گلیت پکارتے ہیں۔ "سارگن" کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ 722 قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ سارگن نے شمالی فلسطینی اسرائیلی حکومت سماریہ کو شکست دی اور بارہ قبائل پر مشتمل قیدیوں کو ساتھ لے گیا اور گلگت کے مقام پر سارگن نام سے بستی قائم کی۔ [۵۳] "گری گت" کا سنسکرت میں مطلب پہاڑوں سے گھرا کے ہیں۔ گلگوت کا مطلب قبرستان ہے یہاں ماضی میں بہت جنگوں میں بہت لوگ قتل ہوئے تو یہ علاقہ قبرستان بن گیا۔ چترال اور گلگت کی سیاسی وحدت ختم ہونے پر انتظامی حوالے سے گلگت کو سات چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کیا گیا جو "مقسوۃ" کہلاتی تھی۔ اس نسبت سے گلگت کو "ست مقسوۃ" بھی کہا جاتا تھا۔ [۵۴]

دریا کے کنارے یہ قدیم شہر اس وقت سے آباد ہے جب انسان نے حجری دور کے بعد دریاؤں کے کنارے بستیاں بسانے کا آغاز کیا تھا۔ جب یہاں سومیری پامیری ہندوکش اور قراقرم کے پہاڑوں میں سے راستے تلاشتے اس خطے میں آئے تب سے یہ شہر آباد ہے۔ [۵۵] سومیریوں کے بعد آریا کے چند گروہ آئے اور یہاں بس گئے۔ پھر دارا اول کے نمائندے اور سپہ سالار آئے۔ میری اور فارسی قبائل آکر آباد ہوئے۔ بعد میں ہر وہ حکمران یہاں پہنچا جس نے گندھارا، کشمیر، سوات، چترال اور شمالی پاکستان پر حکومت کی ہو۔ [۵۶] دریائے گلگت جس کے کنارے یہ شہر آباد ہے 120 میل لمبا ہے۔ جس کا سب سے زیادہ حصہ یاسین میں ساٹھ میل، پنیال میں پچیس میل اور گلگت میں پینتیس میل بہتا ہے۔ [۵۷] گلگت سے ملحقہ علاقہ جات کبھی دردستان اور کبھی بلورستان کے نام سے موسوم تھے۔ یہاں کی مستند قدیم تاریخ دستیاب نہیں۔ البتہ قصے کہانیوں کی شکل میں سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے جس میں افسانوی رنگ اور دیومالائی عنصر کا غلبہ ہے۔ زمانہ وسطیٰ کی سیاسی تاریخ آٹھویں صدی عیسوی میں عربوں کے وسط ایشیا میں پیش قدمی سے شروع ہوئی۔ پامیر پار سے بدخشاں، واخان اور سنکیانگ سے ترک آبادی اس طرف آئی اور کابل کے عربوں کے ساتھ تعلقات سے واخان،

بلور اور تبت خورد متاثر ہوئے۔ یہاں دردیسانامی حکومت تھی۔ پانچویں سے آٹھویں صدی کے دوران یہاں بلور کے نام سے قائم سلطنت پر تبتیوں اور چینیوں کا اثرورسوخ تھا۔[۵۸]

گلگت کی سرحدیں مختلف وقتوں میں بدلتی رہی ہیں۔ شاہ رئیس خان کے مطابق تیرہ چودہ سو سال قبل خاندان تراخان کے دور میں اس سلطنت کی حدود چترال تا پامیر، بدخشاں تا تراگ بل پہاڑ تک پھیلی تھیں۔ اس خاندان کا مورث اعلیٰ آذر جمشید آتش پرست تھا اور ایران سے تعلق رکھتا تھا۔ اس سے قبل راجہ کیسر کے پڑپوتے شری بدو کی یہاں حکومت تھی جو آدم خور کے لقب سے مشہور تھا۔[۵۹] آذر بخت کے بعد ملکہ نور بخت پھر اس کا بیٹا سوملک یہاں حکمران رہا۔ تراخان خاندان کی حکومت کے دوران بدخشاں کے تاج مغل نے یہاں حملہ کیا۔ دیگر تراخانی حکمرانوں میں خسرو خان، حیدر خان، چلس خان، نور خان، مرزا خان، علی شیر، وزیر ریشو، جواری خاتون، گوری تھم حکمران رہے۔[۶۰]

1822ء میں تراخانی خاندان کے آخری راجہ عباس خان کے قتل کے بعد گلگت عدم استحکام کا شکار ہو گیا اور حملہ آوروں کے لیے جولان گاہ بن کر رہ گیا۔ عباس خان کے بعد سے 1842ء تک تیس سال میں یہاں یاسین، پنیال اور نگر کے راجاؤں نے حملہ کیا۔[۶۱] سکھ 1819ء میں کشمیر 1932ء میں لداخ اور 1939-1940ء میں بلتستان پر قبضے کے بعد اب گلگت پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ یاسین کے گوہر امان نے گلگت پر چڑھائی کی۔ وادیٔ گلگت شاہ سکندر پانچ ماہ سے قلعے میں محصور تھا۔ اس کے بھائی کریم خان نے سکھوں سے مدد مانگی۔ نتھے شاہ کی قیادت میں کریم خان نے سکھوں کے ساتھ مل کر گلگت پر حملہ کیا۔ 1842ء کے اس حملے میں گوہر امان شمال کی طرف بھاگ نکلا۔ کریم خان نے غلامی کے بندھن پہنے اور نام کا راجہ بنا، اصل اقتدار سکھوں کے ہاتھ میں تھا۔ ڈوگروں کا دور اہل گلگت کے لیے مصائب و آلام کا دور کا ثابت ہوا۔ 1846ء میں جنگ کے تاوان کے طور پر سکھوں نے انگریزوں کو سندھ اور بیاس کے تمام میدانی اور کوہستانی علاقے بیچ دیے جن میں کشمیر بھی تھا۔ انھوں نے ایک اور معاہدے کے تحت یہ ڈوگرہ سردار گلاب سنگھ کے ہاتھ پچھتر لاکھ نانک شاہی کے عوض بیچ ڈالے۔[۶۲] 1852ء تک گلگت کی تاریخ میں نشیب و فراز آتے رہے۔ گوہر امان نے کئی بار ڈوگروں کو گلگت سے باہر نکالنے کی کوششیں کیں۔ 1852ء میں وہ سکھوں کو شکست دے کر دوبارہ گلگت پر قابض ہوا۔ اس کے خلاف اندر باہر سازشوں کا جال تھا۔ اس لیے اس کی حکومت مستحکم نہ تھی۔ 1855ء میں والی چترال نے مستوج اور یاسین سے اسے بے دخل کیا۔ 1856ء میں وزیر زور آور اور عطر سنگھ نے والیٔ نگر راجہ زاہد کے تعاون سے گوہر امان کو شمال کی طرف دھکیلا۔ 1857ء میں گوہر امان نے دوبارہ گلگت پر قبضہ کیا مگر چترال کا والی آدم دیر و بدخشاں کے حکمرانوں سے مل کر ساز باز کرتا رہا۔ 1860ء میں گوہر امان کی وفات تک ڈوگرے دریائے سندھ کے پار بونجی تک محدود رہے لیکن اب اس کی وفات اور اندرون برصغیر حالات سازگار ہونے پر انھوں نے گلگت پر دوبارہ

کامیاب منظم حملہ کیا۔ پچھلی جنگوں میں بھوپ سنگھ اور ساتھیوں کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے گلگت میں انھوں نے بے شمار لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ [۶۳]

1877ء میں روسی یلغار پر نظر رکھنے کے لیے مہاراجہ کی اجازت سے انگریزوں نے گلگت میں ایجنسی قائم کی۔

> "وسط ایشیا میں روس کی شعلہ خو موجودگی، گلگت کے بروغل و اشکومن دروں کی دریافت اور یہ حقیقت کہ سپاہی (مراد روسی) یہ درے پار کر سکتے ہیں، جیسے حقائق نے فرنگی حلقوں میں روس فوبیا کو جنم دیا۔ اب ہندوستان میں کسی طرح کی روسی نقل و حرکت اور اس کے سدباب کے لیے اصرار کیا جانے لگا۔ لہٰذا حکومت انگلشیہ ہند نے اس جانب اولین قدم کے طور پر مہاراجہ کشمیر کو اپنی سرحد یاسین اور چترال تک پھیلانے کی اجازت دی اور اس اجازت کے بدلے میں اپنے ایجنٹ کو گلگت میں متعین کرنے کی سہولت مانگی۔" [۶۴]

ایک بار گلگت ایجنسی ختم کر کے 1889ء میں دوبارہ بنانے کے پیچھے بھی روس کے شمالی علاقہ جات پر بڑھتے اثرات تھے۔ اس ایجنسی کے قیام سے 1891ء میں ہنزہ، نگر، چترال، پنیال، یاسین، غذر، اشکومن، چلاس، داریل، تانگیر، گورا، استور اور بونجی کے علاقے شامل تھے۔ [۶۵] 1840ء سے 1947ء تک سکھ، ڈوگرے اور انگریز یہاں حکومت کرتے رہے۔ مگر بعد میں بدلتے حالات کے تناظر میں انگریزوں نے گلگت کی عملداری براہ راست اپنے ہاتھ میں رکھنے کے اقدامات کیے اور 1935ء کے معاہدہ پٹہ کی رو سے ساٹھ سال کے لیے انگریزں نے اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ 1947ء میں قیام پاکستان پر پٹہ کی باقی معیاد منسوخ کر کے انگریزوں نے گلگت ایجنسی کو مہاراجہ کی تحویل میں دے دیا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کے کشمیر کے بھارت سے الحاق کے فیصلے سے ناخوش وہاں کے لوگوں نے ڈوگرہ راج کے خلاف بغاوت کی متحدہ کوششیں کیں۔ مرزا حسن، راجہ بابر خان اور گلگت سکاؤٹس کی مدد سے گلگت کو ڈوگروں کے قبضے سے رہائی دلائی۔ [۶۶] یکم نومبر تا 15 نومبر 1947ء یہاں عبوری حکومت قائم رہی۔ 16 نومبر 1947ء کو گلگت کا الحاق پاکستان سے ہو گیا اور عالم خان یہاں پہلے پاکستانی پولیٹیکل ایجنٹ تعینات ہوئے۔ 1972ء میں گلگت کو ضلع کا درجہ دیا گیا۔ گلگت ڈویژن میں ہنزہ، نگر، غذر اور گلگت کے اضلاع شامل ہیں۔ جبکہ گلگت اور غذر کے اضلاع میں گلگت، گاہکوچ، گوپس، پنیال، اشکومن اور یاسین کے علاقے شامل ہیں۔

یہاں مہاراجہ کشمیر اور انگریز کی مشترکہ حکمرانی کا 87 سالہ دور گلگت کی تاریخ کا تاریک ترین دور شمار ہوتا ہے۔ 1935ء تک لوگوں کو اپنی زمینوں پر مالکانہ حقوق حاصل نہیں تھے۔ وہ اپنی ضرورت کے لیے اپنے لگائے درختوں سے ایک چھڑی تک نہیں کاٹ سکتے تھے، ریس، بیگار، مالیہ تلے دبے تھے، ایف سی آر، کرمنل ٹرائبز رولز اور ڈیفنس آف انڈیا رولز جیسے ظالمانہ قوانین کا سامنا تھا۔ مقامی راجاؤں کے چونچلے پورے کرنے کے لیے عوام باز ٹیکس، بیاہ ٹیکس، پناہ ٹیکس، شکار ٹیکس، اوون ٹیکس، میوہ ٹیکس، دودھ ٹیکس اور طلاکشی ٹیکس جیسے ٹیکسوں کے عذاب میں مبتلا تھے۔ [۶۷]

گلگت سطح سمندر سے 8490 فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور محل وقوع کے اعتبار سے 35 تا 55 درجے شمالاً اور 23 تا 47 مشرقی عرض بلد پر واقع ہے۔ مخصوص جغرافیائی محل وقوع کے باعث یہاں مون سون بارشیں نہیں ہوتیں۔ گرمیوں میں موسم گرم اور سردیوں میں ٹھنڈا ہوتا ہے۔ گندم، جو، باجرہ اور آلو کاشت کیا جاتا ہے۔ پھلوں میں آڑو، خوبانی، انگور، سیب، بہی، ناشپاتی، انار اور چیری کاشت ہوتے ہیں۔ فوجی نقطہ نظر سے یہ ایشیا کا صدر دروازہ ہے۔[۶۸] یہ کشمیر کے شمال مغرب میں ہے۔ اس سے بالا بالا دریائے سندھ دوسرے کنارے پر واقع ہے۔ گلگت کے قبائل میں رونو، یشکن، شین، تراخان، مغلوٹ، کرکس، اور کمین اہم ہیں۔ رونو خاندان قدیم عہد میں تخت و تاج کا مالک تھا۔ اب بھی حکمران خاندان کے بعد ان کا درجہ ہے۔ رونو کو راجپوت قرار دیا جا سکتا ہے۔ شین ایک معزز قبیلہ ہے اور یہ کثیر تعداد میں ہیں۔ شین آریا الاصل ہیں۔ یہ بچھڑے کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ قدیم شین ہندومت کے پرستار تھے۔ یشکن زراعت پیشہ ہیں، تورانی الاصل ہیں اور گھوڑوں سے محبت رکھتے ہیں۔ تراخان، مغلوٹ اور کرکس حکمرانوں کے اہم خاندانی سلسلے ہیں۔ کمین قبائل بھی آریاؤں کے ساتھ یہاں آئے۔ اس کے علاوہ یہاں سادات، اخوند، ڈوم، پٹھان، گوجر، پنجابی، بلتی، چترالی، کشمیری وغیرہ بھی رہتے ہیں۔[۶۹]

گلگت میں زیادہ تر شنا بولنے والے افراد ہیں۔ شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے بعد گلگت میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ 1998ء میں گلگت کی کل آبادی 145272 نفوس پر مشتمل تھی، جبکہ اس کا رقبہ 6255 مربع کلومیٹر ہے۔ 2017ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع گلگت کی آبادی تین لاکھ تیس ہزار 330000 ہے۔ ضلع غذر کی آبادی 1998ء میں 120218 نفوس پر مشتمل تھی جو 2017ء میں 170000 ہو چکی ہے۔[۷۰]

ہنزہ، نگر

ہنزہ اور نگر 19 تا 36 درجے عرض بلد اور 38 تا 47 درجے طول بلد میں واقع ہیں۔ ان کا شمار منطقہ معتدلہ میں ہوتا ہے۔ بالائی خطے میں منطقہ باردہ میں شمار ہوتے ہیں۔ نگر اور ہنزہ دونوں قراقرم کے پہاڑی سلسلے کا حصہ ہیں۔ یہاں راکاپوشی، دیران، گولڈن پیک، راج پیک، حہ چھنڈر، بولیجو، شینگ، عطا آباد اور الترپیک چوٹیاں ایستادہ ہیں۔ نگر اور ہنزہ متصل ہیں۔ دریائے ہنزہ ان دونوں کو جدا کرتا ہے۔ قدرتی بناوٹ کے اعتبار سے ہنزہ بالائی، وسطی اور زیریں تین حصوں میں منقسم ہے۔ بالائی ہنزہ کو پہلے ہربر بھی کہا جاتا تھا، جو بالائی اور زیریں گوجال میں بٹا ہوا ہے۔ یہاں واخی اور بروشو آباد ہیں۔ ڈوم اور شین بھی بستے ہیں۔ نگر بھی دو حصوں نگر بالا اور نگر پائین میں منقسم ہے۔ نگر بالا دریائے ہنزہ کے جنوب میں جبکہ زیریں نگر شمال میں واقع ہے۔ زیریں نگر یا نگر پائین میں شنا بولنے والوں کی اکثریت ہے جبکہ نگر بالا میں بروشو قبائل بستے ہیں۔ ہنزہ کا کل رقبہ 7900 مربع کلومیٹر، جبکہ نگر کا 7137 مربع کلومیٹر ہے۔[۷۱] جبکہ

1998ء کی مردم شماری کے مطابق ہنزہ نگر کی کل آبادی 98052 نفوس پر مشتمل تھی جو 2017ء میں پچاس ہزار ہو چکی ہے۔[۴۲]

دریائے ہنزہ، بتورا، پسو، گلمت گلیشئروں اور شمشال ندی کے پانیوں سے تشکیل پاتا ہے۔ بروشال ہنزہ نگر میں دریا سطح زمین سے نیچے بہتے ہیں۔ قطبین سے باہر بڑے گلیشئروں میں ہنزہ کا بتورا گلیشئر ساتویں نمبر پر ہے۔ بارش کی کمی کے باعث ہنزہ نگر کے پہاڑ جنگلات سے محروم ہیں۔ البتہ گلیشئروں کے قریب چراگاہیں پائی جاتی ہیں۔ ہنزہ و نگر نایاب ادویاتی جڑی بوٹیوں اور نایاب قسم کے درختوں کے لیے مشہور ہیں۔ فصلوں میں گندم، مکئی، ترنبہ، اور جو جبکہ سبزیوں میں آلو، بند گوبھی، ٹماٹر، حرفہ، لوسرن اور پالک کی کاشت ہوتی ہے۔ پرندوں میں زاغ ابلق، کوا، باز، گدھ، چڑیا، بطخ، رام چکور، فاختہ، کبوتر اور جنگلی جانوروں میں چیتا، مارخور، سیاہ گوش، بھیڑیا، مارکوپولو شیپ، بلیو شیپ، روز، کیل اور مارموٹ پائے جاتے ہیں۔ زیادہ شکار کے باعث پرندوں اور جنگلی جانوروں کی کئی نسلیں معدومیت کے خطرے سے دوچار ہیں۔[۴۳]

ہنزہ کے چین سے بہت قدیم روابط ہیں اور سرحدی حدود کے تعین میں اختلافات بھی رہے۔ 1963ء میں پاکستان اور چین کے درمیان ایک معاہدے کے نتیجے میں حتمی حدود کا تعین کیا گیا۔ پہلے وقتوں میں نگر سے بلتستان صرف درہ ہسپر کو پار کر کے جانے کا واحد راستہ تھا۔ ہنزہ سے پامیر اور یارقند تک آمدورفت کے قدیم راستوں تک رسائی کی وجہ سے یہاں سے ترکستان اور بھارت کے گزرنے والے قافلوں کو لوٹنے کی روایات کا تذکرہ ملتا ہے۔ ہنزہ کے حکمران اس صورتحال کا فائدہ اٹھاتے تھے۔ ان کا نام تاجروں کے لیے دہشت کی علامت تھا۔ ہنزہ غلاموں کی تجارت کی منڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہنزہ یشکن قوم کے بروشکی بولنے والے افراد کا مسکن ہے۔ جبکہ اس کے شمالی حصوں میں واخی بولی جاتی ہے۔[۴۴] ہنزہ نام کا تعلق نہ ہن نسل کے افراد سے ہے نہ درد نسل سے نہ ہنوسار اویشایا سے۔ یہاں گنیش نام کا قدیم گاؤں ہندو مذہب کی مقبولیت کی یاد دلاتا ہے جسے ہندوؤں کا ایک فرقہ پوجتا ہے۔[۴۵] ہنزہ لفظ کا ماخذ نامعلوم ہے۔ پروفیسر دانی کے مطابق اگر اس کا تعلق بروزا اور بروشال سے فرض کیا جائے تو بروشسکی بولنے والوں کا علاقہ کہا جا سکتا ہے۔ اب ہنزہ ایک چھوٹا سا علاقہ ہے۔ انیسویں صدی میں انگریزوں نے ہنزہ کے لوگوں کے لیے کنجوٹ کی اصطلاح وضع کی جو مقامی لوگوں میں کبھی مستعمل نہیں رہی۔[۴۶] قدیم زمانے میں ہنزہ کے لوگ ہنزہ کو "از کلک تامایون" پکارتے تھے یعنی شمالی سرحد سے نیچے کی آبادی مایون تک وحدت میں پکارتے تھے اور یہی ان کا تشخص ہوا کرتا تھا۔[۴۷]

احمد حسن دانی نے امکان ظاہر کیا ہے کہ بروشسکی بولنے والی قوم کے افراد اسی خطے کے قدیم باشندے ہو سکتے ہیں جنھیں بعد میں آنے والے آریا کے جتھے نے مخصوص علاقے کی طرف دھکیلا ہو۔ بروشسکی میں نہ کوئی ترک لفظ ملتا ہے نہ ہند آریائی زبانوں کا۔ اس لیے یہ اس خطے کے قدیم باسیوں کی زبان ہو سکتی ہے کیونکہ اس میں بیرونی اثرات کے

شواہد نہیں ہیں۔ مزید بر آں عالم پل پر اور بالائی وادئ سندھ میں چٹانوں پر کندہ نقوش اجنبی رسم الخط میں ہیں جو چھٹی ساتویں صدی کے آثار ہیں۔ انھیں واضح طور پر غیر آریائی اور بروشسکی کی ابتدائی صورت کہا جا سکتا ہے۔[۷۸] جبکہ رشید اختر ندوی کے مطابق یہاں آباد ہونے والا پہلا گروہ سومیری قوم کا ہے۔ انھوں نے یہاں پہنچ کر اپنے وطن کی یاد میں دریائے نگر کے کنارے جو پہلی بستی آباد کی اس کا نام سومیر رکھا۔ اس سے منسلک پہاڑ کو سومیر پہاڑ کا نام دیا۔ ان دنوں کا بڑا شہر سومیر ایک چھوٹی سی بستی کی شکل میں موجود ہے۔ جبکہ بیس ہزار فٹ بلند مقام ان کے دیے نام سے اب تک موسوم ہے۔ ویدوں کے سومیر یا اشور پہلے پہل یہاں آئے پھر صدیوں کے فاصلے کے بعد ہنزہ کے راستے گلگت پہنچے۔[۷۹]

رشید اختر ندوی گنیش میں چٹانوں پر موجود تصویری رسم الخط کو ہڑپہ اور موئنجوڈرو سے قدیم قرار دیتے ہیں اور ہنزہ میں تین چٹانوں پر موجود علامتوں کے بارے میں جو کسی نے تختی لگا کر انھیں دوسری صدی عیسوی میں کشان عہد سے منسوب کیا ہے کو غلط قرار دیا ہے:

> "البتہ ہم یہاں اس تختی کو قطعاً غلط قرار دینے میں حق بجانب ہیں جو کچھ مدت ہوئی کسی پروفیسر نے اپنی طرف سے بڑی تحقیق کے بعد ان چٹانوں کو سیکر ڈارکس کا عنوان دے کر ان پر لکھی ہوئی تحریروں کو دوسری صدی عیسوی اور کشان عہد سے منسوب کیا ہے۔ یہ چٹانیں جو جو دریائے ہنزہ کے شاہراہ ریشم یا قراقرم کے ساتھ کھڑی ہیں اتنی قدیم ہیں جتنی قدیم وہ سومیری قوم ہے جو پامیر، ہندوکش اور قراقرم کے دروں کے اندر سے راہ بناتی یہاں تک آئی تھی۔ اور یہ عہد ہمارے نزدیک 7000 قبل مسیح سے لے کر تین ہزار قبل مسیح تک کا ہے۔"[۸۰]

پانچویں چھٹی صدی عیسوی میں یہاں ہن اقتدار تھا۔ پھر پاٹلہ شاہی حکومت رہی۔ تراخان دور حکومت ترکوں کے دور حکومت سے منسلک تھا۔ جو 997ء سے 1241ء تک رہا۔ پھر ایشور اور مغلوٹ آئے۔ ایشو دور پہلے حکمران گیگرس سے شروع ہوتا ہے جو تین ادوار پر مشتمل ہے۔ پہلا دور انیسویں صدی کے وسط تک، دوسرا دور 1892ء تک سے بیسویں صدی کے آغاز تک اور تیسرا دور بیسویں صدی کے آغاز سے 1970ء کے عشرے تک رہا۔[۸۱] ایشو خاندان کا زوال میر غضنفر اول کی وفات کے سال 1864ء سے شروع ہوا۔ اس کے بعد میر غزن خان تخت نشین ہوئے جو انگریزوں سے بہت خوفزدہ تھے۔ برطانیہ نے ہنزہ کو رہزن ریاست قرار دیا۔ ایشو خاندان کی ہزار سالہ تاریخ میں اکثر حکمران قتل کیے گئے۔ میروں نے ہر اہم مرحلے پر عوام کی بجائے اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دی۔[۸۲]

ہنزہ نگر کا علاقہ بلورستان کے راجا کوئی کا حصہ تھا۔ یہاں ابتدا میں سفید ہن آئے۔ ہنزہ میں ہنوکوشل نام کی بستی آج بھی موجود ہے۔ یہاں بڑی بڑی چٹانوں پر کندہ تحریری آثار براہمی، سوگدیائی، خروشی، شاردھا اور گپتا زبانوں کے ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ مختلف تہذیبوں کے کارواں یہاں سے گزرے ہیں۔ یہ بدھ زائرین اور کشان بادشاہوں کے سفر کی یادگاریں ہیں۔ پندرھویں صدی کے وسط تک ہنزہ نگر میں مختلف النسل خاندان قبائل کی طرز پہ زندگی گزارتے تھے۔ یہ آل تراخان یعنی راجگان گلگت کے باج گزار تھے۔ نگر ہنزہ کے مقابلے میں زیادہ متمول تھا مگر چین

سے قربت کے باعث ہنزہ زیادہ اہمیت کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ راجگان ہنزہ و نگر عوام کو قابو میں رکھنے کے لیے خلاف عقل باتیں خود سے منسوب کرتے تھے۔ ماضی میں یہاں کے راجاؤں کو تھم کہتے تھے، ان کی رہائش گاہ تھانگ کہلاتی تھی۔ عوام کا عقیدہ تھا کہ راجگان کی ناراضی سے فصلیں تباہ ہوتی ہیں جبکہ خوشنودی سے علاقے میں رزق کی فراوانی ہوتی ہے۔ انگریزوں کے ہاتھوں راجاؤں کی شکست نے عوام کے ذہنوں سے ان کے طلسم کا خاتمہ کیا۔ [۸۳]

1892ء میں اینگلو بروشو جنگ برپا ہونے پر ریاست بروشال کا خاتمہ ہوا۔ حکومت برطانوی ہند چینی صوبہ سنکیانگ تک ڈاک کی بحفاظت ترسیل کے لیے ہنزہ کے راستے سڑک تعمیر کرنا چاہتی تھی مگر ہنزہ کے میر نے انگریزوں کو جواب دے دیا اس لیے جنگ کی نوبت آئی۔ نومبر 1947ء میں یہ علاقے انگریزوں اور ڈوگروں کے تسلط سے آزاد ہوئے اور پاکستان سے الحاق کیا۔ پاکستان نے ان کی سابقہ حیثیت برقرار رکھی۔ 1972ء میں ان ریاستوں کی آزادانہ حیثیت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ مرکزی ہنزہ کی التت، بلتت اور گنیش یہاں کی قدیم بستیاں ہیں۔ ہنزہ کے میون گاؤں میں رونو قبیلہ آباد تھا، یہ بار بار آباد اور برباد ہوتا رہا۔ زیریں ہنزہ میں شین اور بروشو قبائل اکٹھے رہتے ہیں۔ بالائی ہنزہ میں بروشو اور واخی لوگ آباد ہیں۔ پہلے مرکزی ہنزہ میں ہماچانگ قبیلہ آباد تھا۔ ہنزہ، نگر، یاسین کی اکثریتی زبان بروشسکی ہونے کے باوجود تینوں علاقوں کا لہجہ مختلف ہے جو بالترتیب ہونزوسکی، کھجونا اور جھکوار کہلاتا ہے۔ بروشسکی میں شنا کے بہت الفاظ داخل ہو گئے ہیں۔ [۸۴] ماہرین لسانیات کشمیری کی بنیاد بروشسکی کو قرار دیتے ہیں۔ [۸۵]

ہنزہ کو جنت ارضی بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں سال کے چاروں موسموں میں جدا رنگ دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس کے مرکزی مقام کریم آباد سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر سات سو سالہ قدیم بلتت قلعے کو 2001ء میں "برٹش ائرویز ٹورازم فار ٹومارو" کا اعزاز ملا۔ کسی بھی پاکستانی ثقافتی ورثے کو عالمی حیثیت میں ملنے والا یہ پہلا اعزاز ہے۔ اس قلعے میں 53 کمرے ہیں۔ پوری عمارت کی تعمیر میں بہترین چوبی کا کام کیا گیا ہے۔ لکڑی کی کھڑکیوں، دریچوں، ستونوں اور گیلریوں پر ابھرے چوبی نقش و نگار اپنے معماروں کے فن کی داد دیتے ہیں۔ [۸۶]

دیامیر، استور

استور ڈویژن دیامیر اور استور کے اضلاع پر مشتمل ہے۔ ضلع دیامیر، چلاس، داریل، تانگیر اور بابوسر کی تحصیلوں پر مشتمل ہے۔ جبکہ استور ضلع استور اور شونتر کی تحصیلوں پر مشتمل ہے۔ یہ علاقے گلگت ایجنسی کا حصہ ہونے کی بنا پر گلگت کے ساتھ مشترکہ تاریخ رکھتے ہیں۔ 98ء میں ضلع دیامیر اور استور کی آبادی بالترتیب 131925 اور 71666 نفوس پر مشتمل تھی۔ [۸۷] جو 2017ء میں بالترتیب 230000 اور 90000 ہو چکی ہے۔ [۸۸]

پاکستان کا دوسرا بڑا اور دنیا کا نواں بڑا پہاڑ 8125 میٹر بلند نانگا پربت دیامیر میں واقع ہے۔ استور کے قریب راما جھیل سے نانگا پربت کا خوبصورت نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ گلگت سے چلاس تک پہنچنے کے لیے 90 میل کا سفر طے کرنا پڑتا

ہے ورنہ یہ گلگت کے جنوب میں ہے۔ مگر سڑک کی وجہ سے جو نانگا پربت کے گرد گھوم کر آتی ہے فاصلہ زیادہ طے کرنا پڑتا ہے۔ چلاس کے راستے میں رائے کوٹ کے مقام پر دریائے سندھ شاہراہ قراقرم سے الگ ہوتا ہے۔ یہاں گندھک کے گرم چشمے ہیں۔ رائے کوٹ سے ہی فیری میڈوز کے خوبصورت مقام تک جایا جاتا ہے جو نانگا پربت کے دامن میں ہے۔ بونیر ادی کے مقام پر چلاس کے لوگ گلگت استور روڈ بلاک کر کے سپلائی لائن منقطع کیا کرتے تھے۔[۸۹] بابوسر ٹاپ پر کشمیر، ہزارہ اور چلاس کی حدود ملتی ہیں۔ شاہراہ قراقرم سے پہلے مانسہرہ سے چلاس اور گلگت تک زمینی رابطہ بابوسر کے ذریعے ہی ممکن ہوتا تھا۔ یہیں سے راستہ وادئ کاغان، کشمیر اور شاردہ کو جاتا ہے۔ درد لوگ پرانے زمانے میں کوہستان سے چلاس جانے کے لیے بابوسر ٹاپ سے جگلوٹ جانے والے راستے کو استعمال کرتے تھے۔ خان بری نالہ کے قریب دیامیر بھاشا ڈیم تعمیر کیا جائے گا۔ خان بری وادی کے بعد داریل کی زرخیز اور تانگیر کی وادی آتی ہیں۔ جہاں سے چترال کا راستہ ہے۔ جبکہ چلاس کے مغرب میں کنڈیاں وادی سے سوات اور کالام جایا جاسکتا ہے۔ داریل و تانگیر اور کنڈیاں کی وادیاں منفرد تاریخ، تہذیب و ثقافت اور روایات رکھتے ہوئے کوہستان سے براہ راست منسلک ہیں۔[۹۰]

چلاس میں سکھوں، ڈوگروں اور انگریزوں کو ہمیشہ مشکل کا سامنا رہا۔ یہاں ان کی عملداری قائم نہ ہو سکی۔ چلاس کا البیرونی نے دریائے سندھ کے کنارے "سلاتھیا" اور "شلتاس" کے نام سے ذکر کیا تھا۔ جبکہ پروفیسر دانی کے مطابق چلاس میں چٹانوں پر کندہ عبارت میں اسے "سلاواتا" لکھا گیا ہے۔[۹۱] داریل کے لیے چینی سیاح ہیون سانگ نے "تالی ہو" اور فاہیان نے "تولی" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ ہیون کے مطابق یہاں ادیان (موجودہ سوات) کا دارالخلافہ تھا۔ استور گلگت سے کشمیر کے راستے میں ہمیشہ سے نمایاں اہمیت کا حامل رہا ہے۔ البیرونی نے اس کے لیے "اسویر" کا نام استعمال کیا۔[۹۲]

چلاس سطح سمندر سے 1359 میٹر اور 4460 فٹ بلند ہے۔ چلاس دیامیر کا صدر مقام ہے۔ چلاس کے لفظی معنی چھوٹی پہاڑی یا چٹان کے ہیں۔ مقامی لوگ اس کے معنی "چاند کی سرزمین" بیان کرتے ہیں۔ اس کی شہرت وہ چٹانیں ہیں جن پر بدھ مت کی مورتیاں ہیں اور قدیم تحریریں کندہ ہیں۔[۹۳] زمانہ قدیم میں چلاس بہت اہم علاقہ تھا۔ یہاں چٹانوں پر کندہ علامتوں کے بارے میں رشید اختر ندوی کا کہنا ہے:

> "۔۔۔ ان اداس اداس پتھروں تک پہنچ کر مجھے ایک بڑا ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کہ اس علاقہ میں بھی موہنجوڈرو اور ہڑپہ سے پہلے کے ہجری دور کا زمانہ آیا ہے۔ اور یہ تصویریں جو بظاہر مارخور کی نظر آتی ہیں۔ قدیم عہد کا تصویری رسم الخط ہے اور موہنجوڈرو اور ہڑپہ سے بھی پہلے عہد کا ہے۔"[۹۴]

چلاس کے ایک قدیم قلعے کو سکھ 1851ء کے حملے میں تباہ کر چکے ہیں۔ انگریزوں نے 1893ء کے حملے میں بھی تباہی مچائی۔[95] دنیا کے ہر ملک میں پتھر کے دور کے بعد پہلا دور یہی آیا جب انسان نے اپنے ماحول میں آباد جانوروں اور اپنے ساتھیوں، اپنے مشاغل اور ہتھیاروں کی تصاویر کو ایک دوسرے کو اپنے خیالات سے آگاہ کرنے کے لیے

استعمال کیا۔ ناپختہ تصاویر بہت قدیم عہد کی ہیں۔ یہاں سے ملنے والے اوزار ہڑپہ کے تمدن سے زیادہ پرانے ہیں۔ رشید اختر سر جان مارشل کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> "تو پھر یہ اوزار جو چلاس کے فنکاروں نے استعمال کیے بہت پہلے کے ہیں۔ تین ہزار قبل مسیح میں تو سومیری تہذیب بہت عمدہ سانچے میں ڈھل چکی تھی اور موہنجوڈرو اور ہڑپہ کے سومیری معماروں کے ہم قوم لوگ تھے جو چلاس اور پورے شمالی علاقے کی چین سے ملتی ہوئی سرحد سوست تک اس طرف اور بلوچستان دوسری طرف آباد تھے۔"[96]

ہاتھوں اور پاؤں کی تصاویر کے بارے میں رشید اختر ندوی کا موقف ہے کہ اس سے ان لوگوں کا مقصد یہ سمجھانا تھا کہ وہ شکار کے لیے جا رہے ہیں۔ چلاس کا اصل نام سیوات بھی بتایا جاتا ہے۔ سوات اور چترال کے پہلے پہل آبادی کے زمانے سے چلاس بھی آباد ہے۔ یہاں موجود قدیم آثار 1851ء سے پہلے تھے بعد میں سکھوں نے تباہ کر دیے۔ ورنہ قدیم عہد آریا، دارا اول سے لے کر دارا ثالث، سکندر مقدونی، مہاراجہ اشوک اور ان کے بعد یہاں قائم ہونے والی حکومتوں کے متعلق وہ سب بتاتے جن کی کڑیاں تاریخ سے غائب ہیں۔ چلاس کی چٹانوں اور سٹوپوں پر جن راجوں کے نام کندہ ہیں وہ خروشتی رسم الخط میں ہیں جو 500 سال قبل مسیح کا ہے مگر یہاں اس سے کہیں زیادہ پہلے سے آبادی موجود ہے۔ چلاس میں خروشتی، آرامی اور براہمی میں جتنے کتبات کندہ ہیں تاریخ ان میں سے اکثر کے بارے میں خاموش ہے۔ کشان حکومت کے بانیوں میں سے ایک ریمافورس کے نام کا کتبہ ملتا ہے۔ پارتھی بادشاہ گوندوفیرس کے کتبات ملے ہیں۔ کھس قبیلہ کے راجوں کے نام بہت سے کتبوں پر کندہ ہیں۔ کشان بادشاہوں کے کتبات بہت کم ہیں۔ اس زمانے میں شاید چلاس ان کے دائرہ اثر سے نکل گیا تھا۔ آرامی رسم الخط جو خروشتی رسم الخط کی اصل ہے یہاں ساسانیوں کے عہد میں متعارف ہوا۔ براہمی رسم الخط میں انھوں نے دلچسپی لی۔ رشید اختر ندوی کہتے ہیں:

> "براہمی رسم الخط کی تخلیق تو برہمنوں نے کی مگر اس رسم الخط کا سرچشمہ بڑے علمائے لسان نے موہنجوڈرو اور ہڑپہ میں رائج دراویدی رسم الخط کو قرار دیا ہے۔"[97]

چلاس میں ایک بڑی چٹان پر کندہ تحریر سے یہاں ہندو ساہی خاندان کی حکومت کا پتہ چلتا ہے یہ کوئی باہر کا خاندان نہیں بلکہ مقامی ہے۔ یہ ساہی ساکے یا سکیتھی تھے جو پانچویں یا آٹھویں صدی قبل از مسیح میں ایران سے بلوچستان پہنچے۔ عرصہ دراز تک وہاں حکومت کرتے رہے پھر سندھ پر قبضہ کیا اور ۹۲ء میں براستہ پنجاب ٹیکسلا پہنچے۔[98] سو سال بعد ساکوں پر زوال آیا تو انھیں سندھ اور پنجاب کی طرف لوٹنا پڑا لیکن کچھ گروہ پہاڑوں میں رہ گئے اور ہنوں کے زوال کے بعد دوبارہ قوت پکڑی اور سیستان تک رسائی پالی۔ اسی خاندان کے آخری فرماں روا کے بیٹے داہر کو محمد بن قاسم نے شکست دی اور ملتان تک کا علاقہ اسلامی سلطنت میں شامل ہوا۔ مگر اس کے تھوڑے فاصلے پر بھاٹیہ ریاست اور پنجاب اور شمالی علاقے غزنوی عہد تک ان کے زیر تسلط رہے۔ غزنوی نے ہند ساہی راجوں کو شکست دے کر پنجاب اور

سندھ میں غزنوی حکومت کی بنیاد رکھی۔ مگر شمالی علاقوں میں یہ خاندان اکبر کے عہد تک حکمران رہا۔ ہندو ساہی یا ہند ساہی بت پرست اور ہندو مت کا پیروکار تھا۔ ویشنو ان کا بڑا دیوتا تھا اس لیے چلاس میں شودیو اور ہاتھی کا بنا مجسمہ پچھلی صدی کے اواخر تک قائم تھا۔ رشید اختر ندوی کے خیال میں یہ ماہر سوار تھے۔ پولو کا کھیل انھوں نے یہاں متعارف کرایا۔ بت پرستی کی وجہ سے ان کے عہد میں کوئی بدھ یا سٹوپا تعمیر نہیں ہوا۔ یہ پنڈتوں کا عہد مروج تھا۔ انھوں نے اس سے پہلے اس خطے میں تعمیر شدہ بدھ مت کے آثار مٹانے کی بھی کوشش کی۔[99]

بلتستان

پاکستان کے شمال میں کوہ قراقرم اور کوہ ہمالیہ کے درمیان 10118 مربع میل پر پھیلا پہاڑی علاقہ بلتستان ہے۔ یہ سکردو، خپلو، کھرمنگ، روندو اور گلتری کی وادیوں پر مشتمل ہے۔ جبکہ بلتستان ڈویژن کو کھرمنگ، شگر، بلتستان اور گھانچے کے اضلاع میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سکردو یہاں کا تجارتی مرکز اور دیگر علاقوں سے رابطے کا جنکشن ہے۔ بلتستان کے جنوب میں کشمیر، مشرق میں لداخ و کارگل، مغرب میں گلگت اور دیامیر، شمال میں قراقرم کے برف پوش سلسلے اسے چینی صوبہ سنکیانگ سے الگ کرتے ہیں۔ یہ خطہ 34 درجے سے 26 درجہ عرض بلد اور 75 درجہ سے 77۔7 درجہ طول بلد کے درمیان سطح سمندر سے آٹھ ہزار فٹ تک بلند ہے۔ آب و ہوا مجموعی طور پر خشک ہے۔ اس کے چاروں طرف واقع دروں سے گردونواح کے ملکوں تک رسائی ممکن ہے۔ درہ زوجی لہ، چھور بٹ لہ، ستورولہ، تھلے لہ، برزل لہ، عالم پی لہ، برالدولہ، باشہ لہ، منڈولہ اور ہنگولہ قابل ذکر ہیں۔ ان سے سری نگر، کارگل، لداخ، یارقند، کاشغر، نگر، گلگت اور استورتک رسائی ممکن ہے۔ کوہستانی علاقہ ہونے کے باعث یہاں کی زمین میں ریت بہت زیادہ اور زرخیز مٹی کی کمی ہے۔ آب پاشی کے بغیر زراعت ممکن نہیں۔ زراعت کا دارومدار چشموں اور قدرتی مصنوعی گلیشیروں اور برفانی پانی پر ہے۔ مون سون ہواؤں کی رسائی نہ ہونے کے باعث جنگلات کی قلت ہے۔[100]

بلتستان کی وادی شگر دریائے شگر کے ساتھ دو راستے بناتی ہے۔ ایک ہسپر گلیشیر کے پار نگر کے ساتھ جبکہ دوسرا برالڈو کے ساتھ یارقند کی طرف۔ یہاں پاکستان کی سرحد بھارت کے ساتھ سیاچن گلیشیر کے ساتھ ملتی ہے۔ پہلے کوہ پیما پاکستان کی طرف سے ہی اس راستے پر جایا کرتے تھے۔ وادئ شگر میں 35 میل لمبا بالتورو گلیشیر ہے جو کے ٹو کے راستے میں ہے۔[101] چٹانوں پر کندہ برہمی نقوش کے مطابق شگر کا پرانا نام "سندی وشایا" ہے۔ مغلوں کے زمانے میں اکبر کے عہد میں بلتستان کو "تبت خورد" کا نام دیا گیا۔ یہ نام اس کی اصل تبت سے الگ حیثیت ممتاز کرنے کے لیے دیا گیا۔ 1589ء میں تبت خورد اور تبت بزرگ میں الگ الگ سفیر بھیجے جاتے تھے۔ کشمیر کے گورنر کی وساطت سے مغلوں کے تبت خورد سے تعلقات تھے۔[102]

رشید اختر ندوی کے مطابق سکردو میں سدپارہ جھیل کے پچھلی طرف پہاڑوں سے کشمیر تک راستے ہیں:

"مقامی روایات کی رو سے اکبر بادشاہ کے ایک ہم عصر درد بادشاہ نے جو مقپون یا مقچون خاندان کا انچن تھا، سدپارہ جھیل کا نام دیا اس لیے کہ اس نے یہاں ایک بہت بڑی دیوار بنائی تھی کہ پچھلی سمت سے آنے والے کشمیری آسانی سے سکردو کی حدود میں داخل نہ ہو سکیں۔ گو اس سدپارہ جھیل کے شمال اور جنوب میں دو اونچے اونچے پہاڑ ہیں لیکن اس کی پچھلی سمت جہاں برف ہی برف ہر سمت جمی ہے ادھر آنے کے کئی راستے ہیں حتیٰ کہ جہاں برف جمی ہے اس کی بلندی بھی بہت تھوڑی ہے اور اس کے پیچھے کوئی دو سو میل لمبا میدان بھی ہے جو کشمیر کی سرحد تک برابر اور مسلسل بڑھتا چلا گیا ہے۔"[103]

جغرافیائی، نسلی اور لسانی لحاظ سے بلتستان قدیم زمانے سے ہی تبت کے ساتھ منسلک ہے۔ اس لیے اس کا نام تبت خورد پڑا۔ اس حوالے سے مولوی حشمت اللہ کا موقف ہے کہ عرفاً بلتستان کہلایا جانے والا ملک شروع میں صرف تبت کے نام سے مذکور رہا بعد میں اسے لداخ تک وسعت دی گئی۔ تب لداخ کو تبت بزرگ یا تبت کلاں اور بلتستان کو امتیازاً تبت خورد کے نام سے موسوم کیا گیا۔ مگر مقامی طور پر لداخ کے لیے مریول اور بلتستان کے لیے بالتی یول کے نام مستعمل رہے۔ بالتی یول کا ترجمہ بلتستان ہے۔[104]

یہاں کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں قومی گیتوں اور لوک روایات سے جو انکشاف ہوتا ہے اس کے مطابق کشمیر سے مختلف اشخاص اپنے ہمراہیوں کے ساتھ وقتاً فوقتاً یہاں وارد ہوئے اور آبادی شروع کی۔ گیالو شال لونے گیول، شگر گیالپو نے شگری کلاں اور چوانده کورو آسمون چونے کھربو، برق ماپور چھونے برق نق اور بون چھے کچورہ سے نیچے وادئ سندھ میں آبادی شروع کی۔[105]

بلتستان کی جغرافیائی حیثیت ماضی میں بدلتی رہی ہے اور کئی ممالک کے ساتھ بلاواسطہ یا بالواسطہ جغرافیائی، نسلی، لسانی، سیاسی و مذہبی تعلقات استوار رہے جن میں چین، روس، ہندوستان، شمالی ہندوستان، لداخ، کارگل، تبت، بھوٹان، نیپال، سکم، مستانگ، چینی و روسی ترکستان، منگولیا، ہنزہ، نگر، چلاس، گلگت، چترال اور ایران قابل ذکر ہیں۔[۱۰۶]

بلتستان کی قدیم تاریخ پر مبنی کوئی دستاویز نہیں۔ اسے تاریخ میں پلولا، بلور، بلتی اور تبت خورد جیسے ناموں سے پکارا جاتا رہا۔ لوک روایتوں کے مطابق قبل مسیح میں تبت (لہاسہ، لداخ، کارگل، بلتستان) پر دیومالائی کردار کی مالک شخصیت کیسر کی حکمرانی تھی۔ جس نے ان علاقوں پر تبتی تہذیب و تمدن کے ان مٹ نقوش مرتب کیے۔ لوگ اسے دیوتاؤں کی اولاد سمجھتے تھے۔ اس کی رعایا تبتی الاصل مذہب بون چھوس کی پیروکار تھی۔ اس کی رزمیہ داستان بارہ ابواب پر مشتمل بلتستان کے کلاسیکی ادب کا شاہکار ہے جو سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے۔[107] جبکہ 400 تا 600 قبل مسیح کے دوران چین میں چو خاندان کی حکومت کے عہد میں بلتستان چینی تسلط میں چلا گیا۔ ساتویں تا دسویں صدی عیسوی کے دوران جب چین میں تانک خاندان برسر اقتدار آیا تو تب بھی چینی تسلط تبتی حکومت کے ذریعے قراقرم کی وادیوں تک تھا۔[108] سو دو سو سال قبل مسیح میں یہاں بدھ مت کی تبلیغ کے آثار ملے۔

"۔۔۔۔یہاں کے بدھ مجسموں پر جو برہمی یا ناگری رسم الخط کے الفاظ کندہ ملے ہیں۔ یہ ان بدھ راہبوں اور ان کے چیلوں کے ہاتھوں سے کندہ ہوئے ہیں جنھوں نے وسطی ہندوستان یا مہاراج اشوک کے پایہ تخت کے آس پاس کے علاقوں میں بنی ہوئی خانقاہوں میں رہ کر برہمی یا ناگری کی تعلیم پائی تھی۔"[109]

تبت کے بلتستان سے قریب ہونے کی بنا پر شمالی علاقہ جات، سوات، چترال، کشمیر میں مہاراجہ اشوک، مینانڈر اور مہاراجہ کنشک کے دور میں جو خانقاہیں تعمیر ہوئیں ان کے راہب برہمی علاقوں سے ادھر آئے اور برہمی رسم الخط ساتھ لائے۔ کیونکہ بدھ مت کی تبلیغ کشمیر، سوات اور بلتستان کے راستے چین اور تبت کے ملکوں میں ہوئی۔ اسی لیے بلتی رسم الخط تبتی نہیں بلکہ برہمی اور ناگری سے ماخوذ ہے۔ یہاں قدیم بدھ عہد کے کتبات میں برہمی رسم الخط اور آخری دور میں ناگری رسم الخط استعمال ہوا ہے۔ اس میں کہیں خروشی رسم الخط کا وجود بھی ملتا ہے۔ منتھل نالے کے قریب منتھل کی بدھ چٹان پر بدھ تصویر کے نیچے چھ فٹ لمبی چار سطروں میں برہمی سے مشابہ ناگری رسم الخط میں لکھی عبارت اس امر پر روشنی ڈالتی ہے۔[110]

بدھ مت کے بعد بون مت کے اختلاط سے یہاں لاما ازم وجود میں آیا۔ پانچویں سے چھٹی صدی عیسوی میں بلتستان پر پلولا شاہی حکمران تھے جن کی سرحدیں لداخ سے گلگت تک پھیلی ہوئی تھیں۔ 900ء تک یہ تبت کا صوبہ تھا۔ تب خانہ جنگی کے باعث الگ ہو گیا۔ لوک روایات کے مطابق رگیالو ستر البو افسانوی حکمران نے یہاں حکومت کی۔ 1200 میں سکردو کا شاہی خاندان اولاد نرینہ سے محروم ہوا تو ایرانی نوجوان ابراہیم کشمیر کے راستے سکردو آیا اور مقامی حکمران شکری کا داماد بنا اور ابرہیم مقپا کہلایا۔ اسی سے مقپون خاندان کی بنیاد پڑی۔ یہ خاندان ساڑھے چھے سو سال سکردو پر حکمران رہا۔ خپلو میں ترک خاندان یبگو اور شگر میں ختائی خاندان اماچہ کی حکمرانی رہی۔ مگر مجموعی طور پر پورے خطے پر مقپونوں کی بالادستی تھی۔ مقپون بوخا نے کھرپوچو پر قلعہ تعمیر کر کے دارالحکومت شگر سے سکردو منتقل کیا۔ شیر شاہ کے بیٹے علی خان کے دور (1540ء تا 1565ء) سے مقپون خاندان نے عروج حاصل کیا۔ شیر خان انچن کا نام تاریخ میں سنہرے حروف میں درج ہے۔ اس نے تبت پورالک سے لے کر گلگت چترال تک وسیع خطہ فتح کیا۔ انچن کے لداخ کے راجہ کی بیٹی سے شادی اور بعد میں جدائی پر مبنی گیت ہلال باغ تبتی لوک ادب کا سرمایہ ہے۔ شیر علی کی رسائی مغل شہنشاہ اکبر کے دربار تک تھی۔ اس کی بیٹی شہزادہ سلیم سے بیاہنے سے قریبی تعلقات قائم ہوئے۔[111]

راجہ شیر علی خان انچن کی بیٹی کے مغل شہزادہ سلیم کے ساتھ نکاح کی بلتستان میں بکثرت روایات ملتی ہیں۔ اس سلسلے میں دو طرح کی آرا ہیں۔ اول شہزادہ سلیم نے شہزادی سے شادی کی اور بیوی کی حیثیت سے وہ مغل دربار سے وابستہ رہی۔ دوم مغل دربار کی طرف سے لوگوں کا آنا اور شہزادی لے جانا اس بات کی دلیل ہے کہ سفارتی تعلقات بہتر بنانے کے لیے علی شیر انچن نے اپنی بیٹی کو خود بطور کنیز کے مغل دربار میں پیش کیا۔ باقاعدہ شادی کی صورت میں شہزادہ خود آکر تزک واحتشام سے شہزادی کو لے کر جاتا۔[112]

علی شیر خان انچن کے بعد باہمی کشمکش سے حکومت کمزور پڑ گئی۔ اس کے بیٹے عبدال خان کے ظلم و ستم کی داستان بلتی لوک ادب میں موجود ہے۔ بعد کے راجاؤں میں انچن کا پوتا شاہ مراد مدبر راجہ ثابت ہوا۔ تب کاشغر، کشمیر اور ہندوستان سے تعلقات کے باعث تہذیب و شائستگی نے ترقی کی۔ شاہ مراد کے بچوں کے دور میں ملک خانہ جنگی اور بد نظمی کا شکار رہا۔ رفیع خان (1710ء تا 1745ء) کے بعد مقپون حکومت کا زوال شروع ہوا۔ پھر کشمیر سے حملے ہوتے رہے۔ شگر، سکردو اور خپلو کی مقامی حکومتوں کی باہمی لڑائیوں نے بلتستان کی تینوں حکومتوں مقپون، اماچہ اور یبگو کی بنیادیں ہلا دیں۔ 1800ء میں علی شیر خان ثانی کا بیٹا احمد شاہ بلتستان کا آخری تاجدار ثابت ہوا۔ 1800ء سے 1840ء تک بظاہر احمد شاہ کی حکومت تھی مگر اندرونی طور پر ملک انتشار کا شکار تھا۔[113] ۱۸۴۰ء میں مقپون حکمران احمد شاہ نے بڑے بیٹے کی بجائے چھوٹے بیٹے کو ولی عہد بنایا تو بڑے بیٹے محمد شاہ نے جموں جا کر مہاراجہ گلاب سنگھ سے اپنی ولی عہدی کی بحالی کے لیے فوجی امداد طلب کی۔ اس لیے ڈوگرہ فوجیں بلتستان میں داخل ہوئیں اور یہاں تسلط قائم کیا۔[۱۱۴] اپنوں کی غداریوں نے ڈوگروں کے بلتستان پر تسلط کی راہ ہموار کی۔ احمد شاہ کو قید کر لیا گیا۔ ایک سال بعد شگر کے راجہ حیدر خان اماچہ نے ڈوگروں کے خلاف بغاوت کی مگر وہ بھی قید ہو گئے۔ ان کے قید ہونے پر "چو حیدر خان" نامی گیت میں عوام کے جذبات کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان پر خوشیوں کے دروازے بند ہو گئے۔ احمد شاہ کی المناک شکست پر اس کے بیٹے امیر حیدر کی ماں نے ایک حزنیہ گیت "چو امیر حیدر" کے نام سے کہا جو اب بھی زبان زد عام اور مقپون خاندان کی شکست کی علامت ہے۔[115]

ڈوگروں نے سو سال سے زائد عرصہ حکومت میں یہاں طرح طرح کے مظالم ڈھائے۔ مہاراجہ کی تمام تر دلچسپی صرف خراج، مالیہ اور نذرانوں کے حصول میں تھی۔[116] عوام نے کبھی دل سے ان کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد اپنی مدد آپ کے تحت ڈوگرہ حکومت کے خلاف اعلان جنگ کیا اور چھ ماہ کی جنگ کے بعد یہ علاقے آزاد ہو گئے۔ 1948ء میں ان کا پاکستان سے الحاق ہو گیا۔[117]

بلتستان میں کھرمنگ، سکردو اور روندو کے مغربی اطراف کے نالوں میں کہیں کہیں چیڑ، جونیپر، سلو فر اور بھوج پتر کے درخت پائے جاتے ہیں۔ قدرتی جنگلات کا مجموعی رقبہ 2667 ہیکٹر ہے۔ جنگلات کی کمی دور کرنے کے لیے یہاں سفیدے، بید اور بیر کے درخت بکثرت لگائے گئے ہیں۔ چنار اور بید مجنوں کے درخت بھی ملتے ہیں۔ یہاں دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو کے علاوہ مشہ بروم، گشہ بروم اور براڈ پیک بہت مشہور ہیں جو سب آٹھ ہزار فٹ سے بلند ہیں۔ قراقرم کی تین سو بلند چوٹیوں میں سے ڈیڑھ سو بلتستان کی حدود میں ہیں۔ یہاں کے بڑے اور اہم گلیشئروں میں بیافو، بالتورو، چھو غولولوگمہ اور ریگنگو قابل ذکر ہیں۔ یہاں گلیشئر پالنے کا منفرد رواج بھی ہے۔ خشک ریتلے میدانوں کے علاوہ یہاں صاف شفاف جھیلوں میں کچورہ، بوژھو، موروق ژھو، سدپارہ ژھو، کیتاہ ژھو، شگر، حدبہ ژھو، دیوسائی ژھو

اور غندوس غوار شی ژھو اہم ہیں۔ سکردو کے جنوب میں سطح مرتفع دیوسائی ایک وسیع و عریض سبزہ زار ہے۔ لداخ سے نکلنے والا شیر دریا سندھ بلتستان سے گزرتا ہے۔ بلتستان میں یاک، بزو، بزومو، تول، تولمو، گرر، گرمو، بیل، گائے، بکری، بھیڑ، گھوڑا، گدھا، بطخ اور مرغابیاں پائی جاتی ہیں۔ یاک یہاں کی خصوصی شناخت ہے۔ جنگلی حیوانات میں کیل، ہرن، مارخور، اڑیال، آہو، بھیڑیے، چیتے، کالے اور بھورے ریچھ، سیاہ گوش، لومڑی، آبی کتے، جنگلی بلی، خرگوش اور مارموٹ ملتے ہیں۔ پرندوں میں چکور، رام چکور، کبوتر، فاختہ، ہدہد، کوا، بیا، باز، چیل اور تیتر کے علاوہ بہت سی قسموں کی چڑیاں بھی پائی جاتی ہیں۔[118]

ماضی میں گردوپیش کے مختلف ممالک کے جغرافیائی، لسانی، سیاسی اور مذہبی تعلقات کے باعث زمانہ قدیم سے مختلف قوموں اور نسلوں کے لوگ یہاں آکر آباد ہوتے رہے۔ اس لیے موجودہ زمانے میں یہاں پانچ سے سات فی صد شین (درد) اور تقریباً دو فیصد کشمیری نژاد کے علاوہ باقی سب مشترکہ شناخت رکھتے ہیں۔ یہاں کا قدیم اکثریتی گروہ منگول ہے۔ جنھیں تبتی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مجموعی آبادی کا ساٹھ فی صد ہیں۔ انھی کی وساطت سے تبتی زبان نے یہاں فروغ پایا۔ یہاں ایک مخصوص پیشے کو تبتی میں "مون پل" کہتے ہیں۔ یہ بدھ مت کی تبلیغ کے لیے بلتستان آنے والوں کی نسل سے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے یہ موسیقار، موچی اور لوہار تھے۔ اس کے علاوہ بروشو (یشکن)، شین (ہند آریائی نسل سے)، خورباہور (ترک قبائل)، کشمیری (کھچے)، سادات، مقپون، چترالی اور پٹھان قبائل یہاں آباد ہیں۔[119]

چودھویں صدی عیسوی میں غوطہ چوسینگے کے دور میں امیر کبیر سید علی ہمدانی بلتستان میں آئے اور اسلامی تبلیغ کا آغاز کیا۔ اس سے پہلے یہاں بدھ مت اور بون مت رائج تھا، بعد میں سید محمد نور بخش، سید شمس الدین عراقی، طوسی برادران، میر عارف اور دیگر علمائے دین تبلیغی دوروں پر یہاں آتے رہے۔ ان مشائخ کے مقبرے بھی یہاں موجود ہیں۔[120] 1998ء کی مردم شماری کے مطابق بلتستان کی آبادی 303214 نفوس پر مشتمل تھی جو 2017ء میں تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔[121]

چترال

چترال پاکستان کا منفرد لسانی و ثقافتی خطہ ہے۔ یہ خیبر پختونخواہ کے شمال مشرق میں مالاکنڈ ڈویژن کا صدر مقام ہے۔ یہاں کم سے کم 3727 فٹ اور زیادہ سے زیادہ بلندی 12000 فٹ ہے۔[122] چترال کی سرحدیں مغرب، شمال اور جنوب تین اطراف سے افغانستان سے ملتی ہیں۔ مشرق میں گلگت اور سوات ہیں۔ جنوب سے ایک درہ دیر کو جاتا ہے۔[123] تاریخی اعتبار سے چترال، دردستان اور بلورستان کا حصہ رہا ہے۔[124] باجوڑ کے لوگوں سے کبھی بھی چترالیوں کا رشتہ نہیں رہا۔ یہ نسل، ثقافت ہر حوالے سے مختلف ہیں۔ 1892ء تک چترال کی حدود وسیع تھیں۔ اس کے کٹور خاندان کے یاسین کے خوش وقت خاندان سے مراسم تھے۔ کشمیری مہاراجہ اور بعد ازاں برطانیہ نے چترال کے

TH-27882

معاملات میں مداخلت شروع کی تو 19 اکتوبر 1892ء کو چترال کو گلگت ایجنسی سے الگ کر کے مالاکنڈ ایجنسی کا حصہ بنا دیا گیا۔[۱۲۵] ونسٹن چرچل کی یادداشتوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے:

"کوتل کیمپ سے سات میل آگے جا کر آمندرہ کا درہ ہے۔۔۔ یہ ایک بہت ہی تاریخی سڑک ہے۔۔۔ دراصل یہ سڑک چترال کو جاتی ہے۔ انگریزوں نے اس سڑک کے لیے ایک خاص پالیسی بنائی ہے۔ برطانوی حکومت چاہتی ہے کہ مالاکنڈ سے چترال تک کا راستہ ہمیشہ کھلا رکھا جائے کیونکہ چترال کو برطانیہ کی حکومت اپنے ماتحت رکھنا چاہتی ہے"۔[126]

چترال کے پرانے ناموں میں مختلف وقتوں میں قاشقار، کھوستان، گوک، مغلستان، پھرار[127] چتر، چترار شامل رہے ہیں۔ قاشقر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ اصل میں کاش غار ہے یعنی کاش کی غار۔ ابتدائی دور میں یہاں آباد بدھ لوگوں نے اسے یہ نام دیا تھا۔ بعد میں چینی فغفور نے اسے چتر کے نام سے موسوم کیا۔ اہل اسلام کے زمانے میں یہ چتر سے چترار بنا۔[128] پروفیسر عبدالرحمٰن کے مطابق چترال کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ 334 قبل مسیح میں سکندر اعظم کے ساتھ یونان سے آنے والوں نے خوراک اور پانی کی تلاش میں جب یہاں قدم رکھا تو زرخیز زمین کے باعث اسے "چھت" کہا پھر بگڑ کر یہ چھترار بنا، اردو میں چترار اور پھر چترال بن گیا۔ اہل چترال اسے اب بھی چترار کہتے ہیں۔[129]

قدیم عہد میں چین اور دیگر ایشیائی ممالک کے درمیان مشہور شاہراہ ریشم چترال سے گزرتی تھی اس لیے یہ اہم تجارتی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔[130] افغان صوبے بدخشاں، کنٹر، نورستان اور واخان کے خطے چترال کے قریبی ہمسائے ہیں۔ واخان پامیر کی پٹی کے راستے کاشغر اور یارقند (چینی ترکستان)، بدخشان کے راستے تاجکستان، ازبکستان کے ثقافتی مراکز تک ماضی میں آمدورفت ہوتی رہی۔[131] چترال کے شمال سے مغرب اور جنوب تک ہندوکش کے پہاڑی سلسلے ہیں۔ ترچ میر چوٹی پچیس ہزار فٹ سے بلند ہے۔ مشرق میں ہندوراج کا سلسلہ ہائے کوہ ہے۔ جس کی اہم چوٹی بونیروم ہے۔ چترال کے دونوں طرف 204 بلند چوٹیاں ہیں۔ یہاں کے مشہور پہاڑی دروں میں شندور، چیمبرکن، تھوئی، درکوت، چترال کو گلگت سے ملاتے ہیں۔ بروغل، کان خون، سدا مسترغ، او چھیلی، ختنزہ چترال کو افغانستان سے ملاتے ہیں۔ لواری دیر کے راستے چترال کو باقی ملک سے ملاتا ہے۔ یہاں چھوٹے بڑے کئی گلیشئر ہیں جن میں چیان تارپیچ اوخ، کچی کھنی، کھوٹ گاز، میراگام، گازکستان مشہور ہیں۔ دریائے چترال کا منبع چیاں تار گلیشئر ہے۔ اس مناسبت سے وادیٔ بروغل میں اس دریا کو چانتاروغ کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے معاون دریاؤں میں لاسپور، تورکھو، موڑکھو اور لٹکوہ کے دریا ہیں۔ اہم جھیلوں میں شندور اور قرمبر ہیں۔ شندور جھیل ڈھائی میل لمبی اور ڈیڑھ میل چوڑی ہے۔ چٹی بوئے نامی بڑی جھیل 1908ء کے سیلاب میں خشک ہو گئی۔ جغرافیائی اعتبار سے چترال بالائی اور زیریں حصوں میں منقسم ہے۔ زیریں چترال کالاش ثقافت کے حوالے سے مشہور ہے۔ کلاش گوم بریر، رمبور اور بمبوریت پر مشتمل ہے۔ درویش، لٹکوہ اور چترال اس کے الگ خطے ہیں۔ بالائی چترال کھو ثقافت کے باعث مشہور ہے اسے تورکھو، موڑکھو اور

مستوج نام کے الگ تین خطوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ بالائی چترال میں برفانی پہاڑوں پر پایا جانے والا خاص جانور ہرن ہے۔ یہاں بید، صنوبر اور بھورج کے جنگلات ہیں۔ تیتر اور چکور عام پرندے ہیں۔ مایون موسمی پرندہ ہے۔[132]

چترال کی تاریخ کا تحریری حصہ ڈھائی ہزار برس پر محیط ہے۔ 500 قبل مسیح میں یہاں ایرانیوں کی حکومت تھی۔ ابتدائی لوگ غاروں میں رہتے تھے۔ پھر سکندر مقدونی کا تذکرہ ملتا ہے۔ پہلی سے ساتویں صدی عیسوی تک چترال چینیوں کا باج گزار رہا۔ گندھارا کے راجا کنشکا نے بھی اس دوران اسے تاراج کیا۔[133] قاشقار سے چینی حکومت کو جگنوؤں کا صندوق بطور خراج بھیجا جاتا تھا جو جشن کے دنوں میں چراغاں کے طور پر بہت کار آمد ثابت ہوتا تھا۔[134] آٹھویں صدی میں مقامی سرداری نے یہاں سر اٹھایا۔ بہمن کھوسانی پہلا مقامی سردار تھا۔ اس نے چینی طرز پر ایک قلعہ بھی تعمیر کیا۔ جس تک مارخور اور ہرن کے سینگوں کی مدد سے پائپ لائن بچھا کر پانی لایا گیا۔ زیریں چترال پر بلہ سنگ، راجہ رائے اور دیگر کلاشی سرداروں نے حکومت کی۔ بالائی حصے پر سو ملک کا اقتدار تھا۔ لیکن تسلسل کے ساتھ کوئی خود مختار حکومت نہ کر سکا۔ 1320ء میں ترکستان کے رئیسہ خاندان نے یہاں حکومت قائم کی۔ اس کے بعد خاندان سنگین علی اور کٹور خاندان کی حکمرانی رہی۔ کچھ حصوں پر خوش وقت خاندان بھی قابض رہا۔ کٹور خاندان سوا چار سال تک چترال پر حکمران رہا۔[135] کٹور عہد کے دوران 1895ء میں انگریزوں نے چترال کو اپنی نو آبادیات میں شامل کیا۔ 1947ء میں اس کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہوا۔ 1969ء میں چترال کے ضلع بننے کے بعد 1974ء میں ریاستی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ چترال قدیم عہد میں بدھ مت کا گڑھ رہا ہے مگر اس کے آثار بہت کم ملے ہیں۔ کالاش مذہب ایک زمانے میں بہت عروج پر رہا۔ اس کے اثرات اب بھی موجود ہیں۔ تیرھویں صدی کے بعد یہاں اسلام آیا۔ تاج مغل، اخون سلہا اور ناصر خسرو کی دعوت اسلام کا تذکرہ تواتر سے روایات میں موجود ہے۔[136]

چترال میں محدود دائرے میں چودہ نسلی گروہ الگ الگ رہتے ہیں۔ کھو قوم یہاں اکثریت میں ہے اور کل آبادی کا 86 فیصد ہے۔ آبادی کے دیگر اجزائے ترکیبی میں پختون، شین، گجر، کلاش، تاجک، بشگالی، ڈمیلی، وخی، گواری، منجی، اور سونی، سریقولی اور کرغیز شامل ہیں۔[137] کھو مختلف النسل قبائل ہیں۔ آریا حملوں کے دوران پشاچہ نام کا جو قبیلہ یہاں آباد تھا اور حملہ آوروں میں مدغم ہوا یا بھاگنے پر مجبور ہوا کھو کہلایا۔ اس میں بعد میں ایران، کشمیر، ترکستان، تانگیر وغیرہ سے ترک وطن کر کے آنے والے ملتے گئے۔ شین قبیلہ چودھویں صدی میں یہاں آیا۔ انھوں نے چترال میں ابھی تک اپنی اصل ثقافت اور زبان کو محفوظ رکھا ہے۔ گواری قبیلے کو ارندوئی بھی کہتے ہیں۔ یہ تین جگہوں سے یہاں آئے اور اپنی منفرد شناخت برقرار رکھی۔ ڈمیلی قبیلے کی اکثریت اپنے آپ کو یہاں کا اصل باشندہ کہتی ہے۔ 1450ء میں یہ باجوڑ سوات سے آکر یہاں کے لوگوں میں شامل ہوئے۔ بشگالی کو ان کے سابقہ مسکن بشگال (نورستان) کی نسبت سے بشگالی کہا جاتا ہے۔ یہ افغانستان کی اس مشہور نسل سے تعلق رکھتے ہیں جنھیں سیاہ پوش کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انھی

کے وطن کو کافرستان کہا گیا جو اب نورستان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ لنکوہ، رمبور اور بمبوریت میں ان کی خاصی آبادی ہے۔ اس قبیلے نے اپنی تہذیب و ثقافت، زبان اور لباس کو محفوظ رکھا ہے۔ محققین کالاش سے امتیاز کرنے کے لیے انھیں سرخ کافر کا نام دیتے ہیں۔[138] منجی افغان قبیلہ ہے۔ کالاش چترال کا سب سے مشہور قبیلہ سیاہ پوش کافروں کا گروہ ہے۔ ان کی نسبت سے بریر، بمبوریت اور رمبور کو کلاش گوم کہا جاتا ہے۔ اپنے اور دوسروں کے ریوڑ پالنے والے گجر خانہ بدوش ہزارہ اور سوات کے پہاڑوں سے آکر آباد ہوئے۔ سفید ہن یا افتالی قبائل سے تعلق رکھتے ہیں جو پانچویں صدی میں شمال کی طرف سے برصغیر آئے۔ واخان باشندوں کو یہاں وخیک یا واخی کہا یا تا ہے۔ انھوں نے گلہ بانی اور زراعت کا پیشہ اپنایا۔ سریقولی چین ترکستان سے ہجرت کر کے آئے اور منگول نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور سونی بشگالی تارکین سے الگ شناخت کے حامل ترک وطن کر کے آئے اور خود کو قریش کہلواتے ہیں۔ انھیں مسلم فاتحین کے ساتھ افغانستان آنے کا دعویٰ ہے۔ آبادی کے اجزائے ترکیبی کی مناسبت سے چودہ نسلی گروہ چودہ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔[139]

کلاشہ بولنے والے کلاشیوں کے بارے میں بہت سی روایات ہیں۔ احمد حسن دانی کے مطابق افغانستان میں ویگال وادی ابھی بھی کالاشم کے نام سے موسوم ہے۔ یہ وہاں کے نورستانی قبائل سے صدیوں پہلے نکالے گئے ہیں۔ تب انھوں نے زیریں چترال پر قبضہ کیا اور آباد ہو گئے۔[140] مختلف ماہرین لسانیات اور بشریات انھیں یونانی، ہند آریائی بتاتے ہیں۔ کوئی انھیں شمالی یورپ، کوئی وسطی ایشیا، کوئی بابل ونینوا اور ایران کے لوگ بتاتے ہیں۔ خود کافر اپنے پرانے وطن کا نام تسیام (سیام) بتاتے ہیں۔ پشاچہ، دردوں اور کافروں کا پرانا وطن گندھارا تھا۔ یہاں کے لوگ نسلاً مختلف قبائل میں بٹے تھے اور ہمیشہ کشت و خون میں گرفتار رہتے تھے۔ کمزور قبائل دور دور ہجرت کر جاتے تھے۔ اس نسل کا قدیمی مرکز سوات اور پشاور تھا۔[141]

> "یوسف زئی قبیلہ کے آنے سے قبل جو لوگ یہاں قیام پذیر تھے وہ ہندو مت، بدھ مت اور کالاش مت کے پیروکار تھے۔۔۔ اور کافر لوگ موجودہ کالاش لوگ تھے جو سوات کے اصل اور قدیمی باشندے تھے۔"[142]

اس حوالے سے پرویش شاہین کی تحقیق کا نچوڑ یہ ہے کہ سوات سے قبائل کی ہجرت بار بار ہوتی رہی۔ یہاں یونانی تہذیب بہت عرصہ رہی کیونکہ افغانستان، گندھارا اور درد علاقے یونانیوں کے گڑھ رہے ہیں۔ سوات کو یہاں مرکزیت حاصل تھی۔ یونانی کہیں غائب نہیں ہوئے بلکہ پختونوں کے ساتھ گھل مل گئے۔ یہ دردی، پشاچی، کلاشی قدیم گندھاری لوگ ہیں۔ سولہویں سترھویں صدی میں شانگلہ پار ڈومانامی کلاش حکمران تھا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر بشام تھا۔ کافر لوگوں کا یہ کہنا کہ یہ تسیام سے آئے ہیں یہی بشام ہے۔ کیونکہ ان علاقوں میں یہ ان کا آخری گڑھ تھا۔ ہنزہ کے مومن

آباد میں ڈومکی بھی اسی ڈوما کی اولاد یار عایا ہیں۔ اورنگزیب عالمگیر کے عہد تک سوات میں کالاش کافر پائے جاتے تھے۔ دیر کوہستان میں ان کی بادشاہت تھی۔ یوسف زئی حملوں کے بعد ان کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔[143]

سوات، کلاش اور شمالی علاقہ جات کے قدیم رسوم ورواج کی قدامت و قربت کا پتہ با آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے پرویش شاہین کا کہنا ہے:

"ہمارے نزدیک یہی وہ کافر ہیں مگر ہم انھیں خطے کے قدیم رہنے والوں سے جدا نہیں کر سکتے۔ میرے خیال میں یہ بات ہے بھی ناممکن، کیونکہ اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں انھیں یہاں کی قدیم حقداری تہذیب و تمدن اور ثقافت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اگر اب بھی اس خطے کی پرانی تہذیب و ثقافت اور معاشرے کو معلوم کرنا ہو تو ہمیں اس علاقے پر بہت زیادہ توجہ دینا ہوگی کیونکہ قدیم روایت کا اثر مکمل نہیں تو کم از کم آدھی سے زیادہ حصہ اب بھی کافرستان میں ان کی پرانی قوم اور مذہب کے ساتھ لگاؤ کی وجہ سے موجود ہے۔"[144]

جارج میکمن کے خیال میں 1892ء کے قریب قریب عام روایات و اعتقادات کے مطابق کافرستان ایک مقدونوی رخنہ سمجھا جاتا تھا جو ہندوستان میں سکندر کے گزشتہ سپاہیوں کے باقیات کا مسکن تھا مگر 1892ء میں گلگت کے لیے برطانوی ریزیڈنٹ جارج سکاٹ رابرٹس یہاں گیا تو مختلف دیہات کی زبان، عادات، روایات کے گہرے مطالعے کے بعد اس نے اس تاثر اور مفروضے کو رد کیا کہ یہ مقدونوی ماخذ کے تھے۔ اس کے خیال میں اسلام کی آمد پر مشرقی افغانستان کے بعض باشندوں کو وادیوں کے اوپر دھکیل دیا گیا جو وہاں پائے جانے والے درد گروہوں سے متصادم ہوئے اور چند علاقوں تک محدود ہو گئے۔ ان کی رسمیں بہت عجیب تھیں۔ گھوڑے کے سر والی چھوٹی نقرئی چھڑی گویا عورتوں کا نشان عزو افتخار تھی۔[145]

یونانی مورخین کی کتب میں دریائے کھو اور نورستان کے تذکرے ملتے ہیں۔ شمالی علاقہ جات، دیر، سوات میں کالاشی ثقافت کے آثار پائے گئے ہیں۔ چترال میوزیم کے میر حیات کا کہنا ہے کہ جدید ٹیکنالوجی سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ یہ کالاشی آریائی ہیں کیونکہ کھدائی سے کوئی ایسی شہادت سامنے نہیں آئی کہ یہ سکندر اعظم کی فوج کے زخمی سپاہیوں کی اولاد ہیں۔ DNA ٹیسٹ کے ذریعے بھی ثابت ہوا ہے کہ ان کا یونانیوں سے کوئی تعلق نہیں۔[146] کالاش کا رقبہ چھے ہزار کلومیٹر اور آبادی پانچ ہزار سے اوپر ہے۔ یہاں کی تین مشہور وادیوں بمبوریت، رمبور اور بریر کو مقامی زبان میں ھومریت، رک موہ اور برو جبکہ ان میں رہنے والوں کو مومولا، رک لا اور بری لا پکارتے ہیں۔[147] یہاں کی مشہور چوٹیوں میں ترچ میر، استور نال اور خوشاق ہیں۔ یہاں کے درختوں کی لکڑی بہترین ہے۔ یہاں قیمتی جڑی بوٹیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ مشروم کو یہاں دیوتاؤں کی خوراک سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کے معروف دریاؤں میں مومو ریت گا (دریائے بمبوریت)، بی ربو گا (دریائے بریر) اور رک مو گا (دریائے رمبور) شامل ہیں۔[148]

1998ء میں چترال کی کل آبادی 318000 نفوس پر مشتمل تھی۔[149] 2017ء کی مردم شماری کے مطابق چترال کی کل آبادی تقریباً ساڑھے چار لاکھ ہے۔ آبادی میں اضافے کی شرح 1.8 فیصد رہی ہے۔ [150] لواری ٹنل بننے سے پہلے چترال کا زمینی رابطہ برف باری کے دوران باقی ملک سے کٹا رہتا تھا، اب سارا سال بحال رہے گا۔ پہلے برف باری کے دوران چترال کے لوگوں کو لواری ٹاپ بند ہونے کے باعث افغان صوبہ کنڑ سے ہو کر پاکستان کے مختلف شہروں کا رخ کرنا پڑتا تھا۔[151] لواری ٹنل کا افتتاح جون 2017ء میں ہوا اور اسے عوام کے لیے جولائی 2017ء میں کھول دیا گیا۔[152]

سوات

اسلام آباد سے شمال مشرق کی جانب 255 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع وادئ سوات کا رقبہ 8788 مربع کلومیٹر ہے۔ سوات کے شمال میں چترال، جنوب میں بونیر اور مردان، مغرب میں دیر اور مشرق میں کوہستان ہے۔[153] لفظ سوات کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف آرا ہیں۔ سُوءات کا معنی سورج کی مانند چمکنے والا ہے۔ یہ لفظ بگڑ کر سوات بن گیا۔ یہاں سورج دیوتا کی پرستش کی جاتی ہے۔ دریائے سوات کو پانی کی نسبت سے عہد قدیم میں سواستو پکارا جاتا تھا۔ اس کا تذکرہ لفظ ادویانہ بمعنی باغ کے بھی قدیمی کتب میں آتا ہے۔[154]

> "سوات کا نام یونان کی کتابوں میں "اساگنی" درج ہے اور یہ لفظ سنسکرت کے لفظ "اسالا" سے لیا گیا ہے۔ جس کے معنی بہادر شہسواروں کے ہیں لیکن بعد میں یہ لفظ "اسوکا" پکارا جانے لگا۔ بعد کے یونانیوں نے اسے اسائی اور اساکائی میں تبدیل کر دیا۔ چینی سیاح ہیون سانگ نے اس علاقے کو "ستوپوموسوتو" کا نام دیا تھا جبکہ دو اور چینی سیاحوں اور زائرین فاہیان اور سانگ لون نے اس علاقے کو "یوچانگ" کا نام دیا۔ جب کہ آخری چینی سیاح جو تیرھویں صدی میں یہاں آیا سوات کو آرگیان کے نام سے پکارتا ہے۔"[155]

پرویش شاہین کے مطابق محققین نے سواستو، سوتھاس، گوری اور کوپھس جیسے ناموں سے یاد کیا ہے۔ تاریخ میں ادویانہ، اجیانہ، اوچانگ، تیرات، نادربن، سواد، صوات جیسے نام ملتے ہیں۔[156]

سوات اپنے وافر پانی کے باعث سوات ہے۔ یہاں بہت سی آبشاریں اور جھیلیں موجود ہیں۔ دریائے سندھ یہاں پچاس کلومیٹر تک بہتا ہے۔ دریائے سوات یہاں کا سب سے لمبا اور خوبصورت دریا ہے۔ سوات کی زرخیزی اسی کی مرہون منت ہے۔ یہاں بے شمار چھوٹے دریا (خوڑ) بہتے ہیں۔ جن میں درال، چیل، لوئے، خوازہ خیلہ، منگلور، جامیل، مرغزار، باروکی، ارونی، میاں دم، مدین اور شاہ پور خوڑ شامل ہیں۔ یہاں باون چھوٹی جھیلیں پائی جاتی ہیں جن میں زیادہ مشہور جو اپنے پیچھے پوری تہذیبی داستان اور مذہبی تقدس رکھتی ہیں درال، جبہ لی، کونڈول، سپین خور، خاپیرو، لیدام، اسمس، بڑی بابا، مانکیال، سوکاڑ، مہوڈنڈ، تناز گاہ، بٹ گرام، نخنے، موچی، سنگری جھیل شامل ہیں۔ سوات کے چاروں طرف بلند و بالا پہاڑ ہیں۔ یہاں کے مشہور پہاڑوں میں کالام میں واقع کوہ فلک سیر 20 ہزار فٹ بلند جسے مقامی طور پر

بالاسر کہا جاتا ہے، بحرین کے علاقے مانکیال، کوہ ایلم، شانگلہ، شل خوسر، پیر سر، مالم جبہ شامل ہیں۔ پیر سر سکندر کے حملے کے باعث مشہور ہے۔[157]

تاریخی طور پر سوات کا ذکر "رگ وید" میں آیا ہے۔ مگر کھدائی سے اس کی زیادہ قدیم شاندار تاریخ کے شواہد ملے ہیں:

"ان آثار کی روشنی میں سوات کی تہذیب، تاریخ، تمدن، آریاؤں سے ہزاروں سال پہلے کے ایک شاندار دور تک پہنچی اور جس کی روشنی میں با آسانی یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ آریاؤں سے قبل بھی وادئ سوات معاشی، تجارتی اور سماجی طور پر ایک بھرپور پھلی پھولی وادی تھی۔"[158]

قدیم آثار کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ سوات پانچ ہزار سال قبل مسیح سے آباد ہے۔ قبل از تاریخ سے آباد اس علاقے کے بارے میں ماہرین آثار قدیمہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قدیم دور میں گلگت، چترال اور دیر کی طرف سوات کالام کا استعمال بحیثیت ایک شاہراہ ہوتا تھا، ہندوکش اور واخان کو وادئ سندھ سے ملانے والا یہ راستہ افغانستان کی وادئ کونٹر سے گزرنے والے راستے سے زیادہ آسان تھا۔[۱۵۹]

وادئ سوات کے مختلف مقامات غالیگے، گوکدرہ، علی گرامہ، بری کوٹ، لوٹ نیڑ سے قدیم زمانے کے آثار ملے ہیں جو وادئ سندھ کے نوادرات سے مماثلت رکھتے ہیں۔ بری کوٹ میں آگ کی پرستش کے شواہد پائے گئے ہیں۔ سوات میں تمام خوب صورت علاقوں کی خصوصیات یکجا پائی جاتی ہیں۔ تاریخ، تہذیب، دلکشی و دلفریبی سے مالا مال یہ خطہ آثار قدیمہ، قیمتی معدنیات، سنگ مرمر اور عمارتی لکڑی کے باعث مشہور ہے۔ مختلف ادوار میں دراوڑ، آریا، ایرانی، یونانی، ساکا، کشن، ہن، ہندوشاہی، زرتشت، بدھ مت اور اسلام کے پیروکاروں کی یہ سرزمین تاریخی حوالے سے بہت اہم ہے، دریائے سوات مہابھارت میں بھی مقدس گردانا گیا ہے۔[۱۶۰] ہندوکش کے راستے آنے والے آریا کے ایک جتھے اور دراوڑوں کی پہلی مشہور جنگ جو تاریخ میں پنجال کی لڑائی سے مشہور ہے، سوات میں ہوئی۔ دریائے سوات کے کنارے ویدوں کے بھجن تخلیق ہوئے۔ قدیم سوات کے تبت، چین، ایران، عراق، روم اور وسطی ایشیا کے لوگوں سے گہرے تجارتی، ثقافتی و مذہبی تعلقات تھے۔[161]

سکندر کی یہاں آمد کے حوالے سے رشید اختر ندوی کہتے ہیں:

"اسپی کو شکست دینے کے بعد سکندر باجوڑ سے وادئ سوات میں داخل ہوا، جہاں ان دنوں یونانی نسل کی ایک وہ قوم آباد تھی، جو آج کل کافرستان میں رہتی ہے، اس قوم نے سکندر کے حضور پہنچ کر دعویٰ کیا کہ وہ ان یونانیوں کی اولاد ہے جو ڈائی نوسوس کے ساتھ ہندوستان سفر پر آئے تھے اور یہاں رہ گئے تھے۔"[162]

ہندومت میں سوات اہمیت کا حامل ہے ان کا عقیدہ ہے کہ رام چندر جی نے بن باس سوات میں کاٹا۔ اس حوالے سے سوات کا پہاڑ ایلم ان کے لیے مقدس ہے۔ بدھ مت کا تو گہوارہ سوات کہلاتا ہے۔ یہ شاہراہ ریشم کا ایسا سنگم

رہا ہے جہاں وسط ایشیا میں، چین، ہندوستان اور رومۃ الکبریٰ کے راستے آکر ملتے تھے۔ اہل سوات کی بہادری کے باعث ایرانی شہنشاہ دارا اول نے انھیں اپنے لشکر میں شامل کیا۔ سکندر اعظم کو سوات میں لڑائی کے بعد ان سے صلح کرنی پڑی اور وہ واپس لوٹ گیا۔ سکندر کے بعد یہ علاقہ مختلف وقتوں میں موریا خاندان، یونانی باختری، ساکا، پارتھین، کشان، ہندوشاہی، غزنوی، غوری، چنگیز خان، قبیلہ یوسف زئی، بابر عالمگیر، احمد شاہ ابدالی، سکھوں اور اخوند آف سوات کے درمیان اہم حیثیت کا حامل رہا۔[163]

سوات گندھارا کا حصہ تھا۔ گندھارا کو اتھروید میں گندھاری کہا گیا۔ یہ گاں دھاروا کی بدلی شکل ہے، اور قدیم معدوم دراوڑی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب تھا گھوڑے کے منہ والے لوگ۔[164] ادویانہ میں موجودہ سوات، بونیر، دیر، پشاور، پشکلاوتی، ٹیکسلا اور اٹک وغیرہ شامل تھے۔ گندھارا کے زیر اثر بدھ ازم کا عروج یہاں رہا۔ سولھویں صدی میں یہاں بین الاقوامی طور پر اثرورسوخ کی کم از کم 1400 بدھ عبادت گاہیں تھیں۔ بدھ عقیدے کے مطابق آخری بدھ اسی خطے میں پیدا ہوں گے۔ اسی لیے بدھ عقیدت مندوں نے یہاں گندھارا فن کے نت نئے تجربات کیے اور پتھروں کو بولنے کی فصیح زبان عطا کی۔ پتھر کی سلوں کو صحیفوں کا سا تقدس دے کر گوتم بدھ کی پوری زندگی محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس لیے سوات کو گندھارا تہذیب کا گہوارا کہا جاتا ہے۔[165] گندھارا آرٹ دراصل آریائی، یونانی، ساکا، پارتھی اور کشن تہذیبوں کا نچوڑ ہے۔[166] دریائے سوات کے کنارے سترھویں صدی قبل مسیح میں آریاؤں کی موجودگی کے شواہد ملے ہیں۔ وہ چوکور مکان بنا کر رہتے تھے، جن میں آتش دان ہوتا تھا وہ اپنا غلہ اور اجناس بڑے بڑے گڑھوں اور مٹکوں میں محفوظ کرتے تھے۔ اپنے مٹی کے برتنوں پر جانوروں کی تصویریں بناتے تھے۔[167]

1900ء میں سوات کو مالاکنڈ ایجنسی کا حصہ بنایا گیا۔ قبیلہ یوسف زئی کی آمد سے سوات کی تاریخ کا روشن باب شروع ہوتا ہے۔ شیخ علی، ملک احمد اور خان کچھ کے دور میں یوسف زئی کی اہمیت مستحکم رہی۔ اس سے قبل سواتیوں کے مقامی بادشاہوں میں سلطان تکل اور سلطان جہانگیر زیادہ مشہور ہیں۔ خاندان کجو کے بعد سوات مختلف خانگیوں میں تقسیم ہو گیا اور اس کی معاشرتی ترقی رک گئی۔ سوات میں جدید بادشاہت کا آغاز سید احمد شہید بریلوی کی شہادت کے بعد اور انگریزوں کے اس طرف آنے سے ہوا۔ تب یہاں روحانی بزرگ اخوند صاحب نے سکھوں انگریزوں کے خطرے کو بھانپ کر خوانین سوات کو مضبوط حکومت بنانے کی ترغیب دی۔ 1847ء میں یہاں پہلی شرعی حکومت قائم ہوئی اور سید اکبر شاہ سربراہ مقرر ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے کو ناکام حکومت کے باعث معزول کر دیا گیا۔ 1885ء سے 1914ء تک سوات بادشاہ کے بغیر رہا۔ 1914ء میں خوانین سوات کے جرگے نے یہاں دوبارہ حکومت بنائی۔ اس دوران میاں گل عبدالودود کا دور حکومت مثالی تھا۔ 1949ء میں ان کے بیٹے میجر جنرل جہانزیب نے سوات کو بیرونی دنیا سے متعارف کرایا اور یہاں کے لوگوں کو تعلیم، صحت، مواصلات کی سہولیات سے نوازا۔ 1969ء

میں سوات ریاست کو پاکستان میں مدغم کیا گیا تو یہ ضلع سوات کی حیثیت سے جانا جانے لگا۔ سوات کی مقامی ثقافت بیرونی اثرات کے بغیر شاندار تھی۔ سوات کے فرزند شاہ میر نے کشمیر میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ یہاں کے داؤد خان نے ریاست روہیل کھنڈ اور امیر خان نے ریاست ٹونک کی بنیاد رکھی۔[168]

مالاکنڈ جنگ کے دوران برطانوی وزیر اعظم چرچل یہاں تعینات تھا۔ اس کی یادداشتوں میں سوات کا تذکرہ ہے۔ اس سے انیسویں صدی کے اختتام کے سوات کی جھلک نظر آتی ہے:

> "مالاکنڈ درے کو پار کرنے کے بعد پہلا موڑ دائیں جانب ہے۔ وہاں سے ایک سڑک وادئ سوات کو جاتی ہے۔ اب ہمارا سفر پہاڑی راستے پر تھا۔ ہر جانب بڑی بڑی چٹانیں ہیں لیکن وادی کافی وسیع ہے۔ زمین زیادہ تر ہموار ہے اور زرخیز ہے۔ وادی کے درمیان میں سے سفید جھاگ اڑاتی ہوئی ندی گزرتی ہے۔ ندی کے دونوں کناروں پر چاول کے کھیت ہیں۔ دوسری فصلیں بھی ہیں۔ وادی میں بہت سے گاؤں ہیں اور آبادی کافی گنجان ہے۔۔۔ قدیم زمانہ میں اس وادی میں بدھوں کی حکومت تھی تب اس وادی کو "ووچانگ" یا "ادویانہ" کہا جاتا تھا جس کا مطلب ہے گلستان۔۔۔ ندی کے دونوں کناروں پر آباد ہونے کی وجہ سے اس کو "سب ھاواستو" بھی کہا جاتا تھا۔ یہ نام بعد میں بگڑ کر سوات ہو گیا۔ ندی سوات کے کناروں پر قلعوں اور پھلوں کے باغات تھے جو ایک مدت گزرنے کے بعد تباہ ہو گئے۔ لیکن سوات کی خوبصورتی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ اگرچہ اس وادی کو بارہا حملہ آوروں نے لوٹا اور تباہ کیا"۔[169]

سوات قدیم زمانے سے زرخیزی کے لیے مشہور ہے۔ چینی زائرین نے اپنے سفرناموں میں یہاں زیتون، صندل، زعفران، انگور اور سومابوٹی کی موجودگی کا بھی خصوصی ذکر کیا ہے۔ آج سوات مالٹا، سیب، جاپانی پھل، انگور، اخروٹ، بادام، خوبانی، آلوچہ، ناشپاتی، سٹرابری اور انار کے باعث مشہور ہے۔ یہاں کی ٹراؤٹ مچھلی بھی اہمیت کی حامل ہے۔[170]

پاکستان میں تین کوہستان زیادہ مشہور ہیں۔ دیر کوہستان، اباسین کوہستان اور سوات کوہستان۔ دیر اور سوات کا کوہستانی علاقہ مختلف نوابوں کے درمیان وجہ تنازع بنا رہا۔ پہلے 1948ء اور پھر 1954ء میں کالام کے بڑوں اور سوات کے بادشاہوں کے درمیان معاہدے سے یہ سوات بادشاہت کا حصہ بن گیا۔[171] کالام کی تہذیب قدیم عہد کی یاد تازہ کرتی ہے۔ ان کے گیتوں میں ہزاروں سال قبل کی قبائلی زندگی کے نقوش ملتے ہیں۔ کالام کا علاقہ کالام کے نام سے زیادہ پرانا ہے۔ یہ آتش پرستی اور ناگ پرستی کا مرکز رہا ہے۔[172] دیر کے قدیم نام تبدیل ہونے کے باعث قدیم کتب میں اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔ قدیم دور میں یہاں کافر اور بعد میں کوہستانی آباد رہے۔ یہ سرزمین پنج کوڑہ کے نام سے مشہور تھی۔ دیر کی تاریخ قدیم اور خون ریز ہے۔ یہاں کی کھدائی سے تین زمانوں کی ثقافت دریافت ہوئی ہے جو پندرھویں صدی قبل مسیح سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کی روشنی میں یہاں کے لوگوں کے پہلے دور کو پروٹو یورپی نسل کہا گیا ہے۔

دوسرے دور کے لوگ مقامی تھے نووارد نہیں تھے۔ تیسرے دور کے لوگ لوہے کے زمانے سے ہیں۔[173] دیر میں مختلف نوابی خاندان بر سر اقتدار آنے کی وجہ انگریزوں کا چترال، دیر، باجوڑ، سوات میں اپنی مرضی کی حکومت چاہنا تھا۔ 1969ء میں ریاست دیر کا خاتمہ کر کے اسے ضلع کی حیثیت دی گئی۔[174] اور یہ مالاکنڈ ڈویژن کا حصہ بنا۔ سوات کی آبادی 1998ء کی مردم شماری کے مطابق 1257602 نفوس پر مشتمل تھی جو 2017ء میں 3.24 کی شرح کے ساتھ بڑھ کر 2309570 ہو گئی ہے۔[175]

وادیٔ کاغان

وادیٔ کاغان بابو سر ٹاپ سے بالا کوٹ تک 152 کلو میٹر طویل وادی ہے۔ یہ پھولوں کی وادی کہلاتی ہے اور کشمیر اور وادیٔ سندھ کی وادیوں کے درمیان ہے۔[176] اس کی بلندی 213.36 میٹر (7000 فٹ) سے شروع ہو کر بابو سر ٹاپ پر اپنی انتہائی بلندی پر پہنچتی ہے جو 4145.22 میٹر (13600 فٹ) پر مشتمل ہے۔[177] بالا کوٹ وادیٔ کاغان کا دروازہ ہے۔ وادیٔ کاغان کو بالا کوٹ سے دو پل ملاتے ہیں۔ ایک معلق پل 1895ء میں بنا دوسرا 1959ء میں۔[178] بالا کوٹ کے گرد و نواح میں وادیٔ کاغان کے اہم مقامات میں شنکیاری ہٹ (ڈنہ)، کیوائی، شوگراں، سری، پائے، کوہ مکڑا، پارس، شڑاں، درشی، موسیٰ کا مصلیٰ، شینو، جرید، مہانڈری، منور گلی، کھنیاں، کمال بن، کاغان قصبہ، ناران، لالہ زار، ملکہ پربت، بٹہ کنڈی، بڑوائی، ہبر اور بابو سر ہیں۔ بالا کوٹ سے 59 کلو میٹر دور کاغان ہے۔ یہاں ایک ہندو عورت کاگی کی نسبت سے اس کا پرانا نام کاگان ہے۔ یہ سرول چوٹی کے نیچے واقع ہے جو سطح سمندر سے 13529 فٹ بلند ہے۔ کاغان کے شمال مشرق میں وسیع چراگاہیں ہیں۔ مشرق میں شنگھڑی پہاڑ ہے۔ کاغان میں سادات خاصی تعداد میں آباد ہیں اور زیادہ تر وہی جنگلات اور زمینوں کے مالک ہیں۔ خوبانی اور اخروٹ یہاں بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔[179]

کاغان سے 25 کلو میٹر کے فاصلے پر ناران ہے۔ درمیان میں کنیاری کٹھ اور بھملہ کٹھ کے اہم مقامات آتے ہیں۔ ناران کی سطح سمندر سے بلندی 8250 فٹ ہے۔ یہاں دریائے کنہار کی ٹراؤٹ بہت مشہور ہے۔ یہاں کا خالص دودھ غذائیت سے بھرپور ہوتا ہے۔ کاغان کی بلند ترین چوٹی ملکہ پربت ہے جو 17360 فٹ بلند ہے۔ باقی چوٹیوں سے بلند ہونے کی بنا پر اسے ملکہ پربت کہا جاتا ہے۔ برف سے ڈھکی رہنے والی اس چوٹی کا عکس سیف الملوک جھیل میں نظر آتا ہے۔[180] سری اور پائے وادیٔ کاغان کے مشہور مقامات ہیں۔ سری شوگراں کے سر پر ہونے کے باعث سری اور پائے کوہ مکوڑا کے دامن میں ہونے کی وجہ سے پائے کے نام سے معروف ہے۔ کوہ مکوڑا کے جنگلات میں کالا ریچھ، بھورا ریچھ، جنگلی بلی، مارخور اور ہرن پائے جاتے ہیں۔ پرندوں میں برفانی تیتر اور رام چکور عام ہیں۔ موسیٰ کا مصلیٰ نامی پہاڑ 13500 فٹ بلند ہے۔ یہاں درشی کا جنگل بھی ہے جس سے وابستہ رومانی داستان لوک گیت میں ملتی ہے۔[181]

وادیٔ کاغان میں نو جھیلیں ہیں۔ ان میں آنسو جھیل، جٹی جھیل، سیف الملوک، جھل کھڈ جھیل، دودی پت سر جھیل، لولو سر جھیل اہم ہیں۔ جبکہ دریائے کنہار اس وادی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ لولو سر جھیل سے نکلنے والا یہ دریا پوری وادی کے درمیان سے گزر کر جہلم سے ملتا ہے۔ اس کا ٹھنڈا پانی آنکھوں کے لیے اکسیر ہے۔ 14100 فٹ بلند آنسو جھیل دریائے منور کا منبع ہے۔ یہاں کاغان سے پیدل اور سیف الملوک سے کچ گلی کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے، جٹی جھیل پیالہ نما ہے۔ سیف الملوک 10200 فٹ بلند ہے۔ جھل کھڈ نوری ٹاپ کے قریب ہے۔ اس کا پانی گہرا نیلا ہے۔ دودی پت سر سفید پانی کی جھیل ہے۔ لولو سر وادیٔ کاغان کی سب سے طویل جھیل ہے اور ہلالی شکل کی ہے۔ اس کے آس پاس "چاہو" نامی ایسا پودا پایا جاتا ہے جسے سونگھ کر انسان بے ہوش ہو جاتا ہے۔[182]

وادیٔ کاغان کے نو فیصد رقبے پر جنگلات ہیں۔ تین فیصد حصہ قابل کاشت ہے اور 88 فیصد حصہ بلند و بالا بنجر پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ یہاں شڑان، دروشی، مہانڈری، ملکنڈی اور کمال بن کے جنگلات ہیں۔ کمال بن کے جنگلات سے لکڑی کی بھاری بھر کم گیلیاں لوہے کے رسوں کی مدد سے فضائی راستے سے بھاگل لائی جاتی ہیں۔ یہاں بہت قیمتی نباتات پائی جاتی ہیں۔[183] جنگلی جانوروں میں یہاں موہر، بندر، چیتا، کالا بھورا ریچھ، بھیڑیا، لومڑی، ہرن، نافہ، گوریال، مارخور اور کھن چوہی مشہور ہیں۔ رینگنے والے جانوروں میں تھپریا ناگ، کوڑیالہ ناگ، افغنی، گوہ، گرگٹ اور سپ سلنڈرا وغیرہ ہیں۔ شکاری پرندوں میں باز، شکرا، کوا، الو، چیل اور گدھ پائے جاتے ہیں۔[184]

وادیٔ کاغان میں زیادہ تر گوجر خاندان، سواتی خاندان، سادات اور اعوان آباد ہیں۔ گوجر کا ماخذ سنسکرت لفظ گورجر بمعنی دشمن کو اجاڑنے والا بہادر ہے۔ مہابھارت میں آہیروں، ہنوں اور جاٹوں کا ذکر ملتا ہے۔ گوجروں کو مورخین نے باہر سے آنے والی قوم تصور کیا ہے اور آریا کے ساتھ ان کی آمد بتائی ہے۔ آریا دراصل مذہبی نسبت سے ویدوں کے ماننے والے ہیں۔ انھیں نسل قرار دینا غلط ہے۔ گوجر مذہباً آریا تھے اور ہندوستان ہی کے قدیم باشندے تھے۔ منصف خان سحاب کے بقول مورخین نے جسے آریا کی آمد سمجھا وہ دراصل ان کی وطن واپسی تھی۔[185]
گوجروں کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے۔ سواتی افغان قبیلہ خلجی کی شاخ ہے۔ یہ وادیٔ کاغان کی دوسری بڑی قوم ہیں۔ سادات سترھویں صدی عیسوی میں ہزارہ سے آئے۔ اس کے علاوہ اعوان، مغل، کوہستانی، کشمیری اور چلاسی بھی یہاں آباد ہیں۔[186]

وادیٔ کاغان ہزارہ سے متصل ہے۔ اس لیے اس کی تاریخ کا مطالعہ ہزارہ کے تناظر میں کیا جاتا ہے۔ ہزارہ کے تہذیبی آثار پتھر کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا قدیم نام عروسہ ہے جس سے "اورش" کا لفظ بنا۔ مہابھارت میں اس کا نام اراگا بمعنی جھیل ہے۔ یہ خطہ 557 تا 529 قبل مسیح میں ایرانی خمینی سلطنت کا حصہ تھا۔ 521 تا 457 قبل مسیح میں اس کا الحاق ٹیکسلا سے ہوا۔ 362 قبل مسیح میں سکندر اعظم کے حملے کے بعد کچھ دیر راجہ ابھیسارا کے پاس رہا۔ تب

اسے بھسیارا کہا جانے لگا۔ 319 قبل مسیح میں یہاں موریہ خاندان کا قبضہ تھا۔ 329 قبل مسیح میں چندر گپت موریہ کے عہد میں سنہ گپتا کا اجرا ہوا۔ پھر ہندو سر بادشاہ بنا۔ 272 قبل مسیح میں اشوک اعظم تخت نشین ہوا تو ٹیکسلا اس خطے کا دارالحکومت تھا۔ اشوک کے فرمان مانسہرہ بریڑی کے پتھروں پر آج بھی کندہ ہیں۔ 135 قبل مسیح میں یہاں سیتھین قوم کے حملے شروع ہوئے تو 250ء تک وہ قابض رہے۔ پھر ساکا خاندان کا غلبہ ہوا۔ 484ء میں ساکا خاندان کے راجہ رسالو نے ہزارہ پر قبضہ کیا اور راجہ ہوڈی کو بھی شکست دی۔ آج بھی یہاں لوگ بچوں کو راجہ رسالو کی کہانیاں سناتے ہیں۔ جو سربن پہاڑ میں اس سے منسوب ایک غار بھی ہے۔ 700ء میں چینی سیاح ہیون سانگ کی برصغیر آمد کے زمانے میں یہاں کشمیری حکمران ورلبھاوردانہ کی حکومت تھی تب اس کا نام ولاش اور دارالحکومت مانگلی تھا۔ 1000ء میں چینی سیاح کلہانہ کی آمد پر درش کے نام سے منسوب تھا۔ پھر ترک شاہی اور ہندشاہی کی حکومت رہی۔ راجہ جے پال کٹھانہ اور اس کا خاندان یہاں 900ء سے 1013ء تک حکمران رہے۔ پھر کشمیری قابض رہے۔ پھر غزنوی، غوری، خاندان غلاماں، خلجیوں اور تغلقوں کی اہمیت رہی۔ امیر تیمور ہندوستان پر حملے کے بعد کابل واپسی پر ہزارہ سے گزرا تب یہ علاقہ ہزارہ فارلق کے نام سے مشہور ہوا۔ 1414ء سے 1450ء تک خاندان سادات کی حکومت رہی۔ اس کے بعد پکھلی سرکار کی حکومت رہی۔ 1713ء میں جلال بابا کی قیادت میں سواتیوں نے پکھلی پر حملہ کر کے لوگوں کو نکال باہر کیا اور یہاں قبضہ کیا، اٹھارویں صدی کے نصف تک یہاں درانیوں کی حکومت رہی، پھر سعادت خان، پھر اس کا بیٹا نجیب اللہ اور پھر اسکا بیٹا حبیب اللہ سربراہ مقرر ہوا۔ اس کا عہد سکھوں کی حکومت کے آغاز تک رہا۔[187]

ہزارہ پر 1818ء تا 1849ء سکھوں کا تسلط برقرار رہا۔ تب ہری پور ہزارہ کا صدر مقام تھا۔ 1846ء میں سکھوں اور انگریزوں کے درمیان جنگ پر صلح ہونے کے بعد ہزارہ اور کشمیر کو گلاب سنگھ کو فروخت کیا گیا۔ ہزارہ کے عوام نے بغاوت کی۔ گلاب سنگھ سے حالات قابو نہ ہوئے تو اس نے ہزارہ واپس کرنے کی درخواست کی۔ 1849ء میں ہزارہ انگریزوں کے قبضے میں آ گیا تب جیمز ایبٹ یہاں کا پہلا ڈپٹی کمشنر بنا۔ 1852ء کو جیمز ایبٹ کو سادات کے کاغان مجاہدین اور ڈھونڈ قوم کو اکسا کر بغاوت کرنے کی اطلاع ملی تو اس نے ضامن شاہ رئیس سادات کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ جس سے سیدوں اور حکومت میں ناراضگی شروع ہوئی۔ لیوی کی تعزیری فوج کاغان پر حملے کے لیے روانہ ہوئی۔ سیدوں نے مزاحمت کے بغیر اطاعت قبول کر لی۔ انھیں کاغان سے پکھلی جلاوطن ہونا پڑا۔ 1853ء میں نئے کمشنر نے یہاں چھاؤنی قائم کی۔ 1855ء میں سادات کو واپس کاغان جانے کی اجازت ملی۔ 1857ء میں جنگ آزادی شروع ہوئی تو مردان کے سپاہیوں نے بغاوت شروع کر دی اور سوات بھاگ گئے۔ وہاں سے انھوں نے ہزارہ کشمیر جانے کا ارادہ کیا۔ میجر بیچر نے کاغان کے نمبرداروں کو باغی مجاہدین کی سرکوبی کا حکم دیا۔ جب باغیوں کو راستوں کی بندش کا پتہ چلا تو انھوں نے کوہستان کے راستے کشمیر پہنچنے کا فیصلہ کیا تو وہ وادئ کاغان اور کوہستان کے درمیانی علاقے سے گزرے۔ یہ مشکل

علاقہ تھا۔ زخمی باغیوں نے جھیل دودی پت سر کے قریب سیدوں، گوجروں اور کوہستانیوں کی اطاعت قبول کرلی۔ یہاں سے باغیوں کو قید کرکے ہزارہ بھیجا گیا۔ کاغان میں 10700 فٹ بلند پوربی ناڑ کنٹھہ کہلانے والا نالہ قبائلیوں اور ان باغیوں کے درمیان خونریزی کی یادگار ہے۔ انگریزوں نے لوگوں کو وفاداری کے انعام میں جاگیریں دیں۔ ہزارہ میں اراضی کا بندوبست ہوا تو جن خاندانوں کے سردار انگریزوں کے وفادار تھے انھیں جاگیردار بنا دیا گیا۔ 1919ء کی تحریک خلافت میں ہزارہ کے عوام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جاگیرداری کے خلاف تحریک میں بھی عوام نے عبدالرحیم پوپلزئی کا ساتھ دیا۔ 1947ء میں ہندوستان کی تقسیم کے موقع پر صوبہ سرحد میں ریفرنڈم ہوا اور یہ علاقے پاکستان میں شامل ہوئے۔[188]

انگریزوں کے بعد بھی یہاں جاگیرداری نظام برقرار رہا۔ مختلف وقتوں میں مختلف زرعی اصطلاحات نافذ ہوتی رہیں۔ 1982ء میں وادی کاغان کے دروازے بالاکوٹ قصبے کو تحصیل کا درجہ دیا گیا۔ 1992ء میں سیلاب نے یہاں بہت تباہی مچائی۔ یہ علاقہ اکثر اوقات آفات سماوی کی زد میں رہا۔ کبھی زلزلے اور کبھی سیلاب یہاں تباہی مچاتے رہے۔[189]

حواشی

1. عثمان علی، پروفیسر، خطہ قراقرم زبانیں اور معاشرہ (لاہور: مقبول اکیڈمی، 1996ء)، ص 15۔
2. شیر باز علی خان برچہ، عکس گلگت بلتستان (گلگت: نارتھ بکس، 2013ء)، ص 28۔
3. عثمان علی، پروفیسر، محولہ بالا، ص 15۔
4. ایضاً، ص 18 تا 19۔
5. شیر باز علی خان برچہ، محولہ بالا، ص 18 تا 20۔
6. ایضاً، ص 36۔
7. جمشید خان دکھی، "گلگت، غذر، دیامر"، مشمولہ پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا شمالی علاقہ جات (جلد اول) مرتب: سید محمد علی (اسلام آباد: لوک ورثہ، 2004ء)، ص 1 تا 2۔
8. شیر باز علی خان برچہ، محولہ بالا، ص 30۔
9. Karl Jettmar, "Northern Areas of Pakistan-An Ethnographic Sketch", In *History of Northern Areas of Pakistan (Upto 2000 AD)*, ed. Ahmed Hassan Dani, (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2007), 68.
10. محمد علی چراغ، تاریخ پاکستان (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2012ء)، ص 35۔
11. شیخ نوید اسلم، پاکستان کے آثار قدیمہ (لاہور: بک ہوم، 2012ء)، ص 18۔
12. عثمان علی، پروفیسر، قراقرم کے قبائل (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2000ء)، ص 55۔
13. رشید اختر ندوی، شمالی پاکستان (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2002ء)، ص 39۔
14. احمد حسن دانی، محولہ بالا، ص 99۔
15. مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور فلسفہ تاریخ (لاہور: فکشن ہاؤس، 1993ء)، ص 15۔
16. شیر باز علی خان برچہ، عکس گلگت بلتستان، محولہ بالا، ص 134 تا 135۔
17. احمد حسن دانی، *History of Northern Areas of Pakistan (Upto 2000 AD)*، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2007ء)، ص 117۔

18. ایضاً، ص113 تا114۔

19. ایضاً، ص103۔

20. رشید اختر ندوی، محولہ بالا، ص45۔

21. ایضاً، ص90۔

22. ایضاً، ص15۔

23. ایضاً، ص15۔

24. ایضاً، ص97 تا99۔

25. عثمان علی، پروفیسر، قراقرم کے قبائل، محولہ بالا، ص431۔

26. احمد حسن دانی، محولہ بالا، ص129۔

27. عثمان علی، پروفیسر، قراقرم کے قبائل، محولہ بالا، ص431۔

28. ایضاً، ص497۔

یشکن یعنی بروشو اور راجپوتوں کا سورج کی اولاد ہونے کا نظریہ انھیں قریب کرتا ہے اور ہن ہونا ظاہر کرتا ہے۔ سبط حسن کے مطابق بھی ہنوں نے وادی سندھ پر اور ہندوستان پر دو سو برس تک حکومت کی۔ انھیں ہمتالی بھی کہتے ہیں جو مسلمان ہونے کے بعد ابدالی بن گئے۔

سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا (کراچی: مکتبہ دانیال، طبع ہشتم، 1989ء)، ص146۔

29. عثمان علی، پروفیسر، قراقرم کے قبائل، محولہ بالا، ص505۔

30. ایضاً، ص102۔

31. شیخ نوید اسلم، پاکستان کے آثار قدیمہ، محولہ بالا، ص81۔

32. عثمان علی، پروفیسر، خطہ قراقرم زبانیں اور معاشرہ، محولہ بالا، ص19۔

33. اے ایل باشم، ہندوستان کی تہذیب کی داستان، مترجم: ایس ایم غلام سمنانی (لاہور: نگارشات پبلشرز، 2008ء)، ص493۔

34. عظمیٰ سلیم، ڈاکٹر، شمالی علاقہ جات میں اردو زبان و ادب (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 2008ء)، ص41۔

35. عثمان علی، پروفیسر، قراقرم کے قبائل، محولہ بالا، ص196۔

36. محمد سرور خان اعوان، وادیٔ سون سکیسر (اسلام آباد: لوک ورثہ، 2002ء)، ص24۔

37. شیر باز علی خان برچہ، عکس گلگت بلتستان، محولہ بالا، ص137۔

38. احمد حسن دانی، محولہ بالا، ص6۔

39. احمد حسن دانی، "شمالی علاقہ جات کی حیثیت"، مشمولہ شمالی پاکستان کی تاریخ و ثقافت، مرتبہ: نوین غلام حیدر علی (لاہور: فکشن ہاؤس، 2015ء)، ص21 تا 22۔

40. محمد قاسم نسیم، گلگت بلتستان اور مسئلہ کشمیر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2007ء)، ص43۔

41. شیر باز علی خان برچہ، عکس گلگت بلتستان، محولہ بالا، ص138۔

42. عثمان علی، گلگت کی روگ کہانی (لاہور: مقبول اکیڈمی، 2004ء)، ص20۔

43. عثمان علی، پروفیسر، گلگت کا انقلاب 1947ء (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2012ء)، ص42۔

44. ایضاً، ص48۔

45. شیر باز علی خان برچہ، عکس گلگت بلتستان، محولہ بالا، ص140۔

46. محمد قاسم نسیم، محولہ بالا، ص65۔

47. جعفر شگری "گلگت بلتستان سیلف گورننس آرڈر 2009ء اور اس کے تحت ہونے والے انتخابات کا ایک جائزہ" مشمولہ شمالی پاکستان تاریخ و ثقافت، مرتبہ: نوین غلام حیدر علی، محولہ بالا، ص87 تا 90۔

48. محمد قاسم نسیم، محولہ بالا، ص12۔

49. شیر باز علی خان برچہ، محولہ بالا، ص79۔

50. http://khabarwalay.com/archives/30387. 31-08-2017

51. جمشید خان دکھی، "گلگت، غذر، دیامر"، محولہ بالا، ص1۔

52. احمد حسن دانی، ہسٹری آف ناردرن ایریاز آف پاکستان محولہ بالا، ص46۔

53. میاں کریم اللہ قریشی کرناہی، پہاڑی اور اردو ایک تقابلی جائزہ (راولپنڈی: مقتدرہ قومی زبان، 2007ء)، ص12۔

54. جمشید خان دکھی، "گلگت، غذر، دیامر"، محولہ بالا، ص1۔

55. رشید اختر ندوی، شمالی پاکستان ، محولہ بالا، ص70۔

56. ایضاً، ص71۔

57. احمد حسن دانی، محولہ بالا، ص33۔

58. جمشید خان دکھی، "گلگت، غذر، دیامر"، محولہ بالا، ص8۔

59. احمد حسن دانی (مولف) شاہ رئیس خان کی تاریخ گلگت (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2000ء)، ص9۔
60. جمشید خان دکھی، "گلگت، غذر، دیامر"، محولہ بالا، ص9 تا10۔
61. امر سنگھ چوہان، ڈاکٹر، تاریخ گلگت، مترجمین: عظمیٰ سلیم، ڈاکٹر، شیر باز علی خان برچہ (لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، 2012ء)، ص14۔
62. عثمان علی، گلگت کی روگ کہانی (لاہور: مقبول اکیڈمی، 2004ء)، ص19 تا21۔
63. ایضاً، ص22 تا23۔
64. امر سنگھ چوہان، محولہ بالا، ص171۔
65. ایضاً، ص155۔
66. عثمان علی، گلگت کی روگ کہانی (لاہور: مقبول اکیڈمی، 2004ء)، ص24 تا25۔
67. ایضاً، ص10۔
68. امر سنگھ چوہان، محولہ بالا، ص171۔
69. جمشید خان دکھی، "گلگت، غذر، دیامر"، محولہ بالا، ص15 تا18۔
70. http://khabarwalay.com/archives/30387. 31-08-2017
71. شیر باز علی خان برچہ، "بروشال، ہنزہ، نگر"، مشمولہ پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا شمالی علاقہ جات (جلد اول) مرتب: سید محمد علی (اسلام آباد: لوک ورثہ، 2004ء)، ص159۔
72. http://khabarwalay.com/archives/30387. 31-08-2017
73. شیر باز علی خان برچہ، "بروشال، ہنزہ، نگر"، محولہ بالا، ص160۔
74. احمد حسن دانی، محولہ بالا، ص30 تا31۔
75. ایضاً، ص32۔
76. ایضاً، ص46۔
77. عبداللہ جان ہنزائی، ہنزہ کے قدیم تہوار اور رسوم و رواج (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2000ء)، ص28۔
78. احمد حسن دانی، محولہ بالا، ص64۔
79. رشید اختر ندوی، شمالی پاکستان، محولہ بالا، ص90۔

80. ایضاً، ص93۔

81. نیت شاہ "ہنزہ۔سیاسی تاریخ اور تحریک آزادی" مشمولہ شمالی پاکستان تاریخ و ثقافت مرتبہ: نوین غلام حیدر علی، محولہ بالا، ص75 تا 76۔

82. ایضاً، ص80 تا 82۔

83. شیر باز علی خان برچہ، "بروشال، ہنزہ، نگر"، محولہ بالا، ص162 تا 164۔

84. ایضاً، ص164 تا 166۔

85. میاں کریم اللہ قریشی کرناہی، پہاڑی اور اردو ایک تقابلی جائزہ (راولپنڈی: مقتدرہ قومی زبان، 2007ء)، ص15۔

86. شیخ نوید اسلم، پاکستان کے آثار قدیمہ، محولہ بالا، ص236۔

87. شیر باز علی خان برچہ، عکس گلگت بلتستان، محولہ بالا، ص21۔

88. http://khabarwalay.com/archives/30387. 31-08-2017

89. احمد حسن دانی، محولہ بالا، ص36۔

90. ایضاً، ص37۔

91. ایضاً، ص47۔

92. ایضاً، ص47 تا 48۔

93. انجینئر سید اطہر حسین بخاری، پاکستان ٹورسٹ گائیڈ (لاہور: ادبستان، 2012ء)، ص281۔

94. رشید اختر ندوی۔ محولہ بالا، ص38۔

95. ایضاً، ص41۔

96. ایضاً، ص44۔

97. ایضاً، ص49۔

98. ایضاً، ص56۔

99. ایضاً، ص54 تا 56۔

100. محمد حسن حسرت، "بلتستان"، مشمولہ پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا شمالی علاقہ جات (جلد اول) مرتب: سید محمد علی (اسلام آباد: لوک ورثہ، 2004ء)، ص211۔

101. احمد حسن دانی، محولہ بالا، ص28 تا 29۔

102. ایضاً، ص48۔

103. رشید اختر ندوی،شمالی پاکستان، محولہ بالا، ص36۔

104. مولوی حشمت اللہ خان لکھنوی،تاریخ جموں (میر پور:ویری ناگ پبلشرز،1991ء)، ص447۔

105. ایضاً، ص448۔

106. محمد حسن حسرت، بلتستان تہذیب و ثقافت (راولپنڈی:بی ایس پرنٹرز،1995ء)، ص18۔

107. محمد حسن حسرت، "بلتستان"، محولہ بالا، ص213۔

108. محمد حسن حسرت، محولہ بالا، ص7۔

109. رشید اختر ندوی،شمالی پاکستان، محولہ بالا، ص143۔

110. ایضاً، ص139 تا 144۔

111. محمد حسن حسرت، "بلتستان"، محولہ بالا، ص213 تا 214۔

112. عظمیٰ سلیم،ڈاکٹر،شمالی علاقہ جات میں اردو زبان و ادب(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 2008ء)، ص57۔

113. محمد حسن حسرت، "بلتستان"، محولہ بالا، ص215 تا 216۔

114. محمد قاسم نسیم، محولہ بالا، ص26۔

115. محمد حسن حسرت، "بلتستان"، محولہ بالا، ص216۔

116. عظمیٰ سلیم،ڈاکٹر،شمالی علاقہ جات میں اردو زبان و ادب(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 2008ء)، ص32۔

117. محمد حسن حسرت، "بلتستان"، محولہ بالا، ص217۔

118. ایضاً، ص211 تا 213۔

119. ایضاً، ص216 تا 217۔

120. ایضاً، ص214۔

121. http://khabarwalay.com/archives/30387. 31-08-2017

122. عنایت اللہ فیضی، "چترال"، مشمولہ پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا شمالی علاقہ جات (جلد اول) مرتب: سید محمد علی (اسلام آباد: لوک ورثہ، 2004ء)، ص317۔

123. عنایت اللہ فیضی، چترال (اسلام آباد: لوک ورثہ اشاعت گھر، 1989ء)، ص6۔

124. ایضاً، ص 11۔

125. احمد حسن دانی، محولہ بالا، ص 17۔

126. ونسٹن چرچل، جنگ مالا کنڈ مترجم: ملک اشفاق (لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، 2009ء)، ص 29۔

127. عنایت اللہ فیضی، محولہ بالا، ص 11۔

128. منشی عزیز الدین، تاریخ چترال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز 1991ء)، ص 1 تا 2۔

129. عبدالرحمٰن، پروفیسر، چترال چترال ہے (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، 2009ء)، ص 30۔

130. ایضاً، ص 29۔

131. عنایت اللہ فیضی، "چترال"، محولہ بالا، ص 317۔

132. ایضاً، ص 317 تا 318۔

133. ایضاً، ص 318۔

134. عنایت اللہ فیضی، محولہ بالا، ص 14۔

135. عنایت اللہ فیضی، "چترال"، محولہ بالا، ص 318۔

136. عنایت اللہ فیضی، محولہ بالا، ص 14۔

137. عنایت اللہ فیضی، "چترال"، محولہ بالا، ص 318 تا 319۔

138. ایضاً، ص 320۔

139. ایضاً، ص 321 تا 323۔

140. احمد حسن دانی، محولہ بالا، ص 66۔

141. محمد پرویش شاہین، کافرستان : تاریخ ، نسل، زبان، ثقافت اور سیاحتی جائزہ (لاہور: مکتبہ جمال، 2014ء)، ص 42 تا 44۔

142. ایضاً، ص 44۔

143. ایضاً، ص 46 تا 47۔

144. ایضاً، ص 48۔

145. جارج میکمن، سر، شمال مغربی پاکستان اور برطانوی سامراج، مترجم: انور رومان، (کوئٹہ: نسا ٹریڈرز، طبع دوم، 1988ء)، ص 141 تا 142۔

146. عبدالرحمٰن، پروفیسر، محولہ بالا، ص 120۔

147. محمد پرویش شاہین، محولہ بالا، ص 21۔

148. ایضاً، ص 23 تا 24۔

149. عبدالرحمٰن، پروفیسر، محولہ بالا، ص 40۔

150. http://www.pbs.gov.pk/sites/default/files//DISTRICT_WISE_CENSUS_RESULTS_CENSUS_2017.pdf

151. عبدالرحمٰن، پروفیسر، محولہ بالا، ص 55۔

152. http://en.m.wkipedia. org/wiki/ lowari_Tunnel.

153. خائستہ محمد سواتی، "نقش گندھارا بر سنگ سوات"، مشمولہ، شمالی پاکستان تاریخ و ثقافت، محولہ بالا، ص 27۔

154. ایضاً، ص 29۔

155. شیخ نوید اسلم، شمالی علاقہ جات اور پاکستان (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2013ء)، ص 107۔

156. محمد پرویش شاہین، سوات کوہستان (لاہور: مکتبہ جمال، 2011ء)، ص 25 تا 27۔

157. محمد پرویش شاہین، مشرق کا سویٹزرلینڈ وادئ سوات (لاہور: مکتبہ جمال، 2009ء)، ص 20 تا 21۔

158. ایضاً، ص 22۔

159. محمد پرویش شاہین، سوات کوہستان، محولہ بالا، ص 31۔

160. محمد پرویش شاہین، مشرق کا سویٹزرلینڈ وادئ سوات، محولہ بالا، ص 23 تا 25۔

161. محمد پرویش شاہین، سوات کوہستان، محولہ بالا، ص 24۔

162. رشید اختر ندوی، ارض پاکستان کی تاریخ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، جلد دوم، 2009ء)، ص 61۔

163. محمد پرویش شاہین، مشرق کا سویٹزرلینڈ وادئ سوات، محولہ بالا، ص 26 تا 28۔

164. یحیٰ امجد، تاریخ پاکستان (قدیم دور سے زمانہ قبل از تاریخ) (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1997ء)، ص 440۔

165. خائستہ محمد سواتی، محولہ بالا، ص 30 تا 31۔

166. سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا (کراچی: مکتبہ دانیال، طبع ہشتم، 1989ء)، ص 135۔

.167 محمد علی چراغ،تاریخ پاکستان (لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2012ء)،ص38۔

.168 محمد پرویش شاہین،مشرق کا سویٹزر لینڈ وادئ سوات، محولہ بالا،ص28تا31۔

.169 ونسٹن چرچل، جنگ مالاکنڈ، محولہ بالا، ص27۔

.170 محمد پرویش شاہین،مشرق کا سویٹزر لینڈ وادئ سوات، محولہ بالا،ص34۔

.171 محمد پرویش شاہین،سوات کوہستان، محولہ بالا،ص32۔

.172 ایضاً،ص52تا53۔

.173 محمد پرویش شاہین،دیر کوہستان:تاریخ، لوگ،ثقافت، سیاحت (لاہور:مکتبہ جمال،2011ء)، ص30۔

.174 ایضاً،ص41۔

175. http://www.pbs.gov.pk/sites/default/files//DISTRICT_WISE_CENSUS_RESULTS_CENSUS_2017.pdf

.176 انجینئر سید اطہر حسین بخاری، محولہ بالا،ص257۔

.177 شیخ نوید اسلم،شمالی علاقہ جات اور پاکستان، محولہ بالا،ص60۔

.178 مصنف خان سحاب، وادئ کاغان : تاریخ، لوگ، ثقافت، سیاحت(لاہور:مکتبہ جمال، 2011ء)،ص65۔

.179 ایضاً،ص73تا74۔

.180 ایضاً،ص74تا75۔

.181 ایضاً،ص69تا70۔

.182 ایضاً،ص79تا83۔

.183 ایضاً،ص75تا76۔

.184 ایضاً،ص107۔

.185 ایضاً،ص130۔

.186 ایضاً،ص139۔

.187 ایضاً،ص13تا15۔

.188 ایضاً،ص16تا19۔

189. ایضاً، ص26۔

باب دوم

تہذیب و ثقافت کے نظری مباحث اور سفر ناموں میں اہمیت

باب دوم

تہذیب و ثقافت کے نظری مباحث اور سفر ناموں میں اہمیت

تہذیب و ثقافت کے نظری مباحث

معاشرت اور سماجی و معاشرتی اقدار کا نظام تہذیب کہلاتا ہے۔ انسان کی خارجی ترقی کو تمدن کا نام دیا جاتا ہے جبکہ اس کے داخلی یا ذہنی ارتقا سے مراد تہذیب لی جاتی ہے۔ جو کچھ معاشرہ ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر سیکھتا اور اشتراک کرتا ہے وہ سب کلچر ہے۔[1] ثقافت ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ اس کا تعلق علوم وفنون سے ہے۔ ثقافتی تخلیق کو فروغ دینے والا سماجی نظام تہذیب ہے۔[2] تہذیب ایک سماجی حقیقت ہے۔ یہ ارضی مظہر ہے مگر اس کے اصول غیر ارضی منابع سے آتے ہیں۔ تہذیب، تمدن، ثقافت اور کلچر کی اصطلاحات ہمہ گیر معنوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ مختلف دانشوروں نے ان سے متعلق اپنے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ کچھ دانشور کلچر کے بعض پہلوؤں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں جبکہ کچھ دانشور کلچر کے چند دوسرے مظاہر کو بنیادی سمجھ کر بقیہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مختلف دانشوروں کی تہذیب، ثقافت، کلچر اور تمدن کے بارے میں آرا اور نظریات کا جائزہ ذیل میں لیا جائے گا۔

ترقی پسند نقطہ نظر کے حامل ادیب، شاعر، صحافی اور دانشور احمد ندیم قاسمی (1916ء-2006ء) کلچر کو طریق حیات کا دوسرا نام کہتے ہیں۔[3] ان کے نزدیک کلچر مستقل اور جامد شے نہیں بلکہ تغیر پذیر ہے:

> "کلچر کسی ہمیشہ کے لیے مقرر اور منضبط لائحہ عمل کا نام نہیں ہے۔ کلچر انسانی ذہن کی طرح نامیاتی ہے اور مسلسل بدلتا اور سنورتا اور ارتقا پذیر رہتا ہے۔ اور جب کوئی کلچر بظاہر مر جاتا ہے تو وہ دراصل مرتا نہیں ہے بلکہ اس کی بعض زندہ رہنے والی خصوصیات دوسرے کلچر میں نفوذ کر جاتی ہیں یا پھر اس کی بعض قدروں کی صورت بدل جاتی ہے۔"[4]

احمد ندیم قاسمی قومی کلچر سے مراد لیتے ہیں جو اس قوم کے ہر فرد کے رگ و پے میں جاری و ساری ہو۔ قوم کا ہر فرد اسی کلچر کی روشنی میں زندگی گزارتا ہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، سوچنا، فکر کرنا، محبت و نفرت، ارادے باندھنا، عزم کرنا، امنگیں پیدا کرنا، تجربات میں سے گزرنا، آدرشوں کو اختیار کرنا، گانا، تصاویر بنانا، شعر کہنا، مابعد الطبیعات کو ادراک کی گرفت میں لانا، کائنات کو تسخیر کرنا اور زندگی کو زندہ رہنے کے لائق بنانا اسی قومی کلچر کے مطابق ہوتا ہے۔ چونکہ قومی کلچر میں پائی جانے والی وسعت اور گہرائی صدیوں کے انسانی رشتوں، سوچوں اور تمناؤں کی تخلیق ہے۔ اس لیے اس کی طرف درست رہنمائی قومی تاریخ کرتی ہے۔ قومی کلچر بڑی شدت سے قومی تاریخ سے

وابستہ ہوتا ہے جو اس جغرافیائی خطے کی تاریخ ہوتی ہے جس میں وہ قوم بستی ہے۔ یعنی پاکستان کا کلچر اس خطہ ارض کی معلومہ تاریخ جتنا پرانا ہے۔[5]

احمد ندیم قاسمی اسی مکتبہ فکر کے حامی ہیں جو اپنی تاریخ اور کلچر کا آغاز موہنجوڈرو اور ہڑپہ کی تہذیب سے کرتے ہیں۔ اس کا مطلب وہ بت پرستی عزیز ہونا یا ماضی قریب کی تاریخ اور موجودہ کلچر سے بدظن ہونا نہیں لیتے بلکہ صرف یہ کہ:

> "ہم کہاں ہیں اور کہاں کہاں سے سفر کرتے ہوئے کہاں پہنچے ہیں۔ وہ قدیم تہذیبیں اپنی بعض خصوصیات کو مستقبل کے حوالے کر کے ختم ہو گئیں۔"[6]

ہماری سرزمین پر ویدک، برہمنی، بدھ، یونانی کلچر بھی آئے اور بعض آثار کو مستقبل کے حوالے کر کے ختم ہو گئے۔ اسی خطہ زمین میں عرب، افغان، مغل اور انگریز آئے۔ اتنے بہت سے کلچروں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خالصتاً پاکستانیوں کا اپنا طرزِ حیات ہے جو ہمارے دین، عقائد کے علاوہ ہماری تاریخ اور جغرافیائی حالات نے بھی دیا ہے۔[7]

احمد ندیم قاسمی کلچر کی صورت پذیری میں مذہب کے غالب کردار کو تسلیم کرتے ہیں مگر ہمارا لباس عربی لباس سے مختلف ہونے کے حامی ہیں۔ مذہب کا کسی تہذیب کی تشکیل میں نمایاں کردار ہے مگر اس ملک کی آب و ہوا اور تاریخ کا بھی اس میں اہم حصہ ہوتا ہے۔ شعر و ادب، مصوری، موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ قومی کلچر کے باطنی یا روحانی مظاہر ہیں۔ قومی کلچر کے حوالے سے آرائش جمال کی اصطلاح عورت کے حسن کے علاوہ اخلاق، رسم و رواج، مزاج پرستی کے حسن، باغ، سڑک، گلی، کسی دکان کے سائن بورڈ تک کے حسن کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ کیونکہ جمالیات تہذیب کی جان ہے۔[8]

قوموں کی شناخت ان کے انفرادی کلچر میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ قومی وجود میں قومی تہذیب کی حیثیت انسانی جسم میں چہرے کی طرح ہے۔ حصول پاکستان کا اہم مقصد یہی تھا کہ ہم ایک منفرد نظریہ حیات اور منفرد تہذیب رکھتے ہیں۔[9] یہ خطہ جو پاکستان کہلاتا ہے کئی صدیوں سے آباد ہے۔ جہاں انسان بستا ہے وہاں تہذیب بھی صورت پذیر ہوتی ہے لہذا ہم ایک قابل فخر قدیم تہذیبی ورثے کے امین ہیں۔[10]

قاسمی صاحب تہذیبوں کے آپس میں لین دین کے حامی ہیں۔ یعنی ایک تہذیب اپنی انفرادیت کا علم بلند کرتے ہوئے دوسری تہذیبوں کے اچھے اثرات قبول کرے۔ وہ اس تہذیبی حقیقت کے قائل ہیں کہ انسان تہذیبی لحاظ سے ہمیشہ آگے بڑھتا ہے وہ ماضی کی تہذیبی روایتوں سے قوت حاصل کرتا ہے مگر کوئی تہذیب عین ماضی کی تہذیب جیسی نہیں ہو سکتی:

"اگر کسی تہذیب کی ایک صدی، اس کی دوسری صدی پر اپنی تمام جزئیات سمیت فٹ بیٹھتی ہے تو تعجب ہے یہ تہذیب مر کیوں نہیں گئی کیونکہ یہ "انطباق" تو تہذیب کے عالم نزع پر دلالت کرتا ہے۔"[11]

پاکستانی تہذیب کی صورت پذیری کی وضاحت کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی کا کہنا ہے کہ ہمیں اپنی معلومہ تاریخ سے کلچر کا آغاز کرتے ہوئے شرمانا نہیں چاہیے۔ یہاں متعدد تہذیبیں ابھریں، پھیلیں، رکیں اور خاک ہو گئیں۔ ہر مرنے والی تہذیب اپنی بعض نشانیاں چھوڑ جاتی ہے جیسے انسان اپنی اولاد کے روپ میں زندہ رہتے ہیں۔ اسی طرح ان تہذیبوں پر نئے عناصر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان میں بننے بگڑنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کسی بھی تہذیب میں اس ملک کی قدیم ترین تہذیب کی جھلک لازمی ہو گی۔ اس خطہ زمین میں مختلف تہذیبوں نے بعض اضافے کیے، بعض روایتیں بدلیں، بعض تصورات کو منقلب کیا، لیکن ہر تہذیب اپنا کوئی نہ کوئی نقش یہاں ثبت کرتی چلی گئی۔[12]

احمد ندیم قاسمی کے نزدیک پاکستانی تہذیب کا عنوان تہذیب کا اسلامی تصور ہی ہے لیکن ساتھ وہ اس حقیقت کے بھی قائل ہیں کہ ہر تہذیب میں اس کی مٹی کی بوباس ضرور آ جاتی ہے جہاں وہ پیدا ہوتی، پھلتی پھولتی ہے۔ اس لیے تمام اسلامی ممالک کی تہذیبیں بعض امور میں مماثل ہیں تو بعض تفاصیل میں اختلافات بھی رکھتی ہیں۔ ان کی تہذیبی مماثلتیں تہذیب کے اسلامی تصور کی پیداوار ہیں تو ان کے تہذیبی اختلافات ان ملکوں کی ہزاروں برس کی قدیم تاریخ، مخصوص معاشرے، مخصوص معیشیتی رشتوں، مخصوص آب و ہوا اور مخصوص مٹی کی تخلیق ہیں۔[13] ہمیں منفرد تہذیب کے مالک ہو کر بھی دوسری تہذیبوں کا احترام اور ان کی انفرادیتوں کا اعتراف کرنا چاہیے۔ تہذیب ہمیں تہذیبوں سے محبت سکھاتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے خیال میں تہذیب کا مفہوم محبت، امن اور خیر سگالی ہے۔ بشرطیکہ دوسری تہذیبوں کے نزدیک بھی تہذیب کا یہی مطلب ہو۔[14] انسان دوستی کو بھی احمد ندیم قاسمی بہت اہمیت دیتے ہیں کہ انسان دوستی دینی یا تہذیبی اختلافات کی نفی نہیں یہ اس وقت خوب صورت لگتی ہے جب وہ دینی یا تہذیبی یا معاشی امتیازات کے ماحول میں پھلے پھولے۔[15] انسانی معاشرے میں دین، ثقافت، اختلافات اور عقیدے کے اختلافات فطری، ضروری اور مقبول ہیں۔

کسی گروہ، طبقے، قوم کا مخصوص طرز زندگی کلچر ہے۔ تہذیبوں کی طرح کلچر بھی پیدا نہیں کیے جاتے۔ یہ عقائد، تاریخی واقعات، جغرافیائی حالات اور مختلف کلچروں سے پیدا ہونے والے اثرات کا نتیجہ ہے۔ احمد ندیم قاسمی قومی کلچر کو ہمہ گیر اور ہمہ اثر بنانے کے لیے علاقائی کلچروں سے استفادے پر زور دیتے ہیں۔ کیونکہ ایشیائی اور افریقی ممالک محکومی کے دور میں لوک فن کی اہمیت سے غافل رہے بعد میں پسماندگی کا کلنک دھونے کے لیے اپنے تہذیبی و ثقافتی ورثے سے شرمانے لگے۔[16] حالانکہ مشترک تہذیب سے علاقائی تہذیبوں کی نفی نہیں ہوتی بلکہ قومی کلچر صوبائی اور علاقائی کلچروں کی بہترین خصوصیات اپنا کر ان کے فروغ کا باعث بنتا ہے۔

اپنی نوعیت کے منفرد نقاد حسن عسکری(1919ء-1978ء) تہذیب و ثقافت کے بارے میں الگ زاویہ نظر رکھتے ہیں۔ ان کی رائے میں پاکستان کے قومی کلچر کے چار بنیادی عناصر ہیں۔ اسلام، ہند اسلامی کلچر کی روایت، مقامی کلچری روایتیں اور بین الاقوامی کلچر کا اثر۔ عسکری نے پاکستان کے قومی کلچر کے نقوش اس وقت واضح کیے جب قومی کلچر کی بحث بہت زوروں پر تھی۔ عسکری قیام پاکستان کے مطالبے کی سب سے بڑی غرض ہماری کلچری روایت کا غیروں کی دست درازیوں سے تحفظ اور اس کے فروغ کو گردانتے ہیں۔[۱۷] تشکیل پاکستان سے ہندوؤں کو بھی اپنے کلچر کے حوالے سے آزادی اور خود مختاری حاصل ہوئی کیونکہ اس سے دو کلچروں کے متناقص اور متضاد مطالبات کے باہمی ٹکراؤ کا احتمال بھی نہیں رہتا۔[۱۸] وہ انسانی زندگی کے غیر مرئی عناصر جیسے آرٹ، فلسفہ، مذہب وغیرہ کو کلچر کا نام دیتے ہیں۔

پاکستانی کلچر کے بنیادی عناصر میں پہلا اسلام کو قرار دیتے ہوئے عسکری ان لوگوں کے مخالف ہیں جو اسلامی کلچر سے مراد صرف عربوں کا کلچر لیتے ہیں اور پاکستان کو صرف رواج کے اعتبار سے نہیں بلکہ معمولی باتوں میں بھی خلافت راشدہ کا نمونہ بنانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ حالانکہ عربوں کے ثقافتی نظریات زمانے کی ضرورتوں سے ہم آہنگ نہیں۔ اسلامی کلچر میں اور کلچر کے بنیادی عناصر میں اسلام کی اہمیت کے حوالے سے عسکری کا موقف ہے کہ ساری اسلامی تاریخ اس کے اندر آئے گی۔ یہ جامد نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے:

> "ہم مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ کلچری تاریخ کو کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں۔ اگر نظر انداز کر بھی دیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ "اسلامی کلچر" کے معنی جمود اور تعطل کے ہیں۔ اسلامی کلچر کا ایسا تنگ دلانہ نظریہ خود اسلام کی روح کے منافی ہے۔ اسلام نے تو اپنے پیروؤں کو کلچری معاملات میں زیادہ سے زیادہ آزادی دی ہے اور مسلمانوں پر کوئی ایسی پابندی عائد کی ہی نہیں کہ وہ دوسرے کلچروں سے استفادہ نہ کر سکیں۔ اسلام جس ملک میں بھی پہنچا ہے وہاں کے تمدن، معاشرت اور تہذیب سے اس نے بیسیوں چیزیں مستعار لی ہیں اور تو اور اسلامی طرز تعمیر کو ہی لے لیجیے انسانی کلچر کے خزانے میں مسلمانوں کا سب سے بڑا اضافہ یہ فن ہے مگر مسلمانوں کی عمارتوں کا کوئی خاص طرز نہیں ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ان کی عمارتوں میں ایک ایسی روح مل سکتی ہے جو بالکل علیحدہ اور سب سے مختلف ہے۔ اس اعتبار سے ہم انھیں اسلامی عمارتیں کہتے ہیں۔ مگر ویسے کہیں مسلمانوں نے رومی طرز تعمیر سے اثر لیا ہے، کہیں مصری طرز سے، کہیں ایرانی طرز سے، کہیں ہندی طرز سے۔ یہی حال کلچر کے اور شعبوں کا بھی ہے-----"[۱۹]

اسلامی کلچر کی بنیاد تو یہ ہے کہ بنیادی تصورات و عقائد اسلام کے ہوں مثلاً علم حاصل کرو۔ دوسروں سے سیکھو اور ان کو سکھاؤ۔ مگر اس کا مطلب عربوں جیسا لباس پہننا نہیں ہے۔ عسکری کے نزدیک اسلام پاکستانی کلچر کا سب سے ضروری رکن ہو گا کیونکہ اسلام کے نام پر پاکستان بنا۔ اس کے باشندے اسلام سے کنارہ کش نہیں ہوں گے مگر اس کا

مطلب یہ بھی نہیں کہ اقلیتوں کو بھی ڈنڈے کے زور سے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ بحیثیت مجموعی قومی کلچر میں اسلامی اقدار کا شمول ناگزیر ہے۔ مذہب اسلام سے آزاد رہنے کے خواہشمند افراد بھی اپنی ثقافتی سرگرمیوں میں اسلامی اقدار سے اپنا دامن نہیں بچا سکتے۔ اسلام ہماری زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی چیزوں تک میں نفوذ کر چکا ہے۔[۲۰]

پاکستانی کلچر کے دوسرے بنیادی عنصر، ہند اسلامی کلچر کی روایت کے متعلق حسن عسکری کا موقف ہے کہ یہ وہ کلچر ہے جو دہلی کی مسلمان سلطنتوں کے زیر سایہ نشو نما پاتا رہا۔ اس کے دو بڑے مظاہر ہیں مغل عمارتیں اور اردو زبان۔ ہندوستانی مسلمان جذباتی اعتبار سے اپنے آپ کو مغل سلطنت سے متعلق سمجھتے تھے اور اپنے آپ کو ایک وحدت تصور کرتے رہے اسی لیے انھوں نے متحدہ طور پر پاکستان کا مطالبہ کیا۔ ہند اسلامی تہذیب کے بنیادی خاکے کے اوپر پاکستان کی کلچری عمارت تعمیر ہونی چاہیے۔ مگر اس دور کی مطلق العنان اور آج کی جمہوری ریاست میں فرق ہونا چاہیے۔ یہی کلچری اختلاف اس روایت میں تسلسل بھی باقی رکھے گا اور جمود بھی پیدا نہیں ہو گا۔[۲۱]

اسلام کے بعد ہند اسلامی کلچر کی روایت ہی وہ مشترک قدر تھی جس نے برصغیر کے مسلمانوں سے پاکستان کے مطالبے کی حمایت کرائی۔ مسلمانان برصغیر شمالی ہند کے بادشاہوں کی تاریخ کو اپنی تاریخ سمجھ کر اور ان کے کلچری کارناموں پر فخر محسوس کرتے رہے ہیں۔ بے شک ہند اسلامی کلچر جن علاقوں میں پلا بڑھا وہ پاکستان میں نہ بھی ہوں پھر بھی اس جذباتی تعلق کی بنا پر اس روایت کی خدمت کو پاکستانیوں کو اپنا فرض سمجھنا چاہیے۔[۲۲]

پاکستانی کلچر کا تیسرا بنیادی عنصر عسکری کے نزدیک مقامی کلچری روایت ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر علاقے کے کلچر کو اظہار کی الگ الگ آزادی ملے اور کوئی مشترک کلچر نہ ہو۔ مقامی اور قومی کلچر ساتھ ساتھ زندہ رہ سکتے ہیں مگر یکساں اہمیت نہیں ہو گی۔ کیونکہ جب کئی وحدتیں مل کر ایک نئی وحدت کو جنم دیں تو ہمیں اپنی انفرادیت کی تھوڑی بہت قربانی دینی پڑتی ہے۔ اگر اس سے گریز کیا جائے تو نئی وحدت مختلف انفرادیتوں کے تصادم کا شکار ہو جائے گی۔ قومی کلچر سے الگ ہو کر علاقائی کلچر سمٹ کر رہ جائیں گے کیونکہ ایک بڑی کلچری روایت میں شامل ہونے کی بات اور ہوتی ہے جو ایک علاقے تک محدود رہنے سے حاصل کرنا ممکن نہیں۔ مقامی کلچر اپنی جگہ زندہ رہیں گے مگر قومی کلچر کی تعمیر میں ان کا حصہ ہو گا۔ اس وجہ سے ہند اسلامی کلچر کی روایت کو توانائی اور تازگی مل سکتی ہے۔ قومی کلچر، ادب، زبان مختلف صوبوں سے نئے طریقے، نئی تفاصیل حاصل کر سکتا ہے۔[۲۳] دراصل قومی کلچر اور مقامی کلچر کے درمیان ایسا توازن ڈھونڈنا چاہیے کہ مرکزی روایت مستحکم اور مالا مال ہوتی رہے جبکہ علاقائی انفرادیت بھی برقرار رہے۔ ہر قومی کلچر کی تشکیل اسی طرح ہوتی ہے۔ نہ کلچر کی مرکزی روایت ڈرنے کی چیز ہے نہ مقامی روایت۔ دونوں کے تعاون اور اشتراک سے ہی کلچری سرمائے میں بڑا اضافہ ممکن ہے۔[۲۴]

پاکستانی کلچر کے چوتھے بنیادی عنصر بین الاقوامی کلچر کے اثر کی وضاحت کرتے ہوئے عسکری کا کہنا ہے کہ مغربی کلچر سے قطع تعلق کرنا آج کل کے دور میں ممکن نہیں۔ اب کلچری ضرورتیں ایک خاص ملک تک محدود نہیں بلکہ عالمگیر ہیں۔ مغربی اثرات سے بے نیاز نہیں رہا جا سکتا۔ اگر ہم پاکستان میں وسیع اور توانا کلچر کی تخلیق چاہتے ہیں تو بین الاقوامی رشتوں کو ترک کرنے کی بجائے مزید مضبوط بنانا ہوگا۔ پاکستانی کلچر بیک وقت مقامی بھی ہونا چاہیے، اسلامی بھی اور عالمگیر بھی۔[۲۵] خارجی اثرات سے گھبرانا قومی کلچر کے لیے مہلک ہو سکتا ہے:

"ہم اپنے کلچر کو دوسری قوموں کے کلچر سے اور پوری انسانیت کے مشترکہ کلچر سے بھی علیحدہ نہیں رکھ سکتے۔ اسلام نے مسلمانوں کو پوری انسانیت کے کلچر کا حقدار ٹھہرایا ہے۔ اگر ہم اس معاملے میں تعصب برتیں گے تو یہ خود اسلام کی روح کے منافی ہوگا۔"[۲۶]

حسن عسکری کے نزدیک پاکستان کی بنیاد رنگ، نسل، جغرافیائی حدود یا اعداد و شمار کی بجائے ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے مشترکہ قومیت کے احساس پر ہے۔ کیونکہ پاکستان کا خواب صرف یہاں رہنے والے مسلمانوں نے نہیں بلکہ پورے برصغیر کے مسلمانوں نے دیکھا تھا۔[۲۷] اس لیے یہاں کے کلچر کے بنیادی عناصر میں اسلام، ہند اسلامی کلچری روایت، مقامی کلچر اور بین الاقوامی کلچر کا اثر شامل ہیں۔ کلچر دیر پا ہوتا ہے عوام میں اس کی جڑیں گہری ہوتی ہیں۔ یہ کوئی ایسی سیدھی سادھی چیز نہیں ہے جو دو دن میں بن کے تیار ہو جائے۔ کلچر کی اقدار کو عوام کی رگ رگ میں اترنے کے لیے طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔[۲۸]

عسکری کا کہنا ہے کہ ہمیں تاریخی روایات کو مجموعی طور پر قبول کرنا پڑے گا۔ یہ نہیں کہ اس کے کسی دور کو اچھا یا برا کہہ کر اس سے اپنا تعلق ختم کر لیں۔ پوری تاریخ کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھانا ہوگا۔ مسلمانوں کی تاریخ بھی اسلام کا جزو ہے۔ اسلام صرف چند عقائد کا نام نہیں یہ انسانیت کی تاریخ میں تہذیبی قوت بن کر آیا ہے۔ اسلام ابدی حقیقت یوں ہے کہ وہ انسانی تاریخ کی رو سے الگ ہٹ کر کونے میں نہیں بیٹھ جاتا بلکہ تاریخ کی ہر نئی قوت کو اپنے اندر جذب کرنے کی استعداد رکھتا ہے۔[۲۹]

زوار حسین کے مطابق کلچر کا تعلق چونکہ مرز بوم سے ہے اس لیے وہ بے زماں ہوتا ہے جبکہ نئی تہذیب اسی کلچر کی وہ صورت ہے جو زمان مسلسل کے تابع ہو کر دور تک پہنچتی ہے اور تاریخ کو وجود میں لانے کا سبب بنتی ہے۔ تہذیب اور کلچر در حقیقت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ تہذیب کے واقعاتی زاویہ نگاہ سے زوار حسین یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ تہذیب ہمیشہ انسان کے ساتھ رہتی ہے کبھی فنا پذیر نہیں ہوتی۔ یہ بالفعل اپنا واقعاتی وجود رکھتی ہے۔ اس کی تخلیقی کارکردگی کے نمونے انسان کے ذاتی اور نوعی تشخص کے مترادف ہیں۔ تہذیب کا سفر انسان ہی کے دائرہ صفات پر روشنی ڈالتا ہے۔ تہذیبی فعل (مثلاً پتھر کے اوزار) قبل از تاریخی وجود رکھتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت اور قدامت انسان کی ہم مرتبہ ہے۔ انسان تہذیب کو نہ خیر باد کہہ سکتا ہے اور نہ اس پر سبقت حاصل کر سکتا ہے۔ تہذیب کی

حلاوت میں فطرت شامل رہتی ہے لیکن انسان اور تہذیب فطرت میں تحلیل نہیں ہو سکتے۔ تہذیب کے مظاہر بہ اعتبار ہیئت نامیاتی نہیں بلکہ ریاضیاتی ہیں۔ تہذیب فطرت کا حصہ یا مقبوضہ نہیں بلکہ یہ بعد از فطرت تعمیر یا غیر فطری تجاوز کا نام ہے۔[۳۰]

غیر فطری تجاوز کی وضاحت کرتے ہوئے زوار حسین کا کہنا ہے:

"۔۔۔۔فطرت جہاں اپنے قوانین سمیت اختتام پذیر ہوتی ہے ٹھیک اسی مقام سے انسانی تہذیب کا آغاز ہوتا ہے۔ انسان کی نشو نما اور اس کی تاریخی پیش قدمی کے یہی معنی ہیں۔"[۳۱]

جیسے طلوع قمر فطری واقعہ ہے یہ فطرت اور اس کے قوانین کے تابع ہے اس کے برعکس چراغ تہذیبی واقعہ ہے اس کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے انسان کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ دنیا تاریک ہو سکتی ہے مگر انسانی ہاتھ کا تہذیب کے چراغ سے خالی رہنا ممکن نہیں۔ تاریخی پیش قدمی کا سارا میدان انسانی اختیار اور آزادی کا ہے۔ تہذیب کے جملہ اعمال کی نوعیت شعوری ہے۔[۳۲]

مختلف زبانوں میں تہذیب کے لغوی معنی کے متعلق زوار حسین کہتے ہیں کہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی کسی درخت یا پودے کو کاٹنا اور تراشنا تاکہ نئی شاخیں پھوٹیں کے ہیں۔ فارسی میں یہ کسی شے کو آراستہ پاک اور درست کرنے کے مترادف ہے۔ اردو زبان میں یہ مودب، بااخلاق اور شائستہ ہونے کے معنوں میں مستعمل ہے۔ جیسے فنون لطیفہ کا ذوق اور روایت کا احترام وغیرہ۔ انگریزی زبان میں لفظ کلچر کے معنی ریشم کے کیڑے پالنا، زراعت ور ذہنی وجسمانی اصلاح وترقی وغیرہ ہے۔[۳۳]

ریشم کے کیڑے پالنے سے کپڑوں کی تراش خراش تک بات تہذیب کی ہی آتی ہے۔ حتیٰ کہ ناخن تراشنا بھی انسان کو جانوروں سے مختلف بناتا ہے۔ کسی عنصر کو تراش کر اسے اپنی مرضی کے مطابق بنانا ایسا انتخاب ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ فطرت کہاں اختتام پذیر ہوئی اور انسانی تہذیب کا آغاز کیسے ہوا۔[۳۴] انسان اور تہذیب لازم وملزوم ہیں۔ فطرت اور تہذیب کے قوانین یکساں نہیں ہیں۔ تہذیبی افعال فطری ماحول کا جمود توڑ کر الگ انداز کا تہذیبی تناظر پیدا کرتے ہیں۔ تہذیبی افعال کے تسلسل سے تمام تہذیبوں کی تہہ میں ثقافتی یکسانیت کے ثبوت ملتے ہیں۔

"تہذیب کی اصطلاح مخصوص انسانی طریقہ کار اور حسن تخیل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ہر وہ فعل جو اپنی اصلیت، ماخذ اور شناخت کی بناپر انسانی نوعیت کا حامل ہو تہذیب کے معنی پیدا کرے گا۔ اس مفروضے میں طریقہ کار سے مراد بامقصد تخلیقی اظہار ہے۔"[۳۵]

جیسے حیوان پانی کو دیکھ کر براہ راست اپنا چہرہ اس میں ڈبو دیں گے ۔ ان کے لیے کوئی درمیانی واسطہ یعنی "ظرف" غیر ضروری ہو گا جبکہ انسان کے نزدیک ظرف کا غیر فطری وجود حیاتیاتی ضرورت کے علاوہ شائستگی کی

ذیل میں آتا ہے۔ ہر ظرف کا واقعاتی وجود تہذیب کے اساسی مفہوم کی تجسیم قرار پاتا ہے۔ تہذیبی عمل ایسا متین اور بردبار عمل ہے جو انسانی ذات کو فطرت کے حیوانی رگ وریشے سے جدا کر کے امتیازی مقام دے سکتا ہے۔[۳۶]

زوار حسین کے مطابق کوئی تہذیب بہ اعتبار اساس غیر انسانی نہیں ہو سکتی۔ تہذیب کے اس زیریں معنی کو "تہذیبی وحدت" کا عنوان دیا جا سکتا ہے۔ جبکہ شناخت کے اعتبار سے بالائی اور ارتقائی معنی کثرت پذیر ہیں۔ انھیں "تہذیبی کثرت" کا عنوان دیا جا سکتا ہے۔ جیسے رنگ، نسل، مذہب، زبان اور جغرافیہ یہ سب مزید کثرت پذیر ہیں۔ جغرافیہ ارضی وحدت ہونے کے باوجود تقسیم پذیر ہے۔ مذاہب متعدد ہیں۔ نسلی امتیازات اور زبان کی نوعیت بھی یہی کثیر ہونا ہے۔ کامیاب تہذیب وہ ہوگی جو اپنے زیریں انسانی معانی کی تکریم کرتے ہوئے دیگر تمام افراد کو ایک موزوں کل میں جمع کر سکے۔ تہذیب کے زیریں معنی ایک واحد، اساسی، اولین اور اصلی سٹرکچر کا تصور اجاگر کرتے ہیں جو مختلف سلسلہ ہائے عمل پر مشتمل ہوتا ہے۔ مثلاً اوزار سازی، مصوری، ستر پوشی، رنگ آفرینی، ظرف سازی، زراعت، غذا کا نظام، طب کا نظام، روشنی اور آگ کی تسخیر، تعمیرات وغیرہ۔ تہذیب کے فعلیاتی معنی کا مطالعہ تہذیب کی آفاقی وحدیت کا مطالعہ ہے۔ تمدنی ارتقا ایک واحد عمل زمانی پر مشتمل ہے۔ یہ بعد میں آنے والے تمدن کو جذب کر لیتا ہے۔ یعنی تمدن ترسیل اور اکتساب کے لائق ہے۔ لہٰذا اجتماعی طور موت یا ہمیشہ کے لیے فنا اس کا مقدر نہیں مثلاً یونانی تمدن کو اہل روما نے، یورپی تمدن نے یونانی، رومی، عبرانی، مسیحی اور عربی تمدن کے عناصر کو اپنے نظام میں شامل کیا۔[۳۷] سپینگلر کے استدلال کے مطابق انسانی تمدن بھی حیوانی انواع کی طرح پیدائش، عالم شباب اور پیری سے گزر کر ابدی موت کے حوالے ہو جاتے ہیں۔ جن کا اعادہ ممکن نہیں۔ لیکن زوار حسین تہذیب و تمدن کے ناقابل جذب و انتقال اور نالائق ترسیل و ترجمہ ہونے کے مخالف ہیں۔

نامور ترقی پسند دانشور سبط حسن (1916ء تا1986ء) جو مارکسزم کو تاریخ کو سمجھنے کا بنیادی اصول گردانتے ہیں۔ اسی نظریے سے تہذیب و تمدن کا جائزہ لیتے ہوئے ان کا کہنا ہے کہ تہذیب انسان کا موجود سے ممکن کی جانب سفر ہے۔ ماضی کی تہذیبوں کے موجودات نے وقت کے ساتھ ممکنات کی کونسی شکل اختیار کی اس لیے پرانی تہذیبوں کو پس پشت ڈال کر نئی تہذیبوں کا مطالعہ ممکن ہی نہیں۔ ہر قوم تہذیبی تشخص کی حامل ہوتی ہے۔ جو کچھ پہلوؤں میں دیگر تہذیبوں سے مماثل اور کچھ میں الگ اور ممتاز ہوتی ہے۔ یہ انفرادی خصوصیات اس کی پہچان کا سبب بنتی ہیں۔ قومی تہذیب ایک سماجی حقیقت ہے جبکہ ریاست اور قوم کی سرحدوں کا ایک ہونا ضروری نہیں۔ یعنی ریاستوں کے حدود اربع گھٹ بڑھ سکتے ہیں مگر قومی تہذیبوں کی حدود بدلنا بہت مشکل ہے۔ ایک سے زائد قومیتوں کے حامل ملکوں میں ریاستی

تہذیب کی تعمیر و تشکیل کا انحصار مختلف اقوام کے طرزِ فکر، طرزِ عمل اور طرزِ احساس کے آہنگ اور ربط پر ہوتا ہے۔[۳۸]

سبطِ حسن کے بقول معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کا نام تہذیب ہے:

"تہذیب معاشرے کی طرزِ زندگی اور طرزِ فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے چنانچہ زبان، آلات و اوزار، پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے، رہن سہن، فنونِ لطیفہ، علم و ادب، فلسفہ و حکمت، عقائد و ایماں، اخلاق و عادات، رسوم و روایات، عشق و محبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔"[۳۹]

مشرق میں تہذیب کا لفظ شائستگی کے معنوں میں استعمال ہونے کی توجیہہ کا پس منظر سبطِ حسن کے نزدیک یہ ہے کہ ایران وہندوستان کے عمائدین کے طرزِ زندگی کا پرتو وہ تہذیب کے تخلیقی عمل میں خود شریک نہیں ہوتے تھے۔ صرف لطف اندوز ہونا جانتے تھے، فقط تماشائی کی حیثیت سے اداکار کی حیثیت سے نہیں۔ اس لیے تہذیب کا تخلیقی کردار ان کی نظروں سے اوجھل رہا اور وہ آدابِ مجلس کی پابندی سے ہی تہذیب مراد لینے لگے۔[۴۰]

سبطِ حسن تہذیب کی خصوصیات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ انسان اور تہذیب لازم و ملزوم ہیں۔ یہ انسان کی نوعی انفرادیت ہے۔ انسان کی سب سے عظیم الشان سماجی تخلیق زبان ہے۔ جس کے ذریعے وہ اپنے احساسات، خیالات و تجربات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ جانور علامتوں کی تخلیق سے قاصر ہوتے ہیں۔ مصنوعی دنیا کی تخلیق انسان کا بڑا کارنامہ شمار ہوتی ہے۔ باشعور حیاتی عمل انسان کو دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتا ہے۔ چونکہ تہذیب خالصتاً انسانی تخلیق ہے، اس کی اساس انسان کی جسمانی ساخت پر ہے لیکن اس کا کردار غیر جسمانی ہے۔ یہ بذریعہ جسم ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل نہیں کی جاسکتی۔ البتہ ہر انسانی تہذیب میں تسلسل اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ہر نئی نسل کی شخصیت پرانی نسل کی تہذیب کے دائرے میں تشکیل پاتی ہے۔[۴۱]

سبطِ حسن کے مطابق ہر تہذیب چار بنیادی عناصر؛ طبعی حالات، آلات و اوزار، نظامِ فکر و احساس اور سماجی اقدار سے تشکیل پاتی ہے۔ یہ عناصر ایک دوسرے پر اثرانداز بھی ہوتے ہیں۔ اول: ہر تہذیب ایک مخصوص جغرافیے کی حامل ہوتی ہے۔ کسی قوم کی تہذیب کے تعین میں اور افراد کی شخصیت بنانے بگاڑنے میں خارجی ماحول اور حالات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ پوری انسانی تاریخ طبعی ماحول یا قدرت کی تسخیر کی جدوجہد کی داستان ہے۔

دوم: انسانی تہذیب کی عمارت اور ترقی کا انحصار آلات و اوزار پر ہے۔ جس طرح کے آلات و اوزار ہوں گے اسی قسم کی تہذیب ہوگی۔ جیسے پتھر کے زمانے میں مخصوص آلات و اوزار کے استعمال کی بنا پر مخصوص تہذیب تھی، کانسی کے آلات و اوزار کے رواج پانے سے معاشرے کا پورا بالائی ڈھانچہ بدل گیا۔ پہلی بار بستیاں بسائی گئیں۔ مویشی پالے، کھیتی باڑی کا آغاز ہوا۔ ظرف سازی کا سلسلہ شروع ہوا۔ آہستہ آہستہ ریاستیں، سلطنتیں قائم ہونے سے نئے ہنر، پیشے وجود میں آئے۔ طبقاتی تقسیم نے جنم لیا۔ قوانین وضع ہوئے۔ مذہب و اخلاق کے ضابطے بنے۔ غرض سماج میں

طرزِ عمل، طرزِ زندگی اور طرزِ فکر و احساس کا نیا نظام قائم ہوا جو پتھر کے زمانے کے سماجی نظام سے یکسر الگ تھا۔ زرعی نظام میں لوگ امداد باہمی کے اصول پر کام کرتے ہیں۔ پیداواری عمل سے گاؤں کی مخصوص تہذیب جنم لیتی ہے جیسے پانی بھرنے، چکی پیسنے، چاک گھمانے، فصل کاٹنے کے گیت، لوک ناچ، لوک کہانیاں، تہوار، فصلی میلے، ذاتی استعمال کے لیے بنائی جانے والی گھریلو دستکاریاں۔ اس زرعی نظام کی اعتقادی خصوصیات بھی الگ ہوں گی۔ اس کے مقابل ہل بیل کی بجائے بھاری مشینوں سے ہونے والے زرعی نظام میں کاشتکار ٹھیکیدار کی بجائے ماہر زراعت ہوں گے۔ چٹائی، بوائی، کٹائی، ذخیرہ اندوزی کے لیے مشینیں استعمال ہوں گی۔ ایسے معاشرے میں خواتین کا کردار ہل بیل والے معاشرے سے قطعی مختلف ہوگا۔ ایک مختلف معاشرت کا وجود عمل میں آئے گا۔ [۴۲] اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے سبطِ حسن رقمطراز ہیں:

> "۔۔۔اور جب نہ چکی رہی نہ چرخے، نہ فصلوں کی کٹائی کے موقعوں پر گہما گہمی تو لوک گیت، لوک گانے اور لوک ناچ کی امنگیں کیسے اٹھیں گی۔ جن حالات میں یہ فنون پرورش پاتے تھے جب وہ حالات ہی باقی نہ رہے تو یہ فنون کیسے زندہ رہیں گے۔ چنانچہ اس بستی میں جس میں ریڈیو بجتے ہوں اور ٹی وی کھلے ہوں لوگ فن کی تخلیق کرنے کی بجائے فن کے تماشائی بن جاتے ہیں۔ ان کا حصہ فقط دور کا جلوہ ہوتا ہے۔" [۴۳]

چونکہ ہر تہذیب انسانوں کی جسمانی و ذہنی محنتوں کی تخلیق کا ثمر ہوتی ہے اس لیے اگر کسی معاشرے میں نئے تجربوں، تحقیقوں اور جستجوؤں کی راہیں مسدود کی جائیں تو تہذیب جمود کا شکار ہو کر پروان نہیں چڑھتی اور معاشرتی تقاضوں کا ساتھ نہ دینے کے نتیجے میں فنا ہو جاتی ہے۔ [۴۴]

سوم: انسان باشعور حیوان ہے۔ ہر تہذیب کا مخصوص نظامِ فکر و احساس ہوتا ہے جو افرادِ معاشرہ اور موجودات کے درمیان استوار رشتے کی نوعیت ظاہر کرتا ہے۔ انسان کے حالاتِ وجود کی جس سطح پر ہوں گے شعور کی سطح بھی وہی ہوگی۔ دیگر انسانوں سے اس کا ربط، سوچنے سمجھنے، محسوس کرنے کا انداز، عقائد و رجحانات بھی اسی قسم کے ہوں گے۔ مثلاً قرونِ وسطیٰ کا انسان نظریہ ارتقا، نظریہ اضافت، اور جوہری توانائی کے نظریے دریافت نہیں کر سکتا تھا۔ قدیم انسان جن چیزوں سے سکھ پاتا تھا انھیں پسند کرتا تھا اور جن سے دکھ پاتا تھا انھیں ناپسند کرتا تھا۔ بعد میں یہ نیکی اور بدی کی قوتیں قرار پائیں۔ پتھر کے زمانے کا معاشرہ سفری و شکاری تھا جبکہ کانسی کا معاشرہ حضری اور زرعی تھا۔ کانسی کے زمانے کی تخلیقی سرگرمیوں کے اس دور کے نظامِ فکر و احساس کے رشتے کی وضاحت سبطِ حسن اس طرح کرتے ہیں:

> "۔۔۔۔مثلاً جب معاشرے میں طبقات قائم ہوئے اور ذاتی ملکیت نے رواج پایا اور معاشی اور سیاسی اقتدار مطلق العنان بادشاہوں، درباروں کے امیروں اور پروہتوں کے ہاتھ میں آیا تو ان طبقوں نے اپنے معاشرتی نظام سے ملتا جلتا اور اس کے متوازی پوری کائنات کا ایک دیومالائی نظام وضع کر لیا۔" [۴۵]

ہر معاشرے کا نظام فکر و احساس سماجی شعور کے تابع ہوتا ہے۔ جبکہ سماجی شعور خود سماجی حالات کے مطابق ہوتا ہے مثلاً زمانہ قدیم میں زمین کو کائنات کا مرکز و محور مانا جاتا تھا۔ قدیم تہذیبوں کا عقیدہ تخلیق بہت مختلف تھا۔ ڈارون کے نظریہ ارتقا نے انسانی افکار میں متعدد تبدیلیاں پیدا کیں۔ سماجی حالات میں ہونے والے تغیرات نے تہذیب کے نظام احساس و فکر کو بدلا۔ چونکہ خیالات انسانی سرگرمیوں کا رخ متعین کرتے ہیں، اس کی قوت عمل کو حرکت میں لاتے ہیں۔ اس لیے طبقات میں بٹنے کے بعد تہذیب کے خیالات کی نوعیت بھی طبقاتی ہو جاتی ہے۔ معاشرے کی مادی قوتوں پر جو طبقہ غالب ہو وہی ذہنی قوتوں پر بھی غالب ہوتا ہے۔ مثلاً بنو امیہ عقیدہ جبر کے حامی تھے کیونکہ یہ ان کی حکومت کے لیے تقویت کا باعث تھا جبکہ اس کے برعکس ان کے مخالفین قدر و اختیار کے فلسفے کے حامی تھے۔[۴۶]

چہارم: کسی معاشرے میں اخلاق و عادات، ربط و سلوک، رسم و رواج، طرز بود و ماند، فن و اظہار اور حسن و جمال کے رائج شدہ معیار سماجی اقدار کہلاتے ہیں۔ ان کے پیچھے صدیوں کی تاریخی روایات ہوتی ہیں۔ ہر معاشرہ اپنی سماجی اقدار کی پاسبانی کرتا ہے کیونکہ سماج کی بقا کا انحصار ان اقدار کے تحفظ پر ہوتا ہے۔ ان سے غفلت برتنے کی صورت میں معاشرے کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے۔ مثلاً عربوں کا سارا معیشتی نظام درہم برہم ہو جاتا اگر حج کے زمانے میں بھی جنگیں جاری رہتیں۔ اس لیے ان مہینوں میں خونریزی یکسر ممنوع تھی۔ ہر معاشرہ اپنی ضرورتوں کے پیش نظر معاشرتی اقدار وضع کرتا ہے۔ یہ جامد اور ناقابل تغیر نہیں ہوتیں۔ ایک معاشرے کی سماجی قدریں دوسرے کو پرکھنے کا معیار نہیں ہیں۔ بعض سماجی قدریں تولائی ہوتی ہیں اور بعض مولائی یا آقائی۔ اول الذکر کو مادی نظام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ان میں محبت اور میل ملاپ کا عنصر غالب ہے، جیسے بچوں سے پیار، بیماروں کی دیکھ بھال، مظلوموں سے ہمدردی وغیرہ۔ جبکہ جن میں حاکمیت یا آقائیت کا عنصر غالب ہے مولائی یا آقائی قدریں ہیں مثلاً حاکم کی اطاعت، بزرگوں کا احترام، ایفائے عہد، قتل، چوری، ڈاکہ، ناجائز قبضہ وغیرہ۔ ہر معاشرہ مولائی اور تولائی قدروں کے درمیان ہم آہنگی اور توازن قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی معاشرے میں سماجی قدروں کے مختلف پیمانے رائج ہوتے ہیں۔[۴۷]

پاکستانی تہذیب کی قدامت اور اس کے ماخذ کی بابت رائے دیتے ہوئے سبط حسن لکھتے ہیں:

"یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پاکستان میں انسان چار لاکھ برس سے آباد ہے اور وہ اس طویل مدت میں پتھر کی تہذیب، کانسے کی تہذیب اور لوہے کی تہذیب سے دور سے گزرا ہے۔ یہ بھی ایک مسلمہ امر ہے کہ اس دوران میں دراوڑ، آریہ، ساکا، ایرانی، یونانی، کشن، ہن، عرب، ترک، افغان اور مغل قوموں کے لوگ وقفے وقفے سے یہاں آکر آباد ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ امری، موئنجوڈرو، ہڑپہ، ٹیکسلا، پشاور، ملتان، اوچھ، لاہور اور ٹھٹھہ وغیرہ

میں ان قوموں کے تہذیبی آثار اب تک موجود ہیں۔ اہل پاکستان کی تہذیب کا خمیر انھیں پرانی تہذیبوں کے قوام سے اٹھا ہے۔"[۴۸]

مذہب کی تہذیب میں اہمیت کے حوالے سے سبط حسن اسے تہذیب کا جزو مانتے ہیں مگر تہذیب کا کل تسلیم نہیں کرتے۔ تہذیب کا دارومدار مذہب پر ہے کے نظریے کو سبط حسن غیر تاریخی قرار دیتے ہیں۔[۴۹] ان کے مطابق تہذیب کی تشکیل و تعمیر میں مذہب کا بہت عمل دخل رہا ہے مثلاً گندھارا تہذیب، بدھ مت اور گوتم بدھ کی شخصیت سے متاثر ہے۔ قرون وسطیٰ کی مغربی تہذیب پر حضرت عیسیٰؑ اور مسیحی پیشواؤں کی گہری چھاپ ہے۔ مگر یہ اعتقادی مظاہر پوری گندھارا تہذیب اور مغربی تہذیب کی ذہنی و مادی تخلیقات کا فقط ایک جزو ہیں۔ یہی معاملہ ہماری تہذیب کے ساتھ ہے۔ مذہبی تہوار، عرس، نعتیہ قصائد، مسدس، مرثیے، سلام، یوسف زلیخا کے قصے، امیر حمزہ کی داستانیں، مساجد کا حسن تعمیر اور ان کے دلکش نقش و نگار، فن خطاطی کے پیچ و خم غرض ہماری تہذیب کے بکثرت پہلوؤں کا سرچشمہ مذہبی عقائد و رسوم ہی ہیں۔ مگر ہماری زبان، بولیاں، خوراک، پوشاک، آلات و اوزار، اوڑھنا بچھونا، طرز تعمیر، موسیقی، شاعری، مصوری، رسم و رواج، ادب کسی کا تعلق عہد رسالت کی مکی یا مدنی تہذیب سے نہیں ہے۔ پاکستانی تہذیب کو عرب تہذیب کے قالب میں نہیں ڈھالا جاسکتا۔ یہ فرق مذہب کے معیار پر نہیں پرکھا جاسکتا۔[۵۰]

صنعتی دور میں پاکستانی تہذیب کے حوالے سے سبط حسن کا موقف ہے کہ صنعتی تہذیب سے قبل تمام تہذیبوں کے فکر و فن اور اقدار حیات کا تمام نظام کھیتی باڑی سے وابستہ تھا۔ ان کی گھریلو دستکاریوں میں زمین کی مہک موجود تھی۔ ان کے تخلیقی محرکات بازاری نہیں تھے۔ مگر صنعتی تہذیب کا سارا نظام خود کار مشینوں کے گرد گھومتا ہے۔ اس میں ہر چیز بازاری ہے۔ اس لیے ادب، علم و ہنر، فن، محبت و اخلاق کے رشتے سب نفع و نقصان کی ترازو میں تولے جارہے ہیں۔ مشینی مصنوعات کی بدولت ہر جگہ کے ماحول اور ہر چیز میں یکسانیت در آئی ہے۔ سبط حسن علاقائی تہذیبوں کو صنعتی تہذیبوں سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیتے ہیں تاکہ ان کا فروغ ممکن ہو۔[۵۱]

سبط حسن بھی اسی نظریے کی تائید کرتے ہیں کہ قوموں یا تہذیبوں کے فنا ہونے کے بعد بھی نئی نسلوں کے طرز معاشرت پر صنعت و حرفت پر، سوچ کے انداز پر، ادب و فن کے کردار پر ان کا اثر باقی رہتا ہے۔ تہذیبوں کے مٹنے کے باوجود ان کے نقش و نگار سے نئی تہذیبوں کے ایوان جگمگاتے ہیں۔ چونکہ تہذیب معاشرے کی اجتماعی تخلیقات اور اقدار کا نچوڑ ہوتی ہے جبکہ تمدن کی بنیاد شہری زندگی ہے۔ ہر تہذیب اپنے تمدن کی پیش رو ہوتی ہے۔[۵۲]

سجاد باقر رضوی (1928ء-1992ء) آسمانی اور زمینی رشتوں کے اختلاط کو تہذیب کی تخلیق قرار دیتے ہیں۔ آسمان کو وہ پدری اصول اور زمین کو مادری اصول تخلیق سے تعبیر کرتے ہیں۔ پدری و مادی اصول کے اختلاط سے تہذیب کی مختلف صورتیں ادب، زبان، رسم ورواج، طرز تعمیر وغیرہ تشکیل پذیر ہوتی ہیں۔ کلچر، تہذیب اور تمدن کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے سجاد باقر رضوی کا کہنا ہے:

"۔۔۔لفظ تہذیب اور کلچر کو ہم معنی تصور کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی روح عمل تخلیق یا افزائش پیداوار میں مضمر ہے۔ اب چونکہ تمدن شہر میں رہن سہن اور زندگی کرنے کے طرز کا نام ہے اس لیے ہم اسے زندگی کا خارجی اظہار کہہ سکتے ہیں۔ ایسی انسانی اکائی یا قومیں جو متمدنی نہیں ہیں کسی نہ کسی تہذیب کی حامل ضرور ہوتی ہیں اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تمدن انسانی روح کے اظہار یا تہذیب کی صورت متعین کرنے میں ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے بہت سے رسم و رواج جو تہذیبی زندگی کا جزو ہوتے ہیں ہمارے تمدن یا خارجی ماحول میں اپنی شکل وضع کرتے ہیں۔"[۵۳]

وہ تہذیب کو تمدن کا روحانی پہلو سمجھتے ہیں اور اسے خود تخلیق اور تخلیق کا ذریعہ بھی کہتے ہیں۔ تہذیبی جمود کا سبب ان کے نزدیک یہ ہے کہ اگر ہم اپنے لاشعور کے تخلیقی و مادری اصول کو کسی دوسری تہذیب کے پدری اصول کے حوالے کر دیں تو لازماً ہماری تخلیقی زندگی وہ نہیں ہوگی جو ہماری اپنی تہذیبی زندگی کو آگے بڑھا سکے۔ جذبات و جبلتوں کا تخلیقی اصول مادری ہے جبکہ تنظیمی اور رہنما اصول پدری اصول زندگی ہے۔ صحتمند، تخلیقی اور متحرک تہذیب تب ہوگی جب مادری و پدری، تخلیقی و تنظیمی دونوں اصولوں کے امتزاج کو تخلیقی زندگی کے لیے ضروری سمجھا جائے۔ حسن عسکری کی طرح سجاد باقر رضوی بھی قیام پاکستان کا اصل محرک مسلمانوں کی تہذیب کے تحفظ کو سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں پاکستان کی سیاسی سالمیت پاکستانی تہذیب کا جسم اور تہذیب پاکستان کی روح ہے۔ پاکستانی تہذیب، پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے موجود تھی اور پاکستان محض اس روح کو جسم دینے کے لیے وجود میں آیا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے پاکستان کا مطالبہ اس لیے کیا تھا کہ مسلمانوں کی تہذیب کا تحفظ کیا جا سکے۔[۵۴]

مادری اور پدری اصول کی اسلام اور تہذیب کے حوالے سے وہ اس طرح وضاحت کرتے ہیں کہ تمام مسلم ممالک میں اسلام کا تنظیمی و پدری اصول زمین یعنی تخلیقی و مادری اصول کے رابطے سے وہاں کی تہذیبی زندگی میں جاری و ساری ہے۔ ان میں اختلاف اور یگانگت بھی ہے۔ یگانگت پدری اصول کے حوالے سے جبکہ اختلاف مادری اصول کے حوالے سے ہے۔ وہ پاکستان کی تہذیب کی سب سے نچلی سطح موئنجوڈرو اور ہڑپہ جبکہ ارفع سطح بین الاقوامی تہذیب کو قرار دیتے ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں نے پچھلے ہزار سال میں دوسری قوموں سے ممتاز تہذیب پیدا کی۔ اسی کی بقا کے لیے الگ مملکت کی تشکیل کے لیے جدوجہد کی۔ یہاں وہ زندگی کا تنظیمی و پدری اصول ساتھ لے کر آئے۔ یہ اہم نہیں کہ وہ کہاں سے آئے۔ وہ مشترک تنظیمی اصول ساتھ لائے۔ یہاں کی زمین، آب وہوا، مادی حالات اور یہاں بسنے والوں کی

اپنی تہذیب ان کی تخلیقی زندگی کے لیے مادری اصول بنی۔ اس اشتراک سے جنم لینے والی تہذیب مادری اصول کے حوالے سے یہاں کے دیگر باشندوں کے ساتھ مشترک تھی مگر پدری اصول کے حوالے سے مختلف۔

سجاد باقر رضوی صحتمند تخلیق کے لیے لاشعور اور شعور، زمین اور آسمان، مادری اور پدری اصولوں کا اختلاط ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق مسلم تہذیب میں بنیادی اہمیت آسمان یا پدری اصول کو حاصل ہے۔ ہماری تہذیب کے تمام عناصر جیسے زبان، ادب، طرز تعمیر، رسم و رواج سب آسمانی و زمینی، پدری و مادی اصول تخلیق کے اختلاط کا نتیجہ ہیں۔ سجاد باقر رضوی اپنی تہذیب میں زیادہ سے زیادہ اعلیٰ تجربے کرنے کے قائل ہیں مگر دوسروں کی تہذیب و روایت کو اپنانے کا مطلب وہ دوسری تہذیب میں اضافہ لیتے ہیں۔[۵۵]

نامور نقاد اور افسانہ نویس سلیم اختر (1934ء-2018ء) کے خیال میں کلچر حال کا گریز پا لمحہ ہونے کے ساتھ ساتھ ماضی کے تہہ در تہہ تجربات کا امین اور مستقبل کے لیے سمت نما ہوتا ہے۔ عوامی شعور کو متاثر کرنے والے چند اہم ترین اور بنیادی عوامل جیسے مذہب، قومی فخر و ناز، جغرافیائی حالات، مخصوص ادوار کے اقتصادی حالات اور سیاسی کوائف قومی کلچر کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مذہب عوام کے لیے خیر و شر کا مسلمہ معیار ہوتا ہے۔ ”کلچر میں مذہب کے اثرات کا مطالعہ خاص اسلام کا مطالعہ نہ ہوگا بلکہ مذہب کے نام نہاد آسمانی اور زمینی پہلوؤں کا تجزیہ ہوگا۔“[۵۶]

کلچر کی تشکیل اور فروغ میں سیاسی حالات کا کردار اساسی ہوتا ہے۔ حکمران قوم کا کلچر بھی افضل اور قابل تقلید قرار پاتا ہے۔ لیکن فاتح اور مفتوح دونوں ایک دوسرے کے کلچروں سے اخذ و قبول کرتے ہیں۔ حسن عسکری نے ہند اسلامی کلچر کو اہمیت دی تھی۔ سلیم اختر ہند ایرانی کلچر کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ”مسلمان حکمرانوں کے زیر اثر اور درباری تقاضوں کی بنا پر پہلے ہندو درباریوں نے اور بعد ازاں عام آبادی نے بھی مسلمانوں کے لباس وغیرہ کو اپنایا۔ لیکن فلسفہ، فنون لطیفہ، علوم اور فنون وغیرہ کی صورت میں خود مسلمان بھی ہندوؤں سے بہت کچھ سیکھ رہے تھے۔ یوں دونوں قوموں کے اس تہذیبی سنگم سے ہند ایرانی کلچر نے جنم لیا۔ جس کی علامت کلس میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ کلس ہندوؤں کے مندروں کا نشان تھا مگر مسلمانوں کی مسجدوں اور مقبروں کے گنبدوں پر جگمگایا۔ عام زندگی میں ملبوسات، توہمات اور مذہب کے زمینی پہلوؤں کی صورت میں اس کلچر کی کارروائیوں کا آج بھی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔“[۵۷]

جو ملک دوسروں سے کٹ کر رہے ہیں وہ اپنے کلچر کو خالص رکھ سکے جیسے بہت عرصے تک تبت۔ سلیم اختر عالمگیر کلچر کے باعث کلچر اور جغرافیے کے تعلق کی نفی کرتے ہیں کہ آج کل جس انداز میں دنیا میں بین الاقوامیت کو فروغ ہو رہا ہے اس لیے اب بظاہر مخصوص جغرافیائی خطوں میں پنپنے اور اقوام سے منسوب کلچر کا تصور متروک نظر آرہا

ہے۔ [58] پاکستانی خطے میں اپنا کلچر کبھی نہیں رہا۔ کیونکہ یہاں وہ طرز فکر جنم نہیں لے سکا جو قومی احساس اور قومی سربلندی کے جذبات پر مبنی ہو۔ سلیم اختر زندگی، کلچر اور تہذیب میں تعلق اس طرح دیکھتے ہیں کہ اگر زندگی کو ایک قطعہ اراضی سے تشبیہ دیں تو اس پر تعمیر ہونے والے مکان کو تہذیب کہیں گے جبکہ اس کی تزئین و آرائش اور نقاشی کلچر کہلائے گی۔ تہذیب اور کلچر دریا اور اس کی لہروں کی مانند ہیں۔ تہذیب ایک تسلسل اور دریا کے بہاؤ کی طرح ہے۔ اسی دریا کے مختلف مقامات پر ابھرتی، ڈوبتی لہریں کلچر ہیں۔ دریا پر لہریں کلچرل پیٹرن ہیں۔ دریا بہت سی لہروں کا منبع بھی ہے اور نئے دریا بھی اس میں شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح مختلف تہذیبیں اور کلچرل اثرات ہیں۔ دریا کے کنارے آباد بستیاں اس کے پانی سے استفادہ کرتی ہیں مگر یہ پانی اور اس میں شامل ہونے والے دھارے ان کے اختیارات سے باہر ہوتے ہیں۔ ان بستیوں کے حصے میں تھوڑا پانی اور چند لہریں آتی ہیں۔ طویل سفر کے بعد دریا کا پانی ان تک پہنچنا ان کے لیے باعث فخر ہو سکتا ہے مگر تمام دریا ان کے حصے میں نہیں آتا۔ تہذیب کے دریا میں موجود کلچرل لہروں کے پیٹرن میں کسی طرح کی منصوبہ بندی کی پیدا کردہ یکسانیت نہیں ملتی۔ ہزار روپ بدلنے پر بھی کلچر پانی کی وہ لہر ہی رہے گا جو دریا کا ایک حصہ ہے۔ یعنی ہزار تنوع کے باوجود بھی تہذیب اور کلچر بہ لحاظ اساس ایک ہیں۔ یہ تغیر و تنوع منشور میں سے نکلنے والی شعاع کے سات رنگوں کی مانند ہے۔ یعنی کلچر کی سطح پر یہی وحدت میں کثرت کا عمل ہو گا۔ عملی زندگی میں تضادات تبھی جنم لیتے ہیں جب تہذیب اور کلچر کی اساس یکساں نہ رہے۔ معاشرے کا کوئی فرد اپنی تہذیب اور کلچر سے فرار حاصل نہیں کر سکتا۔ انسانی جبلتیں اس کا وجود ہیں اور کلچر خارج۔ کلچر کے تقاضوں سے عہدہ بر آ ہونے کے لیے جبلتوں کے تقاضوں میں ترمیم و تنسیخ کرنا پڑتی ہے۔ بعض ٹیبوز کو توڑا جاتا ہے تو بعض کا احترام کیا جاتا ہے۔ سلیم اختر کے مطابق اسلامی تہذیب کے داعی ہونے کے باوجود ہمارا کلچر مغرب سے مستعار شدہ ہے۔ اسلامی تہذیب کے مسلم کلچر نہ دے سکنے کے باعث عملی زندگی میں بہت سے تضادات نے جنم لیا۔ زبان اور کلچر ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہیں جو قومی اقدار کی میزان ہیں۔ وہ پہیے جن کے باعث قوم منزل مراد کا سفر جاری رکھ سکتی ہے۔ قومی زبان اگر ماں ہے تو قومی کلچر میں باپ کا روپ نظر آتا ہے۔ بگڑے بچے جیسی قوم کے لیے کلچر نشان راہ بن جاتا ہے۔ [59]

کلچر جسے مختلف طبقات میں فاصلوں کو پاٹنے کا کردار ادا کرنا چاہیے خلیج پیدا کرنے کا سبب بھی بن رہا ہے۔ اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے سلیم اختر رقمطراز ہیں:

> "۔۔۔اس سلسلے میں عجیب لطیفہ یہ ہے کہ گاؤں کی نیم متمدن زندگی کی ترجمان اشیا نو دولتیہ گھرانوں میں اب کلچر کی علامت ہیں۔ چنانچہ ڈرائنگ روم میں چنگیروں سے سجاوٹ اور مٹی کے برتنوں سے مینٹل پیس وغیرہ کی تزئین اس رجحان کے غماز ہیں۔ ادھر کسان کی بیوی چنگیروں سے جان چھڑا کر خوب صورت اور چمکیلی پلیٹوں کے خواب دیکھتی ہے۔ یوں دیکھیں تو ایک طرح کا دائرہ بن جاتا ہے۔ لیکن یہ دائرہ اس بنا پر مکمل نہیں ہو پاتا کہ معاشی بعد کے لحاظ سے دونوں طبقات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی لیے تو ان مختلف کلچرل پاکٹس میں ابلاغ ختم ہو

چکا ہے۔ یہ ایک ملک کے باشندے ہیں ایک دوسرے کی بولی سمجھ بھی لیتے ہیں لیکن ابلاغ سے محروم ہیں۔ ایک کلچر سے محرومی کا سب سے زیادہ نقصان یہ ہوا کہ کلچر آبادی کے مختلف طبقات میں خلیج بن چکا ہے۔ اسے ملانے والے پل کا کردار ادا کرنے میں ناکام رہا ہے۔"[٦٠]

کراچی یونیورسٹی میں فلسفے کی ماہر عارفہ فرید کے مطابق وہ عقائد، روایات، طور طریقے اور رویے قوم کا کلچر کہلاتے ہیں جو اس قوم کے کردار کی عکاسی کریں خواہ یہ عقائد و رویے مذہبی ہوں، معاشرتی، ادبی یا اخلاقی۔ مذہب، فلسفہ، اقتصادی ڈھانچہ، زبان اور فنون لطیفہ کلچر کے ایسے اجزا ہیں جو اس کے ترجمان بھی ہیں اور تعمیر و تخلیق میں شراکت دار بھی۔[٦١] ہر روایت کی طرح کلچرل روایتوں کا تعمیری پہلو بھی ہوتا ہے اور تخریبی بھی۔ حالات کے بدلاؤ سے ان میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ ان میں شکست و ریخت کا عمل جاری رہتا ہے۔ کسی کلچر میں معاشرتی آداب کی حیثیت لباس کی سی ہے۔ جیسے لباس کسی فرد کی ذہنی کیفیت کا ترجمان ہوتا ہے اسی طرح معاشرتی آداب کلچر کے ترجمان ہوتے ہیں۔ یہ کسی قوم کے کردار کی ایک جھلک ہیں۔ کلچر کو اگر انسانی جسم تصور کیا جائے تو معاشرتی ادارے اس کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جبکہ زبان، آداب معاشرت، فنون لطیفہ، مذہب اور دیگر ارکان معاشرت کی حیثیت دل، دماغ، گوشت پوست اور دیگر اعضا کی طرح ہے۔ معاشرتی اقدار اس لیے اہم ہیں کیونکہ یہ کسی کلچر کو سمجھنے میں بہت معاون ہوتی ہیں۔ اس کی شناخت کا باعث بنتی ہیں۔[٦٢] کسی قوم کے نصب العین، یقین و عزم، اتحاد و تنظیم اور امن کی روایات مجموعی طور پر اس کا اجتماعی شعور یا اجتماعی ادارہ کہلائی جاسکتی ہیں۔[٦٣]

مذہب اور کلچر کے تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے عارفہ فرید کا کہنا ہے کہ مذہب اور مذہبی کلچر الگ چیزیں ہیں۔ دو قوموں کا مذہب یکساں ہونے کے باوجود ان کا کلچر مختلف ہو سکتا ہے۔ تمام بڑے مذاہب کے عقائد اور ارکان صرف ان قوموں تک محدود نہیں رہتے جن سے اسکی ابتدا ہوئی بلکہ دوسری قومیں بھی ان سے اثر قبول کرتی ہیں۔ لیکن کسی مذہب کو قبول کر لینے کے بعد ہر قوم اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے اور اپنے معاشرتی و اقتصادی حالات، ثقافتی روایات اور مزاج کے مطابق اس کی تعمیر کرتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ مذہبی روایات بھی شکست و ریخت کے عمل سے گزرتی ہیں۔ ایک مذہب مشترک عقائد و ارکان کے باوجود مختلف النوع روایتیں دے سکتا ہے۔ جیسے مشترکہ اسلامی ورثے کے ساتھ بھی مختلف اسلامی ممالک میں بعض مذہبی روایتیں بعض خطوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔[٦٤]

لباس، معاشرتی آداب، فنون لطیفہ، مذہب اور دیگر طور طریقے کلچر کے اظہار کا ذریعہ ہیں مگر ان سے بڑھ کر زبان کلچر کے اظہار کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ یہ قوموں کے رویوں امنگوں، آرزوؤں، خوابوں کی ترجمان ہوتی ہے۔ ترقی یافتہ زبانوں میں یا نئے الفاظ شامل ہوتے رہتے ہیں یا پرانے الفاظ نئے معنی اختیار کرتے ہیں۔ کسی قوم کے مزاج کو سمجھنے میں زبان معاون ہوتی ہے۔ قومی زبان کلچر کی بعض روایات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ تہذیب ان روایات کے فروغ

کا نام ہے جو حیوانی بشر کو ناطقہ میں تبدیل کرے۔ کوئی بھی قوم علم و فکر، تہذیب اور مدنیت کی دہلیز پار کیے بغیر مہذب نہیں کہلا سکتی۔ کلچر اور تہذیب دراصل ایک ہی تصور کے دو مختلف پہلو ہیں جن میں سے پہلا محدود اور دوسرا زیادہ ہمہ گیر ہے۔ کلچر میں فروعات بھی شامل ہو سکتی ہیں مگر تہذیب کی عمارت گہرے مشاہدے اور عمیق روایات پر استوار ہوتی ہے۔ تعلیمی ادارے خصوصاً جامعات ایک طرف افراد کی تربیت کر کے کلچر کے فروغ اور اس کی تعمیر میں مدد و معاون ہوتے ہیں دوسری طرف جامعات خود کلچر کا آئینہ بھی بن جاتی ہیں۔ یہاں کلچر کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔[۶۵] کلچر کے مختلف مظاہر میں لوک ورثہ کی روایتیں، آداب معاشرت، شرف و رسوائی کے پیمانے، معاشرتی اقدار وغیرہ اہم ہیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی (1920ء-1998ء) کلچر میں زبان کی بنیادی اہمیت کے قائل ہیں:

> "اور اس زبان کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جو اس کو ملنی چاہیے تھی۔ پاکستانی کلچر کی شیرازہ بندی اس کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ جس قوم کے پاس زبان نہ ہو وہ کلچر کی شیرازہ بندی بھلا کس طرح کر سکتی ہے؟"[۶۶]

برصغیر میں پیدا ہونے والی فارسی اور اردو کے جن شعرا نے اسلامی کلچر کو فروغ دیا ان کے ہاں ان ثقافتی رویوں کی گہری چھاپ ہے۔ اس سلسلے میں امیر خسرو، ولی دکنی، میر درد، میر تقی میر، غالب اور مومن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی قائم کردہ تہذیبی و ثقافتی روایت ہمارے کلچر اور تہذیب کا بنیادی حصہ ہے۔ ان ثقافتی روایات کو ہمیں ساتھ لے کر چلنا ہو گا ورنہ تہذیب و کلچر کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا اور ہم زمین کی بجائے اپنے آپ کو خلا میں محسوس کریں گے۔ کلچر پر جغرافیائی حالات کے گہرے اثرات اور اس سلسلے میں زمین کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کی تشکیل میں تاریخ، عقائد، افکار و خیالات بھی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو زبان پاکستان کی ثقافتی شیرازہ بندی اور سیاسی استحکام کی بہت بڑی نشانی ہے۔ علاقائی زبانیں اور ثقافتیں قومی زبان اور قومی ثقافت کو سہارا دیتی ہیں۔ اس لیے ان کا فروغ بھی لازمی ہے۔ علاقائی زبانیں بھی اسی زبان کی مختلف رنگا رنگ صورتیں ہیں۔ علاقائی زبانوں کے تخلیقی ادب کی روایت اردو کی عظیم روایت سے ہم آہنگ ہو کر ثقافتی اعتبار سے یہاں نئی زندگی جنم دینے کا سبب بن سکتی ہے۔[67] عبادت بریلوی کلچر کے تمام مظاہر میں زبان کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ زبان کا معاشرت اور تہذیب سے گہرا تعلق ہے۔ زبان کی ترقی و انحطاط معاشرتی حالات کے تابع ہیں۔ اس لیے ماہر لسانیات تمدن و معاشرت کی تاریخ کو زبان کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں۔[۶۸]

عبادت بریلوی بھی اسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں جو پاکستان کے قیام کا اہم محرک مسلمانوں کی منفرد تہذیب کے تحفظ کو سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے برصغیر میں بسنے والی مسلم قوم دیگر افراد سے مختلف خصوصیات کی

حامل تھی۔ یہ منفرد خصوصیات ان میں دینی عقائد نے پیدا کیں۔ اس لیے یہاں کے مسلمانوں میں ایک خاص نظام اخلاق، خاص نظام افکار اور خاص جذباتی نظام قائم ہو گیا۔"۔۔۔پاکستان کی تحریک در حقیقت بنیادی طور پر ایک دینی، تہذیبی اور ثقافتی تحریک تھی۔ اس تحریک کو مجبوراً سیاست کا سہارا لینا پڑا۔"[۶۹]

برصغیر کے تمام مسلمانوں میں تہذیبی مماثلت کے حوالے سے ڈاکٹر عبادت بریلوی کا موقف یہ ہے:

"کشمیر سے راس کماری تک اور پشاور سے ڈھاکہ تک بنیادی طور پر مسلمانوں کا ایک کلچر تھا۔ اس کلچر کی بنیاد اسلام اور اس کے بنیادی اصول تھے۔ وہ دینی عقائد تھے جن کی شمعیں اسلام اور خصوصیت کے ساتھ اسلامی تصوف نے افراد کے دلوں میں فروزاں کی تھیں۔ اسی صورتحال نے ہر علاقے کے مسلمانوں کو ایک رشتے میں منسلک کیا اور ان کے لباس، رہن سہن کے طور طریقے، فکری رویے، جذباتی تقاضے، اخلاقی معیار، سب میں ایک یگانگت اور مماثلت پیدا کی۔ اردو زبان اس کلچر کی سب سے بڑی مظہر تھی۔"[۷۰]

فلسفے کے ماہر اور سماجی دانشور علی عباس جلالپوری (1914ء-1998ء) علم الانسان کے طلبہ کے نظریے کہ وہ ہر کام جو بنی نوع انسان نے بحیثیت انسان سر انجام دیا تہذیب یا کلچر کے ضمن میں آتا ہے اور ابن خلدون اور سپنگلر کے تمدن کو شہری زندگی تک محدود کرنے سے متفق نہیں ہیں۔ وہ ان اہل علم کی طرح تہذیب اور تمدن کی تفریق کے قائل بھی نہیں جن کا کہنا ہے کہ تمدن انسان کی خارجی ترقی کا نام ہے جبکہ تہذیب سے انسان کا داخلی یا ذہنی ارتقا مراد لیتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا کہنا ہے:

"جس طرح علم ذہن اور مادے کے باہمی عمل ورد عمل کی مربوط و با معنی صورت ہے اسی طرح تمدن بھی انسان کے خارجی ماحول اور اس کے ذہن کے باہمی عمل ورد عمل ہی کی ایک تخلیقی شکل ہے۔"[71]

علی عباس جلالپوری تمدن کی ترکیب کو وسیع تر مفہوم میں استعمال کرتے ہیں اور تہذیب کو بھی تمدن میں شامل متصور کرتے ہیں۔ ان کے مطابق انسانی متمدن زندگی کا آغاز ہوئے دس ہزار سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ جب زرعی انقلاب کے ساتھ انسان نے فصلیں اگانے کا راز دریافت کیا تو وہ شکار کی تلاش میں مارے مارے پھرنے کی بجائے دریاؤں کے کنارے کھیتی باڑی کر کے بستیاں بسا کر رہنے لگا۔ خوراک فراہم کرنے کی بجائے پیدا کرنے لگا تو اس مرحلے پر وہ وحشت و بربریت کے دور سے نکل کر تمدن کے دور میں داخل ہوا۔ قدیم تمدن کا مطالعہ کیے بغیر ہم جدید تمدن کو سمجھ نہیں سکتے۔ اس میں بنی نوع انسان کی فکری و ذوقی یکجہتی کا ثبوت پنہاں ہے۔ یہاں یکساں نوعیت کے مسائل کو سلجھانے کے لیے اقوام عالم کا مختلف وسائل بروئے کار لانا ثابت ہوتا ہے۔ عالمی تمدن کی تشکیل میں تمام اقوام کا حصہ لینے اور ایک دوسرے سے استفادے کا راز کھلا نظر آتا ہے۔ جدید دور کے مسائل کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ان کی جڑوں کا کھوج قدیم زمانوں میں لگانا ضروری ہے ورنہ یہ مغالطوں کا سبب بن سکتا ہے۔[۷۲]

علی عباس جلالپوری نے قدیم تہذیبوں عراق، مصر، کنعان، بنی اسرائیل، یونان، ایران، ہند اور چین کے تمدن کی تمام جزئیات مثلاً اس کا زمانہ، جغرافیائی حقائق، رسم و رواج، طرز زندگی، طرز فکر، فن تعمیر، مذہبی عقائد، دیومالا، ایجادات، علوم و فنون، تہوار اور ہنر وغیرہ کا احاطہ کیا۔ انھوں نے مختلف قدیم تہذیبوں کے درمیان مماثلتیں تلاش کی ہیں۔ جیسے بنی اسرائیل کے بچھڑے کی پوجا کی روایت مصریوں کی اے پس پوجا سے لی گئی۔ کنعان میں زرخیزی کا مت قدیم سمیریا بابل اور مصر سے لیا گیا۔ بنی اسرائیل کے اسیری بابل کے دوران ان کے مذہب پر مجوسی اثرات پڑے۔ بابلی مذہب کو صائب یا ستارہ پرستی بھی کہا جاتا تھا۔ جادو اور توہم پرستی کا آغاز وہیں سے ہوا۔ تمدن مصر کے ابتدائی دور میں جادو اور طب کا گہرا تعلق تھا۔ جنت عدن کی بابلی روایت مختلف صورتوں میں مصر، ایران، ہند اور یونان کی دیومالا میں موجود ہے۔ علی عباس جلال پوری نے سنگ تراشی، کلیسائے روم، گندھارا آرٹ، گپتا آرٹ، بدھ مت اور مصوری کی مثالیں دے کر واضح کیا ہے کہ فن و ادب کی اپنی مستقل روایات ہیں جن کا سلسلہ ماضی بعید کے لوک گیتوں، علم الاصنام اور اساطیر سے ملتا ہے۔ انھیں کسی مخصوص مذہب کے روحانی فیض سے وابستہ کرنا درست نہیں۔ فن و ادب قدیم ہیں۔ اہل مذہب نے اپنی عبادتوں کی رسوم میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ ادبیات اور فنون لطیفہ سے استفادہ کیا۔[73] جیسے ہندومت میں بھجن اور رقص وغیرہ۔

قدیم تمدن سے جدید تمدن کی طرف آنے میں پچھلی بنیاد پر ہی نئی اینٹیں لگتی ہیں۔ نئے تمدن کی عمارت قدیم پر ہی استوار ہوتی ہے۔ تمام عالم کے مذاہب کی بنیاد روح کے مفہوم کی تبدیلی کے تصور پر قائم ہے۔ جادو، دیومالا اور مذہب پر روحوں کے مت کے گہرے اثرات ثبت ہوئے۔ شیطان کا تصور مجوسیت سے اخذ شدہ ہے۔ نیک روحوں کو اپنی مدد کے لیے طلب کرنا اور روحوں کی وساطت سے دشمنوں کو نقصان پہنچانے کے جتن کرنا جادو کی صورت ہے۔ جب جادو کی غلطیوں کا ازالہ کیا گیا تو سائنس معرض وجود میں آئی۔ جادو سے ہی طب، ہیئت، کیمیا اور عملی سائنس نکلی۔[74] قدیم دیومالا پر بھی روحوں کے مت کی گہری چھاپ ہے۔ دیومالا انسان کی ان کوششوں کی سرگزشت قرار دی جا سکتی ہے جو اس نے کائنات سے تعلق پیدا کرنے کے لیے قدیم عہد میں کی تھیں۔ لوک کہانیوں کی وضاحت کرتے ہوئے علی عباس جلال پوری کہتے ہیں:

> "لوک بات ہر قسم کی روایات پر مشتمل ہے جن سے پرانے زمانوں کی رسوم و رواج کا کھوج ملتا ہے۔ لوک کہانیاں قدیم داستانوں کی باقیات ہیں۔ جن میں بعض اوقات دیومالائی قصے بھی شامل ہو گئے ہیں۔"[75]

اقوام عالم میں بہ لحاظ نوعیت ایک ہی طرح کے قصوں کی موجودگی اس حقیقت کو ثابت کرتی ہے کہ تہذیب و تمدن کی ابتدا سے ہی بنی نوع انسان کے افکار اور محسوسات کے انداز یکساں رہے ہیں۔ مختلف تہذیبوں کے دیوی دیوتاؤں کے ناموں میں بھی حیرت انگیز مماثلت ملتی ہے۔ صائبیت کے تہذیبی، مذہبی، تمدنی اور دیومالائی اثرات

دوسری سامی النسل اقوام، ماقبل عرب کے بنی اسرائیل، کنعانیوں کی دیومالا اور مذاہب میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ جے جی فریزر نے حضرت عیسیٰؑ کی موت اور احیا کی روایت اور لوٹس کے دیومالائی قصے میں مماثلت کا کھوج لگایا ہے۔[76] اقوام عالم کی دیومالا میں مزید مماثلتوں کی طرف علی عباس جلال پوری اس طرح اشارہ کرتے ہیں:

"۔۔۔اقوام عالم کی دیومالا میں تکوین و تخلیق، جنت دوزخ، بقائے روح، زمین دوز عالم کی سیر، لنگ پوجا، دھرتی دیوی، سورج کی پوجا، بار آوری کے تصورات، پتھروں اور چٹانوں کی پوجا، آگ کی تقدیس، خیر اور شر کی دوئی، یزداں و شیطان کی کشمکش، سیلاب کی کہانی، سزا و جزا کے دیوتاؤں اور سیاروں وغیرہ کے ملتے جلتے قصے ہیں۔ جن کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی طرح قدیم زمانے کے انسان نے مظاہر فطرت کو اپنے ہی جیسا ذی شعور و ذی حیات سمجھا اور ان سے ذہنی و قلبی ربط ضبط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ تاکہ وہ اس وسیع کائنات میں اپنے اجنبی ہونے کے تلخ احساس سے نجات پاسکے۔ اس طرح گویا دیومالا روحوں کے مت ہی کی ارتقائی صورت تھی۔"[77]

مخصوص تمدن میں مخصوص اقدار فروغ پاتی ہیں۔ جیسے زرعی تمدن میں ہر کہیں گائے کی پوجا نظر آتی ہے۔ کیوں کہ وہ دودھ دیتی ہے اور اس کے بچھڑے ہل کھینچتے ہیں۔ اسی طرح صنعتی انقلاب کے بعد اجتماعیت کا فروغ اور اجتماعی بہبود انفرادی بہبود کا معیار بنتی نظر آتی ہے۔[78] علی عباس جلال پوری فریڈرک اینگلز سے متفق ہوتے ہوئے محنت کو تمدنی ترقی کی بنیاد قرار دیتے ہیں کہ کام اور محنت نے اسے حیوان سے انسان بنادیا۔ محنت معاشرتی ترقی کا ایک فیصلہ کن عامل بن گئی۔ تاریخ عالم میں ابتدا سے معاشرے کی بنیادی تبدیلیاں محنت وپیداوار سے منسلک رہی ہیں۔[79]

اسلامی تہذیب کے بڑے حامی ڈاکٹر غلام جیلانی برق (1901ء-1985ء) اس مکتبہ فکر کے مخالف ہیں جو پاکستانی تہذیب کا نقطہ آغاز گندھارا اور موئنجوڈارو کی تہذیب کو تصور کرتے ہیں اور ان لوگوں پہ اعتراض کرتے ہیں کہ کچھ لوگ گندھارا اور موئنجوڈارو کی تہذیب پہ نازاں ہیں وہ یہ نہیں سوچتے کہ ان فناشدہ تہذیبوں کے پاس بت پرستی، ابتدائی سنگ تراشی، بھدی سی نقاشی، بدہیئت اوزاروں اور برتنوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔[۸۰]

ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے نزدیک تہذیب، ثقافت، تمدن اور کلچر الگ الگ چیزیں ہیں۔ ان کا زاویہ نظر ان کے متعلق یوں ہے:

"۔۔۔لیکن میرے نقطہ نگاہ سے کلچر صرف ذہنی جلا، دانش اور اس نقطہ نگاہ کا نام ہے جو علم، مطالعہ اور ایمان سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا عملی اظہار تہذیب ہے۔ کلچر صرف ذہن کا عمل ہے اور تہذیب ذہنی تصورات اور خارجی اعمال ہر دو کا مجموعہ۔ ثقافت، تمدن اور کلچر خاص ہیں۔ ثقافت کا تعلق علوم وفنون سے ہے۔ تمدن کا عمارات و باغات سے۔ کلچر کا دانش، ذہنی تصورات اور ایمانیات سے اور تہذیب ایک عام چیز ہے ان تینوں پر حاوی۔"[۸۱]

اگر کوئی قوم اپنی اساسی اقدار کو چھوڑ دے تو اس کی تہذیب مٹ جاتی ہے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق اسلام میں اقدار کا سرچشمہ اول قرآن کو قرار دیتے ہیں اور تہذیب کو مذہب کی بیٹی کہتے ہیں۔ سیاسیات، اخلاقیات، عبادات، معاشیات اور روحانیات اسلامی تہذیب کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب کی ہیئت میں تبدیلی آئی۔ پہلے یہ صرف عربوں کی شاعری، قبائلی روایات اور آثار پر مشتمل تھی۔ بتدریج اس میں ایرانی، عراقی، مصری اور شامی تہذیبوں کے اجزا شامل ہوتے گئے۔ اور ہر ملک میں اسلامی تہذیب کا رنگ بدل گیا۔ علاقائی روایات کے باعث صورت تبدیل ہوگئی مگر بنیادی تصورات وہی رہے۔ جیسے اسلامی تہذیب نے عباسی دور کے بغداد میں علم و حکمت کی صورت اپنائی۔ ایران میں پہنچ کر نقاشی، مصوری اور شاعری میں ڈھلی۔ ہندوستان میں حسین عمارات کا قالب اختیار کیا۔ اور ہسپانیہ میں عظیم درسگاہوں اور لائبریریوں میں بدلی۔ اسی طرح قدیم تہذیبوں میں مصر کی تعمیراتی تھی، یونان کی عقلی، چین کی مصورانہ اور ہند کی صنمیاتی رہی۔ اسلام نے ہر علاقے میں پہنچنے کے بعد ان سے کچھ نہ کچھ لیا۔ زوال کے بعد اب بھی اسلامی تہذیب کے اثرات ہر ملک کے علوم و فنون، تعمیرات، لباس، مصوری اور رہن سہن میں نظر آتے ہیں۔ [۸۲]

ڈاکٹر برق کے مطابق تہذیب کے مختلف مدارج ہیں۔ جیسے کپڑے سینا، برتن بنانا ایک طرح کی تہذیب ہے۔ لیکن کپڑوں پر کشیدہ کاری اور برتنوں پر نقش و نگار بنانا تہذیب کی بلند تر ذیل میں آتا ہے۔ عمارات پہ کتبہ نگاری اس سے عظیم ہے۔ شاعری، تصنیف و تالیف، تحقیق و تلاش اور انکشاف و ایجاد و تہذیب کی اعلیٰ ترین منازل ہیں۔ تاریخ کی قوت تہذیب کو باقی رکھتی ہے۔ کسی تہذیب کے بننے کی صورت میں تاریخ کے بل بوتے پر اس کا احیا ممکن ہے۔ تہذیبی تسلسل کے لیے تاریخ، اقدار و روایات و تصور اور ہیروز کا ایک ہونا ضروری ہے۔ کسی قوم کی زبان، اس کی تاریخ، روایات اور تہذیب کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ [83]

ڈاکٹر غلام جیلانی برق علم ایمان اور تقویٰ کو اسلامی تہذیب کے اہم عناصر شمار کرتے ہیں۔ وہ آرٹ سے مراد فنون لطیفہ لیتے ہیں جیسے مصوری، نقاشی، خطاطی، تعمیرات، موسیقی وغیرہ۔ ہر قوم کا آرٹ اس کے اعتقادات، تصورات، مذاق، کردار، رسم و رواج اور تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔ آرٹ کے نمونے اپنے عہد کی تہذیب کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اسلامی تصاویر کا امتیازی پہلو ان کا غیر جذباتی ہونا ہے۔ [84] اسلامی فن تعمیر کی وضاحت کرتے ہوئے ان کا کہنا ہے کہ اس کی ابتدا گارے کا چھپر یعنی مسجد نبوی تھی جبکہ انتہا آگرہ کا تاج محل۔ عربوں کا کوئی فن تعمیر نہیں تھا۔ وہ جس ملک میں پہنچے وہاں کے معماروں سے کام لینے لگے۔ اس طرح مختلف ممالک کی خصوصیات اسلامی فن تعمیر کی تشکیل میں معاون ہوئیں۔ خطاطی خالصتاً مسلمانوں کی چیز ہے۔ اس کی خوش نمائی و حسن میں کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اسے روحانی جیومیٹری بھی کہا جاتا ہے۔ [85]

معروف ترقی پسند شاعر اور دانشور فیض احمد فیض (1911ء تا 1984ء) ایسے متعدد سرکاری اداروں سے وابستہ رہے جن کا مقصد ملک کی ثقافتی پالیسی کا تعین اور اس کے فروغ کی راہیں تلاش کرتا تھا۔ فیض نے کلچر کے موضوع پر بہت جگہوں پر تحریری و زبانی اظہار کیا۔ ان کے مطابق ثقافت ایسی ہمہ گیر اصطلاح ہے جو ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ اس کے جوہر سے ہمارا تشخص جنم لیتا ہے۔ مذہب، تاریخ اور جغرافیہ اسے نشو نما بخشتے ہیں۔ فکر اور تہذیبی افکار اس کا تشخص عمل ابھارتے ہیں۔ ثقافت کا تجزیہ کرتے ہوئے فیض زندگی کو کلچر کہتے ہیں۔ اس میں سبھی کچھ شامل ہوتا ہے۔ اس کی اثر اندازی ذہنی و عقلی عقائد و اقدار کے ذریعے، عملی طور سے اور زندگی کے آداب ورسوم سے بھی ہوتی ہے۔ ادب، موسیقی، فنون، مصوری اس کے منجھے ہوئے اور ترشے ہوئے اجزا شمار ہوتے ہیں۔[86] ہر تہذیب کے تین پہلو ہوتے ہیں اقدار، رہن سہن کے طریقے اور فنون۔ اس کی خصوصیات میں تاریخ، جغرافیہ، انداز معاشرت اضافی ہیں۔ قوم اور تہذیب لازم وملزوم ہیں۔

فیض معاشرے کے زندگی بسر کرنے کے مجموعی طریقے سے کلچر مراد لیتے ہیں۔ ظاہری اور باطنی صورت اس کی دو شکلیں ہیں۔ باطنی طور پر معاشرے میں رائج باطنی قدروں کا نظام اس کا باطنی پہلو ہے جیسے عقائد۔ باطنی حصے میں وہ تمام مادی، اخلاقی اور جمالیاتی قدریں، عقیدے، امنگیں، تجربے، خواب، آدرش شامل ہیں۔ جنھیں قوم کا با اختیار طبقہ تسلیم کرتا ہے۔ ظاہری پہلو میں ان جذبات و عقائد کا اظہار شامل ہے۔ ظاہری نظام کی غیر شعوری یا ناتراشیدہ صورت رسم ورواج، ملنے جلنے کے طریقے، لباس، زبان وغیرہ یعنی زندگی کا روزمرہ ہے۔ جبکہ اس کی تراشیدہ اور شعوری صورت فنون ہیں جیسے مصوری، شاعری، ظروف سازی، فن تعمیر۔ "کلچر کی تجریدی صورت معاشرے کا رہن سہن، ان کے قاعدے، ان کے رسوم، ان کے فنون اور ان کی ذہنی اچھائی اور بڑائی کے معیار ہیں۔"[87]

فیض تاریخ کو کلچر یا تہذیب کا طول، جغرافیائی حدود کو عرض اور معاشرے میں اس کی رسائی کو گہرائی کہتے ہیں۔ تاریخ، جغرافیہ اور معاشرتی نفوذ مل کر کلچر تشکیل دیتے ہیں۔ یعنی کلچر کی ابتدا تاریخ، جغرافیائی حد اور اس کی مقبولیت، نفوذ یا رسائی اہم ہیں۔ کلچر اور دین کے رشتے کے تعین پر فیض زور دیتے ہیں:

> "ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے کلچر کی بنیاد ہمارا دین ہے۔ دین باطنی چیز ہے۔ دین کی وجہ سے زندگی کی بہت قدریں متعین ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کلچر کے بہت سے اجزا ایسے ہیں جن کو مذہب یا دین متعین نہیں کرتا۔ خاص طور پر مذہب اسلام متعین نہیں کرتا۔"[88]

ہندومت یا صیہونی مذہب کسی نسل یا جغرافیہ سے منسلک ہیں۔ لیکن عیسائیت اور اسلام عالمگیر مذاہب ہیں۔ انھیں کسی نسل یا خطے کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ مختلف اسلامی ممالک کی تہذیبوں کے جن حصوں کا تعلق قومیت سے ہے ان سے مذہب یا دین کا کوئی تعلق نہیں۔ کلچر کی نوعیت یا ماہیت متعین کرنے کے لیے قومیت کی طرف

لوٹنا ہو گا۔ اسلام نے ہر جگہ پہنچنے کے بعد اپنی تہذیب کا اظہار وہاں کے قومی سانچے میں ڈھل کر کیا۔ تہذیب جغرافیائی حدود کے اندر مقید نہیں رہتی بلکہ اس حد سے اندر باہر بھی پہنچتی ہے۔ اگر سیاسی واقتصادی نظام کو بنیاد مانا جائے تو اس پر کھڑی ہونے والی معاشرتی عمارت کلچر ہے۔[89]

فیض کے بقول پاکستانی تہذیب میں تین طرح کی روایات شامل ہیں۔ مقامی وعلاقائی، کلاسیکی یا درباری اور جدید مغربی تہذیبی اثرات۔ قومی تہذیب کی تشکیل کے لیے مذہبی معتقدات کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن قوم، تہذیب اور دین الگ الگ حیثیتیں ہیں۔ قومی تہذیب قومی زندگی کا جوہر اور اس کے اظہار کا اہم ذریعہ ہے۔ اس اظہار قومیت کی دو صورتیں ہیں۔ اول سماجی صورت، اس میں رہن سہن، برتن، آلات غرض معاشرتی زندگی کے سب کاروبار شامل ہیں۔ دوم فنی یا جمالیاتی صورت میں ہر نوع کی ہنر مندی شامل ہے۔ قومی تہذیب بننے کے لیے طویل تاریخی عمل درکار ہوتا ہے۔ پاکستان کو موجودہ مختلف تہذیبی روایتیں ورثے میں ملیں۔ انھیں کلی طور پر قومی تہذیب نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ عوامی یا علاقائی تہذیب ہماری قومی و جغرافیائی حدود سے کمتر ہے جبکہ شہنشاہی یا درباری کلاسیکی تہذیب ہماری حدود سے متجاوز ہے۔[۹۰]

داخلی طور پر اقدار کا نام اور ظاہری طور پر طریق زندگی کا نام کلچر ہے۔ قومی ثقافت کے بطن میں مختلف طبقاتی ثقافتیں ضرور موجود ہوتی ہیں۔ کلچر کی اور ریاست یا سیاست کی حدود ایک نہیں ہوتیں۔ تاریخی اعتبار سے ہماری سرزمین میں موجود ہر چیز قومی ثقافت میں شامل ہے۔ اپنی ثقافت کو معتبر جان کر بیرونی ثقافتی یلغار اور ثقافتی جارحیت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ تہذیب کلچر کی ظاہری صورت ہے۔ یعنی طرز زندگی کا نام کلچر ہے۔ اس کی متشکل صورتیں تہذیب ہیں۔ کلچر پورا طریق زندگی ہے جبکہ فن اس کا ایک مظہر ہے۔ تہذیب محبت کی علامت ہے اور آشتی وامن کی گود میں فروغ پاتی ہے۔[۹۱] قومی کلچر سے مراد کسی ایک چھوٹے طبقے یا گھرانے کی پسند ناپسند نہیں بلکہ سارے معاشرے کا اجتماعی ظاہر و باطن مراد ہے۔ کلچر کے ظاہری و عملی پہلو مصوری اور عارضی مظاہر کو دوام بخشنا زیادہ تر ادب کی ذمہ داری ہے۔

اسلامی تہذیب کے بڑے داعی مولانا مودودی (1903ء-1979ء) اسلامی تہذیب کی تشکیل میں غیر اسلامی عناصر کی موجودگی کی نفی کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اسلامی تہذیب کی عمارت کا نقشہ اور مخصوص طرز تعمیر اس کا اپنا ہے۔ یہی اصل واساس ہے۔ جبکہ اس کا رنگ وروغن، زینت و آرائش اور نقش و نگار مسلمانوں نے دوسروں سے لے کر اضافہ کر دیے۔ لیکن دیکھنے والے اصل اساس کو دیکھنے کی بجائے صرف اضافی چیزوں کو نمایاں دیکھ کر پوری عمارت پر نقل کا حکم لگا دیتے ہیں جو غلط ہے۔[۹۲] مولانا مودودی لوگوں کے ذہنوں میں عام طور پر موجود تہذیب کے تصور کو غلط سمجھتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا موقف ہے:

"۔۔۔لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کی تہذیب نام ہے اس کے علوم و آداب، فنون لطیفہ، صنائع و بدائع، اطوار معاشرت، انداز تمدن اور طرز سیاست کا۔ مگر حقیقت میں یہ نفس تہذیب نہیں ہیں، تہذیب کے نتائج و مظاہر ہیں۔ تہذیب کی اصل نہیں ہیں۔ شجر تہذیب کے برگ و بار ہیں۔ کسی تہذیب کی قدر و قیمت ان ظاہری صورتوں اور نمائشی ملبوسات کی بنیاد پر متعین نہیں کی جاسکتی ان سب کو چھوڑ کر ہمیں اس کی روح تک پہنچنا چاہیے۔ اور اس کے اساس اصول کا تجسس کرنا چاہیے۔" [۹۳]

مولانا مودودی کی رائے میں تہذیب کی تکوین پانچ عناصر سے ہوتی ہے۔ دنیوی زندگی کا تصور، زندگی کا نصب العین، اساسی عقائد و افکار، تربیت افراد اور نظام اجتماعی۔ ہر تہذیب انھی پانچ عناصر سے بنی ہے۔ اول: تصور حیات سے مراد ہے دنیا میں انسان کی کیا حیثیت ہے، اس کا دنیا سے کیا تعلق ہے؟ وہ دنیا کو کیا سمجھ کر برتے؟ انسانی زندگی کے تمام اعمال پر اس کا نہایت گہرا اثر ہوتا ہے اور اس تصور کے بدل جانے سے تہذیب کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ دوم: نصب العین سے مراد ہے کہ انسان ساری جدوجہد کس لیے کرتا ہے۔ آدمی کو کیا مطلوب ہے جس کی طرف اسے دوڑنا چاہیے؟ ابن آدم کو کس مطمع نظر تک پہنچنے کی سعی کرنی چاہیے؟ یہی مطلوب و مقصود کا سوال انسان کی عملی زندگی کے رخ اور رفتار کا تعین کرتا ہے۔ اور عمل کے طریقے اور کامیابی کے وسائل اسی کے مطابق اختیار کیے جاتے ہیں۔ سوم: اساسی عقائد و افکار سے مراد ہے کہ زیر بحث تہذیب میں انسانی سیرت کی تعمیر کن بنیادی عقائد و افکار پر کی گئی؟ یہ انسانی ذہنیت کو کس سانچے میں ڈھالتی ہے؟ انسان کے قوائے عمل اس کے قوائے فکر کے تابع ہیں؟ اس کے دل و دماغ پر جو تخیل پوری قوت کے ساتھ مسلط ہو گا عملی قوتیں، احساسات، جذبات اور داعیات اسی کے مطابق پیدا ہوں گے۔ دنیا کی کوئی تہذیب اساسی عقیدہ اور بنیادی متخیلہ کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے تہذیب کی قدر و قیمت جانچنے کے لیے اس کے عقیدہ اور متخیلہ کو سمجھنا اور اس کے حسن و قبح کو جانچنا ضروری ہے۔ چہارم: اخلاقی تربیت سے مراد ہے وہ تہذیب انسان کو کیسا انسان بناتی ہے۔ کس اخلاقی تربیت کے تحت وہ انسان کو اپنے نظریہ کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے تیار کرتی ہے۔ انسان میں کن خصائل و اطوار کی نشو نما کی کوشش کرتی ہے۔ تہذیب کا اصل مقصد نظام اجتماعی کی تعمیر ہے۔ مگر افراد ہی وہ مسالہ ہیں جن سے جماعت کا قصر بنتا ہے۔ پنجم: نظام اجتماعی سے مراد ہے تہذیب میں انسان اور انسان کا تعلق مختلف حیثیتوں میں کس طرح قائم کیا گیا؟ دیگر متعلقہ انسانوں سے اس کے تعلقات کس قسم کے ہیں؟ وہ کن حقوق و فرائض کا پابند ہے؟ کتنا آزاد اور کتنا مقید ہے؟ اخلاق، معاشرت، قانون، سیاست اور بین الاقوامی تعلقات کے تمام مسائل اسی ذیل میں آتے ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ خاندان، سوسائٹی اور حکومت کی تنظیم زیر بحث تہذیب کس طرح کرتی ہے۔ [94]

مختلف تہذیبوں کی عمارتیں دنیوی زندگی کے مختلف مذاہب اور رائے کے مخصوص تصورات پر استوار ہوئیں۔ اسی کی بدولت ان کی ہیئت مختلف ہے۔ اسلامی تہذیب میں اسلامی تصور حیات فطرت کے مطابق ہے۔ جس میں

نہ ترک دنیا کی تعلیم دی گئی ہے نہ دنیا کی لذتوں میں گم ہونے کی۔ انسان روئے زمین پر اللہ کا نائب ہے دنیا کی تمام طاقتیں اس کے لیے مسخر کی گئی ہیں۔ وہ سب کا حاکم اور ایک کا محکوم ہے۔ اسے دنیوی زندگی کی مختصر مدت میں ہر لحہ جوابدہی کا احساس رہتا ہے۔ اسلامی تہذیب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جب تک اس میں خالص اسلامیت رہی تب تک یہ خالص عملی تہذیب تھی۔ دوسری تہذیبوں کے اثرات در آنے سے اس کی عملیت باقی نہ رہی۔ مولانا مودودی کا اس حوالے سے مزید کہنا ہے:

"۔۔۔ دوسری تہذیبوں سے متاثر ہو کر مسلمانوں کی سیرت میں پوری اسلامی شان باقی نہیں رہی تو انھوں نے وہ سب کچھ کیا جو دنیوی زندگی کے اسلامی تصور کے خلاف تھا۔ عیش و عشرت میں منہمک ہوئے، عالی شان قصر تعمیر کیے، موسیقی، مصوری، سنگ تراشی اور دوسرے فنون لطیفہ میں دلچسپی لی۔ معاشرت اور طرز بودوماند میں اسراف اور اس شان و شکوہ کو اختیار کیا جو اسلامی ذوق کے بالکل خلاف تھی۔ حکومت و سیاست اور دوسرے دنیوی معاملات میں وہ طریقے اختیار کیے جو بالکل غیر اسلامی تھے مگر اس کے باوجود دنیوی زندگی کا اسلامی تصور، جو ان کے دل میں اترا ہوا تھا، کہیں نہ کہیں اپنا اثر نمایاں کر کے رہتا تھا اور یہی اثر ان کے اندر دوسروں کے مقابلے میں ایک امتیازی شان پیدا کر دیتا تھا۔"[95]

تہذیب کے نصب العین کے متعلق مودودی صاحب کی رائے ہے کہ تہذیب کا نصب العین وہ ہو سکتا ہے جو شعوری یا غیر شعوری طور پر انسانوں کی بڑی جماعت کا مشترک اجتماعی نصب العین بن گیا ہو۔ امن، سلامتی، خوشی اور جمیعت خاطر کو ہر انسان کا فطری نصب العین کہا جا سکتا ہے۔ مذہبی روحانی تخیل پر جن تہذیبوں کی بنیاد نہیں ان کا نصب العین برتری، فتح ہے جبکہ جن کی بنیاد مذہبی و روحانی تخیل پر رکھی گئی ان کا نصب العین عموماً نجات قرار دیا گیا۔ اسلام نے تمام دنیوی اور اخروی اغراض کو چھوڑ کر اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے حصول کو نصب العین قرار دیا ہے۔[96]

کسی بھی تہذیب کا وجود اس کے عقیدہ و عمل کے نظام کی پابندی پر منحصر ہے جو اس نے وضع کیا۔ جب اس کے متبعین میں اس کی پابندی ہی نہ رہے اس نظام سے باہر کے تصورات اور طریقے ان کی ذہنی اور عملی زندگی پر قابض ہو جائیں تو تہذیب کا کوئی واقعی وجود باقی نہ رہے گا۔ ہر تہذیب اپنے متبعین سے اپنے وضع کردہ نظام کی پابندی کا مطالبہ اور دوسرے خارجی نظامات سے علیحدگی پر اصرار کرتی ہے۔ ایک تہذیب کے اعتقادی و عملی نظام کو دوسری تہذیب کے نظام سے بدلا نہیں جا سکتا۔ اسلامی نصب العین نے اسلامی تہذیب کو مخصوص تہذیب بنا دیا ہے جو بنیادی طور پر دیگر تہذیبوں سے مختلف ہے۔ اس کا اعتقادی عملی نظام دوسرے نظاموں سے بنیادی اختلافات رکھتا ہے۔ یہ انسان کی زندگی کے تمام اعمال کا رخ اسی مقصد کی طرف پھیر دیتی ہے کہ جس آقا کا وہ نائب ہے اس کی خوشنودی حاصل کر لے۔ عقائد و اعمال کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان اس نے کفر اور ایمان کا امتیاز قائم رکھا اسی طرح زندگی بسر کرنے کے طریقوں اور چیزوں کے درمیان حرام، حلال، جائز، ناجائز، مکروہ اور منتخب کا امتیاز قائم کیا ہے۔ اسی طرح تصورات و

افکار، اخلاق و خصائل، معیشیت و معاشرت، تمدن و عمران، سیاست و حکومت، غرض انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی تہذیب دوسری تہذیبوں سے الگ راہ پر گامزن ہوئی ہے۔[97]

دیگر تہذیبوں سے اسلامی تہذیب کے مختلف ہونے کی مثال مولانا مودودی فنون لطیفہ کے حوالے سے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"مثال کے طور پر فنون لطیفہ دنیا کی بہت سی تہذیبوں میں جان تہذیب ہیں اور ان فنون میں اعلیٰ مہارت رکھنے والوں کو قومی ہیرو کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر اسلام ان میں سے بعض کو حرام، بعض کو مکروہ اور بعض کو ایک حد تک جائز قرار دیتا ہے۔ اس کے قانون میں ذوق لطیف کی پرورش اور جمال مصنوعی سے لطف اندوزی کی اجازت صرف اس حد تک ہے جہاں انسان اس کے ساتھ ساتھ خدا کو یاد رکھ سکے، اس کی رضاجوئی کے لیے عمل کر سکے، اپنے منصب خلافت کے فرائض بجا لا سکے۔ مگر جس مقام پہ ذوق لطیف احساس فرض پہ غالب آجاتا ہو، جہاں لطف اندوزی کا انہماک انسان کو خدا پرست کے بجائے حسن پرست بنا دیتا ہو۔ جہاں فنون لطیفہ کی چاشنی سے انسان کو عیش پسندی کا چسکا لگ جاتا ہو۔۔۔ ٹھیک اسی سرحد پر اسلام عدم جواز، کراہت اور حرمت کے مواقع قائم کر دیتا ہے۔"[98]

یہی اختلافات معاشرت و تمدن کے اور معاملات میں ہیں۔ جیسے مردوں، عورتوں کے تعلقات، مالدار اور مفلس کے تعلقات، راعی اور رعیت کے روابط اور طبقات انسانی کا باہمی برتاؤ وغیرہ۔

اشتراک ایمانی کا رابطہ افراد کو ایک قوم بنا دے گا۔ جب ایک ہی مشترک تخیل ان کے دلوں میں ایمان بن کر جم جائے۔ ایک مشترک ایمان کے زیر اثر افراد کی مشترک قومی سیرت بن جائے تو ان کے اعمال میں ایک طرح کی یک رنگی جنم لیتی ہے اور مخصوص تہذیب جنم لیتی ہے۔ اس لیے ہر تہذیب کی تاسیس اور تشکیل میں ایمانیات کا اہم دخل ہے۔ اگر کسی قوم کی ایمانیات روحانی امور پر مشتمل ہوں تو اس کا مذہب اور تہذیب ایک ہو گی ورنہ الگ۔ دوسری صورت میں شخصی اور قومی زندگی پر مذہب کا اثر باقی نہیں رہتا اور تہذیب کا مذہب سے آزاد ہو جانا اخلاقی انحطاط کا سبب بنتا ہے۔[99] مولانا مودودی کے بقول اسلامی ایمانیات کی خاص بات یہ ہے کہ ان پر صرف اسلام کے روحانی نظام ہی کی نہیں بلکہ اخلاقی و سیاسی اور تمدنی نظام کی بنیاد بھی ہے۔ اس نے دین و دنیا دونوں کو ملا کر وضع کردہ نظام میں انسانی زندگی کے تمام شعبے حرکت کرتے ہیں۔ اسلام صحیح معنوں میں انسانی تہذیب کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے جس کا تعلق کسی خاص ملک، نسل، رنگ یا زبان کی حامل قوم سے نہ ہو۔ اور اس کے زیر انتظام ایسا اجتماعی نظام قائم ہو سکے جس میں انسانوں کے لیے خیر و صلاح کی حامل ہر چیز کی پرورش ہو اور باعث شر اور فساد چیز کو مٹایا جا سکے۔[۱۰۰]

مجموعی طور پر اسلامی تہذیب اور دیگر تہذیبوں کا موازنہ کرتے ہوئے مولانا مودودی کا کہنا ہے کہ ہر تہذیب میں تین چیزیں اساسی ہیں طریق فکر، اصول اخلاق اور قوانین مدنی۔ طریق فکر اہل حکمت کی تعلیمات سے ماخوذ ہوتے

ہیں۔ اصول اخلاق خاص قوموں پر اقتدار حاصل کرنے والے رہنماؤں، مصلحتوں، پیشواؤں سے لیے جاتے ہیں اور مدنی قوانین جنگی مہارت پیدا کرنے والے وضع کرتے ہیں۔ جبکہ ایمان بالرسل کی بنیاد پر قائم تہذیب میں تینوں عناصر ایک ہی مبتدا سے آتے ہیں۔ وہ شخص بیک وقت دنیائے فکر، عالم اخلاق اور جہان عمل تینوں کا صدر انجمن ہوتا ہے۔ اس میں تفکر، لطیف جذبات اور حکمت عملی کی معتدل آمیزش ہوتی ہے۔ جسے وہ تہذیب کے مرکب میں شامل کر دیتا ہے۔ اس لیے رسول اکرم ﷺ کی قائم کردہ تہذیب میں ہی عالمگیر، بشری اور دائمی تہذیب بننے کی صلاحیت ہے۔[۱۰۱]

سفر ناموں میں تہذیب و ثقافت کی اہمیت

سفر انسان کی سرشت میں ہے۔ یہ معمولات زندگی میں بہت اہم اور خود انسان جتنا ہی قدیم ہے۔ یہ اہم انسانی سرگرمی بہ اعتبار نوعیت مشغلہ، ضرورت اور فرض بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی تجارتی، مذہبی، زیارت کے لیے، تعلیمی، ہجرت، عارضی یا مستقل نقل مکانی کی صورت میں سفر۔ حرکت سفر کی بنیاد ہے۔ زندگی مسلسل حرکت میں رہنے کے باعث بذات خود سفر کا استعارہ ہے۔ حضرت آدمؑ کی جنت سے بے دخلی اور زمین پر آمد تاریخ میں پہلا سفر تھا اور نسل انسانی کے ارتقا کا نقش اول بھی۔ اس کے بعد سے انسان مسلسل سفر میں ہے۔ سفر نئی حیرت، جستجو کا ذریعہ اور ذات و صفات کے انکشاف کا وسیلہ ہے۔[۱۰۲] سفر انسانی تجربے کو وسعت دیتا ہے اور تہذیب و شائستگی حاصل کرنے اور خیالات و افکار میں اضافے کا بھی اہم ذریعہ ہے۔[۱۰۳] یہ روئے زمین کے مختلف خطوں کے بارے میں آگہی دیتا ہے اور مزید جاننے کی تشنگی بڑھاتا ہے۔ انسان فطری طور پر تنوع پسند ہونے کے باعث سفر کو پسند کرتا ہے کیونکہ نقل مکانی سے یکسانیت ختم ہوتی ہے۔ انسان کو سیر وفی الارض کا حکم ربانی نافذ کیا گیا تو تجربات حیات نے سفر کو وسیلہ ظفر قرار دیا۔[۱۰۴]

سفر میں مسافر کے پاؤں سب سے زیادہ کار آمد ہوتے ہیں۔ جانوروں نے بھی صدیوں انسان کی سفر میں معاونت کی ہے۔ پہیے کی ایجاد نے زمینی فاصلوں کو سمیٹ دیا۔ چونکہ ہر شخص کے مقدر میں سفر کرنا نہیں مگر کچھ لوگ کوائف سفر سن کر ہی اپنے ذوق سفر کی تسکین کا سامان کر لیتے ہیں۔ دوسرے سیاحوں کے تجربات و مشاہدات سے استفادہ کرنے، ذوق سفر کی تسکین کے عوامی دلچسپی کے پہلو اور انسانی فطرت کے مطالبات نے سیاحوں کو سفر نامے لکھنے پر اکسایا۔[۱۰۵] اس طرح سفر نامے کی صنف وجود میں آئی۔ سفری تجربات و مشاہدات کو قلمبند کرنے والے دوسرے مسافروں کی راہوں کو آسان کر دیتے ہیں۔ روزنامچے اور خطوط لکھ کر واقعات سفر کو محفوظ کرنے کا طریقہ ابتدا سے ہی رائج ہے۔ اچھے سفر نامہ نگار کے داخلی خواص میں اہم ترین سیاحت کا فطری رجحان ہے۔ کیونکہ سفر ہر شخص کے مقدر میں ہوتا ہے۔ سیاح کا سفر خود اختیاری اور مسافر کا جبری ہوتا ہے۔ مسافر خارجی پابندیوں کی جکڑبندیوں کا شکار جبکہ سیاح

داخلی طور پر آزاد ہوتا ہے۔ مسافر کے لیے سفر باعث زحمت ہو سکتا ہے مگر سیاح کے لیے باعث رحمت۔ سیاح کے لیے ادیب ہونا ضروری شرط نہیں مگر اچھا سفر نامہ نگار ہونے کے لیے اس میں ادیب کے خواص کا ہونا ضروری ہے۔

سفر کے جدید ذرائع نے سفر کی راہ میں حائل دشواریوں کو قصہ پارینہ بنا دیا ہے۔ کچھ علاقے موقع کی مناسبت سے سیاح کو سفر پر اکساتے ہیں۔ میدانی، ریگستانی، بحری، فضائی اور پہاڑی سفر کے الگ الگ تقاضے ہوتے ہیں جو مسافر کو نبھانے پڑتے ہیں۔ ذاتی طور پر حاصل ہونے والی واقفیت بالواسطہ یا ثانوی حیثیت سے حاصل شدہ حقیقت سے زیادہ ٹھوس، قابل اعتبار اور بہتر ہوتی ہے۔ جیسے تاج محل کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے سے جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ اس کے بارے میں لکھی کتابوں میں تفصیلات پڑھنے سے نہیں مل سکتی۔ براہ راست تجربے کے لیے سفر بحر حال لازمی ہے۔[۱۰۶]

سفر وسیلہ ظفر صرف ایک فقرہ نہیں بلکہ ایک طرز احساس کا نام ہے۔ سوچ کا ایک انداز ہے۔ اسی سے سفر اور سیاحت میں باعث امتیاز بننے والے ذہنی رویے کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ سفر کسی بھی مقصد یا محور کے پیش نظر کیا جاتا ہے جبکہ سیاحت صرف اپنے لیے ہوتی ہے۔ سیاحت مقصود بالذات ہے۔ سفر میں مجبوری اور ناگواری بھی شامل ہو سکتی ہے۔ اس لیے سلیم اختر کے خیال میں سفر نامہ درحقیقت سیاحت نامہ ہوتا ہے، سفر نامہ کی اصطلاح موزوں نہیں لگتی۔[107]

سفر نامہ کیا ہے؟

"سفر" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مسافت طے کرنا ہیں۔ اردو میں عربی سے مستعار ہے اور انھی معنوں میں مستعمل ہے جبکہ "نامہ" فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے لفظی معنی خط، فرمان یا عام طور پر تحریر شدہ عبارت کے ہیں۔ اردو علمانے "سفر" عربی سے اور "نامہ" فارسی سے لے کر سفر نامہ کی اصطلاح وضع کی۔[۱۰۸]

سفر نامہ روداد سفر کا نام ہے۔ اس کی واضح تعریف متعین نہیں۔ مختلف لوگوں نے اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے اس کے تعین کی کوشش کی ہے۔ بیانیہ سفر نامہ سفر کے حالات و کوائف اور تاثرات پر مشتمل ہوتا ہے۔ سفر نامہ نگار دوران سفر میں پیش آنے والے محسوسات، مشاہدات، کیفیات اور واردات قلبی کو دوران سفر یا سفر کے اختتام پر مرتب کرتا ہے۔ گو کہ اس صنف کا تمام مواد منظر کے گردوپیش میں موجود ہوتا ہے مگر سفر نامہ نگار صرف خارجی ماحول کے مشاہدے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اپنے بیانیہ کو ہمہ جہت اور مدلل بنانے کے لیے دیگر جزئیات کو بھی سمیٹتا ہے۔[۱۰۹]

بقول ڈاکٹر انور سدید:

> "سفر نامہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں مشاہدے کی قوت سب سے زیادہ روبہ عمل آتی ہے۔ یہ صنف علم، تاریخ اور جغرافیہ کے فنی مقاصد کے لیے میکانکی انداز میں کوائف جمع نہیں کرتی بلکہ ایک مربوط، دلچسپ اور خوشگوار بیانیہ مرتب کرنے کے لیے ان سب سے فائدہ ضرور اٹھاتی ہے۔ سفر نامہ نگار اپنے عہد کو زندہ حالت میں دیکھتا ہے اور زندگی کے اس مشاہدے کو سفر نامے میں یوں منتقل کر دیتا ہے کہ آنے والا زمانہ اس دور کی روح کا

تحرک محسوس کرلیتا ہے۔ اور اس میں مکمل کامیابی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب سفر نامہ نگار ادب کے جملہ تقاضوں سے بخوبی واقف ہو اور مشاہدے کو تخلیقی انداز میں پیش کرنے کی قوت رکھتا ہو۔"[10]

اردو میں سفر نامہ بتدریج زبان و بیان کے مختلف اسالیب اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگی اختیار کرتا ہوا محکم صنف ادب بن چکا ہے۔ ظہیر احمد صدیقی کے خیال میں اچھے سفر نامے میں داستان کی سی داستان طرازی، ڈرامہ کی سی منظر کشی، ناول کی سی فسانہ سازی، آپ بیتی کا سا لطف ہونے کے علاوہ سفر نامہ نگار کا اپنے تاثرات اس طرح پیش کرنا ضروری ہے کہ تحریر پر لطف اور معلومات افزا ہو۔[11] ظہیر احمد صدیقی سفر نامے کو مختلف رنگوں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس میں ساری اصناف کا عکس دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔

ڈاکٹر مسعود انور سفر نامے کا سب سے قیمتی عنصر اس کے افسانوی جزو کو گردانتے ہیں۔ داستان کے کہانی والے حصے نے افسانے کا روپ دھار لیا جبکہ حالات سفر کے بیان پر مشتمل حصے نے سفر نامے کی شکل اختیار کرلی اور اردو میں ایسی صنف کا اضافہ ہوا جس میں چشم دید مشاہدے کو اہمیت حاصل ہے۔[12] مشفق خواجہ کا روایتی و غیر روایتی سفر نامے کے فرق کے حوالے سے موقف ہے کہ روایتی سفر نامہ واقعات سفر سے اور غیر روایتی سفر نامہ کیفیات سفر سے متعارف کرانے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ کیفیات سفر کو قلمبند کرنا سفر نامے کو معلومات کا گنجینہ بننے سے بچا کر اس کا رشتہ ادب سے قائم کرتا ہے۔"[13]

مرزا ادیب کے مطابق سفر نامہ نگار جو دیکھتا ہے جو پاتا ہے جہاں سے گزرتا ہے اس کی ساری خوشبوئیں، سارے باطنی رنگ اور ساری کیفیات کو سمیٹ کر ان کا اطلاق اپنے تخلیقی تجربے کی صورت میں سفر نامے میں کر دیتا ہے۔"[14]

سفر نامے سے متعلق اسی طرح کے خیالات کا اظہار ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی کیا ہے:

> "ایک کامیاب سفر نامہ وہ ہوتا ہے جو صرف ساکت و جامد فطرت کا عکاس نہ ہو بلکہ لمحہ رواں میں آنکھ، کان، زبان اور احساس سے ٹکرانے والی ہر شے منظر میں سما جانے والی ہو۔ تماشہ، نغمہ و نکہت کا صورت و رنگ، لفظوں کی امیجری میں جمع ہو کر ان کو مرقع بہار بنادے اور قاری ان تمثالوں میں جذب ہو کر خود کو اس مرکب آئینہ گری کا حصہ بنالے۔"[15]

سفر ناموں میں انسانی زندگی کے ان گوشوں پر روشنی پڑتی ہے جو ادب، تاریخ و جغرافیہ کی کتب میں تاریک رہ جائیں۔ جیسے معاشرتی طور طریقے، عقائد و رواج، فرقے، زبانیں، تجارتی و صنعتی خصوصیات، تعلقات وغیرہ کی متحرک تصاویر سفر ناموں میں سامنے آتی ہیں۔ سفر نامے صرف حالات و واقعات اور مشاہدات و تجربات کا مجموعہ نہیں ہوتے بلکہ ان سے زندگی کے کچھ نئے راستے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی کی رائے میں سفر نامہ مثبت و منفی خیالات و جذبات و تاثرات کا مرکب ہے۔ یہ حالات اور واقعات سفر کا مکمل مربوط بیان ہوتا ہے۔ وہ طرز ادا یا اسلوب

بیان سفر نامہ ہے جس میں سیاح اپنے داخلی احساسات خارجی حالات کے ساتھ ملا کر اپنی دلی، طبی و ذہنی کیفیت ظاہر کرے۔ یہ ایسی وسیع کیفیت ہونی چاہیے کہ قاری اس سے اثر قبول کرے۔"[16] اس حوالے سے ان کا مزید کہنا ہے کہ سفر نامے کسی سفر یا سیاحت کی معمولی داستان یا سرسری بیان واقع نہیں بلکہ اپنے اندر جانے کتنے پہلو پوشیدہ رکھتے ہیں جو قدم قدم پر قاری کے لیے مطالعے اور فکر کے نئے دروا کرتے ہیں۔ سفر نامے سیاست، معاشرت اور قدرتی مناظر کی دلچسپ اور دلکش تصویریں ہیں۔ سفر نامے کے علاوہ ادب کی کسی دوسری صنف میں ایسا مکمل اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر محیط تصویری جائزہ نہیں ملتا۔"[17]

جمیل الدین عالی کے خیال میں روداد سفر سفر کے تجربات و مشاہدات کی فطری عکاسی اور سفر کے دوران پیش آنے والے مثبت و منفی واقعات و حالات کو تحریری طور پر پیش کرنے کے مترادف ہے۔[18] سفر نامے کی بیانیہ صنف میں خارجی مشاہدے کو تخیل پر فوقیت دی گئی ہے۔ سفر نامہ نگار اپنی تحریر سے معلومات بہم پہنچانے کے علاوہ اپنے تخلیقی تجربے میں احساسات و جذبات کے ذریعے دوسروں کو شریک کرتا ہے۔ اس لیے سفر نامہ معلوماتی تحریر سے ادبی تحریر کے دائرے میں آجاتا ہے۔ ظہیر احمد صدیقی کی طرح ڈاکٹر صدف فاطمہ بھی سفر نامے میں دیگر اصناف کی خصوصیات کی موجودگی کی حامی ہیں:

> "سفر نامہ ایسی غیر افسانوی صنف ادب ہے جس میں فکشن کی تنظیم، آپ بیتی کی ذاتیت، رپورتاژ کی قوت متخیلہ، اینتھروپولوجسٹ کی انسان دوستی، تاریخ کی تخلیقی بصارت، جیالوجسٹ کی وسعت نظر اور تخلیق کی جولانیاں شامل ہو سکتی ہیں۔ دراصل سفر نامہ ایک ایسا فن ہے جو دوسری اصناف ادب سے الگ انفرادیت پر مبنی ہے۔ اس صنف میں اپنی تکمیلیت کے لیے دوسری اصناف سے کسب فیض کی ضرورت ہے۔ اور اس میں دوسری اصناف کی خصوصیات کو جذب کرنے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔"[19]

اب سفر نامہ ایسی صنف ادب کی صورت اختیار کر گیا ہے جس میں دیگر اصناف کے بیشتر عناصر شامل ہیں۔ تخلیقی اسلوب کی آمیزش سے اس میں شعری کیفیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اب سفر نامہ نئی زمینوں کے مشاہدے کے ساتھ ساتھ سیاح کے داخل میں آباد دنیا کی دریافت کا وسیلہ بھی بنتا ہے یعنی دو دنیاؤں کے سنگم پر تخلیق ہو رہا ہے۔[20] ایک لحاظ سے سفر نامہ نگاری وقائع نگاری ہے۔ یہ صنف قدیم اس لیے ہے کہ نئی دنیاؤں کی دید اور دریافت کا شوق ہمیشہ سے انسانی جبلت کا حصہ رہا ہے۔ اسی لیے قدیم عہد کے سفر نامے اپنے عہد کی معاشرت، تاریخ و تہذیب کے بارے میں مستند تاریخی دستاویز کا درجہ بھی رکھتے ہیں۔ لیکن رجحان کی صورت سفر نامہ نگاری نے اس وقت اختیار کی جب سماجی تبدیلیوں کے باعث سیر و سفر کے نئے محرکات سامنے آئے اور سفری سہولیات میں اضافہ ہوا۔[21]

سفر نامے کے فنی لوازمات

سفر چشم دید واقعات کا بیان ہے۔ معلومات کی پیشکش سفر نامے کی حدود میں آتی ہے لیکن وہ معلومات نہیں جو با آسانی کتابوں یا معلومات کے دوسرے ذرائع سے میسر ہوں بلکہ انھیں تخلیقی مہارت سے پیش کرنا اہم ہے۔ ہر سفر نامہ ادب پارے کی حیثیت اختیار نہیں کرتا۔ سفر نامہ ادب کا گراں قدر اثاثہ ہے۔ یہ آپ بیتی سے بھی متصل ہے لیکن سفر نامے کی بنیادی شرط اور محرک سفر ہے۔ سفر نامہ ادیب کا موضوع ہے کیونکہ وہ خارجی اور داخلی دنیا کا مسافر ہوتا ہے۔ اپنے مشاہدات، واقعات، سانحات، واردات، تجربات و خیالات میں اپنی سوچ، اپنے جذبات کو شامل کرتا ہے۔ اس کی تخلیق میں بصارت اور بصیرت کا ملاپ ہوتا ہے۔"[۱۲۲]

سفر نامہ لکھنے والے کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ چونکہ یہ سفر ہو چکنے کے بعد وجود میں آتا ہے اس لیے اس کے تجربات ماضی کی مشکلات و مصائب کا بیان ہیں۔ ابتدائی عہد کے سفر نامے صرف معلومات کا ذخیرہ تھے مگر بعد کے سفر ناموں میں تاریخی، جغرافیائی و تہذیبی معلومات کی پیشکش کے ساتھ تاثرات کو ادبی اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ کچھ سفر نامے صرف تاریخی واقعات کے بیانیے ہوتے ہیں اور کچھ صرف جغرافیائی معلومات کا مجموعہ۔ سفر نامہ نئی زمینوں کی دریافت کا وسیلہ ہے کیوں کہ کسی ملک کے جغرافیائی نشیب و فراز سیاح کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اس کیفیت کے سلیقہ مندانہ اظہار سے قاری کو بھی ان دریافتوں میں شرکت کا موقع ملتا ہے۔ اس طرح سفر نامہ کسی ملک کے تاریخی حقائق پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ سفر نامہ نگار واقعات و حادثات کی تاریخی صداقت معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے اس لیے جغرافیہ اور تاریخ دونوں کا سفر نامہ میں در آنا غیر فطری نہیں۔ لیکن اگر سفر نامہ نگار موسموں کے احوال، پہاڑوں کی اونچائی، دریاؤں کی لمبائی اور گہرائی وغیرہ میں غیر معمولی دلچسپی لے اور ان کیفیات کو نظر انداز کر دے جو ان کو دیکھ کر اس پر طاری ہوئیں تو اس سے سفر نامے کی داخلی روح متاثر ہوتی ہے۔ یہی حال تاریخی معلومات کا ہے۔ سفر نامہ تاریخ کی سطح ایک حد سے آگے عبور نہیں کرتا یعنی مربوط تاریخ پیش نہیں کرتا۔ البتہ اگر سفر نامہ نگار اپنے عہد کو تخلیقی انداز میں سفر نامے کی زینت کا حصہ بنا دے تو مستقبل کا مورخ تاریخی نتائج اخذ کرنے میں اس سے معاونت لے سکتا ہے۔"[۱۲۳]

اچھے سفر نامے کی خوبی یہ ہے کہ وہ قاری کو "دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے" کے مصداق اپنے تجربے میں دوسروں کو اس طرح شریک کر سکے کہ جس بے نام مسرت کو اس نے خود محسوس کیا قاری بھی کر سکے۔ وہ قاری کو زمانے کی تینوں ابعاد میں سفر کرائے اور جغرافیائی کوائف کی متعین حدود میں بہت زیادہ تاریخی صداقتوں سے گریز کرتے ہوئے سفر نامہ کو ذاتی واردات بنا دے۔ سفر نامے کے لیے استعمال ہونے والے وسیلے کا بھی سفر نامے میں بہت عمل دخل ہے کیونکہ بلندی کے سفر سے زمینی چیزیں واضح نظر نہیں آتیں اور منظر تیزی سے بدلتے ہیں۔ مگر پیدل سفر میں سیاح زمین کے ساتھ خاص ربط و تعلق قائم رکھتا ہے اور جزئیات کا قریبی مشاہدہ کرتا ہے۔ اسی

طرح اس کا وقوف و قیام بھی اس کے مشاہدے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کیونکہ طویل قیام سے اور زمین کو مس کرنے اور برتنے سے ہی کسی خطے کے اسرار کھلتے ہیں۔[124]

سفر نامے نے اپنا اولین ربط کہانی سے قائم کیا۔ اس لیے قدیم کہانیاں، داستانیں اور مثنویاں سب سفر نامے ہیں یعنی ان کا خمیر سفر نامے کے قوام سے ہی اٹھا۔ تخلیقی سفر نے حقیقی سفر اور داستان کی داخلی جہت نے سفر نامے کی خارجی جہت کی شکل اختیار کی۔ اس طرح رفتہ رفتہ سفر نامے کی صنف کے نقوش اجاگر ہونے لگے۔ اب سیاحت نامہ بتدریج افسانے کی صنف میں ضم ہو رہا ہے لیکن پھر بھی یہ افسانے سے مختلف ہے۔ مرزا ادیب کے مطابق سفر نامہ نگار کی باطنی زندگی سفر نامے میں جھلکتی ہے جبکہ واقعات کے حوالے سے کرداروں کی باطنی زندگی افسانے میں۔[125] سفر نامہ، کہانی اور داستان کے آہنگ میں بہت یکسانیت ہوتی ہے۔ آغاز، ارتقا اور اختتام کی ملتی جلتی کیفیات اور اشکال تینوں اصناف میں موجود ہیں۔ سفر نامے اور فکشن میں اصل اور نقل کا فرق ہے۔ یہ داستان، افسانے اور ناول سے مختلف ہے۔ اس میں وسیع امکانات کی گنجائش اور کافی لچک ہے۔

تکنیک کا مناسب انتخاب سفر نامے کی دلچسپی اور اس کے فنی حسن کو بڑھاتا ہے۔ تاہم اصل چیز یہ اہم ہے کہ سیاح اپنی قوت باصرہ کو کس طرح کام میں لایا۔[126] سفر نامے کی بنیادی خصوصیات میں اس کی نثر دلکش ہونا، گہرا مشاہدہ، مصنف کا اپنے لطف میں قاری کو شریک کرنا اور مصنف کے ذاتی مرقعے شامل ہیں۔ ہر سفر نامہ ایک ایسی داستان سفر ہے جو اس ملک کے تاریخی، تہذیبی و سماجی پس منظر کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مصنف کا نقطہ نظر بھی پیش کرتا ہے۔[127] دو مختلف معاشروں کے مابین تجزیے اور موازنے کی کیفیت کو ابھارنا اچھے سفر نامے کی اہم خوبی شمار ہوتا ہے۔ کیونکہ سفر ناموں نے قوموں کے درمیان تہذیبی رشتوں، علمی تعلق اور نئے جزیروں کی تلاش کا کام کیا ہے۔ اچھا سفر نامہ اپنے مخصوص اسلوب کے ساتھ تمام تر جزئیات کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔[128] سفر نامہ نگار کا علم جتنا زیادہ، تجربہ جتنا زیادہ وسیع، خیال جتنا زیادہ پختہ ہوگا سفر نامہ اتنا ہی معتبر، دلچسپ اور معلومات افزا ہوگا۔ طرز تحریر میں سادگی، سلاست، شگفتگی اور اخلاقانہ بصیرت سفر نامے کو قبول عام کی سند عطا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ اگر سفر نامہ نگار جو مناظر کی روح میں اترنے کے بعد مناظر کو تحریر کی روح میں اتارنے کا سلیقہ رکھتا ہو تو جلد اس کے قارئین کا حلقہ اثر وسیع ہو جاتا ہے۔[129]

سفر نامے کا بیان سچائی کی سادہ زبان میں زیادہ معتبر ہوتا ہے۔ احساسات و تاثرات و جذبات کا بیان جتنا سیدھے سادھے انداز میں ہو اتنا ہی موثر اور دلوں کو چھو لینے والا ہوگا۔ رنگین بیانی کے پردے حقیقت کو چھپانے کا کام دیتے ہیں مگر سفر نامہ حقیقت سے ملاقات کراتا ہے۔ آپ بیتی سے زیادہ قریب ہونے کی بھی یہی وجہ ہے۔[130]

سفر نامے کو تخلیقی ہونا چاہیے۔ تخلیقی سفر ناموں اور رہنمائی سفری کتب میں فرق کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر کا کہنا ہے:

"آج جب ہم سفر ناموں کو بطور ایک صنف ادب دیکھتے ہیں تو اس میں تاریخ، جغرافیہ کی معلومات کے ساتھ ساتھ چیزے دیگر بھی ملتی ہے۔ اور یہی چیزے دیگر ہے جو سفر نامے کا مخصوص مزاج متعین کرتی ہے۔ یہ ہے سفر نامے کا ادبی و تخلیقی پہلو، جسے خارجی وقوعات، بدیشی مناظر اور غیر ملکی آب و ہوا کے ساتھ اپنی ذات کی آمیزش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دیکھنے والا غیر ممالک کے افراد، مناظر، آثار و عمارات کو کسی ڈاکیومینٹری فلم کی مانند لاتعلقی یا محض تجسس کی دلچسپی سے نہیں دیکھتا بلکہ وہ خود پر انھیں یوں وارد کرتا ہے کہ سفر ایک تخلیقی تجربہ بن جاتا ہے۔ گویا وہ کسی ملک سے نہیں گزرتا بلکہ ایک تجربے سے گزرتا ہے۔ اسی انداز نظر کی بنا پر تخلیقی سفر نامہ اور گائیڈ بک نما سفر ناموں کی کھیپ میں امتیاز ممکن ہوتا ہے۔"[۱۳۱]

سفر نامہ کسی ملک کے تاریخی حالات، اہم تاریخی عمارات کی پیمائش اور جغرافیائی کوائف کا نام نہیں بلکہ تخیل اور تصور کی آمیزش سے اس میں ادب پارہ کا لطف آتا ہے اور تخلیقی اسلوب سے جمالیاتی حظ پیدا ہوتا ہے۔ سفر نامہ نگار اپنے سے مختلف تمدن، جداگانہ کلچر اور متضاد تہذیب کے دھاروں میں جو رویہ اپناتا ہے آیا وہ ان میں بہہ جاتا ہے یا ان کے مقابل خود کو آخری چٹان سمجھتا ہے۔ یہ سوچ پرکھ کا جذباتی انداز اور ذہنی رویہ کسی بھی سفر نامے کی مخصوص فضا کے تعین میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سیاحت دیار غیر کے تخلیقی تجربات کا ثمر ہے۔ آج کا قاری سفر نامے میں تخلیقی صلاحیت کی بنا پر ہی دلچسپی لیتا ہے۔ ڈاکومینٹری فلم خوش رنگ مناظر تو دکھا سکتی ہے مگر افراد کو زندہ روپ میں پیش کرنے سے قاصر ہے۔ سیاحت نامے کے اس پر بازی لے جانے کی یہی وجہ ہے کہ وہ چند افراد اور واقعات کی مدد سے اس علاقے کو زندہ کرتا ہے۔[۱۳۲]

سفر نامے کی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر صدف فاطمہ کا کہنا بجا ہے کہ سفر نامہ نہ جغرافیہ ہے نہ تاریخ مگر اس صنف سے اکثر عالمی تاریخیں وجود میں آئیں اور جغرافیے کے خاکے دستیاب ہوئے۔ یہ انسانیت کے مطالعے کا صحیفہ ہے نہ سماجی علوم کی کتاب لیکن اس کی بدولت بہت سے سماجی علوم راہ پا گئے۔ کسی ملک کے سیاسی، اقتصادی، معاشی حالات کا اندازہ بہت حد تک سفر ناموں سے لگایا جا سکتا ہے مگر اس میں افراط و تفریط کا خدشہ رہتا ہے۔ اچھے سفر نامے میں انسانیت کے مطالعے کے امکانات وافر ہوتے ہیں۔ اگرچہ سفر نامہ حرکی تاثرات کا وقتی وجذباتی ریکارڈ ہے پھر بھی اس میں ماضی کی داستان سمونے اور حال کے واقعات کے بیان کی بہت قابلیت ہے۔[۱۳۳]

قدیم وجدید سفر ناموں کا فرق

اردو میں سفر نامہ بتدریج زبان و بیان کے نت نئے اسالیب اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا ہوا محکم صنف ادب بن چکا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس صنف میں تبدیلی آئی ہے۔ ابتدائی دور کے سفر ناموں اور جدید دور کے سفر ناموں میں واضح فرق ہے، کچھ مماثلتیں بھی ہیں۔ اردو میں پہلا سفر نامہ نگار یوسف خان کمبل پوش کو مانا

جاتا ہے۔ جبکہ سفر ناموں کی باقاعدہ ابتدا سر سید کے عہد میں ہوئی۔ بیسویں صدی کی پہلی چار دہائیوں کے سفر ناموں کو سفر نامے کا عبوری دور کہا جاتا ہے تب اس میں جدیدیت کے ابتدائی نقوش نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ بیسویں صدی کے نصف سے آخری دہائیوں تک کا عرصہ سفر نامے کے عہد زریں میں شمار ہوتا ہے اور بعد والا زمانہ جدید دور میں۔

متعدد قدیم سفر نامہ نگار بطور سیاح سفر کو انجام دینے، غیر ممالک اور اجنبی جگہوں کو کسی مخصوص زاویہ نگاہ سے دیکھنے اور آزاد ناظر کی طرح اپنے محسوسات مرتب کرنا زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے پیش نظر سفر نامے کو دوسرے ممالک کے بارے میں معلومات کی فراہمی کا وسیلہ بنانا اور قاری کو مفید طلب کوائف فراہم کرنا تھا۔ قدیم سفر نامہ نگار ابتدا سے ہی مقصد کی ڈور سے بندھے ہوتے تھے۔ قدیم سیاح سفر نامے میں ماحول پر سرسری نظر ڈال کر اس کا خاموش بیانیہ مرتب کرتا تھا۔ وہ بے آواز فلم کی مانند صرف بے رنگ مناظر اور تصاویر پیش کرتا تھا جبکہ جدید سفر نامے نے بتدریج جمود سے حرکت کی طرف سفر کیا ہے۔ یہ پورے تاثر کو قاری تک منتقل کرتا ہے۔

قدیم سفر نامہ نگار واقعات کو احاطہ تحریر میں لاتے وقت اپنی ذات کو منہا کر دیتا تھا۔ دور جدید کے سفر نامہ نگار نے اپنی ذات اور ماحول کی دوئی کے خاتمے کی کوشش کی ہے۔ قدیم سفر ناموں میں معروف شہروں، عمارتوں، جگہوں کا تذکرہ زیادہ ہوتا تھا۔ لیکن جدید سفر نامہ نام ونشان کی شناخت سے بلند ہوتا جا رہا ہے۔ قدیم سفر نامے میں فکری یا تہذیبی تصادم دیکھنے میں نہیں آتا تھا۔ ان کی رفتار بھی سست تھی۔ اس کے برعکس جدید سفر ناموں میں فکری تصادم کی واضح لہر ہے اور سوچ کی رفتار سفر کی رفتار سے تیز تر ہے۔ اب سفر نامے کا رخ جسمانی سے ذہنی کی طرف مڑ گیا ہے۔ یہ ذہن اور روح کو متحرک کرتا ہے۔ البتہ تکنیک کے اعتبار سے قدیم و جدید سفر ناموں میں مماثلت موجود ہے یہ بدستور بیانیہ تکنیک میں لکھا جا رہا ہے۔ [۱۳۴]

قدیم سفر نامہ نگار خارجی کوائف جمع کرنے پر توجہ مرکوز کرتا تھا مگر جدید سفر نامہ نگار خارج اور داخل دونوں جہات کا احاطہ کرتا ہے۔ اب سفر نامہ داخلی لگن کے ساتھ لکھا جا رہا ہے۔ جس کا مقصد سفر کے تجربات سمیٹنے کے علاوہ ذوق تخلیق کی تسکین بھی ہے۔ جبکہ پہلے صرف ضرورت کے تحت لکھے جاتے تھے مقصد دوسروں کی رہنمائی کرنا ہوتا تھا۔ اب سیاح مناظر و مظاہر کے کیف میں ڈوب جاتا ہے۔ جدید سفر نامے میں فراوانی کے ساتھ تاثرات پیش کیے جا رہے ہیں۔ اب سفر نامہ نگار کے لیے سفر ذاتی واردات اور سفر نامہ ذاتی واردات کا اظہار ہے۔ نیا سفر نامہ نگار مناظر کو دور سے دیکھنے کا قائل نہیں وہ ان کا حصہ بن جانا چاہتا ہے۔ آج کا سیاح ماضی کے سیاح کی طرح نئی زمینوں کی تلاش احوال، اجنبی بازاروں کی رونق، معاشرت اور عجائب و غرائب کی تفصیلات دینے اور اشیا کا شمار و تعارف کرانے کی بجائے انفرادی رد عمل اور ذاتی احساسات ظاہر کرتا ہے۔ [۱۳۵] آج کے سفر نامہ نگار کا مقصد صرف نظری یا بصری نہیں بلکہ

تاثراتی ہوتا ہے۔ وہ خود محور و مرکز بن کر ہر لمحے کو اپنے گردوپیش میں محسوس کرتا ہے۔ اس کے نزدیک سفر کا بیان واقعات کے علاوہ کیفیات سفر کا بیانیہ بھی ہے۔ وہ صرف زمانہ حال کا مسافر نہیں ہوتا بلکہ ماضی کی بازیافت بھی کرتا ہے۔

قدیم سفر نامے معلومات کا خزانہ ہوتے تھے جن کی روشنی میں سفر پر جانے والے لوگ اپنا راستہ متعین کرتے تھے۔ مگر جدید سفر نامہ مشاہدات، تجربات پر منحصر ہونے کے ساتھ ساتھ تخیل کی کار فرمائی اور جذبات کی چاشنی سے بھی لبریز ہوتا ہے۔ جدید سفر ناموں میں قدیم سفر ناموں کی اکتا دینے والی تاریخی و جغرافیائی تفصیلات سے گریز کیا جاتا ہے۔[۱۳۶] ابتدائی دور کے سفر ناموں پر تاریخ اور جغرافیہ کا غلبہ ہے۔ ابتدائی سفر نامہ نگاروں نے غیر جانبدار ہو کر مختلف اقوام و ممالک سے متعلقہ ہر قسم کی تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی معلومات کی فراہمی کی کوشش کی۔ انھوں نے غیر ضروری تخلیق کاری سے گریز کیا۔ لیکن بعد کے سفر نامہ نگاروں نے اپنی ذات کو الگ نہیں رکھا۔ انھوں نے اپنے مشاہدات و تجربات کو زیادہ ادبی انداز میں پیش کیا۔ انھوں نے تاریخ و جغرافیے کے غلبے اور معلومات کی فراہمی کے طریق کار اور دائرہ اثر سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو سفر نامہ کو اپنے ذاتی تاثرات، نظریات و احساسات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔[۱۳۷]

میڈیا اور گلوبل ویلج بننے کے باعث خدشہ ہے کہ سفر نامہ نگاری کی روایت کمزور پڑ سکے گی۔ عالمی ذرائع ابلاغ نے دنیا کو جتنا مرضی قریب کر دیا ہو لیکن محسوسات کی بنیاد، مشاہدے کی خواہش اور لذت ختم نہیں ہو سکتی۔ اپنی آنکھ سے کیا جانے والا مشاہدہ جو احساس و شعور مرتب کرتا ہے وہ کسی اور متبادل ذریعے سے ممکن نہیں۔[۱۳۸]

سفر نامے میں تہذیب و ثقافت کی اہمیت

تہذیب کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کا نام ہے۔ یہ معاشرے کے طرز زندگی اور طرز فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے۔ چونکہ کسی تہذیب کے مطالعے کے لیے اس کے جغرافیائی خدوخال اور تاریخ کی اہمیت سے مفر ممکن نہیں اس لیے سفر نامے میں تمدنی، تہذیبی پہلوؤں کے ساتھ تاریخی و جغرافیائی پہلوؤں کا تذکرہ بھی آئے گا۔

قدیم سفر ناموں کا تاریخ و تمدن کے اہم ماخذ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ ان میں علمی، تہذیبی و تمدنی معلومات کے علاوہ جغرافیائی کوائف، تاریخی واقعات اور طرز معاشرت کی معلومات کا بیش بہا خزانہ موجود ہے۔ ابن بطوطہ کا سفر نامہ ہندوستان کے بارے میں اور مارکوپولو کا سفر نامہ چین کے بارے میں جو مفید معلومات فراہم کرتے ہیں وہ تاریخی کتب میں دستیاب نہیں۔ اکثر مورخین نے اس دور کی تاریخ لکھنے میں ان سے مدد لی ہے۔ قدیم زمانے کا انسان فطرتاً مہم جو اور سفر پسند تھا۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں مختلف تہذیبوں کے فکری تصادم سے ثقافتی انقلاب رونما ہونے کے پیچھے اہل حرفہ کا عمل دخل زیادہ نظر آتا ہے۔ جو دوسرے ممالک کا سفر اختیار کرتے وقت سامان تجارت کے ساتھ کتابیں بھی لے جاتے تھے۔ جن سے لوگ دوسرے ممالک کے طرز معاشرت اور دیگر چیزوں سے آگاہ ہوتے

تھے۔[139] انسانی تہذیب و تمدن اور معاشرت کی تاریخ سفر ناموں کی بدولت ہی ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچی ہو گی۔ آثار قدیمہ کے کھنڈرات سے آج بھی اس بات کا ثبوت حاصل کیا جا سکتا ہے کہ انسانی تہذیب اور تمدن قدیم سیاحوں کے تجربات و مشاہدات کا حاصل ہیں۔"[۱۴۰]

سفر کے ذریعے چونکہ تہذیبی و ثقافتی لین دین کی بنیاد پڑتی ہے اس لیے سفر ناموں میں اس کا شمار بہت اہم عنصر کے طور پر ہوتا ہے۔ اور قدیم سفر نامے اس بات کے شاہد بھی ہیں۔ رامائن کے عہد کے سفر نامے آریا تہذیب اور رسم و رواج کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں۔ انھی سے قدیم ہندوستان کے سماجی، معاشی و جغرافیائی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ لہٰذا سماجی و تاریخی نقطہ نظر سے سفر ناموں کی اہمیت مسلم ہے کہ یہ اپنے عہد کی سماجی و تاریخی دستاویز ہیں۔ مختلف ممالک کے تہذیبی حالات اور سیاحوں کے مشاہدات سفر ناموں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ رہ جانے کے باعث سفر نامے اب ایسا آئینہ ہیں جو سینکڑوں سال پہلے کے سیاسی، سماجی، تمدنی و تہذیبی حالات دکھاتے ہیں۔"[۱۴۱]

اس حوالے سے انور سدید کا کہنا ہے:

"۔۔۔ حقیقت کے ان متلاشیوں کے ہاں جب اپنے مشاہدات اور تجربات بنی نوع انسان میں تقسیم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی تو سفر نامہ وجود میں آگیا۔ پس سفر نامہ محض سیاح کے ذوق سفر ہی کو آسودہ نہیں کرتا بلکہ یہ رنگ، نسل، زبان اور عقیدے کے اختلاف کے باوجود ایک ملک کو دوسرے ملک سے اور ایک انسان کو دوسرے انسان سے متعارف کرانے اور ان کے درمیان پل تعمیر کرنے کا وسیلہ بھی ہے۔ اور اس سے کسی ملک کی جغرافیائی، تاریخی و تہذیبی اور تمدنی معلومات بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔"[۱۴۲]

چونکہ سفر نامے اپنے عہد کی تاریخی و سماجی دستاویز ہیں اسی لیے سفر نامہ نگار کا تہذیبی و ثقافتی معلومات کو اپنے سفر نامے میں جگہ دینا لازمی ہے۔ سیاح کسی ملک کی سماجی و تہذیبی زندگی پر گہری نظر رکھتا ہے۔ اچھے سفر نامے میں تہذیبی و علمی عناصر کی شمولیت کو بہتر سمجھا جاتا ہے۔ دوسروں کے طرز معاشرت کو بہتر انداز میں دیکھنے کے لیے اس کے قریب جانا اور شرکت کرنا لازمی ہے جس کا واحد ذریعہ سفر ہے اسی لیے سفر نامے میں تہذیبی و ثقافتی معلومات آجاتی ہیں۔ سیاحت ناموں میں تہذیب و معاشرت کے مختلف پہلوؤں کی جیتی جاگتی اور متحرک تصاویر مل جاتی ہیں۔ یہ موجودہ دنیا کا معلومات سے بھرپور رواں تبصرہ ہیں۔"[۱۴۳]

تاریخ کے ہر طالب علم کو سفر ناموں کا احسان مند ہونا چاہیے کہ اسی زمانے میں جب انسان تاریخ نویسی سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتا تھا سفر نامے تاریخ کو اپنے سینے میں چھپانے کا بے بہا خزانہ تھے۔ بہت حد تک مصر، بابل، چین، ہند، روم اور عرب کی تواریخ سفر ناموں میں سموئی ہوئی ملتی ہیں۔"[۱۴۴] سفر ناموں کی تاریخی و سماجی اہمیت میں کوئی دو رائے نہیں ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے حوادث و واقعات درج ہوتے ہیں جو عام تاریخی کتب میں ناپید ہوتے ہیں۔ تاریخ نہ ہوتے ہوئے بھی سفر نامے تاریخ کا ایسا مواد ضرور فراہم کرتے ہیں کہ بذات خود تاریخ بن جاتے ہیں۔ اپنے عہد کے

حالات و واقعات، معاشرت و تہذیب کو سیاح اپنے نقطہ نظر سے پیش کرتا ہے۔ شادی بیاہ، رسم و رواج، لوگوں کے اخلاق، عادات، نشست و برخاست، سیاسی و سماجی نقطہ نظر وغیرہ کی ایسی تصویریں جو سفر نامے پیش کرتے ہیں کسی اور صنف میں نظر نہیں آتیں۔ تاریخ تو صرف بادشاہوں کی تبدیلی کے بڑے بڑے واقعات کے احوال پر مشتمل ہوتی ہے۔ تاریخ بے جان واقعات کا بیان ہے اور سفر نامے زندہ واقعات کی تاریخ۔ لیکن سفر ناموں میں پیش کردہ حقیقت کا تصور مورخ کے تصور سے مختلف ہوتا ہے۔ مورخ تفصیل کے ساتھ واقعہ کو مع سن اور تاریخ لکھتا ہے جبکہ سیاح اس کو پورے سیاق و سباق اور اثرات کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے سفر نامہ نگار واقعات کی ترتیب بدل دے مگر چھوٹے چھوٹے واقعات کسی جگہ کی تہذیب کو سمجھنے میں بہت اہم ہوسکتے ہیں۔ سفر نامہ نگار مورخ کی طرح ہر واقعے کی چھان بین نہیں کرتا اس لیے ان میں پیش کردہ حقیقت کے انکشاف کا عمل تاریخ نویسی سے مختلف ہوتا ہے پھر بھی تاریخ اور سفر ناموں کے حقائق میں فرق ہونے کے باوجود سفر نامے کسی جگہ یا ملک کی جو تصویر پیش کرتے ہیں وہ تاریخی کتب میں موجود نہیں ہوتی۔ سفر نامے ملک کی جو تاریخ پیش کرتے ہیں ان میں سیاح کے ذاتی تجربات و احساسات اور تہذیبی و ثقافتی جھلکیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔"[۱۴۵]

ڈاکٹر قدسیہ اس حوالے سے کہتی ہیں:

"سفر نامہ کی تاریخی و سماجی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ غالباً کسی ملک کے جملہ حالات جاننے کے لیے تاریخ سے زیادہ سفر نامے مفید ہوتے ہیں۔ کیونکہ تاریخ سے تو واقعات اور طرز حکومت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن سفر نامے تاریخ کے ساتھ ساتھ سماجی حالات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ اور یہ امر قابل ذکر ہے کہ جب تہذیبی اور سماجی حالات سے انسان کماحقہ واقفیت حاصل کر لیتا ہے تو اس کے لیے ملک کے دوسرے حالات کو سمجھنے اور جاننے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی۔"[۱۴۶]

سیاحتی ادب کے گراں قدر مواد سے جدید مورخین نے بخوبی استفادہ کیا ہے۔ سفر ناموں کی تاریخی و سماجی اہمیت پر غور کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ سفر ناموں کو علم جغرافیہ کی بنیادی اینٹ تصور کیا جاسکتا ہے اور انھوں نے نئی تاریخ کو جنم دیا ہو گا۔ سفر نامے تاریخی، سماجی، معاشرتی و تجارتی معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ جغرافیائی معلومات کا بھی وسیلہ ہیں۔ کسی ملک میں انقلاب کے بعد سماجی، سیاسی، ادبی و اقتصادی حالات لازماً متاثر ہوتے ہیں۔ سفر ناموں میں کسی جگہ رونما ہونے والی یہ تمام تبدیلیاں مل جاتی ہیں۔ سفر ناموں سے دیگر ممالک کی تاریخی، ادبی و تہذیبی زندگی کا عکس ہمارے سامنے آجاتا ہے اور تاریخ کی کھوئی ہوئی کڑیاں مل جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ سیاح کو لوگوں کے جن اخلاق و اطوار کا سامنا کرنا پڑتا ہے انھیں وہ سفر نامے میں جگہ دیتا ہے اور ایسی باتیں سفر نامے میں اخلاقی نمونہ بن جاتی ہیں۔ سفر نامے میں موجود تاریخی و سماجی مواد بے شک کسی ملک کی تہذیبی و سماجی اقدار کو سمجھنے کے لیے خالص تاریخی کتاب سے زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ مگر اس سے مستفید ہونے کے لیے بہت احتیاط سے کام لینا ہو گا کیونکہ

سفر ناموں میں زیب داستاں کے لیے بھی بہت سی چیزیں اضافہ شدہ ہو سکتی ہیں۔ بعض اوقات سیاح صرف دلچسپی پیدا کرنے کے لیے متعدد چیزیں اپنے سے بڑھا دیتا ہے، یا روایتی طور پر بہت سے سی باتیں بغیر تصدیق کے بھی سفر نامے کا حصہ بنا دیتا ہے۔ اسی لیے سفر نامے کو تاریخی یا سماجی ذریعے کے طور پر استعمال کرنا ہو تو بہت محنت سے سب بیانات کی جانچ پرکھ کرنا ہوگی ورنہ گمراہی اور غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ لیکن غلطیوں کے احتمال کی وجہ سے سفر ناموں کو یکسر نظر انداز کرنا بھی غلطی ہوگی۔ اغلاط کا احتمال سفر نامہ کی اہمیت کو کم نہیں کرتا کیونکہ تاریخی و سماجی اعتبار سے ان کی اہمیت مسلم ہے اور تاریخ کی تمام تر ترقی کے باوجود ان کی الگ اہمیت ہے۔"[۱۴۷]

سفر نامے لوگوں کے مابین علمی، تہذیبی رشتوں کی مضبوطی اور ثقافتی و باہمی رشتوں کی استواری میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ تہذیب و تمدن کی آگہی کا بڑا سرچشمہ ہوتے ہوئے بھی ان میں لکھے کو صد فی صد درست سمجھنا اور نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کیونکہ سیاح تھوڑے عرصے کے لیے کسی علاقے میں رہتا ہے اور سرسری نظر سے ہر چیز کا جائزہ لیتا ہے۔ اس کا رشتہ وہاں کی زمین میں جڑوں تک استوار نہیں ہوتا۔ پھر وہ اپنے تاثرات، احساسات بھی ہر چیز میں شامل کرتا ہے تو مورخ کی طرح غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ سفر نامہ نگار جغرافیہ دان اور تاریخ دان حضرات سے قدرے ممتاز ہو جاتا ہے کیونکہ ان کا موضوع تحقیق کائنات کا خارجی زاویہ ہے۔ کسی علاقے کی مربوط تاریخ پیش کرنا سفر نامہ نگار کی ذمہ داری نہیں مگر وہ اپنے عہد کے تاریخی شواہد کو تخلیقی انداز سے برت سکتا ہے۔ سفر نامے کے تاریخی حصوں میں احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ سفر نامہ نگار کو تاریخ اور جغرافیہ کو سفر نامے پر حاوی نہیں ہونے دینا چاہیے، توازن رکھنا چاہیے۔

سفر نامہ کسی ملک کے تاریخی شواہد کو نظر انداز کر سکتا ہے نہ جغرافیائی حقائق سے نظر بچا کر نکل سکتا ہے۔ کیونکہ سیاح ماضی میں جھانکتے ہوئے تاریخ کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی بہتے دریا، گنگناتے چشمے، بے کراں سمندر، عظیم الجثہ پہاڑ اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور وہ فطرت کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ لیکن سفر نامہ نگار کو جامد و ساکن اشیا پر زیادہ توجہ صرف کرنے کی بجائے ان لطیف کیفیات پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے جو اس کی بصری قوتوں کو متاثر کرنے کا سبب بنے ہوں۔"[۱۴۸]

قدیم سفر ناموں میں سیاحوں نے بہت احتیاط سے کام لیا۔ اسی لیے اب وہ اس دور کی معاشرت، تاریخ کا مستند اور اہم ماخذ سمجھے جاتے ہیں۔ سفر نامے اپنے عہد کی تاریخی و سماجی دستاویز ہیں اس لیے اگر آج سیاح سفر ناموں میں دور حاضر کے واقعات کو صحیح تاثر کے ساتھ پیش کر دے تو مستقبل کا مورخ تاریخی و ثقافتی نتائج اخذ کرنے میں ان سے مدد لے سکتا ہے۔ البتہ ان معلومات کو سفر نامے کا حصہ بناتے وقت سیاح کو احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ محتاط ہو کر قابل

بھروسہ معلومات اور حقیقت سے قریب چیزوں کو سفر نامے کی بنت میں جگہ دینی چاہیے۔ سفر ناموں میں تہذیب و ثقافت کی پیشکش کے بغیر سفر نامے مکمل نہیں کہلائے جاسکتے۔

حواشی

1. ڈاکٹر مبارک علی، "کلچر اور سماجی تبدیلی" مشمولہ سہ ماہی تاریخ لاہور: فکشن ہاؤس، شمارہ 23 (اکتوبر2004ء)، ص36۔
2. ول ڈیورانٹ، ہیروز آف ہسٹری(تہذیب کی مختصر کہانی، قدیم سے جدید دور کی ابتدا تک)مترجم: یاسر جواد(لاہور: نگارشات پبلشرز، س ن)، ص18۔
3. احمد ندیم قاسمی،تہذیب و فن جلد اول(لاہور: پاکستان فاؤنڈیشن، 1975ء)، ص76۔
4. ایضاً، ص77 تا 78۔
5. ایضاً، ص77۔
6. ایضاً، ص78۔
7. ایضاً، ص79۔
8. ایضاً، ص82 تا 83۔
9. ایضاً، ص88۔
10. ایضاً، ص91۔
11. ایضاً، ص91۔
12. ایضاً، ص95۔
13. ایضاً، ص96۔
14. ایضاً، ص97۔
15. ایضاً، ص29۔
16. ایضاً، ص140۔
17. محمد حسن عسکری، مقالات محمد حسن عسکری جلد دوم، مرتب: شیما مجید(لاہور: علم و عرفان پبلشرز۔ 2001ء)، ص22۔

18. ایضاً، ص18۔

19. ایضاً، ص48۔

20. ایضاً، ص56۔

21. ایضاً، ص49۔

22. ایضاً، ص57۔

23. ایضاً، ص50۔

24. ایضاً، ص57۔

25. ایضاً، ص51۔

26. ایضاً، ص58۔

27. ایضاً، ص62۔

28. ایضاً، ص72۔

29. شہزاد منظر، محمد حسن عسکری تنقیدی مطالعہ (کراچی: اورنگ پبلی کیشنز، 2012ء)، ص 115۔

30. زوار حسین، تہذیب (ملتان: بیکن بکس، 2000ء)، ص10 تا 11۔

31. ایضاً، ص9۔

32. ایضاً، ص13۔

33. ایضاً، ص15۔

34. ایضاً، ص20۔

35. ایضاً، ص22۔

36. ایضاً، ص41۔

37. ایضاً، ص44 تا 48۔

38. سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء (کراچی: مکتبہ دانیال، طبع ہشتم، 1989ء)، ص9 تا 12۔

39. ایضاً، ص13۔

40. ایضاً، ص14۔

41. ایضاً، ص19 تا 25۔

42. ایضاً، ص25 تا 31۔

43. ایضاً، ص32۔

44. ایضاً، ص33۔

45. ایضاً، ص40۔

46. ایضاً، ص44 تا 46۔

47. ایضاً، ص48 تا 51۔

48. ایضاً، ص400۔

49. ایضاً، ص402۔

50. ایضاً، ص404۔

51. ایضاً، ص410۔

52. سبط حسن، ماضی کے مزار (کراچی: مکتبہ دانیال، طبع ہفتم، 1986ء)، ص23۔

53. سجاد باقر رضوی، تہذیب و تخلیق (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 1987ء)، ص67۔

54. ایضاً، ص71۔

55. ایضاً، ص72 تا 75۔

56. ڈاکٹر سلیم اختر، ادب اور کلچر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2001ء)، ص310 تا 312۔

57. ایضاً، ص312۔

58. ایضاً، ص315۔

59. ایضاً، ص320 تا 325۔

60. ایضاً، ص330۔

61. عارفہ فرید، پاکستانی کلچر کی روایات (کراچی: رائل بک کمپنی، 1993ء)، ص4۔

62. ایضاً، ص13 تا 22۔

63. ایضاً، ص47۔

64. ایضاً، ص57 تا 60۔

65. ایضاً، ص95 تا 115۔

66. ڈاکٹر عبادت بریلوی، پاکستان کے تہذیبی مسائل (لاہور: ادارہ ادب و تنقید، 1971ء)، ص14۔

67. ایضاً، ص15 تا16۔

68. ایضاً، ص61۔

69. ایضاً، ص12۔

70. ایضاً، ص13۔

71. علی عباس جلالپوری، روایات تمدن قدیم (جہلم: خرد افروز، 1991ء)، ص9۔

72. ایضاً، ص10۔

73. مہر اختر وہاب، اردو میں اسلامی ادب کی تحریک (اسلام آباد: پورب اکیڈمی، 2010ء)، ص224۔

74. علی عباس جلالپوری، کائنات اور انسان (لاہور: تخلیقات، 2000ء)، ص76۔

75. ایضاً، ص81۔

76. ایضاً، ص107۔

77. ایضاً، ص130۔

78. علی عباس جلالپوری، روح عصر (لاہور: تخلیقات، طبع پنجم، 2002ء)، ص208۔

79. علی عباس جلالپوری، تاریخ کا نیا موڑ (لاہور: تخلیقات، طبع چہارم، 2005ء)، ص9۔

80. ڈاکٹر غلام جیلانی برق، ہماری عظیم تہذیب (لاہور: الفیصل ناشران، 2014ء)، ص9۔

81. ایضاً، ص13۔

82. ایضاً، ص15 تا16۔

83. ایضاً، ص19۔

84. ایضاً، ص188۔

85. ایضاً، ص234۔

86. شیما مجید، "حرف تقدم" فیض احمد فیض اور پاکستانی ثقافت از فیض احمد فیض (کراچی: پاکستان سٹڈی سنٹر، 2006ء)، ص11۔

87. فیض احمد فیض، فیض احمد فیض اور پاکستانی ثقافت مرتب: شیما مجید (کراچی: پاکستان سٹڈی سنٹر، 2006ء)، ص20۔

88. ایضاً، ص21۔

89. ایضاً،ص23تا25۔

90. ایضاً،ص32تا37۔

91. ایضاً،ص96تا98۔

92. سید ابوالاعلیٰ مودودی،اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی(لاہور:اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ،1966ء)،ص6تا7۔

93. ایضاً،ص7تا8۔

94. ایضاً،ص8تا10۔

95. ایضاً،ص57تا59۔

96. ایضاً،ص77۔

97. ایضاً،ص95تا99۔

98. ایضاً،ص100۔

99. ایضاً،ص115تا116۔

100. ایضاً،ص123۔

101. ایضاً،ص195۔

102. ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب میں سفر نامہ(لاہور:مگربی پاکستان اردو اکیڈمی،1987ء)،ص14۔

103. ڈاکٹر قدسیہ قریشی،اردو سفرنامے انیسویں صدی میں(نئی دہلی:مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،1987ء)، ص31۔

104. ڈاکٹر انور سدید،اردو ادب میں سفرنامہ، محولہ بالا،ص49۔

105. خالد محمود،اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ(نئی دہلی:مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،2011ء)،ص7۔

106. ایضاً،ص21۔

107. 1ڈاکٹر سلیم اختر،ادب اور کلچر(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2001ء)،ص256۔

108. ڈاکٹر صدف فاطمہ،خواتین کے اردو سفرناموں کا تحقیقی مطالعہ(کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،2011ء)،ص10۔

109. ڈاکٹر انور سدید،اردو ادب میں سفرنامہ، محولہ بالا،ص52۔

110. ایضاً،ص59۔

111. ایضاً،ص716۔

112. ایضاً،ص715۔

113. ایضاً،ص715۔

114. ایضاً،ص717۔

115. خالد محمود،اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، محولہ بالا،ص36۔

116. ڈاکٹر قدسیہ قریشی،اردو سفرنامے انیسویں صدی میں، محولہ بالا،ص50۔

117. ایضاً،ص256۔

118. ڈاکٹر صدف فاطمہ،خواتین کے اردو سفرناموں کا تحقیقی مطالعہ، محولہ بالا،ص5۔

119. ایضاً،ص12۔

120. ڈاکٹر انور سدید،اردو ادب میں سفرنامہ، محولہ بالا،ص74۔

121. پروفیسر رئیس قمر،"پیش لفظ"،اردو سفرنامے انیسویں صدی میں از ڈاکٹر قدسیہ قریشی، محولہ بالا،ص11۔

122. ڈاکٹر انور سدید،اردو ادب میں سفرنامہ، محولہ بالا،ص19۔

123. ایضاً،ص56تا58۔

124. ایضاً،ص72تا73۔

125. ایضاً،ص74۔

126. ایضاً،ص70۔

127. ڈاکٹر قدسیہ قریشی،اردو سفرنامے انیسویں صدی میں، محولہ بالا،ص62۔

128. ڈاکٹر صدف فاطمہ،خواتین کے اردو سفرناموں کا تحقیقی مطالعہ، محولہ بالا،ص14۔

129. خالد محمود،اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، محولہ بالا،ص32۔

130. ایضاً،ص308۔

131. ڈاکٹر سلیم اختر،ادب اور کلچر، محولہ بالا،ص257۔

132. ایضاً،ص257تا260۔

133. ڈاکٹر صدف فاطمہ،خواتین کے اردو سفرناموں کا تحقیقی مطالعہ، محولہ بالا،ص14۔

134. ڈاکٹر انور سدید،اردو ادب میں سفرنامہ، محولہ بالا،ص65تا69۔

135. خالد محمود،اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، محولہ بالا، ص59۔

136. فرحت وثیر،1990ء سے 2004ء تک کے سفرناموں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ (غیر مطبوعہ تحقیقی مطالعہ، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی،لاہور،2005ء)، ص39۔

137. خالد محمود،اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، محولہ بالا، ص8۔

138. ڈاکٹر صدف فاطمہ،خواتین کے اردو سفرناموں کا تحقیقی مطالعہ، محولہ بالا، ص370۔

139. ڈاکٹر انور سدید،اردو ادب میں سفرنامہ، محولہ بالا، ص52۔

140. خالد محمود،اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، محولہ بالا، ص64۔

141. ڈاکٹر قدسیہ قریشی،اردو سفرنامے انیسویں صدی میں، محولہ بالا، ص154۔

142. ڈاکٹر انور سدید،اردو ادب میں سفرنامہ، محولہ بالا، ص52۔

143. فرحت تاثیر،1990ء سے 2004ء تک کے سفرناموں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ (غیر مطبوعہ تحقیقی مطالعہ، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی،لاہور،2005ء)، ص8۔

144. ڈاکٹر قدسیہ قریشی،اردو سفرنامے انیسویں صدی میں، محولہ بالا، ص29۔

145. ایضاً، ص217تا225۔

146. ایضاً، ص225۔

147. ایضاً، ص256۔

148. خالد محمود،اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، محولہ بالا، ص30۔

باب سوم

شمالی پاکستان کی تہذیب و ثقافت

باب سوم

شمالی پاکستان کی تہذیب و ثقافت

شمالی پاکستان متنوع ثقافت کا حامل خطہ ہے۔ مخصوص جغرافیائی تناظر میں مختلف علاقے بہت عرصے تک باقی دنیا سے کٹے رہے۔ اس لیے ان میں پروان چڑھنے والی مخصوص ثقافت بیرونی اثرات سے محفوظ رہی۔ سڑکوں کی تعمیر سے آمدورفت کے ذرائع میں بہتری آنے سے ان علاقوں کی ثقافت تیزی سے تبدیلیوں کی زد میں ہے، مگر پچھلی صدی تک تبدیلی کا عمل سست تھا۔ ثقافت ایک طرز فکر، تخلیقی روایت اور طرز معاشرت کا نام ہے۔[1] مقالے کے زیر مطالعہ باب میں شمالی پاکستان کے علاقوں گلگت، ہنزہ، نگر، دیامیر، بلتستان، چترال، سوات اور وادئ کاغان کی تہذیب و ثقافت کے مختلف پہلوؤں معاشرت، سماجیات، عقائد و ایمانیات، فنون لطیفہ، تمدن اور لسانیات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ معاشرت کی ذیل میں ان علاقوں کا رہن سہن، خوراک، لباس، حسن و زیبائش اور عادات و اخلاق کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جبکہ سماجیات کے تحت ان علاقوں کے پیشے، دستکاریاں، رسم و رواج، کھیل، تفریح، تعلیم و تربیت کا احاطہ کیا گیا ہے۔ عقائد و ایمانیات کی ذیل میں ان علاقوں کے مذہبی عقائد، مذہبی رسوم اور افکار زیر بحث لائے گئے ہیں۔ فنون لطیفہ میں ان علاقوں کا لوک ادب، شاعری، موسیقی اور رقص کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تمدن کے تحت ان علاقوں کے فن تعمیر اور علم و فن جبکہ لسانیات کی ذیل میں ان علاقوں کی زبان کا احاطہ کیا گیا ہے۔

ان علاقہ جات کی آبادی بڑھنے سے اور سہولیات کی فراہمی سے مقامی زبان و ادب متاثر ہوئے ہیں۔ مقامی ثقافت پر اثر پڑا ہے۔ مقامی پیشے جو آبائی پیشے چلے آرہے تھے ناپید ہوگئے ہیں۔ پرانی اقدار، پرانے رسم و رواج متاثر ہوئے ہیں۔ طور طریقوں میں غیر محسوس طریقے سے بدلاؤ آیا ہے۔ جب کوئی سماجی طبقہ کسی مخصوص جگہ پر صدیوں تک مخصوص طرز زندگی گزارے تو اجتماعی طرز زندگی کا خاص انداز جنم لیتا ہے، یہ اجتماعی زندگی تمام جذبات و احساسات، سماجی رویوں کے ساتھ ساتھ اس طبقے کی لوک زندگی یا عمومی زندگی کی مظہر ہوتی ہے۔ مشترکہ لوک زندگی کے رویے انسان کو اکٹھا رکھتے ہیں اور وابستگی کا احساس فراہم کرتے ہیں۔ لوک ادب صدیوں سے جاری بتدریج عمل اور معاشرے کے اجتماعی طور طریقوں کا عکاس ہے۔[2] شمالی پاکستان میں جن زبانوں میں تحریری سرمایہ نہیں لوک گیتوں کی صورت میں ادبی سرمایہ ضرور محفوظ ہے جو صدیوں پرانا ہے۔ زبانیں مختلف معاشروں کی شناخت میں مدد و معاون ہوتی ہیں۔ زبان اور معاشرے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ثقافتیں زبان کے توسط سے ہی بنتی اور زندہ رہتی ہیں۔ ہندوکش کے راستے ہندوستان آنے والے آریا نسلی تفاخر میں مبتلا تھے۔ انھوں نے ارفع تہذیب کی علمبردار دراوڑ قوم کو ملیچھ، داسو اور راکش جیسے القابات سے نوازا مگر اس کے تہذیبی اثرات کو قبول بھی کیا۔ یہاں کی بولی پشاچہ کو ماہرین لسانیات قدیم پراکرتوں میں شامل کرتے تھے۔ پشاچہ بولنے والوں پر سخت جغرافیائی ماحول کے اثرات پڑے اور انھی کے علاقے

دردستان کا محور و مرکز رہے۔ اس لیے یہاں بولی جانے والی زبانوں کو داردک کہا جاتا تھا۔ دارد قبائل نے گلگت اور گردونواح میں بروزہا قبائل کو مغلوب کرکے مطیع کیا تو وہ بروزائی (ابتدائی بروشسکی) بولتے تھے۔ پشاچی پراکرت نے کشمیری کو لسانی ڈھانچہ فراہم کیا اور مختلف زبانوں کے کئی سانچے تیار کیے۔ انڈس کوہستان، داریل، تانگیر، چلاس، استور، غذر، گلگت، پنیال میں کوہستانی اور شنا کو جنم دیا۔ کشمیر میں کشمیری کو، چترال، غذر، یاسین، اشکومن میں کھوار اور جنوبی چترال میں کافر زبانوں کو جنم دیا۔ شنا دردیسا کی زبان بنی اور قبائل کی حرکت کے ساتھ ساتھ پھیلتی گئی۔[3] قدیم دردستان میں گیارہ مختلف اہم زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہاں کے ساٹھ فیصد لوگ شنا زبان بولتے ہیں۔ چترال میں کھوار، کلاشہ اور شنا کی ذیلی بولی لہجے کی تبدیلی کے ساتھ پھلوار، یاسین اور اشکومن میں شنا، کھوار، بروشسکی اور واخی، گلگت میں زیادہ تر شنا کچھ جگہوں پر بروشسکی،، ہنزہ میں بروشسکی اور چند علاقوں میں ڈومکی اور واخی، بلتستان میں بلتی، چلاس میں شنا اور کوہستان کے نیچے کے علاقوں میں کوہستانی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ واخی آریائی زبان ہے۔ بلتی تبتی زبان ہے۔ کھوار، کلاشہ اور کوہستانی، کشمیری دردی زبانیں ہیں۔ ڈومکی ہند آریائی ہے۔[4] یہاں کی الگ الگ زبانوں کو اسلام قریب لایا۔[5] پہلے علاقائی زبانیں مرکزی وحدت نہیں بن سکی تھیں۔ اسلام کے بعد اردو نے ان زبانوں کو متاثر کیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عظمیٰ سلیم کہتی ہیں:

> "شمالی علاقہ جات میں ماضی میں بسنے والی اقوام اور کی تہذیب و ثقافت پر سب سے پہلے بدھ مت کے اثرات سے سنسکرت، پھر مغلوں کے اثر سے فارسی، افغانوں کے اثر کے باعث پشتو، سکھوں کے اثر سے پنجابی اور اردو، پھر ڈوگروں کے اثرات کے باعث ڈوگری اور اردو اور بعد میں انگریزوں کے آجانے سے انگریزی اور اردو کے پھیلاؤ تک لسانی تغیرات کے نتیجے میں یہاں اردو کا اثر گہرا ہو گیا۔"[6]

ابتدا میں یہاں کی مقامی زبانوں کو ان کے بنیادی رسم الخط کی بجائے رومن رسم الخط میں تحریر کرنے کی کاوشیں ہوئیں مگر بعض حروف کی ایک سے زائد آوازیں اور انگریزی کی نامانوسیت راہ میں حائل ہوئی۔ اردو کے حروف تہجی اور رسم الخط مقامی زبانوں کی صورت ادا کرنے کا فریضہ انجام دینے کے قابل تھا۔ اور عربی رسم الخط سے قربت کے باعث مذہبی پسندیدگی بھی ملی تو اردو رسم الخط جلد قبول عام کا درجہ اختیار کر گیا۔[7] یہاں کا ادب کچھ مستعار اور کچھ مقامی رنگ کا حامل ہے۔ اس میں منظوم و منثور دونوں اصناف شامل ہیں۔ لوک ادب میں حکایات، دیومالائی قصے، سورمائی نغمے، لوریاں، بجھارتیں، شکار اور شادی بیاہ کے گیت شامل ہیں۔ یہاں مشترکہ مقامی ادبی ورثے میں کیسر داستانوں اور شکاری کے ہاتھوں زخمی ہرنی اور اس کے بچے کا آخری مکالمہ بہت معروف ہیں۔[8] خاص مواقع پر تواتر سے انجام دیے جانے والے خاص افعال کو رسم کہا جاتا ہے۔ شمالی علاقوں کے مختلف حصوں میں مختلف رسوم و رواج منائے جاتے ہیں جبکہ کچھ رواج پورے شمالی خطے میں مشترک بھی ہیں صرف ان کے نام مختلف ہیں۔ اسی طرح کچھ کھیل چند علاقوں میں انفرادی نوعیت کے کھیلے جاتے ہیں جبکہ کچھ مشترک ہیں جیسے پولو۔ ماضی میں یہاں مختلف مذاہب کے اثرات رہے ہیں۔ اسلامی

عقائد کی بات کریں تو گلگت، نگر، حراموش اور بگروٹ کے علاقوں میں شیعہ مسلک بلتستان کے وسیلے سے پروان چڑھا۔ ہنزہ، اشکومن، یاسین، گوپس اپنے محل وقوع اور پامیر وواخان سے متصل ہونے کے باعث اسماعیلیت کے فروغ کا سبب بنے۔ غذر، پنیال، اشکومن میں چترالی حکمرانوں کی وجہ سے کسی حد تک سنی مسلک پھیلا۔ جبکہ چلاس اور داریل و تانگیر کے علاقوں میں سوات اور ہزارہ سے متصل ہونے کے باعث سنی مسلک پروان چڑھا۔[9]

پہلے آبائی پیشوں کو اپنانے کا پختہ رواج تھا جو اب بدل چکا ہے۔ 1990ء کے بعد یہاں کسی حد تک صنعتی شعور آیا۔ محدود پیمانے پر مقامی افراد چھوٹی صنعتوں کی طرف مائل ہوئے جیسے فلور ملیں، سنگ مرمر کا کاروبار، مقامی دستکاریاں، مقامی ظروف سازی وغیرہ۔ پھلوں اور خشک میوہ جات کی تجارت سے بھی بہت سے لوگوں کا روزگار وابستہ ہے۔ اب سرکاری ملازمتیں بھی یہاں صرف مقامی افراد کے لیے مخصوص ہیں۔ مختلف غیر سرکاری تنظیموں سے وابستگی کا رجحان بڑھا ہے۔ سیاحت اہم ذریعہ معاش ہے۔ اس کی نسبت سے ہوٹلوں کا کاروبار پسندیدہ ہے۔ ملکی و غیر ملکی سیاحوں کی رہنمائی کے لیے بطور گائیڈ، کوہ پیا ٹیموں کے ساتھ بطور پورٹر بہت لوگ کام کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں نایاب جڑی بوٹیاں بھی معاش کا ذریعہ ہیں۔[10] یہاں مختلف علاقوں کے درمیان رابطہ سڑکوں کی موجودگی سے ٹرانسپورٹ کے شعبے سے بھی بہت افراد وابستہ ہیں۔ تعلیم کی صورتحال ماضی میں یہاں مخدوش رہی۔ انگریزوں کی آمد کے بعد بہتری آئی۔

موسیقی کسی بھی علاقے میں بسنے والوں کے رسم و رواج، ثقافت اور مزاج کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہ ثقافت کے اہم عناصر میں شامل ہے۔ شمالی خطے میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں ہر موسم کا تہوار منایا جاتا تھا اور ہر تہوار کی ابتدا اور اختتام موسیقی پر ہوتا تھا۔[11] یہاں موسیقی ہر دور میں اہم رہی ہے۔ ہنزہ کے سازندے مخصوص زبان ڈومکی بولتے ہیں۔

> "بلتستان پر بدھ مت اور زرتشت کے اثرات رہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ موسیقی اس دور میں بھی مذہب اور خوشی کے لمحات سے تعلق رکھتی تھی مغلوں کی آمد سے قبل ہی ایرانی موسیقی بھی یہاں پہنچ چکی تھی۔ آج بھی اس کی آمیزش محسوس کی جاسکتی ہے۔"[12]

یہاں کے اہم آلات موسیقی میں سرنائی، ڈونگ (ڈھول نما)، ڈامل (طبقہ نما ساز)، بانسری، رباب اور ستار شامل ہیں۔ خواتین کا محفلوں میں گلوکاری کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مگر مذہبی گلوکاری میں وہ مردوں سے آگے ہیں اور ان کے صوفیانہ کلام کے کیسٹ بازار میں بہت طلب کیے جاتے ہیں۔[13]

یہاں سب سے زیادہ انحصار موسم پر کیا جاتا ہے اور سب سے ناقابل اعتبار شے بھی موسم ہے۔ موسم کی شدت عام روزمرہ زندگی اور مقامی لوگوں کے مزاج پر بھی اثرانداز ہوتی ہے۔ سرد موسم کے باعث کھانے پینے میں تاثیر میں گرم اشیا کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ خشک پھل اور گوشت یہاں کی مرغوب غذا ہے۔[14]

شمالی پاکستان قبل از تاریخ سے آباد ہے۔ یہاں پتھر کے زمانے میں انسانی موجودگی کے شواہد ملے ہیں۔ پھر یہاں مختلف ادوار میں مختلف اقوام آتی رہی ہیں اس لیے یہاں کی تہذیب میں ان کے اثرات بھی موجود ہیں۔ جیسے چولہوں کا احترام اور مخصوص تہوار پر مشعلیں جلانے کی رسم زرتشت دور کی یادگار ہیں۔ شکاری دور کے انسان نے پتھروں پر اپنی موجودگی کے شواہد ثبت کیے ہیں۔ بدھ مت بھی ان علاقوں میں پروان چڑھا۔ مختلف تہذیبوں کے عروج وزوال کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے سبط حسن کہتے ہیں:

"پتھر کی تہذیب ہو یا کانسے لوہے کی بہر حال انسانوں ہی کی جسمانی اور ذہنی محنتوں کی تخلیق ہوتی ہے۔ انھی کے ذہنی اور جسمانی قوی کے حرکت میں آنے سے وجود میں آتی ہے۔ لہٰذا کسی تہذیب کے عروج وزوال کا انحصار اسی بات پر ہوتا ہے کہ تہذیب کو برتنے والوں نے اپنی جسمانی و ذہنی توانائی سے کس حد تک کام لیا ہے۔ اس توانائی میں اپنی توانائی آفریں تخلیقات سے کتنا اضافہ کیا ہے۔"[15]

تہذیبوں کے زوال کی تاریخ دراصل ان کے آلات واوزار اور معاشرتی رشتوں کے جمود کی تاریخ ہے۔ ہمیشہ ایک زوال پذیر معاشرہ ترقی پذیر معاشرے کے ہاتھوں زک اٹھاتا ہے۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب پر آریا کے غالب آنے کی وجہ یہی تھی کہ ان کے آلات و اوزار یہاں کے قدیم باشندوں سے زیادہ مضبوط تھے۔ اہل مغرب کے ہندوستانیوں پر تسلط کے پس پردہ عوامل میں ان کا ترقی یافتہ معاشرتی نظام اور بہتر آلات و اوزار اہم رہے۔ شمالی پاکستان میں بھی مختلف ریاستوں یا قبائل کے دیگر قبائل پر فتح اور بیرونی حملہ آوروں کے یہاں آکر قبضہ کرنے اور حکومتیں بنانے میں ایسے ہی عناصر کارفرما تھے۔ لیکن یہاں مختلف تہذیبیں ایک دوسرے سے برابر اخذ و قبول کرتی رہی ہیں۔

گلگت

گلگت میں ماضی میں مشترکہ رہن سہن کا نظام رائج تھا۔ ماضی کے ظالمانہ بیگار کے نظام نے مشترکہ رہن سہن کے نظام کو رواج دیا کیونکہ کار بیگار فی چولھا کے حساب سے مقرر تھا۔ ایک کنبے سے ایک فرد لیا جاتا تھا۔ والدین کی زندگی میں بیٹوں کا علیحدہ رہنا معیوب سمجھا جاتا تھا، اب یہ رواج دم توڑ رہا ہے۔ مرد گھر کی ضروریات مہیا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں جبکہ عورتیں غلہ صاف کرنے، دودھ دوہنے، کھانا پکانے، کپڑے دونے، گھر کی صفائی ستھرائی کے کام انجام دیتی ہیں۔ گھر کی مالکن، اناج اور دیگر قیمتی سامان کی کنجیاں سینے کے بائیں جانب قمیض کے ساتھ ایک پرس میں ٹانک دیتی ہے۔ آتش دان تین پتھر تکونی انداز میں رکھ کر بنایا جاتا تھا۔ پتھر کی سلوں کو اس پر رکھ کر حسب ضرورت روٹی بھی بناتے تھے۔ دیا سلائی کا کام چقماق سے لیتے تھے۔ پہلے یہاں ایک دوسرے سے آگ مانگ کر چولہا جلانے کا رواج تھا۔ ہمسایوں سے کشیدگی کے دوران آگ دینے سے بھی گریز کیا جاتا تھا۔ پہلے چربی کے دیے جلائے جاتے پھر مٹی کا تیل استعمال ہونے لگا۔ لکڑی کے برتنوں کا استعمال پچھلی صدی تک بھی عام تھا۔ اس سے پہلے پتھر کے برتنوں کا بھی رواج تھا۔ یہاں اشیا کے بدلے اشیا سے لین دین کرتے تھے۔ رقم کی عدم موجودگی میں بچے بھی تھوڑا اناج دکاندار کو دے کر

اس کے بدلے مٹھائی یا ضرورت کی اشیا لیتے تھے۔ ماضی میں یہاں مخصوص ایام کے دوران خواتین کو غلیظ اور ناپاک شے قرار دے کر گاؤں کے کنارے بنے مخصوص مکان میں ڈال دیا جاتا تھا۔ بعض علاقوں میں غیر شادی شدہ خواتین کے سروں پر اونی پٹو کی سفید ٹوپی جبکہ شادی شدہ خواتین کے سروں پر کالی ٹوپی کا بھی رواج تھا۔ بیوہ نقش و نگار کے بغیر سادہ کالی ٹوپی پہنتی تھی۔ پانی کی نالی محلے کے ہر گھر سے ہو کر جاتی تھی۔ جہاں پتھر کی سلوں پر خواتین کپڑے دھوتی تھیں۔ لکڑی کے ڈنڈے تھناس سے کپڑے دھوئے جاتے اور بغیر استری کے پہنے جاتے۔ استور میں دیگچی نما برتن میں کھولتا پانی ڈال کر استری کا کام لیتے تھے۔ سردیوں میں صرف ایک یا دو بار کپڑے دھوئے جاتے تھے۔ سال میں ایک بار فروری یا مارچ میں کوہلوں اور نالیوں کی صفائی کے لیے دو ہفتے تک پانی بند رکھا جاتا تھا۔ کھیتوں میں گوڈی کا کام عورتوں کے سپرد تھا۔ سردیوں کے آغاز پر نوجوان مل کر چراگاہوں سے مال مویشی لانے والوں کا استقبال کرتے تھے۔ دیہات میں مکانوں کی چھتوں پر جانوروں کے سردیوں کے چارے کے طور پر گھاس کا ذخیرہ کیا جاتا تھا۔[16]

ماضی میں سورج، چاند تاروں سے وقت کے تعین میں مدد لیتے تھے۔ مرغے کی بانگ سے بھی مدد لی جاتی تھی۔ پہلی بانگ ایک بجے کے قریب ہوتی جسے سن کر سحری کے لیے جاگتے اور وقفے وقفے سے دی جانے والی بانگوں کے بعد طلوع سحر کے وقت روزہ کا وقت شروع ہو جاتا۔ نماز کے اوقات، مریضوں کو دوا پلانے اور کام کاج شروع کرنے کے لیے وقت کا اندازہ سورج اور مرغ کی بانگ دونوں سے لگاتے تھے۔ قطبی ستارہ، دب اکبر، کہکشاں اور ثریا کی بدلتی کیفیات سے رات کے مختلف پہروں کا پتہ لگاتے تھے۔ ہر مہینہ تیس دن کا اور انگریزی کی اکیس تاریخ سے شروع ہوتا تھا۔[17] زمانہ قدیم میں لوگ اپنی عمروں کا حساب مختلف واقعات کے حوالے سے رکھتے تھے۔ ان اہم واقعات میں تاج مغل کا حملہ، گوہر امان کا حملہ، نگر کی لڑائی، بھوپ پڑی سنگھ کی جنگ، ڈوگروں کا قبضہ، 1892ء کا بندوبست اول، 1911ء کا بندوبست ثانی، 1905ء کا سیلاب، 1935ء کا پٹہ معاہدہ، نومبر 1947ء گلگت کی آزادی شامل ہیں۔ چیزوں کو ماپنے کے لیے ہاتھوں، بازوؤں اور قدموں کا سہارا لیا جاتا تھا۔ شناگنتی عربی سے ملتی جلتی ہے۔ ہمسائے کوئی چیز ادھار لیتے تو اسی برتن میں واپس کرتے تھے جس میں لیتے تھے۔[18]

ماضی میں یہاں کاہنوں کے مشورے پر بچوں کے نام رکھے جاتے تھے۔ ماضی قریب تک لوگ اپنے ناموں کے آخر میں سنگھ لگاتے تھے۔ جب نرینہ بچے کچھ عرصے تک مر جاتے تو ایسی صورت میں نومولود کو جس جانور کا دودھ پلاتے اسی کے نام پر اس کا نام رکھتے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے اس جانور کی بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت کمزور ہوتی ہے اور متاثرہ خواتین کی بڑھتی ہے۔ عورتوں کے نام شیلی بائی، شوشو بائی، شلی بائی، شلی مارو غیرہ ہوتے ہیں۔ جانوروں کو بھی مخصوص ناموں سے پکارتے تھے۔ لوگوں کے اصل نام بگاڑنے کا رواج عام تھا۔[19]

مذہبی اور جغرافیائی اختلاف کی وجہ سے ایک ہی لسانی گروپ سے تعلق رکھنے والے علاقوں میں بھی روایتی کھانوں اور ان سے متعلقہ طرز بود وباش میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ یہاں عموماً تین دفعہ چائے اور دو دفعہ کھانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ مقامی کھانے مختلف ہونے کے باوجود کھانے کے آداب یکساں ہیں۔ بسم اللہ سے کھانے کا آغاز کرتے ہیں۔ مہمان یا بزرگ کے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانے تک کھانا شروع نہیں کیا جاتا۔ تین تین چار چار آدمی مل کر ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھاتے ہیں۔ مہمان کے کھانے سے ہاتھ کھینچنے تک میزبان کو کھانا کھانا پڑتا ہے۔ پانی پینے کے لیے پہلے ارد گرد کے لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ پئیں۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھو کر دعا پڑھتے ہیں۔ یہاں مخصوص کھانے کو شربت کہتے ہیں جو شادی یا ختنوں کی تقریبات کے لیے بنایا جاتا ہے۔ یہ حلوہ نما ہوتا ہے۔ غذر میں غمی کے موقع پر روایتی کھانا " پھلتی " تیسرے دن بنایا جاتا تھا۔ موت والے گھر تین دن تک رشتہ دار اور ہمسائے کھانا بھیجتے ہیں۔ ان علاقوں میں کئی قسم کی روٹیاں پکائی جاتی ہیں۔ جن میں پچھاؤں، قستہ، تنوری، دھرم پھٹہ، چھٹپیہ، پھلکا، گولہہ اور چھرکیہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں مقامی روایتی کھانوں میں کشی، گل منڈی، رحہ بت، کتی، ذوتی ڈوڈو، دی بارسن، شونتر، پھلئی، پنوشاہ، پے جوہ، اسکرکی، شوپن، ریونگ، اچار شامل ہیں۔ دودھ سے بننے والی چیزوں میں بک، کرغ، برح، موتو دو (دہی)، ہمہ چہ شامل ہیں۔[20]

پنیال میں انگوروں کا رس موردہ بنانے کے یے جمع شدہ انگوروں کو مخصوص برتن میں ڈال کر چار پانچ دن تک رکھتے ہیں۔ پھر ایک آدمی اپنے پاؤں صاف کر کے انھیں پاؤں سے دباتا ہے اور انگوروں کا رس مخصوص جگہ سے دوسرے برتن میں جمع کرتے ہیں اور ڈھکن ٹائٹ کیے بغیر محفوظ کر کے ایک ہفتے تک استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ماضی میں مقامی طور پر انگور سے شراب بنانے کے لیے زمین دوز ٹینکی نما گڑھے بنائے جاتے تھے جنھیں سان کہتے تھے۔ سان میں پتھروں کی سلیں رکھتے تھے اور شگافوں کو چھلکوں سے بھر کر بھیڑ کی گرم چربی سے پلستر کیا جاتا تھا۔ چھت کے درمیان میں شراب نکالنے کے لیے روشن دان کی طرح چھوٹا سا شگاف چھوڑا جاتا تھا۔ دو تین ہفتے میں شراب تیار ہوتی تھی اور سان کے اندر کئی سال تک محفوظ رہ سکتی تھی۔[21]

زمانہ قدیم میں لوگ جانوروں کی کھالوں سے تن ڈھانپتے تھے اور ہڈیوں سے ہتھیار بناتے تھے۔ پھر شعور پیدا ہونے پر جانوروں کی اوون اور بالوں سے بنا اونی لباس زیب تن کرنے لگے۔ علاقائی لباس میں قمیض، شلوار، ٹوپی مشترک ہیں۔ سردیوں میں چوغہ پہننے کا رواج ہے۔ امرا کے چوغوں پر ریشمی دھاگوں کی دیدہ زیب کڑھائی ہوتی تھی۔ اونی کرتے کو مقامی زبان میں پھرن اور شلوار کو حنلو کہا جاتا تھا۔ لباس ڈھیلا ڈھالا ہوتا تھا۔ سفید، کالی اور بھوری ٹوپیوں سے مرد سر ڈھکتے تھے۔ شوقین مزاج مرد حضرات ٹوپی پر روایتی پھول اور پرندے کا چمکدار پر لگاتے تھے۔ ٹوپی کو کھوئی کہا جاتا تھا۔ ننگے سر رہنا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مہمانوں کو روایتی ٹوپی تحفتاً دینا فخر کی علامت تصور ہوتا تھا۔ دو

دوست خوشی کے اظہار کے لیے ٹوپیاں بدل لیتے تھے اور عمر بھر دوستی کے رشتے کو مستحکم رکھتے تھے۔ دیسی اونی ٹوپی کا زیریں حصہ خاصا طویل ہوتا تھا۔ بالائی حصہ تنگ ہوتا۔ اب یہاں چترالی ٹوپی کا رواج ہے۔ بعض اوقات بزرگ کندھوں پر چادر رکھتے تھے جسے کار کہتے تھے۔ علما سروں پر پگڑیاں باندھتے تھے۔ عام لوگ چمڑے کے بنے رنگے ہوئے جوتے پہنتے تھے جو تھوتیے کہلاتے جبکہ خاص لوگ آرائش والے جوتے کوریئے پہنتے تھے۔ غریب لوگ مونج کی بنی ہوئی بان سے پازیب بناتے تھے۔ عورتوں کا لباس شلوار قمیض اور دوپٹے پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس میں دھاگے کی گانٹھ کو بطور بٹن استعمال کیا جاتا تھا۔ زنانہ ٹوپی پر طرح طرح کے پھول بنائے جاتے تھے۔ عورتیں ٹوپی کے اوپر چادر اوڑھتی تھیں۔ اب ٹوپی کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ عورتیں درمیان میں مانگ نکالتی تھیں جبکہ مردوں میں مانگ درمیان میں نکالنا برا سمجھا جاتا تھا۔ دلہن کے روایتی لباس میں گھٹنوں سے تنگ اور تہہ دار شلوار "شروالی" شامل تھی۔ شروالی کے پائنچوں اور قمیض کی کلائی پر بہت خوب صورت پٹی لگائی جاتی تھی جس پر طرح طرح کے سیپ اور لونگ لٹکاتے تھے۔ نظر بد سے بچنے کے لیے بعض مقامات پر پرندوں کے بڑے نوک دار ناخن بچوں کے لباس پر ٹانکتے تھے۔ مرغیوں کے پروں سے سوئی کا کام لیا جاتا تھا۔ یہاں کے روایتی زیورات میں پچولیس، بازی بند، سامله، زمی یا شعئیبے، طوطیہ، کسمیور، چولیے (بالیاں)، اسکاؤ کمتر (قمیض پر لٹکانے کا زیور)، تمر، برونو (انگوٹھی)، حلقہ بند اور بودئیس کاتے (کنگن) شامل ہیں۔[22]

یہاں دیر سے ملنے پر بغل گیر ہونے کا رواج تھا۔ اپنے سے بڑی حیثیت کے لوگوں سے ملتے وقت یا جدا ہوتے وقت ان کے ہاتھوں کو چوما جاتا تھا اور پاؤں چھوئے جاتے تھے۔ عورتیں ایک دوسرے سے ملنے پر مصافحے کے وقت ہاتھ چھوڑے بغیر ایک دوسرے کا گال چومتی تھیں۔ سلام میں چھوٹے پہل کرتے مگر حکمران کے چھوٹوں کو بھی رعایا کے بزرگ تعظیم دیتے اور سلام میں پہل کرتے۔ یہاں رضاعی تعلقات قائم کرنے کے علاوہ خون دینے کی بنیاد پر بھی رشتہ قائم ہونے کی رسم پائی جاتی ہے۔[23] غذر کے بعض علاقوں میں اگر کوئی اجنبی مہمان بھی سر راہ ملے تو مرد کیا خواتین بھی احترام سے سلام کرتی ہیں۔ جبکہ دیگر علاقوں میں ایسا نہیں۔ البتہ مرد حضرات آپس میں اور خواتین آپس میں سلام کرتی ہیں۔ سلام کہتے ہوئے عموماً سر کو جنبش بھی دی جاتی ہے۔[24] یہاں کسی بیمار کی عیادت کو جانے پر لوگ اسے حوصلہ دینے کی بجائے تکلیف پہنچانے اور حوصلہ شکنی کی باتیں کرتے ہیں۔ لوک علاج کے لیے مقامی جڑی بوٹیوں کا استعمال ہوتا تھا۔ چشموں کے پانی سے بھی علاج کی روایات مشہور ہیں۔ جادو کے اثرات زائل کرنے کے لیے سات چشموں کے پانی پر مخصوص دم کر کے متعلقہ شخص کو دیا جاتا تھا۔ دم درود، ٹونے ٹوٹکے اور تعویذوں کا بہت رواج تھا۔[25]

گلگت میں گلیشئروں کی پیوند کاری از منہ قدیم سے جاری ہے۔ مصنوعی پیوند کاری کے ذریعے پانی کی مقدار میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے مخصوص جگہ پر کنواں کھود کر مقررہ تعداد میں نر اور مادہ گلیشئروں سے برف کے بڑے بڑے بلاک مطلوبہ جگہ سے بغیر رکے اور زمین پر رکھے مخصوص گڑھے تک پہنچائے جاتے ہیں۔ ان کے اوپر پیانمک

اور پیا کو ئلہ ڈال کر بند کرتے ہیں۔ سورج کی شعاعیں ان پر براہ راست نہیں پڑنے دیتے۔ خصوصی دیکھ بھال سے کچھ سال میں گلیشئر بڑھنا شروع ہو جاتے ہیں۔[26] یہاں اس طرح کے پالتو گلیشئر خاصی تعداد میں ہیں۔ زرتشت اور بدھ مت کے رائج رہنے کے دوران یہاں تعلیم محض امن و آشتی کے قیام کے اصولوں کو رائج کرنے تک محدود تھی۔ قبول اسلام کے بعد اسلامی اصولوں کی عملی تعلیم اور پرچار کا آغاز ہوا۔ باقاعدہ تعلیم کا آغاز انگریزوں کے بعد ہوا۔ راجگان کے بچوں کے علی گڑھ پڑھنے جانے کے اثرات عام گھرانوں پر بھی پڑے اور ان میں تعلیم کے لیے بیرون ہندوستان بچوں کو بھیجنے کا سلسلہ شروع ہوا۔[27] اب تو یہاں یونیورسٹی بھی موجود ہے۔

یہاں کے اہم پیشوں میں گلہ بانی، کاشتکاری، تجارت شامل ہیں۔ ماضی میں تمام ضروریات مقامی سطح پر پوری کی جاتی تھیں۔ اب معاشرتی قدغنوں کے باعث لوگوں نے آبائی پیشے چھوڑ دیے ہیں۔ پہلے یہاں بھیڑ کی اون سے دھاگہ بنا کر مقامی طور پر تیار کردہ گرم کپڑے کے پٹو سے کمبل، سویٹر، دستانے، گلوبند جرابیں تیار کی جاتی تھیں۔ شکاریوں، چرواہوں اور کھلاڑیوں کی ٹانگوں کے گرد لپیٹنے کے لیے رنگارنگ اونی پٹی بھی خواتین خود تیار کرتی تھیں۔ کاشتکاری کے اوزار پرانے وقتوں میں خود بنائے جاتے تھے۔ یہ بھوج پتر اور پدم کی لکڑی سے بناتے۔ چرواہوں کو مقامی زبان میں تیالو اور اس پیشے کو چوپالی کہتے ہیں۔ یہ بلند و بالا چراگاہوں میں زندگی گزارتے ہیں۔ آج کل اکثر گوجر قوم کے افراد معاوضے پر دیگر اقوام کے مال مویشی پال دیتے ہیں۔ بعض جانور بوجھ ڈھونے کے کام بھی آتے ہیں۔ یہاں زیادہ تر فنون کشمیر سے آئے۔ بڑھئی عمارتوں کے ساتھ ساتھ مقامی ضرورت کے بیشتر ظروف بناتے تھے۔ مرد ایک دوسرے کے بال خود مونڈتے تھے۔ بید کی لچکدار لکڑیوں سے ٹوکری سازی کا فن بھی اہم تھا۔ جولاہے اون سے بہت چیزیں بناتے تھے۔ آٹے کی پسائی کرنے والے چکی والے کو آسیابان کہا جاتا ہے۔ موچی (شئو) چمڑے اور لکڑی کے جوتے بناتے تھے۔ چاندی کے زیورات بنانے والے زرگر کہلاتے ہیں۔ تاجر پیشہ لوگ بھی موجود ہیں۔ ریت سے سونا تلاش کرنے والوں کو سونیوال اور مقامی طور پر مروح کہا جاتا ہے۔ سازندے ڈوم کہلاتے ہیں۔ لوہار پیشہ لوگوں کو اکھر کہتے ہیں۔ یہ فن اتنا ترقی یافتہ نہیں۔ روایتی کشتیوں کے استعمال سے پہلے یہاں دریاؤں اور نالوں کو عبور کرنے کے لیے لکڑی کی بڑی گیلیاں استعمال کرتے تھے۔ انھیں چلانے والوں کو جالوان بولتے تھے۔ لٹھوں کے ٹھاٹھ کے ذریعے بھی دریا پار کرتے تھے۔ اس کے لیے بیلوں کے چمڑے سے تیار کردہ چار پانچ مشکیزوں کے اوپر لٹھوں کے ذریعے ایک قابل نشست جال بناتے تھے۔ اب دریاؤں نالوں پر جابجا پلوں کے بعد جالوان کے پیشے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ معمار یہاں مستری کہلاتے ہیں۔ قدیم زمانے میں ناتراشیدہ پتھروں سے اکہری دیواریں بنانے کا رواج تھا۔ قالین یا دری کی جگہ پرانے زمانے میں شرمہ کا رواج تھا۔ پتھر توڑنے والوں کو مارتولی و جبلی کہتے تھے یہ بہت مہارت کا کام تھا۔[28] وادی اشکومن میں جدید عہد

میں اسی فیصد لوگ ملازمت پیشہ ہیں۔ زیادہ تر درس و تدریس اور فوج میں جانا پسند کرتے ہیں۔ گھریلو صنعتوں کے ساتھ اب نئے شعبوں میں دلچسپی کا رجحان بڑھا ہے۔[28-1]

قدیم گلگت میں حکمرانوں نے طاقت و ہیبت کے قصے گڑھ کر لوگوں کے ذہن مفلوج کیے رکھے۔ انسانی طاقت کو ماورائی مخلوق سے وابستہ کر کے خوف و ہراس کے عجیب تصورات کو جنم دیا گیا۔ فال نکالنا، شگون لینا، بدلتے مناظر سے ٹوہ لینا عام تھا۔[29] یہاں موسموں کی مختلف رسمیں، اعتقادی رسمیں، فصلوں کی رسمیں، کھانے کی رسمیں اور معاشرتی رسمیں وافر تھیں۔ مقامی تہواروں میں دھوم نکھا، نوروز، جشن عذیر،، گلابی ایت، سنوبر نو، عیدین، مردوں کی عید اشار، غنونی، صندل کا تہوار اور چلی شامل ہیں۔ دھوم نکھا اناج سے شیاطین کو بھگاتے تھے، نوروز نئے سال کی خوشی کا تہوار ہے۔ اس پر بچے انڈوں پر رنگ کر کے انھیں آپس میں لڑاتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں اس موقع پر پولو اور دیگر کھیلوں کے مقابلے ہوتے تھے۔ جشن عذیر امامیہ فرقے کے لوگ مناتے ہیں۔ گلابی ایت یعنی گلابوں کی عید ہر جگہ مخصوص موسمی حالات کے مطابق منایا جاتا ہے۔ بہار میں پھولوں کے کھلنے پر اہل گلگت سنوبر و نو نامی تہوار مناتے تھے۔ یہ موسم سرما کی مشکلات کے خاتمے سے متعلق ہے۔ نسالو کی ران اور دم کے حصے کا گوشت اس تہوار کے لیے خاص طور پر سنبھال کر رکھتے۔ عیدین کو بھی جوش و خروش سے مناتے تھے۔ بڑی عید کو قربانی ایت جبکہ عید الفطر کو ژرای ایت کہتے ہیں۔ فصل کی کٹائی کا تہوار غنونی قدیم زمانے میں بہت جوش و خروش سے مناتے تھے۔ صندل کی پوجا کا تہوار بھی منایا جاتا تھا۔ سال کا آخری تہوار چلی ہوتا تھا جو گندم کی بوائی کے ساتھ شروع ہوتا تھا۔ اب گلگت میں جشن آزادی گلگت، جشن بہار کا میلہ، سلک روٹ فیسٹیول، جشن آزادی پاکستان اور شیندور میلہ بھی اہتمام سے مناتے ہیں۔[30] یہاں کے زیادہ تر تہوار زراعت سے منسلک رہے ہیں۔

یہاں بچے کی پیدائش پر رائفل سے فائرنگ کی جاتی اور لوگ مبارک باد دینے پہنچ جاتے۔ لڑکی کی پیدائش پر زیادہ خوشی کا اہتمام نہیں کیا جاتا تھا۔ زچہ کے ہاتھ سے ایک ہفتے سے زائد تک کوئی چیز نہیں کھائی جاتی تھی۔ پیدائش والے گھر شام کے بعد کسی رشتہ دار کا آنا برا خیال کرتے کہ اس سے بچہ بیمار ہو جاتا تھا۔ پہلے وقتوں میں چھوٹے بچوں کو پہلی بار گھر سے باہر نکالتے وقت اور ابتدائی بال کاٹتے وقت بھی بڑوں چھوٹوں کا منہ میٹھا کرایا جاتا تھا۔ سال بعد ڈاڈا کی رسم ادا کرتے۔ پیدائش کے بعد رشتہ داروں کی دعوت روایتی طعام مل سے کرتے۔ اس دعوت میں شریک خواتین زچہ کو انڈوں پیسوں یا کپڑوں کی شکل میں تحفہ دیتی جسے بیاڑ کہا جاتا تھا۔ شادی کے لیے والدین زیادہ تر خود لڑکی پسند کرتے تھے۔ بات پکی کرتے وقت دھاگہ اور چھری یا چاقو لڑکے والوں کو دیتے کہ اگر وعدہ توڑا تو اس کا فیصلہ چھری کرے گی اور کپڑا وعدہ خلافی کرنے والے کا کفن ہو گا۔ بچپن کی منگنی کرتے وقت عموماً بچی کے دامن کا معمولی سا حصہ چاک کیا جاتا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ بچی ہمارے فلاں بچے کی ہوئی۔ شادی سے ایک دن پہلے مہندی کی رسم ہوتی۔ پرانے وقتوں میں

نکاح کے وقت کسی با اثر شخصیت کو لڑکی کے تحفظ کے لیے منہ بولا باپ بنایا جاتا تھا اور اس کا باقاعدہ اعلان کیا جاتا تھا۔ آسانی کی خاطر شادیاں جنوری فروری میں کرتے تھے۔ ادل بدل کی شادی میں معاوضات نہیں لیے جاتے تھے ورنہ رقم لے کر لڑکی دینے کا رواج تھا۔ بعض دفعہ نکاح کے بعد رخصتی خاصی تاخیر سے کی جاتی تھی۔ شادی کی مقررہ تاریخ کو دلہا کے گھر سے دو آدمی "سوچت گر" چار پانچ سیر گھی لے کر دلہن کے گھر لے جاتے تھے۔ ایسا نہ کرنے پر دلھن کے گھر رسم تاؤ ادا نہیں کی جاتی تھی۔ شادی پر دلہا کے کپڑے سفید ہوتے تھے۔ دستار پر چاندی سے بنا زیور لگاتے۔ اس موقع پر پرانے ہتھیاروں کی نمائش بھی کی جاتی تھی۔ جہیز کو مقامی زبان میں ملیک کہا جاتا اور تمام اخراجات جو لڑکی والوں کو لڑکے والے ادا کرتے ژپ کہلاتے تھے۔ قدیم دور میں شادی کے موقع پر نمبردار ترنگفا ٹیکس لیتا تھا۔ تاؤ کی رسم کے دوران رشتہ دار حسب استطاعت مختلف تحائف یا نقد رسم ساتھ لاتے اور قرض سمجھ کر ادا کرتے جسے پندر کہتے ہیں۔ دیسی چولہے پر توا رکھ کر روٹی پکائی جاتی اور توے کو ہاتھ میں اٹھا کر ناچنے کے عمل کو رسم تاؤ کہتے تھے۔ پھر روٹیاں تقسیم کی جاتی تھیں۔ بارات کی روانگی کے موقع پر روایتی ناچ کا اہتمام ہوتا تھا۔ دلہن کے گھر پہنچنے پر بارات پر گندگی پھینکتے تھے اس کا مقصد بے عزتی نہیں بلکہ یہ عقیدہ تھا کہ اس طرح فصلیں اچھی ہوتی ہیں۔ دلہن کے ہاں باراتی دادے کا گانا یعنی اسلاف کے کارناموں یا تعارف پر مبنی گیت گانے تک کھڑے رہتے تھے۔ دلہن کی رخصتی پر آٹا چھڑکا جاتا تھا۔ دلہا کے گھر دلہا دلہن کے قدموں میں بکرا ذبح کر کے ان کے پاؤں خون سے آلودہ کرتے۔ دلہا کے گھر دلہن کی آمد کے فوراً بعد لوگوں کو بڑا کھانا دیا جاتا جسے شنا میں گری تکھہ یا ولیمہ کہتے ہیں۔[31] پہلے کی مثبت قدریں اب منفی بن رہی ہیں۔ ژپ لینا اب شرم سمجھا جاتا ہے جبکہ پہلے لڑکی کے عوض روپیہ لینا لازمی تھا۔ پہلے طلاق کے جرمانے مقرر تھے اب ایسی بات نہیں۔ پہلے عورت مہر ترک کرنے کے علاوہ شوہر کے مطالبے پر اسے کچھ رقم دیتی تو پھر طلاق ہوتی تھی۔ اسے لاتن پوریہ کہتے تھے۔[32]

اشاعت اسلام سے پہلے یہاں مردے جلانے کا رواج تھا۔ قریبی رشتہ داروں کی موت پر گلگت میں تین دن تک گوشت نہیں کھاتے تھے۔ نئی قبر پر رات کو دیا جلایا جاتا تھا۔ بچوں کا جنازے یا میت کا سامنا کرنے کو برا شگون سمجھا جاتا تھا۔ نئے گھر میں ہونے والی پہلی دعوت کو مستوج کہا جاتا ہے۔ جس میں شریک لوگ گھر کے استعمال کی چیزیں تحفتاً دیتے۔ گندم کی کاشت کے وقت بیج بکھیرنے کے تہوار کو بی پھاؤ کہتے تھے۔ خیر و برکت کی دعاؤں کے لیے شاپ کی رسم ادا کرتے۔ موسم سرما کے آغاز پر جانور ذبح کر کے اس کا گوشت محفوظ کرنے کے تہوار کو نسالو کہا جاتا تھا۔ ختنہ کی رسم کو بشمون کہتے۔ پرانے وقتوں میں شیر خواری کی بجائے دس بارہ برس کی عمر تک پہنچنے کے بعد اجتماعی طور پر یہ رسم ادا کی جاتی۔ خود سے کسی کے ساتھ رشتہ جوڑنے کی رسم کو اتی نی کہتے تھے۔ قدیم راجے اپنی اولاد کو پرورش کے لیے مقامی لوگوں کے حوالے کرتے جو ان ہونے پر ان کے اصل والدین کو واپس کی جاتی۔ یہ رشتے حقیقی رشتوں کی طرح نبھائے

جاتے تھے۔ ڈاڈا کی رسم یعنی بچے کو پہلی بار پیٹھ پر اٹھانا یہاں تزک و احتشام سے منائی جاتی تھی۔ شری بدھت کے ظلم سے نجات کی خوشی میں رسم چلی منانے کا رواج تھا۔ پرانے وقتوں میں مجرم کو آگ سے گزار کر بے گناہی ثابت کی جاتی تھی۔[33]

یہاں کے خالص مردانہ کھیلوں میں بلہ (پولو)، گھوڑے کے ساتھ اور پیدل، ایک پاؤں اٹھا کر ایک ہاتھ سے اسے پکڑ کر کشتی کی طرح مقابل کو گرانے کا کھیل بسراہ، بھاری پتھر پھینکنے کا کھیل بھت بھل، نیزہ بازی، تبک بازی (نشانہ بازی)، سمولو (کشتی)، باکسنگ کی طرح کا کھیل مست کاہ، بالدراس تھوئنک (رسہ کشی) شامل ہیں۔ زنانہ کھیلوں میں جھولا جھولنا بلہ سا، کنکروں کو اچھالنے کا کھیل رابیلہ یا چھلے ڈوئیک، سٹاپو کی طرح کا کھیل بلی بلا، پٹہ، یب جھکی وغیرہ شامل ہیں۔ بچوں کے کھیلوں میں آنکھ مچولی، لشی بیش، پنڈوک، ٹکروسا (گلی ڈنڈا)، پٹھو دوئنک، رن ٹھسا (کرکٹ کی طرز کا کھیل)، پہاڑی دوڑ، کھکائیں پھل تھوئنک (اخروٹ پھینکنا)، برونوجپ تھوئنک (انگوٹھی چھپانا)، چھوپے ویوئنک، انڈے لڑانے کا کھیل اور تم دوئنک (تیراکی) مستعمل تھے۔[34] شکار کے حوالے سے لوگ مخصوص عقائد پر عمل پیرا تھے۔ شکار کا گوشت متبرک تصور کیا جاتا۔ اسے کتے، بلی اور بدقماش لوگوں کو نہیں کھلایا جاتا تھا۔ ہڈیاں تک دفنا دی جاتی تھیں۔ شکاری کے لیے پکنے والی روٹی میں پاکیزگی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ شکار کے روایتی طریقوں میں کیگہ اور دھڑپ کو یہ شامل ہیں۔[35] دینیل گلگت کی قدیم تہذیب کا حصہ رہا ہے۔ پدم کے پتوں کی دھونی سے وہ مافوق الفطرت دنیا میں داخل ہو کر پیش گوئیاں کرتا تھا۔ موسیقی کی دھنوں سے وہ مست ہو کر وجد میں آتا تھا۔[36]

مقامی مورخین کے مطابق گلگت میں جن چھے بزرگوں کے ذریعے اسلام پھیلا وہ سنی عقیدہ رکھنے والے وسط ایشیائی ممالک سے آئے تھے۔ تاج مغل نے اسماعیلی عقیدے کو پھیلانے کے لیے گلگت پر حملہ کیا۔ بلتستان کے اثر کے باعث مقپون راجہ شیر خان انجن کے عہد میں گلگت کے راجا مرزا خان نے شیعہ عقائد کو اپنایا۔ جس کے بعد مقامی آبادی میں تبدیلی افکار کا آغاز ہوا۔[37]

یہاں لوگوں میں جو عام توہمات اور تصورات پائے جاتے ہیں ان میں گوپس والوں کا عقیدہ تھا کہ اپنی زمینوں پر پیاز اور مرچ کاشت کرنے سے اہل خانہ میں سے کوئی مر جاتا ہے۔ ناخوشگوار واقعہ پیش آنے پر لوگ کہتے کہ فلاں شخص کا منحوس چہرہ دیکھا اس لیے ایسا ہوا۔ سفر پر جانے سے پہلے فال نکالتے تھے۔ چاند کی چودھویں کو سرسبز درختوں کے نیچے رات گزارنا بدشگونی سمجھتے تھے۔ یہ تصور عام تھا کہ پرانا گھر گرنے سے مالک مکان کی موت ہوتی ہے۔ آگ میں سے بجنے کی آواز مہمان کی علامت سمجھتے۔ رات کو کسی کتے کے رونے کی آواز کو رات کو محلے میں کسی کی موت سے جوڑتے۔ مردہ کی ٹانگ پر ٹانگ ہونا ایک اور موت کی نشانی تصور کرتے۔ آسمان پر ستارے زیادہ نظر آنا جلد بارش اور کم ستارے نظر آنا بارش نہ ہونے سے تعبیر کرتے تھے۔ کسی شخص کا ایک جوتا دوسرے پر ہو تو سمجھتے کہ وہ سفر کرے گا۔

روایتی آتش دان کو پیر کا چولھا تصور کرتے۔ اس کے اوپر سے پھلانگنا باعث عذاب سمجھا جاتا۔ گھروں میں مارخور کے سینگ رکھنا خوش بختی کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ گھوڑوں کو بھی متبرک خیال کرتے تھے۔ نظر بد کے تخیلات بہت عام ہیں۔ ان سے بچنے کے لیے روایتی ٹونے ٹوٹکے اپنائے جاتے تھے۔[38]

گلگت میں شنا کو اہم بولی کی حیثیت حاصل ہے۔ زیادہ حصوں میں یہی بولی جاتی ہے۔

"شنا وطن کا دل شنا کی کا خطہ ہے جو دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر ہربن سے لے کر گورتک واقع ہے۔۔۔ شنا زبان جرمن ماہر لسانیات ڈاکٹر جارج بدرسن کے قول کے مطابق تین ہزار سے پانچ ہزار سال قبل مسیح کی زبان ہے۔"[39]

شنا کبھی درباری زبان نہیں رہی۔ اس کا شمار آریائی زبانوں کے داردی خاندان میں ہوتا ہے۔ شنا زبان اس وقت کی سنسکرت کی ایک شکل ہے جو پہاڑوں میں ایک ہزار قبل مسیح میں داخل ہوئی۔ اس لیے شنا کے ابجد میں سنسکرت زبان میں موجود تمام آوازیں شامل ہیں۔ اتنی قدیم ہوتے ہونے کے باوجود یہ صرف بول چال کی زبان رہی۔ انیسوں صدی کے آخر سے اس کی نثری تحریروں کا ریکارڈ ملتا ہے۔[40] 1838ء میں گلگت کے نوپورہ گاؤں سے ملنے والی قلمی دستاویز میں شنا کا رسم الخط بودھی سنسکرت ہے۔ پر ابتدا سے یہ اردو رسم الخط میں لکھی جاتی رہی۔ حروف تہجی کے اعتبار سے اب تک یہ ابہام کا شکار ہے۔[41]

شنا کے مقامی لہجوں میں بہت فرق ہے۔ ایک علاقے کا شخص دوسرے علاقے میں جائے تو مقامی لوگ لہجے کے باعث با آسانی پہچان جاتے ہیں کہ یہ فلاں علاقے سے آیا ہے۔ متفقہ حروف تہجی کی عدم دستیابی کے باعث یہ تحریری ادب سے محروم رہی ورنہ شنا شاعری اتنی ہی قدیم ہے جتنی شنا زبان۔ لوک گیتوں میں شادی بیاہ کے مخصوص گیت شامل ہیں۔ شعرا اہم تاریخی واقعات کو منظوم انداز میں بیان کرتے۔ پرانا ادب برائے تفریح تھا۔ عصر حاضر کا ادب، ادب برائے زندگی کا علمبردار ہے۔ قدیم زمانے میں پیغامات اشعار پر مبنی ہوتے تھے۔ شاعری قافیہ ردیف کی پابندی سے آزاد تھی۔ یہاں گلوکار کو شاعر اور شاعر کو گلوکار کہنا عام ہے۔ شنا شاعری کو دھن اور ترنم کے بغیر سنانے کا کوئی تصور نہیں تھا۔[42] شنا زبان کا قدیم شاعر دینل کھٹیمو ہے جو کاہن تھا۔ 1842ء سے 1947ء تک شنا شعرا کی توجہ مذہبی شاعری یعنی دعا، نوحہ جات، مناجات، حمد، مدح، قصائد، نعت اور مرثیوں کی طرف مبذول رہی۔ اس دور کے اہم شعرا میں محمد رضا اخوند مہربان، وزیر احمد خان، صمد خان اور خلیفہ رحمت ملنگ گزرے ہیں۔[43] شنا شاعری کا دوسرا دور 1947ء تا 1960ء تک ہے۔ یہ زبان وادب کی ترقی کا دور ہے۔ شاعری کو ضبط تحریر میں لانے کا آغاز اسی دوران ہوا۔ اسی دور میں صوفیانہ کلام اور ولولہ انگیز ملی نغموں کا رواج ہوا۔ تیسرا دور 1960ء سے موجودہ زمانے تک ہے۔ یہ شنا شاعری کے عروج کا دور ہے۔ شاعروں نے معاشرتی ناہمواریوں کو اپنی شاعری کے ذریعے اجاگر کیا ہے۔[44]

یہاں لوک داستانیں سننے کا رواج بہت قدیم ہے ۔ سرما کی طویل راتوں میں دیر تک یہ سلسلہ چلتا تھا۔ ان داستانوں میں مافوق الفطرت قصے، علاقے کی مشہور شخصیات کے قصے، مختلف جگہوں، چیزوں کے قصے تھے۔ فارسی کتب سے اخذ کردہ داستانوں میں الف لیلیٰ، رستم و سہراب، داستان امیر حمزہ، یوسف زلیخا اور گلستان سعدی قابل ذکر ہیں۔ مقامی داستانوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی جاتی ہے۔ محبت، نفرت، انصاف، انتقام کے قصے، مردانہ وجاہت، نسوانی حسن و جمال کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ سب داستانوں میں ناقابل یقین عناصر کی موجودگی مشترک ہوتی ہے۔ یہاں کی لوک کہانیوں میں سومیک اور تلی فر، یچھنی اور دینل کھٹیمو، راجا تراخان اور بولتا کوا، رنی اور اسکا چالاک بیٹا، قصہ یرمس وملنگ جان اور سپیلہ تھے شامل ہیں۔[45]

یہاں پہلے پتھروں سے سادہ مکانات بنائے جاتے تھے۔ درد طرز تعمیر کے مطابق پہلے لکڑی کا فریم تیار کر کے دیوار پر رکھتے پھر پتھر کی بھرائی کرتے۔ کہیں مٹی کا پلاستر بھی چڑھاتے تھے۔ یہاں آتش دان کو مقامی زبان میں بخاری کہتے ہیں۔ دیوار کے اندر ہی مخصوص حصہ زیادہ باہر نکال کر نچلے حصے میں آتشدان بناتے۔ پتھروں کی اکہری دیواروں والے گھروں میں سارا بوجھ ستونوں پر پڑتا ہے۔ دیواریں صرف پردے کا کام کرتی ہیں۔ یہاں مٹی کی اینٹوں کو دستک کہتے ہیں۔ چھتوں اور دیواروں پر پلستر کے لیے گارے میں پائیداری کے لیے گندم کا باریک بھوسہ ملانے کا رواج تھا۔ باغات کی دیواریں پتھر یا مٹی سے بنا کر اوپر نوکدار جھاری لگاتے کہ کوئی آدمی باغ میں داخل نہ ہو اور جانور درختوں کو نقصان نہ پہنچائیں۔ راجوں کے قلعوں کو "کوٹ" کہا جاتا تھا۔ روایتی مکان چار ستونوں پر قائم ہوتا تھا۔ دیومالائی تصورات کے مطابق چھت کے درمیان سوراخ رکھا جاتا ہے۔ مستطیل یا مربع نما گھروں میں مکان کے مرکز میں کھانا پکانے والے برتن رکھنے کے لیے دو آتشدان کے سوراخ بنائے جاتے ہیں۔ ان کے درمیان تیسرا آتشدان ہوتا ہے۔ اس کے دائیں بائیں جانب گھر کے مالک اور مالکن کے بیٹھنے کی جگہ مخصوص کی جاتی ہے۔ ایک کونے میں غلہ رکھنے کے لیے شوم رکھتے ہیں یہ رات کو سونے کے لیے چارپائی کا کام بھی دیتی ہے۔ یہاں زمین دوز چار پانچ فٹ گہرے کنویں میں صبح سویرے ندی کا پانی ذخیرہ کرتے کیونکہ اس وقت وہ صاف ہوتا تھا۔ انھیں گلکھ کہا جاتا تھا۔ غلہ ذخیرہ کرنے کے لیے چھت کے نیچے کسی کونے میں یا برآمدے میں چار پانچ فٹ اونچی دیوار تعمیر کرتے تھے۔ یہ بغیر دروازے کے ہوتی۔ قیمتی سامان کو محفوظ کرنے کے لیے سطح زمین سے نیچے کسی خفیہ جگہ پر مٹکا نما گڑھا کھودتے جسے ڈھینغ کہا جاتا۔ اس کا علم گھر کے افراد کے سوا کسی کو نہیں ہوتا تھا۔ ندی کے کنارے ڈھائی تین فٹ اونچا کمرہ بناتے جس میں سے ہر وقت ندی کا تھوڑا تھوڑا پانی گزرتا رہتا۔ اس میں عموماً دہی، لسی، تازہ مکھن وغیرہ رکھتے۔ یہ مچلیچ کہلاتا تھا۔ قدیم مساجد کے ساتھ مسافر خانے کے طور پر ایک کمرہ کٹ گئی تعمیر کیا جاتا تھا۔ پرانی مسجدوں میں گنبد اور مینار کا التزام نہیں کیا جاتا تھا اب ہوتا ہے۔ مساجد کے علاوہ امام بارگاہوں، خانقاہ اور جماعت خانے بھی ملتے ہیں۔ ان میں نقش نگاری کے عمدہ نمونے

پائے جاتے ہیں، راجاؤں کے محلات میں خواتین کے نماز پڑھنے کے لیے نگینہ یا نینا نامی مساجد ہوتی تھیں۔ راجوں مہاراجوں کے محلات خصوصی طرز تعمیر کے ہوتے تھے۔ کئی منزلہ عمارتوں کے دروازے، کھڑکیاں، چھتیں، ستون اور الماریاں اعلیٰ نقش نگاری اور کشیدہ کاری کے مظہر ہوتے تھے۔ چھوٹے محلات میں ایک نمایاں جگہ مردوں کے فارغ وقت گزارنے اور باہمی گفت و شنید کے لیے مخصوص ہوتی تھی جسے بیاک کہتے تھے۔ جانوروں کے لیے بھی الگ پناہ گاہیں بنائی جاتی تھیں۔[46]

رشید اختر ندوی کے مطابق گلگت کے کنارے تعمیر شدہ پرانے گھروں کے ساتھ ساتھ مکئی کے کھیت اور پھلدار درخت تھے۔[47] دریائے گلگت اپنے پانی کو اچھالتا نہیں۔ بازاروں کے منتظمین صفائی کا خیال نہیں رکھتے۔ اٹھارویں صدی تک یہاں درختوں پر ریشم کے کیڑے تیار کیے جاتے تھے اور ریشمی اور اونی مخلوط کپڑا بنایا جاتا تھا جس کا بنا لباس کاشتکار استعمال کرتے تھے۔[48]

دیامیر

دیامیر کے علاقے چلاس، استور، داریل و تانگیر گلگت سے ملحق ہونے کی بنا پر اور ایک ہی لسانی خطہ ہونے کے باعث مشترکہ ثقافتی ورثے کے حامل ہیں۔ اس لیے دیامیر کا تمدن و ثقافت وہی ہے جو گلگت کا ہے۔ جن چیزوں میں اختلاف ہے ان کا تذکرہ ذیل میں ہے۔

دیامیر میں روایتی دشمنیوں کی وجہ سے مشترکہ رہن سہن کا نظام لوگوں کی ضرورت بن گیا۔ اس لیے آج بھی ماضی کی طرح یہ نظام قائم ہے۔ لوگوں کے جھگڑوں کے تصفیہ کے لیے روایتی جرگہ سگاش مقرر کیا جاتا تھا۔[49]

> ”قدیم ایام میں چلاس اور داریل و تانگیر کے لوگ گلگت کے اطاعت گزار تھے۔ لیکن چلاس والے قرب و جوار کے علاقوں پر حملہ کرتے، لوٹ مار مچاتے اور مردوزن و معصوم بچوں کو اغوا کرنے کے باعث بدنام تھے۔“[50]

استور میں مہینوں کے ناموں کی بجائے پندرہ واڑے کا سلسلہ موجود تھا۔ پندرہ واڑے کو اہل استور پچھ کہتے تھے۔ ایک ماہ کے لیے دو پچھ اور ایک سال کے لیے چوبیس پچھ شمار ہوتے تھے۔ شروع چاند سے مکمل چاند تک ایک پچھ تصور ہوتا تھا۔ اسے یون یونی روشنی کہا جاتا جبکہ چاند کا دوسرا پندرہ دنوں کا حصہ چھپے یعنی اندھیرا کہلاتا تھا۔ ماضی میں استور کے لوگ ہر پچھ کے ساتھ کوئی نہ کوئی سرگرمی مخصوص کرتے تھے۔[51] یہاں ملنے والے شواہد کی رو سے یہ علاقے صدیوں سے آباد تھے۔ چینی سیاح فاہیان کے مطابق دیامیر کی تحصیل داریل میں پھگچ کے مقام پر مہاتما بدھ کا 94 فٹ طویل چوبی مجسمہ تھا۔ اس پر سونے کی پتریاں چڑھائی گئی تھیں۔ اس کی زیارت کے لیے تبت اور چین سے جوق در جوق زائرین آتے۔ پھگچ (داریل) میں ہی ایک دارالعلوم تھا جہاں بدھ مت کی تعلیم دی جاتی۔ یہاں سیکڑوں بدھ بھکشو بھی رہتے تھے۔ اس دارالعلوم کے کھنڈرات کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ گوہر آباد (گور) چلاس میں ہیرنگ نامی جگہ

کے بارے میں روایت ہے کہ اہل گور علاقے کے بوڑھے اور عمر رسیدہ افراد کو اس مقام پر پہاڑی سے نیچے دھکیل کر ابدی نیند سلاتے تھے۔[52]

دیامیر کے دیہی علاقوں میں ابھی بھی خوشی کے موقع پر حسب استطاعت جانور ذبح کر کے بڑے دیگچوں میں گوشت بھون کر سادہ شوربہ تیار کیا جاتا ہے۔ گوشت کو الگ کر کے شوربے کو تھالیوں میں ڈال کر مہمانوں کو پیش کرتے ہیں۔ ایک آدمی دیسی گھی ہر تھالی میں انڈیلتا ہے۔ اسے پتلی غیر خمیری روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ گوشت بھی الگ الگ تمام مہمانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ قریبی رشتہ داروں کو شادی پر کارڈ بھجوانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ گھر کا ذمہ دار فرد خود جا کر دعوت دیتا ہے۔[53]

چلاس میں منگنی کے وقت لڑکی کے سر کے چند بال نکال کر کہا جاتا کہ لڑکی فلاں لڑکے سے منسوب ہوئی۔ چلاس تانگیر میں دلہا کو دلہن کے ہاں نشانہ بازی کی رسم بھی کرنی ہوتی تھی۔ مطلوبہ نشانہ نہ لگنے تک رخصتی نہیں کی جاتی تھی۔ آج کل چلاس میں دلہن کے گھر بارات نہیں جاتی بلکہ دلہن کی رشتہ دار خواتین ہی دلہن کو دلہا کے گھر پہنچاتی ہیں۔[54]

یہاں کسی قریبی عزیز کی وفات پر سات دن تک گوشت نہیں کھایا جاتا۔[55] یہاں سرما کے آغاز پر جانور ذبحہ کر کے گوشت محفوظ کرنے کی رسم کو دائیکو کہا جاتا ہے۔ استور میں بچے کی پیدائش پر گھر کا مالک زمین کے نیچے کچھ سامان ذخیرہ کرتا جو بچے کے جوان ہونے پر نکال کر تقسیم کرتا تھا۔ چلاس، داریل، تانگیر میں دو افراد یا فریقین میں جھگڑے خصوصی تقریب منعقد کروا کر حل کیے جاتے تھے۔[56] دیامیر میں پانی کی کمی پوری کرنے کے لیے اسی صدی میں گلیشئرز کی پیوند کاری کا کامیاب تجربہ کیا گیا۔[57] یہاں مکانات دو تین منزلہ بنائے جاتے تھے جنھیں شکار اور گھڑی کہا جاتا تھا۔ یہ رہائش کے علاوہ واچ ٹاور کے طور پر بھی استعمال ہوتے تھے۔ بیرونی حملوں سے بچنے کے لیے ایسے گھر دفاعی حکمت عملی کے تحت بنائے جاتے تھے۔ آج کل یہ گھڑیاں سٹور کا کام دیتی ہیں۔[58]

تانگیر داریل کے علاقوں میں زیریں سوات اور بونیر میں یوسف زئی اور دیگر پختون قبائل کے اثرات کے باعث سنی عقیدے کی ترویج ہوئی۔[59] گلگت کی نسبت یہاں سنی مسلک کے پیروکار زیادہ ہیں۔ تمام وادیٔ استور میں شنا بولی جاتی ہے۔ دیر اور کنڈیاں، تانگیر میں کوہستانی بولی جاتی ہے۔[60] دیامیر کی لوک کہانیوں میں بھنوہل میں عشق و محبت کی داستان، وزیر رشو کی یدینی، شری بائی دیوی کا قصہ، ٹھگئی چکا، کاں موَن تو چلاس کوں کھائی، بیسز اور شیر کی کہانی اور بھوتن کی کہانی مشہور ہیں۔ یہاں صنف نازک کی شاعری منفرد ہوتی تھی یہ جذبات کو بھڑکانے اور دشمنوں کے خلاف اپنے قبیلے کا حوصلہ بڑھانے اور مردانہ وار مقابلہ کرنے پر آمادہ کرنے میں مددگار ہوتی تھی۔ عموماً اشعار کسی سر کے تحت ہوتے تھے۔[61]

ہنزہ نگر

بلتستان اور ہنزہ کے درمیان قدیم عہد سے تاریخی و ثقافتی رشتہ ہے۔ اس لیے ہنزہ کے اکثر تہوار اور رسوم بلتستان والے ہیں۔ نشست و برخاست کے طریقوں میں جزوی فرق ہے۔ ہنزہ پر بلتستان کے اثرات کے پس پردہ کیسر تہذیب کی توسیع، تبتوں کی یلغار، مقپون اور ایشو خاندانوں کے درمیان ازدواجی رشتے اور اخوند ہائے بلتستان کی تبلیغی سرگرمیاں اہم ہیں۔[62] 1891ء تک ہنزہ کے لوگ آس پاس کے لوگوں میں قزاق کے نام سے جانے جاتے تھے۔ درہ لیہ اور قراقرم کی وادیاں اور درے ان کی رہزنی اور قتل و غارت گری کی آماجگاہ تھے۔[63] اب شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے باعث بہت سرعت سے مادی و اقتصادی و معاشرتی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔

بروشال میں گھریلو ملازم رکھنے کی روایت نہ ہونے کے برابر ہے۔ ابتدا میں راجگان کے ہاں بیسیوں ملازم بغیر معاوضے کے کام کرتے تھے۔ انھیں راجا کے ہاں سے روٹی کپڑا ملتا تھا نقد معاوضہ نہیں۔ باقی ہر شخص خواہ کسی بھی سماجی رتبہ کا ہوتا اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو فخر سمجھتا۔ کاہلوں کو طعن و تشنیع کا سامنا کرنا پڑتا۔ مردوں کے لیے آبپاشی، نہروں اور تالابوں کی صفائی، کھیتی باڑی، فصلوں کی کٹائی، کھاد ڈھونا، گاہنا، حاصل شدہ غلہ کھیتوں میں بھرنا، ڈنٹھلوں کو باندھنا اور مویشی خانہ منتقل کرنا، غلے کو پسائی کے لیے چکیوں تک لے جانا اور آٹا گھر لانا، بھیڑ بکریوں کی اون کترنا، لکڑیاں پھاڑنا، پھل اتارنا، مویشی چراگاہ لے جانا، دودھ دوہنا، لسی بنانا، مکھن بلونا اور حاصل شدہ مکھن کو بھوج پتر کی پرتوں میں لپیٹ کر زمین میں دفنانا، رسیاں بنانا، اونی ٹوپیاں بنانا، جانور ذبحہ کرنا اور گری ہوئی دیواریں اٹھانا تھا۔ عورتوں کے گھریلو نوعیت کے کاموں میں کھانا تیار کرنا، برتن دھونا، سلائی کرنا، کڑھائی کرنا، مویشیوں کے لیے چارہ کی فراہمی، نگرانی، فصلوں کی کٹائی میں مردوں کی مدد، سبزیوں کی بوائی شامل ہیں۔ بزرگوں سے جسمانی مشقت کا کام نہیں لیا جاتا، انھیں تعظیم دی جاتی ہے۔ وہ خود چھوٹے موٹے کام کرتے ہیں جیسے اون کاتنا، رسیاں بننا، لکڑی کے چمچ بنانا، قریبی کھیتوں کو پانی دینا، قریبی عزیزوں کے ہاں خیر خبر کے لیے جانا اور کم سن بچوں کو ادھر ادھر گھمانا۔[64]

ہنزہ نگر کے کھانے سادہ، کم مصالحہ جات والے اور کیمیائی اجزا سے پاک ہوتے ہیں۔ سفر میں ساتھ جانے کے قابل اور کئی کھانے کئی روز تک خراب نہیں ہوتے۔ یہاں حلوہ نما سوغات کو شربت کہا جاتا ہے جو خوشی کے موقع پر بنایا جاتا ہے۔ اسماعیلی گھرانوں میں غمی کے موقع پر اموات کے تیسرے دن ہریسہ بنایا جاتا ہے۔ یہاں کی روٹیوں میں خمدلی، قستہ، گیل، بروئے گیل، کری کوڑ، پھل ژھیقو، چھپ شورو، شورو، بلکہ بشیک، شکر کوڑے، پھوؤ، بروش یشک، غملدی، دیڑرم، ملیدہ، ضمولت، سیسر، اڑدون، پھاپھقوء، بئی اے پھوؤ، ہری اے قستہ، بشیک بھئی، پرونٹہ، خمشدون اور چھوریکی شامل ہیں۔ سالن کی قسموں میں میتھی کا سالن شکر کوے، تیپشگلے ہوتی، ژورے ہوتی، ماشے شکر کوڑ، ہوسرے ہونی اوعر ہونی لم گرما مستعمل ہیں۔ گوشت کے سالن میں بلانیشو، چھپے خم، یو سئس پئی، مرخم اور بیار تک دوڑرس شامل ہیں۔ بی

مناثرے، ملوعوشون اور کر کہ آلو متفرق سالن ہیں۔ جوفس اور شوپن پکائی ہوئی ٹھوس غذائیں ہیں۔ جبکہ مل اور مستوک کا شمار آٹے کی نرم غذامیں ہوتا ہے۔ میٹھے پکوانوں میں درم پھٹی، دنگ درم، درم شورو، ژیڈیو درم، ماکولات مغزیات، بنی اے ژمیک شامل ہیں۔ سوپ کو یہاں ڈوڈو کہتے ہیں جو کئی قسموں کا ہوتا ہے۔ جیسے خرنہ ڈوڈو، قرت ژہ ڈوڈو، برس ژہ ڈوڈو وغیرہ۔ کھٹائی کے طور پر استعمال ہونے والی اشیا میں رقینکے ژمیک، فروت اور پٹھاسنک اہم ہیں انھیں دوسری خوراکوں کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ یہاں کے مشروبات میں چائے، بلنگہ چائے (اخروٹ کے مغز سے تیار کردہ)، نمتورو چائے (ہاضم مشروب)، اوردلتر (لسی)، بتسوٗد (سیب کا مقوی شربت) اور چھموس (خوبانیوں کا رس) شامل ہیں۔[65]

ہنزہ نگر میں حلال و حرام کے حوالے سے اسلامی تعلیمات پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ تین وقت کھانے کا رواج ہے۔ ناشتے کو چوردیمو چائے، دوپہر کے کھانے کو دوغویموشیک اور رات کے کھانے کو ساسئے لوپیک کہا جاتا ہے۔ رات کے کھانے کے بعد کی چائے گری ژہ چائے کہلاتی ہے۔ دستر خوان بچھنے سے پہلے سلفچی یا لوٹا لے کر ہاتھ دھلائے جاتے ہیں۔ مرد اور خواتین الگ الگ بیٹھتے ہیں۔ کھانے کا آغاز بزرگ کرتا ہے۔ کھانے کے اختتام پر بھی ہاتھ دھلانے کا رواج ہے۔[66]

قدیم زمانے سے یہاں کے پہناوے جمالیاتی ذوق سے عاری اور سادہ تھے۔ بھیڑ بکریوں کی اون سے موٹا کپڑا "پھلم" تیار کرتے تھے۔ یہ پٹو مختلف معیار کا ہوتا اس سے لباس تیار کیا جاتا۔ مردوں کا کرتا لمبا ہوتا تھا۔ جس پر پٹکا باندھنے کا رواج بھی تھا۔ مردوں کے لیے ٹوپی لازمی تھی اب ننگے سر گھومنا معیوب نہیں رہا۔ مردوں کی ٹوپی صوبہ خیبر پختونخواہ والی ہے۔ خواتین کڑھائی والی ٹوپیاں "گوشکی پھرن" پہنتی ہیں۔ ایسی ٹوپیاں کچھ تبدیلی کے ساتھ ازبک خواتین پہنتی ہیں۔ خواتین لمبے اونی کرتوں کے ساتھ سینے پر ایک تھیلی لٹکاتی تھیں جس میں سرمہ کی سلائی اور توتیا کا دھیلہ رکھتی تھیں۔ ہنزہ و نگر کی اشرافیہ کاشغر، بدخشاں، کشمیر سے درآمد شدہ کپڑے سے لباس بنواتے۔ آس پاس کے علاقوں پر حملوں کے دوران سوتی اور ریشمی کپڑا اتھیالیتے۔ رعایا میں کوئی قیمتی کپڑا پہن لیتا تو راجہ اسے سخت باز پرس کرتے اور سخت سزائیں دیتے۔ خواتین ہمیشہ سے ڈھیلا ڈھالا لباس استعمال کرتی رہی ہیں۔ جوتوں کے طور پر مارخور یا بکرے کے چمڑے سے مقامی طور پر تیار کردہ جوتے بجو پہنتے تھے۔ اب یہاں سردیوں میں عام شلوار قمیض پر سویٹر، کوٹ یا شوقہ پہنتے ہیں۔ گرمیوں میں سادہ شلوار قمیض اور پشاوری چپل کا رواج ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر دلہا سفید اونی شلوار قمیض، سفید اونی ٹوپی اور سرخ رنگ کے بوٹ پہنتا تھا۔ اس کی ٹوپی پر کلغی اور چکیلے پر لگائے جاتے تھے۔ دلہا باراتیوں کے غلو میں کندھے پر تلوار لٹکا کر چلتا تھا۔ دلہن کے لیے لشو کا جوڑا تیار کیا جاتا تھا۔[67]

یہاں زیورات قدیم زمانے سے خواتین میں مروج رہے ہیں۔ اکثر ان کا معیار اور وضع قطع مختلف زمانوں میں مختلف رہی ہے۔ حکمران طبقے کی خواتین نقرئی زیورات استعمال کرتی تھیں۔ ان کے زیورات کے نام مقامی نہیں بدیسی

ہیں اور نقشہ بھی بدخشانی و کشمیری ہے۔ ان زیورات میں ملعوز توفر، حیسکور، بازوبینگ، کشوار، بورایئے، ہار، چلی بلیک، کئے زیک، شاہ مقصودی، پوریئے پدم، لورتیے بروندو، وسولی بروندونو، نمی وشو، طوطاموژ، شلہ، پر طاؤس اور ژمنگ شامل ہیں۔ ماضی میں جانوروں کی آرائش کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔ خصوصاً گھوڑوں کے پالان پر تیز چبھتے رنگوں والی کڑھائی کی جاتی۔ دلہا کے گھوڑے کو شادی کے موقع پر سرخ نقاب پہنایا جاتا، پالان کو بھی سجاتے تھے۔[68]

بروشو علاقوں میں مخصوص روایتی گھر کی چھت چار مضبوط اور منقش ستونوں پر تعمیر کی جاتی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی جوتے رکھنے کی جگہ، درمیان میں چولھا اس کے دائیں بائیں مردوں عورتوں کے بیٹھنے کی جگہ ہوتی تھی۔ اسماعیلی مہمان گھر میں داخل ہو کر یا علی مدد کہتا جواب میں اہل خانہ مولا علی مدد پکارتے۔ دوپہر کے بعد آنے والا مہمان نام سلام اور میزبان روز علیکم کہہ کر جواب دیتے ہیں۔ شیعہ گھرانوں میں السلام علیکم کہنے کا رواج ہے۔ قریبی رشتہ دار مہمان ایک دوسرے کے ہاتھ چومتے ہیں۔ بزرگوں کی رائے کو گھر کے معاملات میں اولیت دی جاتی ہے۔ بچوں کو نظر بد سے بچانے کے لیے ان کے ہاتھوں اور گالوں پر سرمہ کی سلائی سے نقطے اور نقوش بنائے جاتے ہیں۔ کھیلنے کے قابل ہو تو اس کے ہاتھ میں کسی درخت کی ٹہنی کی بنی پولوسٹک تھما کر جیب میں کلچہ نماروٹی رکھی جاتی ہے۔ بزرگوں کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔ چھوٹے بچوں کے بھی ہاتھ چومنے کا رواج ہے۔ گلگت، چلاس، داریل، تانگیر کے مقابلے میں بروشال میں دشمنی کی روایت نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہاں ہتھیاروں کی نمائش کی بھی روایت نہیں۔ دشمنیاں عموماً چراگاہوں کے حقوق پر ہوتی ہیں۔ صلح کے لیے، ثالثی کے لیے حکومتی اداروں کی بجائے علما یا جماعت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ بروشال میں قتل جیسے گھناؤنے جرم کی شرح سب سے کم ہے۔[69]

میروں کے زمانے میں عوام اور حکمرانوں کے درمیان واضح فرق تھا۔ زمین میر کی ملکیت تھی۔ شاہی اخراجات پورے کرنے کے لیے عوام پر کئی ٹیکس عائد تھے۔ لوگ ہمسایوں تک کو اغوا کر کے پامیر بیچ آتے تھے۔ چائے پینا عیاشی سمجھا جاتا تھا جس کے لوگ متحمل نہیں تھے۔ شاہی خاندان کے لیے عوام بلا معاوضہ رہائش گاہیں تعمیر کرنے پر مجبور تھے۔ شکار اور شادی ٹیکس عائد تھا۔[70] زمانہ قدیم کے خاص ہنر مند لوگ پتھر کی دیواریں بناتے اور خطرناک چٹانوں اور پیچیدہ سنگلاخ جگہوں سے نہریں نکلوانے میں مہارت رکھتے تھے۔ اپنی ہنر مندی کے باعث انھوں نے ناقابل یقین جگہوں پر نہریں نکال کر نئی نئی بستیاں آباد کیں۔ تب مارخور اور بکرے کے سینگوں سے کھدائی کر کے مور کو اور دلبر نکالے گئے۔[71] تین سو سال قبل التر جھیل کو بھی یہاں کے محنتی لوگوں نے سینگوں، ہڈیوں اور کلہاڑوں کی مدد سے کھودا اور ندی کی شکل دی۔ اس ذخیرہ آب سے التت اور بلتت بستی کے لیے نالے اور چھوٹی نہریں بنائیں جو ان کی شادابی اور ہر گھر میں آب رسانی کا ذریعہ ہیں۔ یہاں پانی کی قلت نہیں۔ معدنیات ملے پانی میں ریت اور مٹی بھی ہوتی ہے۔[72]

سماجی حوالے سے درجہ بند معاشرہ ہونے کے ناطے ہنزہ نگر میں پیشے افراد کی سماجی حیثیت کا تعین کرتے ہیں۔ بڑھئی کو یہاں بخاری یا چکالو کہتے ہیں۔ یہ کسی خاص نسل سے مخصوص نہیں۔ بڑھئی کے اوزار بہت عرصے بعد یہاں متعارف ہوئے۔ ماضی میں واخان، بدخشاں اور کاشغر سے درآمد کیے جاتے تھے۔ 1923ء کے بعد یہاں لکڑی کا عمدہ کام دیکھنے میں آیا جب جدید طرز تعمیر پر عبادت خانے تعمیر کرنے کا رواج ہوا۔ بلتستان سے بھی لوگ یہاں آکر یہ کام کرتے تھے۔ سازندوں اور لوہاروں کو "ہیر یجو" کہتے ہیں۔ یہ بہت عام گھریلو استعمال کی اشیا جیسے چمٹے، چولھے اور ڈوئی بناتے تھے۔ کچھ ماہر لوہار چھوٹے موٹے ہتھیار چھرا تلوار بھی بناتے تھے۔ مقامی لوگ بہت ماہر نہیں تھے اسی لیے توپ سازی کے لیے میر کوکاری گر بدخشاں سے منگوانے پڑتے۔ سازندے تین قسم کے ساز استعمال کرتے ہیں۔ یہ باقی معاشرے میں گھل مل کر نہیں رہتے۔ گلہ بانی قدیم زمانے کا بہت اہم پیشہ ہے اسے منافع بخش اور بابرکت خیال کیا جاتا ہے۔ پن چکی پر آٹا پیسنا یعنی آسیابانی، زیور بنانا اور ٹوکریاں بنانا بھی یہاں کے اہم پیشے شمار ہوتے تھے۔ قدیم دستکار ٹوکرا سازی کے لیے درختوں کی لچکیلی شاخوں سے مختلف قسم کی ٹوکریاں بناتے تھے۔ موچی کو یہاں حفت ساریا ہوچو او تاشو کہتے ہیں۔ مگر یہ پیشہ اب دم توڑ چکا ہے۔ پہلے ہر طبقے، ہر نسل کے لوگ اپنی ضرورت کے تحت جوتے خود تیار کر لیتے تھے اور اسے معیوب بھی نہیں سمجھتے تھے۔ مارخور کے چمڑے سے بنے چرم سیئے ہوچو سب سے معیاری سمجھے جاتے تھے۔ سلائی کڑھائی کا فن یہاں بہت قدیم ہے۔ بروشو خواتین پہلے اشرافیہ خواتین کے لباس کی سلائی کڑھائی کرتی تھیں۔ اب شاہراہ قراقرم کی تعمیر سے ان کی گھریلو سطح پر تیار کردہ دستکاریاں اچھے داموں دیگر بازاروں میں بک جاتی ہیں۔ اراغی، مشکلان، زردوری اور قلمی یہاں کی کڑھائی کے اہم نمونے ہیں۔ ماضی میں یہاں خشک کدو برتن کے طور پر استعمال ہوتے رہے ہیں۔ پھر سنگ خارا اور لکڑی کے برتن تیار ہونے لگے۔[73]

قدیم دور میں ہر رسم اور تہوار سے مافوق الفطرت قوتیں، منسوب تھیں۔ لوگ انھیں راضی کرنے کے لیے تہوار مناتے تھے۔ اس عقیدے کے تحت خوف کی وہ پوشیدہ و لاشعوری قوت تھی جس کے تحت اس زمانے کا معاشرہ رواں تھا۔[74] شاہراہ قراقرم کی تعمیر سے پہلے ان علاقوں کے الگ تھلگ ہونے کے باعث بہت کم تبدیلی آئی مگر اب بیرونی عناصر کا عمل دخل بڑھ چکا ہے۔

ماضی میں یہاں یک جدی قبائل کے مابین شادیاں نہیں ہوتی تھیں کیونکہ طلاق کی صورت میں لڑائی کے باعث ایک ہی قبیلے کے گھرانوں میں دشمنی پیدا ہوتی تھی۔ اسماعیلی مبلغوں نے اس کا خاتمہ کیا۔ ڈوم طائفہ کے لوگوں سے بروشو قبائل شادی نہیں کرتے۔ پہلے یہاں انتہائی کم عمری میں شادی کا رواج تھا۔ لڑکی نو برس اور لڑکا پندرہ برس کا ہوتا تو شادی کر دیتے۔ ابھی تک بھی زیادہ تر رشتے والدین کی مرضی سے طے پاتے ہیں۔ کورٹ میرج کا تصور نہیں۔[75] ماضی میں اکثر شادیاں ایک ہی دن کی جاتی تھیں موسم سرما کے آغاز اور تھوشلنگ تہوار سے قبل۔ اس کے

آگے پیچھے شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ورنہ بطور جرمانہ شادی ٹیکس ترنگفا وزیر کو دینا پڑتا تھا۔[76] باراتیوں کا شمار رکابیوں کے حساب سے کرتے تھے۔ ایک رکابی کے گرد چھے آدمی بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ جماعت خانوں میں نکاح کے بعد دولھن کے گھر ضیافت کا اہتمام ہوتا تھا۔ شربت اور سپرا سے باراتیوں کی تواضع کرتے۔ دلہن کی رخصتی پر پہلے وقتوں میں "اچولی گیت" اور دھن بجائی جاتی تھی۔ دلھن کے قریبی رشتہ داروں میں چند دلھن کے گھر رات گزارتے۔ شادی کی دیگر رسموں میں دعوت کتب (آٹا اچکنا) اہم ہے۔ پہلے نکاح اور رخصتی کے درمیان طویل وقفہ حائل ہوتا تھا۔ پہلے سال میں دو موقعوں پر درم پھٹی میٹھی روٹی پکاکر دلھن کے گھر پہنچاتے تھے۔ دلھا دلھن ان ایام میں گھر میں داخل ہوتے وقت ایک ساتھ دلہیز پر قدم رکھتے۔ پہل کرنے واے کو کمتر سمجھا جاتا۔ عموماً دلھن پہل کرتی۔ طلاق (چتری) کو بروشو معاشرے میں طعنہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد گھرانوں میں دشمنی کی بنیاد پڑ جاتی تھی۔ بے اولادی بھی یہاں طعنہ ہے۔ قلیل التعداد خاندان یہاں کمزور اور کثیر العیال خاندان رحمت خداوندی تصور کیا جاتا ہے۔ حاملہ عورتوں کو مخصوص خوراک تس چھویس کھلاتے ہیں۔ بچے کی پیدائش کے چھ ماہ تک عورت صرف بچے کی دیکھ بھال کرتی ہے بعد میں گھریلو مصروفیات میں مگن ہوتی ہے۔ یہاں بچوں کی بہت قدر ہے لیکن بچیوں کی پیدائش کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ ہنزہ میں نوزائیدہ بچوں کو گہوارے میں سلانے کا رواج ہے جبکہ نگر میں ایسا نہیں۔ بچے کی پیدائش کے سات ماہ کے اندر نام رکھا جاتا ہے۔ اسماعیلی برادری میں خلیفہ اور شیعہ برادری میں اخوند سے رجوع کرنے کا رواج ہے۔ خلیفہ کے رکھے نام کے علاوہ عام استعمال کے لیے الگ سے نام رکھنے کی روایت ہے۔ دادا کے نام پر بچے کا نام رکھتے تو بچے کو اس نام سے بلانے کی بجائے احتراماً دادو کہتے ہیں۔ یہاں ناموں کو بگاڑنے کا بہت رواج ہے۔[77]

پہلے نوزائیدہ بچوں کو پہلی بار باہر نکالنے کی رسم کو "ہولے ڈوئی سس" کہتے تھے۔ میٹھی روٹیاں پکا کر بچوں کو کھلانے کا عام رواج تھا۔ شیعوں میں یہ رسم ڈاڈا کے نام سے معروف ہے۔ یہاں بچوں کی تربیت پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ دینی تعلیم کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ بچوں کو سات سال کی عمر میں شیر خوار بچوں کا گہوارہ ہلانے پر لگایا جاتا ہے۔ نو برس کا ہونے پر لڑکوں کو مال مویشی چرانے بھیجا جاتا تھا۔ پھر پودوں کو پانی دینا، بندوں کی نگرانی کا کام سونپا جاتا۔ پندرہ برس کا ہونے پر راجہ کی بیگار پر بھیجا جاتا تھا۔ ہنر سیکھنے کے خواہشمندوں کو بڑھئی، درزی، جولاہا اور اخوند کے پاس بھیجا جاتا تھا۔ بچیوں کو مائیں گھر کے ابتدائی کاموں پر لگاتیں ساتھ سلائی کڑھائی کی تربیت دیتیں۔ آج کل کے بچے بچیاں سکول جاتے ہیں تو گھروں کا کام نہیں لیا جاتا۔ سکول سے فرصت ملے تو دینی تعلیم کے لیے جماعت خانوں میں بھیجا جاتا ہے۔ ماضی میں بروشال میں ختنوں کا رواج نہیں تھا۔ اٹھارہویں صدی میں یہ سلسلہ شروع ہوا تو پہلے بہت سے بچوں کا اکٹھا کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد ناچ گانے کا اہتمام بھی ہوتا تھا۔ کسی خاتون کو اپنی باری پر گیت یاد نہ آنے پر جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔[78]

قدیم تہواروں میں گنانی فصل پکنے کی خوشی میں جون میں منایا جاتا تھا۔ ایک ہفتہ قبل اس کی تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں۔ خصوصی ڈش ڈرم پھٹی اس کی خاص علامت تھی۔ میران کی سرپرستی میں تماشے کا آغاز ہوتا۔ جس میں مخصوص دھن پر لوگ ناچتے تھے۔ اختتام بھی مخصوص دھن پر ہوتا تھا۔ نیک شگون کے لیے رسم "پیاقمر" مناتے تھے۔ نوروز یہاں 21 مارچ کو عقیدت واحترام سے قومی تہوار کی حیثیت میں منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر پولو کے مقابلے منعقد ہوتے۔ نوجوانوں کے اور بھی کرتب دکھانے کا اہتمام ہوتا تھا۔ شادی شدہ لڑکیوں کو اس موقع پر خاص کھانا بنا کر بھیجا جاتا۔ خواتین باغوں میں جھولے ڈالتیں اور اس دن کو فراغت کے طور پر اہتمام سے مناتی تھیں۔ کھیل تماشوں کے بعد کاہن کے رقص کا خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا جو اہم پیشگوئیاں بھی کرتا تھا۔[79] بلتستان سے بوپھاؤ کا تہوار یہاں منتقل ہوا۔ اسے فروری میں زمین کی بوائی کے موقع پر منایا جاتا تھا۔ اس موقع پر خصوصی ناچ "اپی چونت" کا اہتمام بھی کیا جاتا جس کے لیے بارہ دھنیں بجائی جاتی تھیں۔ اس موقع پر سالم بیل کا روسٹ شدہ گوشت پتلی روٹیوں کے ساتھ بانٹا جاتا۔ میر "تموچہ" (خصوصی کھیت) میں بیج بکھیر کر بوائی کا افتتاح کرتا۔ ہر گھر میں نمک والا حلوہ مل ضرور بناتے۔ گھروں میں اس دن شہتیروں پر آٹے کی گلکاریاں کی جاتی تھیں۔[80] ماہ جدی کے آغاز پر ایک ظالم حکمران شری بدھت کے جلانے کا دن تھموشلنگ منایا جاتا تھا جسے آگ سے ختم کرنے کی روایات ہیں۔[81] ماضی میں نگر کی طرف چرواہوں سے متعلق "کروئی برائے" نامی رسم ہوتی تھی جس میں اکیس چھوٹی روٹیاں پکا کر گھی سے تر کر کے ساتھ آٹے سے انسانی پتلا بنا کر اس کے سر پر مکھن کا ایک لقمہ رکھ کر پدم کی چھوٹی ٹہنی گاڑتے۔ اس کے بعد خشک میوہ جات ایک برتن میں ڈھیر کی صورت رکھ کر چرواہا سب اشیا اور بچوں کو لے کر بکر کوٹھے کی طرف جاتا جہاں پدم کے پتوں کی دھونی دی جاتی تھی۔ راستے میں جو بھی ملتا انھیں ان چیزوں میں سے کچھ نہ کچھ دیا جاتا۔ آٹے کے پتلے کو چرواہا خود کھاتا تھا۔ اخروٹ کو بکریوں کے سینگوں سے ٹکرا کر توڑتا اور ان کے سینگوں پر مکھن ملتا۔[82]

ہنزہ نگر کے عرس میلے مقامی زرعی تقدیم سے جڑے ہیں۔ کیونکہ معیشیت کا دارومدار زراعت اور گلہ بانی پر تھا۔ پڑوس سے آنے والے تہوار مذہبی نوعیت کے تھے۔ ہنزہ میں عیدین کے علاوہ آغا خان چہارم کی پیدائش اور گلگت میں پہلی مرتبہ تشریف آوری کے حوالے سے سالگرہ منائی جاتی ہے۔ تب بروشو قدیم ثقافتی ورثہ کو زیادہ سے زیادہ زندہ کیا جاتا ہے۔ دیگر تہواروں میں بہار کا خصوصی تہوار کٹ دت، فصل کی کٹائی کا تہوار "جینیر"، نہروں کی مرمت اور بھل صفائی کے دن "ذوتھ چک"، جو کی فصل کے اختتام پر ڈونگوشوئی (جس میں پرندوں کے لیے خاص کھانا تیار کرتے ہیں، انھیں دھتکارنے کی بجائے پیٹ بھر کر خوراک دے کر ٹالا جاتا ہے)، مویشی چراگاہوں سے واپس لانے پر "کچ کھمک خدوئی"، مرحومین کی ارواح کو ایصال ثواب پہنچانے کے لیے "سپر باوڑ" شامل ہیں۔[83]

ہنزہ نگر کے روایتی کھیلوں میں پولو اور کوہ پیمائی نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے۔ مقامی خالصتاً مردانہ کھیلوں میں بلہ (پولو)، درابی (رسہ کشی)، سلما (کشتی)، بچردن پھل اتیس (بھاری پتھر پھینکنا)، نم دیلس (تیراکی) ورزشی نوعیت کے ہیں۔ زنانہ کھیلوں میں خقوماس (جھولا جھولنا)، اولوبائے، لوٹو مناس، پوپور مناس، بوڈیموسنک (دھاگے سے شکلیں بنانا) اور خسکورہیں۔ بچگانہ کھیلوں میں مینڈک ددغہ دغہ، لٹکوری اور حچھت دیلیس شامل ہیں۔[84]

ہنزہ میں اسماعیلی فرقے کی کثرت ہے۔ انیسویں صدی میں تھم مسلم خان سوئم نے یہاں مولائی فرقہ متعارف کرایا جو بدخشاں میں سیاسی پناہ لے کر رہتا بھی رہا۔[85] یہاں سفر سے متعلق توہمات عام تھے۔ کسی کے تلوے میں کھجلی کو سفر کی علامت سمجھتے۔ دوران سفر کسی کے ہاتھ سے لاٹھی گرنا دوبارہ سفر کی علامت تصور کرتے۔ سفر پر نکلنے والے کے پیچھے اس کے گھر والے اسی دن جھاڑو دینے سے گریز کرتے، کسی کو مانگنے پر بھی آگ نہیں دیتے تھے۔ سفر پر جانے والی لاٹھی کی بہت قدر تھی اسے واپسی پر اونچی جگہ رکھتے۔ شیعہ گھروں میں آج بھی سفر پر جاتے وقت بازو پر امام ضامن باندھنے کا رواج ہے۔ یہاں تعویذوں پر بہت اعتقاد کیا جاتا ہے۔[86] قدیم زمانے میں یہاں بدھ کو برا دن سمجھا جاتا تھا۔ اونی ٹوپی پہنتے وقت گانٹھ پیشانی کی طرف آنے کو بھی اچھا نہیں سمجھتے تھے۔[87]

بروشسکی ہنزہ کی بڑی زبان ہے۔ نگر میں بھی بولی جاتی ہے۔ یاسین اور گلگت کے کچھ حصوں میں اس کے بولنے والے ہیں۔ ہنزہ کے مخصوص حصوں میں ڈومکی بھی بولی جاتی ہے۔ اس کے بولنے والے خانہ بدوش قوم کے افراد زیادہ تر موسیقار، لوہار اور سنار ہیں۔ ان کی زبان معدومیت کے خطرے سے دوچار ہے۔ یہ ہند آریائی زبان ہے۔ بالائی ہنزہ میں واخی بولی جاتی ہے جس کا تعلق آریائی بولیوں کی پامیری شاخ سے ہے۔ ہنزہ کی واخی افغان واخی سے زیادہ مختلف نہیں۔[88] بروشو علاقے کی پہچان بروشسکی اب تک مبہم ہے۔ سید یوسف بخاری کے خیال میں کشمیر میں آباد ابتدائی ناگ قوم کی زبان بروشسکی ہے۔ اب اس کے قواعد مقرر ہو چکے ہیں۔[89] یہاں تفریح طبع، اصلاح معاشرہ اور پندو نصائح اور وقت گزاری کے لیے کہانیاں سننے سنانے کا بہت رواج تھا۔ سرما کی طویل راتوں میں آگ کے گرد اپنی اپنی حسب مراتب جگہ سب بیٹھتے، بزرگوں کے کہانیاں سنانے کے دوران ساتھ خواتین اون کاتتیں۔ یہاں مقامی کہانیاں خاصی قدیم اور طبع زاد ہیں۔ جن میں نیکی، بدی، ظلم، جبر، وفا شعاری، ہرجائی پن، بہادری، بزدلی، فتح، شکست جیسے عام انسانی رویوں اور حالات کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان میں کاہن، جن، بھوت، چڑیل، پریاں اور مافوق الفطرت کردار علاقائی انداز میں نظر آتے ہیں۔ مذہبی قصوں کی روایات بھی عام ہیں۔ لوک کہانیوں میں کاہن تالی اور اس کی پری زاد بیری، شون گکر اور ہوکے محو، چپورسن کی تباہی، حضرت شاہ بریا ولی کی داستان، عیاشو ملک اور منکر نکیر کی کہانیاں ہنزہ نگر میں عام ہیں۔ لوک گیتوں میں گریسئیے بینت (قریب المرگ ہرنی اور اس کے بچے کا مکالمہ) بہت مقبول ہے۔[90]

بروشسکی میں لوک کہانیوں، پہیلیوں، ضرب الامثال، محاورات، اقوال اور لوک گیتوں کا انمول ذخیرہ موجود ہے۔

"یہ ایک حیران کن امر ہے کہ بروشسکی میں شاعری کے لیے کوئی لفظ ہی نہیں۔ شعر کے لیے فارسی لفظ "بیت" مستعمل ہے۔"[91]

موجودہ بروشسکی شعری سرمائے میں شادی بیاہ کے اور آباء کے سورمائی گیت ہیں۔ شنا سے مستعار رزمیے، مناقب، حمد، نعت اور نظمیں ہیں۔ ماضی میں رومانی شاعری کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ رومانی ابیات تک مبسوط تاریخ مرتب نہیں ہو سکی۔ پچھلے زمانے کے اہم ناموں میں اخون تراب، اخون علی، گیشور، جمال خان، سید رسول شاہ، سید عباس شاہ، میر غزن خان، سید عبدالمجید، کریم اور محمد رضا بیگ شامل ہیں۔ ماضی کے سورمائی گیتوں کی مثال "گئی مالو" گیت ہے۔ اب ان کا رواج نہیں رہا۔ چرواہوں کے گیت الگ ہوتے تھے۔ سرما میں مقامی بچے دلہا دلہن کا سوانگ رچا کر دعائیہ گیت "ہویا" گاتے ہیں۔ "اجولی" رخصتی کا گیت ہے۔ اب الفاظ کی ادائیگی نہیں ہوتی صرف شہنائی نواز دھن بجاتے ہیں۔[92]

ناچ گانا "تمہ تاشہ" اور سازو طرب "ڈؤنک حریپ" بروشو ثقافت کا لازمی حصہ ہے۔ میدان جنگ، مذہبی رسومات یا شادی بیاہ کی تقریبات پر موسیقی لازمی تھی۔ یہاں آلات موسیقی محدود ہیں۔ ڈڈک، ڈامل، سرنائی، توتک، گبی، پوریلو، دف، رباب، ستار مقبول ہیں۔ ان سازوں سے چھے معروف دھنیں الغنی، تاجور، دنی، بزمی، سوز اور کاہلی بجائی جاتی ہیں۔ یہ رقص کے لیے مخصوص ہیں۔ پولو کی الگ دھنیں ہیں۔ قبائلی، شخصی، خاندانی اور تاریخی دھنیں بھی ہیں۔ کاہنوں کے لیے مخصوص دھنیں گل قل، تسی، آشوس لبیدو، ختون شیریں زبان اور شمہ شور مروج تھیں۔ کاہنوں کو نچوانے کے لیے پوریلو بانسری بجائی جاتی تھی۔ ہنزہ کی فتح کی یاد میں ایک تاریخی دھن بھی ہے۔ اسی طرح بوپھاؤ، تھمو شلنگ، گنانی اور پیا قمر بروشال کے مقامی تہواروں کی مخصوص قومی دھنیں ہیں۔[93]

مرکزی ہنزہ میں گھروں کی تعمیر کا خاص ڈھنگ ہے۔ نچلی منزل کو موسم سرما کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ آگ جلانے کے لیے درمیان میں چولھا اور اس کے دائیں سونے کے لیے پست چبوترے ہوتے ہیں۔ سامنے کی طرف گودام ہوتا ہے۔ باہر کی جانب مال مویشی رکھنے کی جگہ ہوتی ہے۔ اوپر کی منزل کو اگون کہتے ہیں جو موسم سرما کی رہائش ہوتی ہے۔ یہاں دو تین سمتوں میں بیٹھنے، سونے کی جگہیں، ایک کونے میں باورچی خانہ اور دوسری طرف گودام ہوتا ہے۔ گوجال میں واخی طرز کے کھلے گھر بنائے جاتے ہیں۔ باہر سے جاتے ہوئے راہداری میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ دائیں بائیں اور نیچے کی جانب تین چبوترے ہوتے ہیں۔ بیچ میں چولہے کے ساتھ انگیٹھی نما جگہ ہوتی ہے۔ اس کے آگے پچھلی جگہ پر تختوں پر برتن سجائے جاتے ہیں۔ مال مویشی گھر سے الگ دور رکھے جاتے ہیں۔ واخی لوگ انتہائی صفائی پسند ہیں۔[94] قدیم دور میں لوگ یہاں دیوار بند رہائشی علاقوں میں رہتے تھے۔ مقامی زبان میں ان گروہی رہائشوں کو کھن

کہتے۔ اس کے لیے تین طرف سے قدرتی محفوظ جگہ منتخب کی جاتی تھی۔ ان میں برجیاں بھی تعمیر کی جاتی تھیں۔ کھن کے درمیان میں پانی کی ضرورت کے لیے تالاب بنائے جاتے۔ طرز تعمیر سادہ تھا۔ تعمیراتی آلات بھی کمیاب تھے۔ طرز تعمیر پر بلتستان، کشمیر اور بدخشاں کا رنگ غالب ہے۔ مساجد، امام بارگاہوں اور خانقاہوں میں اونچے مکس کشمیری طرز پر بنائے جاتے تھے۔ مسطح چھتوں کا انداز بدخشانی ہے۔ بروشو سادہ گھر ایک کثیر المقاصد کمرہ ضہ، مشترکہ کمرہ جیکس، گودام اکون، بالائی برآمدہ تژک، مال مویشیوں کا باڑہ غوشیور اور بھوسہ خانہ پر مشتمل ہوتا تھا۔ پرانے وقتوں میں گھر سے فاصلے پر کسی کھیت کے چوک میں دیسی طرز کا بیت الخلا تعمیر کیا جاتا۔ جس کی چھت پر کشادہ سوراخ اور مٹی رکھی جاتی تھی۔ ہر گھر کے سامنے دیوار بند کشادہ صحن ہوتا تھا، صحن میں کنواں ہوتا تھا جس پر چھت ڈال کر دروازہ بناتے تھے۔ مکھن بھوج پتر میں لپیٹ کر محفوظ کیا جاتا تھا۔ پانی کی قلت والے علاقوں میں مصنوعی تالاب بھی بنائے جاتے اور صدقہ جاریہ کے طور پر کنویں تعمیر کراتے ساتھ مسافروں کے ستانے کے لیے برآمدہ بھی تعمیر کیا جاتا۔ راجگان کی رہائش گاہ کو تھاک کہتے تھے۔ یہ گارے، مٹی، پتھر اور لکڑی کے استعمال سے دو تین منزلہ وسیع عمارت ہوتی تھی۔ پہلے پہل آباؤاجداد کے نام پر چگوٹی چگوٹی مساجد تعمیر کرنے کا رواج بھی تھا۔ نئی طرز کی مساجد میں گنبد اور مینار ایستادہ ہیں۔ دیواروں پر آرائشی گل بوٹے بنائے جاتے ہیں۔[95]

رشید اختر ندوی کو ماضی قریب کے ہنزہ کی پسماندہ سڑکوں اور راستوں کی حالت سے بہت شکایت رہی ہے۔ انھوں نے یہاں ریاست کو سرکاری تحویل میں لینے اور میروں سے حکومت چھین لینے کو خوش آئند قرار دیا کہ وہ اپنے محل تک پہنچنے والی سڑک بھی پختہ نہیں کرا سکے تھے۔

> "۔۔۔اس شخص سے حکومت چھین لی اور ریاست کو سرکاری تحویل میں لے لیا جس نے اپنا عظیم الشان محل بناتے وقت اپنے محل تک پہنچنے والی سڑک کو پختہ نہیں کیا۔ حالانکہ یہاں نہ صرف بے شمار چٹانیں ہیں بلکی بائیس بائیس چوبیں چوبیں ہزار فٹ اونچے پہاڑوں کا سلسلہ سینکڑوں میلوں تک بڑھتا چلا گیا ہے۔ اور ان پہاڑی سلسلوں میں محض کالے پتھر ہی نہیں، سنگ مرمر، سنگ سرخ، زمرد اور نیلم کی بے شمار کانیں ہیں۔ اگر یہ میر صاحبان چاہتے تو اپنے محل تک آنے والے راستے کو سنگ مرمر، سنگ احمر اور سنگ لاجورد سے تیار کر سکتے تھے۔"[96]

بلتستان

ماضی میں بلتستان، تبت اور لداخ ایک ہی وحدت ہونے کے باعث ان میں کسی قسم کی لسانی، معاشرتی، مذہبی افتراق موجود نہیں تھا۔ اسلام کی آمد سے تبت سے صدیوں پرانا رشتہ منقطع ہوا اور معاشرت میں بہت تبدیلی آئی۔ مختلف اوقات میں یہاں چینی حکومت ہونے کے ناطے چینی سیاسی، سماجی نظام رائج ہوئے۔ بلتستانی تہذیب کئی تہذیبوں کے سنگم سے بنی ہے۔ یہاں زیادہ معاشرتی تغیرات مذہب کی بنیاد پر ہوئے ہیں۔[97] قدیم راجگی دور میں بلتی معاشرہ پانچ طبقات؛ حلقہ شاہی، وزرا، دیگر ملازم، عوام الناس اور موسیقاروں (مون) میں منقسم تھا۔ امرا اور عوام کے کھانے، پینے،

اٹھنے، بیٹھنے، شادی بیاہ میں سد سکندری حائل تھی۔ اب طبقاتی درجہ بندی کا تصور نہیں۔ یہاں سب سے قدیم اور اکثریتی نسلی گروہ منگول یا تاتاری تھے جو اب تبتی کہلاتے ہیں۔ بلتستانی تہذیب کا بنیادی ڈھانچہ تبتی تہذیب ہے۔[98] سکردو اس کا مرکز ہے۔ قدیم دیہات قدیم بلتی تہذیب و تمدن کے امین ہیں۔ بلتیوں کو غصہ بہت دیر سے آتا ہے مگر رفع ہونے میں وقت لگتا ہے۔ یہ امن پسند، خوش اخلاق، مہمان نواز، نرم گفتار ہیں۔ عقائد میں پختہ اور با اصول ہیں۔ اجتماعی نصب العین کے لیے ذاتی نصب العین اور مادی فائدوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ انھیں اپنی روایات اور تہذیب پر ناز ہے۔[99]

انچن اور اس کے پوتے کے دور میں مغلیہ دربار سے وابستگی، ایران، ہندوستان اور یارقند سے باہمی روابط کے باعث بلتستان میں ادب، شائستگی اور تہذیب و تمدن کے امکانات روشن ہوئے۔ مراد شاہ کے دور میں یہاں کے انتظامی و تعمیری امور خوب ترقی کی راہ پر چل پڑے۔ کاشغر، کشمیر اور ہندوستان سے سنگ تراشوں، موچیوں اور پیشہ وروں کو سکردو لا کر آباد کرنے سے بہت فائدہ ہوا۔ تعمیرات میں سنگ مرمر کا استعمال تب شروع ہوا۔[100] یہاں چوری، ڈاکہ، قتل وغارت، اغوا جیسے جرائم کا تصور نہیں۔ لوگ بے ضرر سیدھے سادے اور دیانتدار ہیں۔ یہاں کے مجلسی آداب پڑوس کے علاقوں میں قدیم ایام سے " آداب بلتستان" کے نام سے مشہور ہیں۔ پاکستان کے کسی بھی علاقے کی نسبت دینی عالموں کی تعداد یہاں زیادہ ہے۔ مزاجاً یہ جفاکش اور بردبار ہیں۔ ان کی زبان شستہ ہے۔

> "بلتی کے علاوہ دنیا کی کوئی بھی زبان سیکھنے کے بعد یہ لوگ اہل زبان کی طرح بولتے ہیں۔ جیسا کہ یہاں اردو دان طبقہ دہلی اور لکھنؤ والوں کی طرح رواں اور شستہ اردو بول سکتا ہے۔ اسی طرح قرآنی آیات میں بھی بلتستان کے لوگ عربوں سے کسی بھی طور پیچھے نہیں اور یہ ساری خصوصیات بلتی زبان کی دین ہیں۔"[101]

معروف کھیل پولو کو دنیا میں متعارف کرانے کا سہرا بلتستان کے سر ہے۔ باہمی تعاون، شعر و شاعری، مجلسی آداب، رقص و موسیقی وغیرہ میں یہ علاقہ اپنی پسماندگی اور دور افتادگی کے باوجود ممتاز و منفرد ہے۔ اب صدیوں پرانی زرخیز تہذیب مٹ رہی ہے۔ یہاں کی لوک روایات میں اتنی مافوق الفطرت باتیں ہیں کہ ان کے نام جو مقامی الاصل ہیں غیر فطری لگنا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں کے قدیم ناموں میں تھیچو، بغدور، نقیشری، رگیال سنگے، غونہ جو، ملی، شمک جیسے نام ملتے ہیں۔ قدیم زمانے سے یہاں رائج چلے آرہے غیر اسلامی ناموں میں واتھول، داجو، کھی تھول، کھی فرو، اسون چو، ادت چو، سنگ سنگ، سینگے جبکہ عورتوں میں بونو لدن، کھی لدن، سونی، دیکت، بلوروز، چھومتی، رگیالمو، اگیالبو جیسے نام مستعمل تھے جو اب متروک ہو چکے ہیں۔ اب پیغمبروں، آئمہ دین اور بزرگان دین کے ناموں پر نام رکھنے کا رواج ہے۔ عموماً ان سے پہلے غلام اور کنیز کی اضافت لگائی جاتی ہے۔ یہاں سادات اور راجہ خاندان کے احترام میں لوگ اپنے بیٹوں کے نام شاہ اور خان رکھنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہاں عموماً ناموں کو توڑ کر یا ادھورے ناموں سے مخاطب ہونے کا رواج بھی ہے۔ جیسے محمد حسین ماسین اور اسماعیل کو مایول وغیرہ۔ حقیقی ناموں کے علاوہ عرفی ناموں سے پکارنے

کا بھی رواج ہے۔ آج کل بلتستان میں شاعر ہو یا غیر شاعر اپنے ناموں کے ساتھ تخلص یعنی "تھئیس مینگ" کا رواج تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اسے ہر انسان کے انفرادی شوق کی تسکین بھی کہا جا سکتا ہے۔ بلتستان کے قوم پرست افراد نے پھر اپنے بچوں کے نام بلتی میں رکھنا شروع کر دیے ہیں جیسے سکر چن، عدیلنگ چن، موسیانگ وغیرہ۔[102]

بلتستان میں دادا، باپ، تایا، چچا، بیٹے، بیٹیاں، ساس، بہو، نندیں اور بھاوجیں سب مشترکہ طور پر ایک ہی مکان میں رہائش رکھتے ہیں۔ والدین کی وفات پر علیحدہ گھر بسانے پر مجبور ہوں تو باپ کی جائیداد تمام بھائیوں میں برابر تقسیم ہوتی ہے۔ والدین کی زندگی میں بیٹوں کی علیحدگی کی مثال بلتی معاشرے میں بہت کم ملتی تھی۔ ڈوگرہ دور میں بیگار فی گھر مقرر تھا اس لیے مشترکہ رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔

"آزادی سے قبل مشترکہ خاندان بسانے کا رواج بہت زیادہ تھا۔ کیونکہ ڈوگرہ دور میں بیگار کا بوجھ فی گھرانہ کے حساب سے اٹھانا پڑتا تھا۔ مشترکہ رہنے سے روزینہ، بیگار، زگل ریس (باربرداری کی باری) جیسے مشکلات سے ایک ہی باری پر چھٹکارا مل جانا۔ اس غرض سے دو تین پشتوں تک ایک ہی گھرانے میں مشترکہ طور پر رہتے تھے۔"[103]

بلتستان میں بکرمی، عیسوی اور ہجری تقویموں کے ساتھ ساتھ قدیم زمانے سے مقامی طور پر تبتی جنتری بھی موجود ہے۔ تبت بزرگ اور تبت خورد جغرافیائی، تاریخی و لسانی لحاظ سے ایک تصور ہوتے تھے۔ اب یہاں صدیوں پرانی تبتی جنتری متروک ہو گئی ہے۔ اس میں چھتیس مہینوں کے درمیان تین مہینے 29 دن اور چھ مہینے تیس دن کے شمار ہوتے ہیں۔ چین کی طرح تبتی تقویم میں بارہ بروج کے نام علامتی جانوروں کے ناموں پر ہیں۔ یہاں لوگ شمسی برجوں کے تحت دن اور ساعت دیکھنے کے قائل ہیں۔ ناپ تول کے مقامی پیمانوں میں ہاتھ، انگلیاں، بالشت، قدم، برتن اور ستر انگ نامی مخصوص روایتی گز رہتے تھے۔[104]

بلتستان کے مشہور آداب کے مطابق کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے لیے طشتری، آفتابہ یا لوٹے میں پانی لایا جاتا ہے۔ باری باری ہاتھ دھوتے ہیں۔ ایک شخص پانی ڈالتا ہے۔ کھانے سے قبل بسم اللہ پڑھتے ہیں۔ میر محفل کے کھانا شروع کرنے تک کوئی لقمہ نہیں لے سکتا۔ حتیٰ کہ چائے کی پیالی اٹھانے اور پہلے رکھنے میں بھی میر محفل کا انتظار کیا جاتا ہے۔ یہاں تقریبات میں تین افراد ایک تھالی میں کھاتے ہیں۔ کھانے کے اختتام پر چھوٹے بڑے گھر کے مالک سے مخاطب ہو کر برکت یا خانہ آباد کے دعائیہ الفاظ سے نوازتے ہیں۔ جواب میں میزبان معافی طلب کرتا ہے۔ پانی پینے کے بعد شہدائے کربلا خصوصاً حضرت امام حسین کو لازمی یاد کیا جاتا ہے۔ جس گھر میں دعوت ہو وہاں کھانے کے بعد گزشتہ ارواح کے ایصال ثواب کے لیے فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔[105]

مقامی خوراک یہاں سادہ تھی جو گندم، جو، باقلہ، کنگنی، ترنبہ اور باجرہ پر مشتمل تھی ان میں کئی چیزیں اب متروک ہو گئی ہیں۔ میٹھے آٹے سے بنی روٹی ہر ژپ خوشی کے موقع پر لازمی بنتی تھی۔ ترنبہ اور جو کی روٹی کو اخروٹ کی

گری اور مرچ مصالحہ کے ساتھ چٹنی بنا کر کھایا جاتا تھا۔ ستو کو نمک والی چائے میں ڈال کر یا مکھن یا گھی میں گوندھ کر کھاتے تھے سبز نمکین چائے بلتی بہت شوق سے پیتے ہیں۔ روایتی بلتی کھانوں میں "مازان" سب سے اہم ہے جس میں مکھن یا گری کا تیل حلوہ کے درمیان ڈال کر کھاتے ہیں۔ یہاں گھی کو تین طرح محفوظ کیا جاتا ہے۔ پہلے مکھن کو بھوج پتر کے چھلکوں میں لپیٹ کر دفناتے ہیں۔ دوسرے طریقے میں مکھن کو مٹی کے مٹکے میں ڈال کر اس کا منہ گارے سے بند کر کے زمین میں دفناتے ہیں۔ تیسرے طریقے میں گائے، بیل، بکری کے چمڑے کے تھیلوں میں ڈال کر محفوظ کیا جاتا ہے۔ پہلے شادیوں پر بیس قسم کے سالن پیش کیے جاتے تھے جو کشمیری روایت کا اثر ہے۔[106] ہرتب کھور، ہلابو، کستر، اذوق، پھر پھر، کھوریا چھاپے، بلے، پھوروس یہاں کے دیگر روایتی کھانے ہیں۔ نمک والی چائے کو سالن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ توت کے رس سے تیار کردہ میٹھا مشروب خندہ بھی مقبول ہے۔[107]

موسمی حالات کے پیش نظر بلتستان میں لوگوں کا لباس گرم، اونی اور سادہ ہے۔ مقامی روایتی لباس اب متروک ہو چکے ہیں۔ قدیم ملبوسات میں مرد اونی کرتے، شلوار اور ٹوپی پہنتے تھے۔ مقامی طور پر تیار کردہ پٹو سے آج بھی کرتے اور کوٹ تیار کیے جاتے ہیں۔ یہاں کے قدیم ملبوسات میں لوئی (اونی شال) کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ اسے قار کہا جاتا تھا اور کثیر المقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ بزرگوں کا اسے اوڑھ کر مجلس میں جانا آداب مجلس میں شمار ہوتا تھا۔ اب اس کا رواج تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ آج کل کی واسکٹ کی جگہ پچھلے وقتوں میں بھیڑ کی کھال سے بنی پوستین پہنتے تھے۔ قدیم بلتی مردانہ ٹوپی اب متروک ہو چکی ہے۔ زنانہ ٹوپی پر چاندی کے منقش زیورات سینے کا رواج تھا جسے طومار کہا جاتا تھا۔ اس ٹوپی کے اوپر چادر اوڑھی جاتی تھی۔ اس کے اوپر سرخ اور کالے پٹو کا گھیر ہوتا تھا۔ پیچھے تکون کی صورت میں کپڑا جوڑتے جو کمر پر لٹکتا تھا۔ یہاں بالوں کو سمیٹنے کا منفرد رواج تھا جس میں مینڈھیاں بنا کر ان کے ساتھ پراندہ لٹکاتے تھے۔[108]

فیروزہ کو بلتستان کا قومی پتھر کہنا چاہیے۔ یہاں مرد وزن اس کی انگوٹھیاں پہنتے ہیں۔ خواتین بڑے بڑے فیروزے چاندی کے فریم میں جڑ کر سی لیتی ہیں اور کپڑوں پر حلقہ بند کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ یہاں کے زیورات پر ترک آبادکاروں کے اثرات ہیں۔ عہد رفتہ میں عام لوگ راجہ خاندان میں رائج کپڑے اور زیورات استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں مروج زیورات میں پھرانگ، (چاندی کے ہار)، کوق چنگ (حلقے کی طرح)، برنگ شریک (سینے کا زیور)، کھوڑوکھ (پرس)، ڈولان (ہار)، سانوتو (جھمکہ، بالی)، چہار گل (نتھ)، توزدام (بالوں کی پن)، نمدو (چوری) اور پھوقبو شامل ہیں۔ یہاں اون کے بیل بوٹوں والے والے نمدوں کا بھی رواج رہا ہے۔[109] یہاں قدیم جوتے اونی پٹو اور کچے چمڑے سے بنائے جاتے تھے جنھیں "پیو اور یلم" کہا جاتا ہے۔ لکڑی کے کھڑاؤں "کنگ شنگ" اور گھاس کے بنے چپل "بلا" بھی مستعمل رہے۔[110]

یہاں کی طرز معاشرت کے حوالے سے لوک روایات کا مطالعہ بھی دلچسپی کا حامل ہے۔ جن میں قدیم معاشرت کے نمونے ہیں۔ یہاں رائج کچھ رسوم ورواج صدیوں سے چل کر نسل در نسل ورثے میں آئے۔ یہاں کے بوڑھے اب بھی مجلس میں داخل ہوتے وقت سلام کے ساتھ جھک کر دایاں ہاتھ پیشانی تک لے جاتے ہیں اور ہتھیلی کو پیشانی کی طرف رکھتے ہیں جو قدیم تہذیب کی یاد گار ہے۔ گلے ملتے وقت باری باری دونوں طرف بغلگیر ہوتے ہیں۔ یہاں کے معاشرتی آداب منفرد ہیں۔

"عمر، خاندانی رتبہ، علم اور پیشے کی بنیاد پر عزت و وقار کا رتبہ متعین ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے منکسرانہ طریقے سے آداب بجالاتے ہیں جن میں جھک کر سلام کرنا، ہاتھ چومنا، ایک دوسرے کو آگے بٹھانا، بزرگوں کے سامنے کم بولنا اور طعام کی پہلے پیشکش کرنا وغیرہ شامل ہیں۔"[111]

اچانک مہمان پہنچنے پر خشک پھلوں سے تواضع کرتے ہیں۔ پہلے مہمان کو حسب رتبہ بطور تحفہ جانور پیش کیا جاتا تھا۔ عموماً اسے وہیں واپس کر دیا جاتا تھا۔ بلتستان میں محلے کی سطح پر منظم سماجی نظام "شربا" بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں چھوٹی عمر میں رشتے جوڑنے کا رواج ہے۔ دو دو تین تین شادیوں کا بھی رواج رہا ہے۔ مویشیوں کو ہر گھرانہ اپنی باری پر چرانے لے جاتا ہے۔ فطرتاً امن پسند ہونے کے باعث یہاں مقدمات کی شرح بہت کم ہے۔ یہاں معافی طلب کرنے کا انداز بہت مختلف تھا۔ قدیم زمانوں میں بلتی راجاؤں، وزیروں یا معزز شخصیات کے سامنے کسی سے کوئی گستاخی سرزد ہو جاتی تو اسے منہ میں گھاس اور گلے میں لوئی ڈال کر پر تکلف انداز سے معافی مانگنا پڑتی۔[112]

یہاں شرعی عدالتوں میں بہت سے مقدمات کا فیصلہ ہوتا ہے جو سستے انصاف کی مثال ہے۔ گواہ نہ ہونے پر فیصلہ قسموں پر ہوتا تھا۔ ماضی میں یہاں تمام کاروبار زبانی تھا، تحریری صورت میں نہیں۔ اب کچھ عشروں سے لین دین کا حساب تحریری طور پر کرنے لگے ہیں۔

"کم و بیش تین چار عشرے قبل تک بلتی معاشرے میں یار دوست اور عزیز و اقارب کے مابین باقاعدہ خط و کتابت کی روایت بھی بہت کم تھی۔ البتہ ایک دوسرے کو علاقے کے قدیم کلاسیکی گیت جن کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی تاریخی یا رومانی واقعہ ہوتا ہے، کو بطور پیغام بھیج دیا جاتا اور پیغام وصول کرنے والا دوست یا عزیز اس لوک گیت کے پس منظر کی روشنی میں پیغام دہندہ کے مافی الضمیر اور اس کا نتیجہ اخذ کر لیتا تھا۔"[113]

لوک گیتوں کو بطور پیغام ارسال کرنے کا یہاں انوکھا طریقہ رائج تھا۔ اس کے علاوہ مختلف اشیا جیسے پھول، کوئلہ، کنکر یا سوکھی لکڑی بطور تحفہ بھیجی جاتی، ان چیزوں کے مزاج کے مطابق نتیجہ اخذ کیا جاتا تھا۔ جیسے لالہ نامی پھول یا شنگ کھن کوفہ پا نامی لوک گیت کے بھیجے جانے پر بے وفائی کا پیغام تصور ہوتا۔ کوئلہ فراق کی آگ میں جھلنے کی علامت، کنکر سنگ دلی کی نشانی اور سوکھی لکڑی جدائی کے غم میں ناتوانی کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا۔ یہاں پہلے سینگ کے بنے

حقوں کا رواج تھا پھر کشمیر سے تانبے کے بنے حقے آنے لگے۔ یہ لوگ دھونی دینے کے بہت شوقین ہیں اسے مقامی طور پر شولی کہتے ہیں۔ اس کا تصور پاکیزگی کے ساتھ وابستہ ہے۔[114]

فریڈرک ڈیو نے جموں اور کشمیر نامی کے عنوان سے کتاب میں بلتیوں کے بارے میں کہا ہے کہ یہ تورانی الاصل ہیں۔ ان کی آنکھیں کونوں کی طرف پھیلی ہوئی اور جبروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی ہیں۔ وہ درمیان سے سر مونڈھ کر آخری سروں پر بالوں کو اتنا لمبا کرتے ہیں کہ زلفیں گھونگروں کی شکل میں گالوں اور گردن تک پھیل جاتی ہیں۔ بلتیوں کے لباس گھٹنوں تک چوغے اور پاجامے ہیں۔ سروں پر گول چھوٹی ٹوپیاں پہنتے ہیں۔ سربراہوں کے سروں پر ٹوپیوں کے اوپر پگڑیاں لپٹی ہوتی ہیں۔ لوگ ننگے پاؤں گھومتے ہیں البتہ جوتے ساتھ رکھتے ہیں۔[115]

خپلو میں کشمیری دستکاریاں اور ماہرین کو حکمران خصوصی طور اپنے ہاں بلاتے تھے۔ مگر ان کی آبادکاری کے لیے مقامی آبادی کو متاثر ہونا پڑتا تھا۔ مرکزی حکومت کے اخراجات پورے کرنے کے لیے دیہی علاقوں کے لوگوں کو فصل کی پیداوار کا پانچواں حصہ بطور خراج ادا کرنا پڑتا تھا۔ ہر گھر سے سالانہ لازمی ایک فرد کو چالیس دن کے لیے بیگار پر بھیجا جاتا تھا۔ دفاعی ضروریات پوری کرنے کے لیے بلند و بالا جگہوں پر حکمران قلعے اور محلات بناتے تھے۔ اتنی بلندی پر واقع ان قلعوں تک پانی پہنچانے کا عمومی ذریعہ کوئی نہیں ہوتا تھا۔ قلعے کے محافظوں اور وہاں رہائش پذیر افراد کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ان قلعوں میں بڑے بڑے ٹینک تعمیر کرتے تھے۔ جنھیں مقامی افراد اپنے کندھوں پر پانی اٹھا کر اتنی بلندی پر جا کر بھرتے تھے۔ اس بیگار سے مقامی لوگ ناخوش رہتے تھے۔ اس لیے ڈوگروں کے حملے کے وقت بہت سے قلعوں کا محاصرہ کامیاب رہا کیونکہ پانی کا بندوبست بہت مشکل تھا۔[116]

اب بلتستان میں نت نئے تجربات کے ساتھ جدید فنون کو آزمایا جا رہا ہے۔ اکثر خاندان موروثی پیشوں کو چھوڑ کر تن آسانی اور دیگر شعبوں کی تلاش میں ہیں۔ ورنہ صدیوں پہلے بلتی اپنے خاندانی پیشوں کو بغیر ردوبدل کے اپنانے کے پابند تھے۔ ماضی میں مروج عوامی پیشوں میں کاشتکاری (سہ گیدیا)، گلہ بانی (لورزی پا)، بڑھئی (سنگ کھن)، لوہار (گریہ)، موچی (ہلنگ کھن)، نائی (ٹھاکر)، اخوند (ملا)، جولاہا (تھق سکنن)، کمہار (زیم کھن)، سنار (حسنیر گر)، درزی (بیلم)، موسیقار (مون)، ماکان پن چکی (رینھقق) اور تاجر (زھونگپہ) شامل ہیں۔ یہاں بعض علاقوں میں مردوں سے زیادہ عورتیں کھیتی باڑی کے فرائض نبھاتی ہیں۔ ابتدا میں گلہ بانی کو مغرب سے آنے والے شین قبائل نے اپنایا۔ ہر گھر میں محدود پیمانے پر مویشی پالنے کا رواج تھا۔ دودھ، گوشت اور زراعت میں مدد کے لیے جانور پالے جاتے تھے۔ یاک بلتی لفظ بیاق کی بگڑی شکل ہے۔ ہر نسل کے لوگوں میں بڑھئی کاری گر موجود تھے۔ یہاں لکڑی کے برتنوں کا رواج عام تھا۔ گھروں کی تعمیر میں لکڑی کے کام کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ لوہار کا پیشہ موروثی تھا۔ جسے شروع میں مون لوگوں نے اختیار کیا۔ یہاں زرعی آلات کدال، درانتی عام استعمال کی اشیا اور چھرے، کلہاڑے، تیشہ، بندوق تلوار وغیرہ

بنائے جاتے تھے۔ موچیوں کا پیشہ بھی مون قبائل سے منسلک سے تھا۔ حجامت بنانے اور بچوں کا ختنہ کرنے کے لیے ماہرین کے طبقے کو نائی کہتے ہیں۔ دینی معاملات کی انجام دہی کے لیے اخوند، کھڈیوں پر کپڑا تیار کرنے کے لیے جولاہے، پتھر اور مٹی کے برتن بنانے کے لیے کمہار تھے۔ مون قبائل بدھ مت کی تبلیغ کے لیے ساز بجاتے ہوئے آئے تھے۔ ماضی میں موسیقی سے کچھ بیماریوں کے علاج کی روایات موجود ہیں۔ یہاں کے عوام اور اہل حکمت کا عقیدہ تھا کہ موسیقی سے علاج ہوتا ہے۔ اب ساز ندے نایاب ہوتے جارہے ہیں۔ ماضی میں لداخ اور لہاسہ کیطرف خوبانی کی تجارت ہوتی تھی۔[117]

بلتستان میں پیدائش، شادی بیاہ اور موت کی مخصوص رسوم تھیں۔

> "بلتی معاشرے میں لڑکا لڑکی سے اس خیال کے ساتھ عزیز سمجھا جاتا کہ بیٹے کی وجہ سے خاندان زندہ رہتا ہے اور وقار بلند ہوتا ہے۔ جبکہ لڑکی کو شادی کے بعد چلی جانا ہے اسی لیے بیٹی کی ولادت پر زیادہ خوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میٹھی روٹی "ہرژپ کھور" کھانا گزیر سمجھا جاتا ہے۔"[118]

یہاں ختنہ کی رسم کو چھوٹی شادی کی طرح مناتے ہیں۔ یہاں میت کو غسل دے کر لاش کو کسی چارپائی پر سیدھی رکھتے ہیں۔ اس پر بہت سے نئے کپڑے اور چادریں ڈالی جاتی ہیں جو بعد میں میت کے نام پر قرآن خوانی کرنے والوں کو بطور اجرت دیتے ہیں۔ یہاں موت کے بعد کی رسموں میں سوئم، ہفتم، پندرھویں، چالیسویں اور برسی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ موت کے تیسرے دن بعض علاقوں میں گھر والے "حنہ بوک" کھانا تیار کرتے۔ چالیس دن تک قبر پر پانی ڈالنے کا رواج عام ہے۔ ساتویں دن چراغ جلایا جاتا ہے۔ میت کی تدفین والے دن کے بعد پیر، جمعرات یا جمعہ میں جو دن پہلے آئے سوگواران کے سر دھلانے کی رسم گوچگوس کہلاتی ہے۔ یہ رسم غم سے فارغ ہونا تصور کیا جاتا ہے۔[119] بلتستان میں رنگ، نسل، ذات پات کی تمیز شادی بیاہ اور دوسرے تعلقات میں مانع نہیں تھی۔ مون قبائل کے علاوہ ایک طبقے والے دوسرے طبقے میں شادی بیاہ کو معیوب نہیں سمجھتے تھے۔ شادی بیاہ کی رسوم مسلسل عمل سے سماجی قانون کی شکل اختیار کر گئی ہیں۔ خلاف ورزی کے باعث متاثرہ شخص کا سماجی بائیکاٹ کیا جاتا ہے یا جرمانہ (چھدیا) لیا جاتا ہے۔ عام رسوم کے علاوہ پرتہ سیر، انوے اونارن، پرتہ فسون ولم زان، لوقلے نن ما، چنز، ہرژوشپروس، مارشرما وغیرہ شادی کی رسوم میں شامل ہیں۔ بلتستان میں شادی بیاہ کی رسومات کا تذکرہ "حسوعی حیدر" نامی بلتی لوک گیت میں بھی ہوا ہے۔ یہاں زیادہ تر شادی قریبی عزیزوں میں کرتے ہیں۔ لڑکے والے خاندان یا معزز شخص کو "بلیلا" یعنی رابطہ کار بنا کر لڑکی والوں کے ہاں بھیجتے ہیں۔ رسماً فیصلے کا اختیار لڑکی کے ماموں کے پاس ہوتا ہے۔ پیغام قبول ہونے کے بعد شادی کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ یہاں بچپن کے نکاح کا بھی رواج ہے۔ کھ میتھل کی رسم کے بعد دونوں فریقین اپنے وعدوں کے پابند ہو جاتے ہیں۔ پہلے یہ رسم امرا میں رائج تھی بعد میں سب خاندانوں میں رائج ہو گئی۔ اس میں لڑکی کے

گھر مخصوص سامان بھیجا جاتا ہے۔ پھر نکاح کی رسم ہوتی ہے۔ اس کے بعد دونوں خاندانوں کے باہم مشورے سے شادی کی تاریخ طے کی جاتی ہے۔ شادی کے موقع پر کھانے پینے کی تمام سرگرمیاں رات کو ہوتی ہیں۔ شادی کی تقریب کا آغاز یہاں قرآن خوانی سے ہوتا تھا۔ اگلے دن رشتہ داروں کی دعوت کرکے شادی کے لیے روٹیاں پکانا شروع کر دیتے جنھیں توڑ کر محفوظ کرکے حسب ضرورت گوشت کے شوربے میں بھگو کر مہمانوں کو پیش کرتے۔ شادی کے اخراجات کے لیے تمام لوگ حسب توفیق چندہ "تھودمہ" دیتے۔ شادی سے ایک روز قبل مہندی کی رسم ہوتی۔ پرانے وقتوں میں لڑکی کے گھر سے ایک وفد لڑکے کے گھر جا کر باراتیوں کا جائزہ لیتا اور سامان کا حساب کرتا۔ عروسی لباس پہننے کے بعد دلہار سمأ بارات کے ساتھ دلہن کے گھر جاتا وہاں اسے اور قریبی ساتھیوں کو تحائف دیے جاتے۔ بلتی شادیوں میں دلہا کے سر پر پگڑی باندھنے کی رسم "بل تھود" ہے۔ دلہن کو بھی چاندی کے زیورات سے مزین ٹوپی کے اوپر بل تھود پہناتے۔ یہ عروسی لباس میں سب سے زیادہ متبرک سمجھا جاتا تھا۔ دلہا دلہن الگ الگ قریبی عزیزوں کی معیت میں قبرستان جا کر فاتحہ خوانی کرتے۔ شام کو دلہن کو رخصت کیا جاتا۔ اس موقع پر کاسیکی دھن "چیلاہو" بجائی جاتی تھی۔ دلہن کو اس کے رشتہ دار بارات کی صورت میں دلہا کے گھر چھوڑ آتے۔ دلہن کے ساتھ خدمتگار خاتون بھی جاتی جو منا کہلاتی۔ شادی کی دوسری رات خاص رشتے داروں کی دعوت کرون زان شادی کے اختتام کی نشانی ہے شادی کے بعد دلہا دلہن کی دعوتوں کو بوس زان کہتے ہیں۔[120]

بلتستان کی اکثریتی آبادی شیعہ اور نور بخشیہ مسالک سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لیے محرم کے مہینے میں یہاں مجالس عزا منعقد کی جاتی ہیں۔ امام بارگاہوں کو سیاہ پوش کیا جاتا ہے۔ لوگ محرم کے دس روز خصوصاً اور چہلم تک عموماً دنیاوی معروضات ترک کرکے زیادہ وقت شہدائے کربلا کے سوگ میں وقف کرتے ہیں۔ یہاں گرمیوں میں شمسی ماہ اسد کے دوران بھی محرم کی یاد تازہ کرنے کے لیے عشرہ ماتم کی مجالس منعقد کی جاتی ہیں۔ ماتمی جلوس نکالنے کے بعد نوحے پڑھنے کا رواج ہے۔ سوگ کے باعث محرم صفر میں کوئی خوشی نہیں منائی جاتی۔ یہاں چھوٹی بڑی عید اور نوروز بہت اہتمام سے مناتے ہیں۔ عراق اور ایران میں موجود مقدس مقامات کی زیارت کے لیے جانا خوش بختی سمجھا جاتا ہے۔ یہاں حجاج کرام واپسی پر قریبی عمر رسیدہ عزیزوں کے لیے کلمہ شہادت لکھا ہوا کفن بطور سوغات لاتے ہیں۔ شب برات بھی عقیدت سے مناتے ہیں۔ اس موقع پر شیعہ حضرات کے مخصوص عریضے رات کے آخری پہر دریا میں پھینکنے کی روایت بھی ہے۔[121]

بلتستان میں موسمی نوعیت کا تہوار "مے تھنگ" 21 دسمبر یا اس کے بعد منایا جاتا ہے۔ اس میں خشک لکڑیوں کو آگ جلا کر مشعلیں کسی مخصوص جگہ اجتماعی طور پر پھینک کر واپس آتے ہیں۔ بوائی کا تہوار سون پور اہتمام سے مناتے تھے۔ خواتین کھیتوں میں گوڈی کرتے ہوئے مخصوص گیت بھی گنگنایا کرتی تھیں۔ جو کے خوشوں میں سبز دانے

بھرنے پر یہاں "ستر وب لہ" کی رسم مناتے تھے۔ مویشیوں کو بالائی چراگاہوں کی طرف منتقل کرتے وقت برون کھیر مناتے ہیں۔ گندم گاہنے کے لیے جانوروں کا استعمال کرتے ہیں جسے اونگ چوس کہتے ہیں۔ جانور قطار میں باندھ کر کھونٹے کے گرد چکر کاٹتے ہیں اور گندم کے خوشے ان کے بازوؤں کے نیچے آکر الگ ہو جاتے ہیں اور بھوسے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ گندم کے دانوں کو تھیلوں میں بھر کر گھر لانے کے دوران بات چیت کرنا ممنوع ہوتا ہے۔ نوجوانوں کی تفریحی ضیافت "شہ لین اور گرون" کے نام سے کی جاتی ہے۔ سال کے آخر میں سردیوں کے لیے جانور ذبح کر کے گوشت محفوظ کرنے کو یالو سر یا ستون بیوک کہتے ہیں۔ برف باری کے موسم میں کھر ستون نامی رسم منائی جاتی تھی۔ پھولوں کی نمائش کا تہوار میندوق ہلمنتو قدیم زمانے سے اہتمام سے منایا جاتا ہے۔[122]

گھوڑوں کو چشم بد سے محفوظ رکھنے کے لیے خاص تکونی تعویذ پہنائے جاتے تھے۔ پولو سب سے اہم قدیم کھیل ہے ابتدا میں اس کے مقاصد جنگی تھے۔ پولو خالص بلتی لفظ ہے۔ اس کا بلتی لفظ پلو ہے۔ یہاں ہر گاؤں میں سبزہ زار مستطیل نما پولو گراؤنڈ شغرن موجود ہیں۔ پولو سے متعلقہ خصوصی دھنیں بجائی جاتی تھیں۔ یہاں پولو کے لیے ہفتہ اور منگل کا دن مخصوص تھا۔ محرم اور صفر میں پولو کھیلنا قطعی بند ہے۔ پولو قدیم کھیل ہونے کے ناطے گھوڑے سے متعلق یہاں بہت سی ضرب الامثال مروج ہیں۔ قدیم زمانے میں پولو کی تمہیدی رسومات بھی نافذ العمل تھیں۔[123] دیگر کھیلوں میں پیدل پولو، نیزہ بازی، تیر اندازی، نشانہ بازی، سیپ تراشی، رسہ کشی شامل ہیں۔ بچوں کے کھیلوں میں پھڑاموش، خوبانی کی گٹھلیاں ٹکرانے کا کھیل (یق ھن)، بشمالی، تیک دونگ، چکہ اور رایوش (گلی ڈنڈا)، رود لین پھنگمہ (گول پتھر پھینکنے کا مظاہرہ)، ایپ ایپ (آنکھ مچولی) شامل ہیں۔ دیگر کھیلوں کے طور پر کشتی، ٹاپو، چھولو، جنجالی لو، انڈے لڑانا بھی مستعمل ہیں۔ یہاں بانٹے کھیلنے کا رواج قدیم زمانے سے ہے جس کی سرپرستی راجے کیا کرتے تھے۔[124]

بلتستان میں اسلام ایران سے کشمیر کے راستے آنے والے شیخ امیر سید علی ہمدانی نے پھیلایا۔ ان کے بیٹے کے نائب محمد نور بخش نے شگر اور خپلو میں اپنا عقیدہ پھیلایا۔ مولوی حشمت اللہ خان کے مطابق نور بخش خود شیعہ مسلک کے پیروکار تھے مگر بعد میں دیگر مبلغین جیسے میر شمس الدین عراقی نے ان کا نام اپنے عقائد کی ترویج کے لیے استعمال کیا۔ اس لیے بلتستان کے شمالی علاقوں میں نور بخشی مسلکی عقائد کے لوگ موجود ہیں۔ جبکہ بلتستان کے مرکز، جنوبی اور مغربی حصوں میں شیعہ مذہب کے ماننے والے بڑی تعداد میں ہیں۔[125] یہاں کے لوگوں میں توہمات عام ہیں۔ یہ لوگ بابرکت جنس ہلا اور ہلانو کے وجود پر یقین رکھتے ہیں۔ ہلا اور ہلانو مارخور وغیرہ کا شکار کرتے ہیں تو ہڈیاں دوبارہ جڑ کر زندہ ہو کر انسانوں کے ہاتھوں شکار ہونے کے لیے وجود میں آجاتے ہیں۔ کیسر کی داستان تحریف کے بغیر کوئی سنائے تو اسے غیب سے انعام ملتا ہے۔

"کہا جاتا ہے کہ خطہ بلتستان "ہلاہل" یعنی دیوتاؤں کی سرزمین ہے اس لیے ان کو خوش رکھنے کے لیے آج سے کچھ عرصہ قبل تک گاؤں کی سطح پر موسیقی کی محفلیں جمانا ناگزیر سمجھی جاتی تھی اب یہ رسم ختم ہو چکی ہے۔ چند ایک بزرگوں کا کہنا ہے کہ عوامی سطح پر موسیقی کے متروک ہونے کے بعد سے علاقے میں برکات مفقود ہیں۔"[126]

یہاں ہر بیماری اور ناکامی کو آسیب کا اثر سمجھا جاتا ہے۔ مرغی کی بانگ نحوست کی علامت ہوتی ہے۔ تعویذ پہننا یہاں بہت عام ہے۔ بے وقت بلی اور لومڑی کا چیخنا بد شگونی سمجھتے ہیں۔ کسی میت کا آنکھیں کھول کر انتقال کرنا کسی قریبی عزیز کی جلد موت کا پیش خیمہ سمجھا جاتا تھا۔ سفر پر جاتے وقت لوٹا، برتن اور عورت کو دیکھنا بد شگونی کی علامت سمجھتے تھے۔ کوئی گلے میں غیر ارادی جلن محسوس کرتا تو تصور کرتے اس کی غیبت ہو رہی ہے۔ اچانک گلے میں کھانا پھنسنا کسی عزیز کی یاد سے جوڑتے۔ اگر نوزائیدہ بچے جلد مرنا شروع ہوتے تو ان کے بہت عجیب نام رکھتے۔ انسانی جسم پر مکڑی کے چلنے کو خلعت ملنے سے تعبیر کرتے۔ یہاں بہت سے پتھروں کے ساتھ مخصوص کہانیاں وابستہ ہیں۔ شکار کے حوالے سے بھی مخصوص توہمات پائے جاتے ہیں۔ پہلے یہاں شکار کے دلچسپ قواعد وضوابط مقرر تھے۔ یہاں کتے کی مدد سے لشکری شکار کی روایات بھی موجود ہیں۔ مچھلی کے شکار کے لیے یہاں لکڑی کا دوشاخہ ڈنڈا جس کے درمیان تیز میخ ہوتی اور کھالو کہلاتا دیگر طریقوں کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔[127] یہاں قدیم علاج کے طریقوں میں آگ سے داغنا، جڑی بوٹیوں سے علاج اور نشتر لگانا شامل ہے۔ اکثر امراض کو چشم بد اور آسیب کے کھاتے میں ڈال کر عاملوں کو بلانے کا رواج ہے۔ دیسی علاج کرنے والے طبیب کو اچی کہتے ہیں۔[128]

بلتی بنیادی طور پر تبتی کی شاخ ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ یوں لگا سکتے ہیں کہ اس کے حروف تہجی کی تعداد 58 ہے۔[129] تبتی کا اصل رسم الخط دیوناگری سے لیا گیا ہے جو بلتستان میں متروک ہے۔ اشاعت اسلام کے بعد مذہبی اشعار لکھنے کے لیے اہل علم نے فارسی رسم الخط کا استعمال کر کے لاشعوری طور پر ایک نئے طرز تحریر کا اجرا کیا۔ آج تک کا تمام بلتی ادبی سرمایہ اسی رسم الخط میں ہے۔ امن وامان کے باعث یہ خطہ شعر وادب کے اعتبار سے ثروت مند ہے۔

"بلتستان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ادب کی سرزمین ہے۔ یہاں کا ہر باشندہ فطری طور پر شاعر، ادیب اور فنکار ہے۔"[130]

بلتستان میں شاعری کا آغاز قافیہ ردیف سے مبرا لوک گیتوں سے ہوا جنھیں رگیاخلو کہتے ہیں۔ بعد کے بلتی لوک گیتوں کی پہچان ردیف ہے۔ اس صنف شاعری میں کوئی باقاعدہ شاعر نہیں ہوتا بلکہ اجتماعی طور پر گیت تخلیق ہوتے ہیں۔ بلتی میں باقاعدہ شاعری کا آغاز ڈوگروں کے ہاتھوں سقوط بلتستان کے بعد ہوا۔ زیادہ تر مذہبی موضوعات پر مبنی شاعری ہے۔ عشق ومحبت، سیاست، معاشرت، معاشرتی اونچ نیچ کو بھی موضوع سخن بنایا گیا۔ جدید شاعری میں ملی نغمے، زرعی نغمے بھی ملتے ہیں۔ پہلے دور کے اشعار میں راجہ حسن علی خان محمد مرثیہ گو شاعر کا مقام بہت بلند ہے۔ راجہ حیدر علی خان کو بلتستان کے پہلے قومی شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ دوسرے دور میں بہت سے شاعر منظر عام پر آئے جن میں

قصیدہ گو، مرثیہ گو، غزل گو، ہجو گو اور طویل بحر نگار شامل ہیں۔ تیسرے دور کے شاعروں کی طویل فہرست ہے۔ بلتستان میں پچھلی صدی کی آخری دو دہائیوں میں تحقیق و تنقید کے میدان میں اہل قلم نے طبع آزمائی کی ہے۔ بلتی ریڈیائی ڈرامے کی نئی صنف بھی ابھر کر سامنے آئی ہے۔[131]

یہاں سرما کی طویل راتوں میں داستان گوئی کی روایت قدیم عہد سے متواتر چلی آرہی ہے۔ اس دوران خواتین اون کاتنے اور مرد بکری کے بالوں سے ستلی بنانے کا کام انجام دیتے۔ وسط نومبر سے اواخر فروری تک یہ محفلیں جمتیں۔ فصل بونے سے اٹھانے تک داستان گوئی نحوست سمجھی جاتی۔

"بلتستان کے چند بزرگ داستان گوئی کی اس رسم کو ادا کرنے کے کئی فوائد بھی گردانتے ہیں۔ جن میں سارے محلہ والے ایک جگہ جمع ہونے سے گرم کرنے کے لیے ایندھن کی بچت، ان دنوں تیل کی گرانی اور بجلی کا تصور نہ ہونے کے ناطے روشنی میں کفایت شعاری، بوریت کا ازالہ، داستانوں کے ذریعے پند و نصائح اور عقل و شعور کی باتوں سے مستفید ہونا، مل بیٹھنے سے آپس میں پیار و محبت کا اضافہ ہونا اور ساتھ ساتھ گھریلو دستکاری کے کاموں کا انجام دینا وغیرہ شامل ہیں۔"[132]

یہاں دیسی و بدیسی دونوں قسم کی داستانیں مروج ہیں۔ بدیسی داستانوں میں فارسی کے اخذ کردہ جبکہ دیسی میں خاص مقامی روایات ہیں۔ ان میں ہلو نو کیسر، رگیالو ستر البو، شینگ کھن چندن، اپی ژھو نژوا، رگیالو چولو برنگ، ژھو نگیہ مستو، بدھ یلی رگیالو، سلمہ چوبو، شینگ کھنی خسو سپو، مایون ژھنگہ، شینگ کھن بہادر اور بہ سیر وغیرہ اہم ہیں۔ ان میں ہلا نو کیسر کی دیومالائی داستان کو مرکزیت حاصل ہے۔ باقی سب میں عشق و محبت، رقابت، مردانہ طاقت، بہادری، زنانہ حسن و جمال کا تذکرہ اور جن بھوت یا مافوق الفطرت عناصر موجود ہوتے ہیں۔ بلتستان کی لوک داستانوں سے گزشتہ زمانے کی معاشرت کا مکمل نقشہ سامنے آتا ہے اور لوگوں کے میلانات، عقائد اور رسوم و رواج کا پتہ چلتا ہے۔ جیسے یہاں کی داستانوں میں مردہ پر پانی چھڑکنے سے زندہ کرنے کا تصور وغیرہ۔ کیسر داستان سے تو بہت تمثیلی آثار بھی منسوب ہیں۔ جبکہ یہاں بعض لوک کہانیاں بلتستان کے ہر علاقے والے تھوڑا سا انداز بدل کر خود سے منسوب کرتے ہیں۔[133]

ابتدائی شاعری وزن کے اصولوں سے مبرا تھی۔ رگیا خلو کا شمار بلتستان کی کلاسیکل شاعری میں ہوتا ہے۔ یہ یہاں کی ثقافت کے بھرپور عکاس ہیں۔ برق مالور چو، تیشے مراد، منافو وغیرہ عام لوک گیتوں کی مثالیں ہیں۔ لوک رومانوں میں شرنگ بعدوز، ژھن تھغ ینگ، بروشال پا، شلیے شوک مشہور ہیں۔[134]

یہاں قدیم زمانے میں بون مت کے پیروکار تھے۔ اس میں رقص و موسیقی کی بہت اہمیت ہے۔ اس مذہب کی باقیات کچھ عرصہ قبل تک لوگوں کے اذہان پر اس حد تک سوار تھیں کہ دیوتاؤں کی سرزمین ہونے کے ناطے انھیں خوش کرنے کے لیے موسیقی اور ناچ ناگزیر سمجھتے تھے۔ یہاں کی قدیم دھنوں میں بلتی چھوس، کچھے چھوس، بروق

چھوس، مون چھوس، لورہ چھوس اور بان چھوس شامل ہیں۔ چودھویں صدی میں ایرانی مبلغین کی آمد کے باعث یہاں ایرانی فنون لطیفہ بھی آئے۔

"کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مغلیہ دور سے قبل ہی ایرانی فنون لطیفہ اور موسیقی بلتستان میں رائج ہو چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایرانی موسیقی کے اصولوں میں موجود مقامات، اوزل یا عزل، گوشہ اور روانی وغیرہ بلتستان میں آج بھی مروج ہیں۔[135]

یہاں کلاسیکل، جنگی، غنایہ اور دعائیہ سازوں کی کل تعداد ساٹھ بتائی جاتی ہے۔ موجودہ موسیقار ان میں سے صرف چند دھنیں بجا سکتے ہیں۔ اشاعت اسلام کے بعد کی مروج موسیقی میں راگ (جرید) کی قسموں میں نوبت اور یاسین نمایاں ہیں۔ جبکہ رقص کی دھنوں میں ہرژے کار میں چھوغو یہ اسول، گاشویا، پیندوق ہلمتنو، سیتوپا، پھورگوں کا، تھین کا پوراکار، پھوتونگ کار، لم کار، لنک کار، چلاہو، سغنرا (پولو کی دھن) ہیں۔ ان میں تلوار پر رقص کی دھنیں بھی ہیں۔ آلات موسیقی میں بڑا ڈھول ڈانگ، طبلہ ڈامن، بانسری جلنگ، شہنائی، سرنا، کرنا پور غور، چنگ، چنگ داؤد شامل ہیں۔[136]

سکردو کے گھر چھوٹی دیواروں اور چھتوں پر مشتمل ہیں۔ پتھر اور مٹی سے دیواریں بناتے ہیں۔ بعض گھر دو منزلہ بھی ہیں۔ روندو میں لکڑی کے تختوں سے گھر بناتے ہیں۔ گرمیوں میں تمام گھروں کی چھتوں پر خوبانی سوکھنے کے لیے پھیلی نظر آتی ہے جو ان کی سردیوں کی خوراک ہے۔[137] اب یہاں شدید موسمی حالات کے پیش نظر کچی اینٹوں سے دو منزلہ مکان بنائے جاتے ہیں۔ اینٹیں چکنی مٹی سے تیار کی جاتی ہیں۔ قدیم عمارتیں چھے فٹ سے زیادہ بلند نہیں ہوتی تھیں۔ ان میں چھوٹے چھوٹے دروازے رکھتے تھے۔ قبلہ کے رخ کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ عام قدیم مکانوں کی پہلی منزل چھے سات کمروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ دو منزلہ مکانات کی آدھی بلندی زمین سے نیچے ہوتی تھی۔ سردیوں میں یہاں رہائش رکھتے یہ زہ ہنگا کہلاتی بہار میں اوپری منزل بلیلا بلو نکما میں منتقل ہوتے۔ کمرے کے وسط میں چولہا بناتے اور دھواں نکلنے کی غرض سے آتشدان کی سیدھ میں چھت کے اوپر گول یا چوکور روشندان رکھتے۔ آج کل کمرے کے کسی کونے میں چمنی "اوجاق" بنائی جاتی ہے۔ مکانوں میں پتھک، غسل خانہ، سٹور، حجرہ اور مہمان خانہ بھی بنائے جاتے تھے۔ مخصوص محفلیں منعقد کرانے کے لیے ہر گھر میں ایک بڑا کمرہ بنایا جاتا۔ یہاں کے مقامی طرز کے بیت الخلا پورے ملک میں منفرد ہیں۔ دو منزلہ عمارت کی چھت میں کئی سوراخ رکھے جاتے اور خشک مٹی کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہاں عہد رفتہ میں مکانات پاس پاس بنائے جاتے تھے۔ مرد جنگ و جدل کے لیے یا دیگر کاموں کے لیے باہر ہوتے تھے تو اجتماعی و دفاعی نقطہ نظر سے محلے قلعے کی طرح مستحکم ہوتے تھے۔ دیہاتی مکانوں کی چھت کثیر المقاصد کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ خصوصی طرز تعمیر میں راجاؤں کے قلعے اور محل تین منزلہ ہوتے تھے۔ جن میں بالکونی لازمی ہوتی۔ دیواریں

لکڑی کی چوکھٹوں سے بناتے۔ لکڑی پر مختلف انداز سے کنندہ کاری کر کے منقش ستون، الماریاں، دروازے، کھڑکیاں، ختم بام اور جافری بنائے جاتے تھے۔ ان عمارتوں میں مغل، ایرانی اور کشمیری طرز تعمیر کی آمیزش تھی۔[138] یہاں یہ مقامی روایت بھی ہے کہ ایک مغل شہزادی گل خاتون کی شادی سکردو کے راجہ علی شیر خان انچن سے ہوئی تو وہ دہلی سے اپنے ساتھ بہت سے اہل حرفہ اور معمار بلتستان لائی جس سے یہاں مغل طرز تعمیر کی گہری چھاپ لگ گئی۔ ان تعمیرات کے قدیم ترین نمونوں میں قلعہ کھرپوچو کے علاوہ بلتستان کے راجاؤں کے قدیم قلعے، مسجد چقچن، خانقاہ خپلو، خانقاہ تھغس، خانقاہ کرپس، مقبرہ میر مختار کریسی، مسجد حرنوپی تھاپورو غیرہ قابل ذکر ہیں۔[139]

بلتی کاری گروں کی بنائی عمارتیں لداخ، لہاسہ کے علاوہ نگر اور ہنزہ میں بھی موجود ہیں۔ التت، بلتت کے قدیم تاریخی قلعے بھی بلتستان کے کاری گروں نے بنائے۔ بلتی تعمیرات میں ختم بام میں امن و سلامتی کی علامت بلتستان کا قومی نشان ہے۔ یہاں کی عمارتوں کی کھڑکیوں، دروازوں، چوکھٹوں پر یہی نقش کنندہ ہوتا ہے۔ یہاں لکڑی کے تالوں اور چابیوں کا رواج تھا جو دیوار میں نصب ہوتے تھے۔ یہاں ہر گاؤں میں مرکزی مقام پر چوپال بنے ہوتے تھے جنھیں بلتنگرہ کہتے تھے۔ پانی کی کمی کے پیش نظر یہاں بہت سی جھیلیں اور ہر گاؤں میں تالاب یعنی رزینگ بنے ہوتے ہیں۔ تالاب میں پانی جمع کر کے باری سے استعمال کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ سدپارہ جھیل سے سکردو کا بیشتر رقبہ سیراب ہوتا ہے۔ بلتستان میں باغات کی تعمیر کا رواج، راجاؤں کی ملکیت تک محدود تھا۔ مقپون راجاؤں کے چھے باغ تاریخی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی کے آخر میں عوامی و سرکاری سطح پر باغبانی کے کامیاب تجربے کیے گئے ہیں۔[140]

جن قلعوں پر راجاؤں نے حکمرانی کی ہو انھیں نوکھر اور جہاں رانیوں کی حکومت رہی ہو انھیں لوکھر کہتے ہیں۔ مصنوعی گلیشئروں کی طرح یہاں چشمے بھی نکالے جاتے ہیں۔

> "چھوز گونگ بلتستان میں چشمے نکالنے کا طریقہ تھا۔ جس طرح گلیشئر وجود میں لایا جاتا ہے اس طرح پانی کے چشمے بھی نکالے جاتے تھے۔ نر پانی اور مادہ پانی کو خاص تعداد میں ملایا جاتا تھا۔ اس اختلاط سے چھوز گونگ نکالتے تھے جسے کسی خاص چیز میں بند کر کے اس جگہ لے جاتے تھے جہاں وسیع میدان ہو اور اس کو آباد کرنا مقصود ہو۔ چھوزنگ سے مراد دریا کو تنگ کرنا ہے یا یوں سمجھ لیجیے دریا کو کوزے میں بند کرنا۔"[141]

چترال

چترال تہذیبی اقدار اور ثقافتی معیار کے اعتبار سے خود کفیل معاشرہ تھا۔ اس میں رہن سہن، نشست و برخاست، آداب اور کھانے کے طور طریقے یہیں کی پیداوار تھے اور اسی معاشرے میں انھیں فروغ ملا۔ خوش خوراکی اہل چترال کا خاصہ ہے۔ اسی لیے دودھ، گوشت، گھی اور آٹے سے بیسیوں قسم کے کھانوں کو رواج دیا گیا۔[142] چترالی پھلوں کے ساتھ پھلوں کے بھی دلدادہ ہیں۔ یہاں یہ عام تاثر ہے کہ قدیم باشندوں کو زمین کی مٹی پسند کرتی ہے انھیں پتھالین کہتے ہیں اور تہواروں میں بلا کر خاص عزت دی جاتی ہے۔ قدیم معاشرے میں چرواہے کی بھی بہت اہمیت تھی۔ معاشرے

میں عزت کے تین موروثی القاب ہیں۔ سات نسلوں تک جس خاندان میں سیاسی و سماجی عزت و اقتدار رہے اس کے افراد آدمزہ کہلاتے ہیں۔ سات نسلوں تک جس خاندان میں مذہبی عزت و اقتدار رہے وہ اخونزدہ کہلاتے ہیں۔ عام لوگ یفت کہلاتے ہیں جو طاقت کی علامت تصور کی جاتی تھی۔[143]

چترالیوں کی تاریخ بہادری سے بھری پڑی ہے۔ سینے پر ہاتھ باندھ کر پہلے سلام کرنا، مجلس میں آنے والوں کے لیے اٹھ کھڑے ہونا، مہمانوں کو عزت کی جگہ بٹھانا چترالیوں کی دیرینہ روایت ہے۔[144] چترال میں روایتی طور پر کھانا اجتماعی عمل ہے۔ بہت سے لوگ ایک تھالی میں مل کر کھاتے ہیں۔ بڑے چھوٹوں کو مخصوص لقمہ دیتے ہیں جو اسپیس کہلاتا ہے۔ عام دستر خوان ہو یا مہتر کی محفل ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ چھوٹے اپنے بڑوں کو پانی یا روٹی اٹھا اٹھا کر پیش کرتے ہیں۔ بڑوں سے پہلے لقمہ نہیں توڑتے۔ میزبان پہلے مہمان کو اشیا پیش کرتا ہے خود بعد میں اٹھاتا ہے۔ روایتی طور پر اچھے کھانے کو چھمالی کہتے ہیں۔ قدیم روایت کے مطابق تمام گھروں میں ناشتہ سب سے اچھا ہوتا ہے۔ گوشت، سبزی، انڈے، پنیر، گھی سے بنے کھانے ناشتے کے لیے تیار ہوتے تھے۔ دودھ یا دودھ کے آمیزے کو نیک شگون سمجھا جاتا۔ کسی بھی نئے اور بڑے کام کے آغاز پر دودھ کا گھونٹ یا دودھ سے بنی کوئی شے کھانے کو اشپیری کہا جاتا ہے۔ شادی کے موقع پر رشتہ داروں کو جو کھانا بھیجتے وہ اور دیوتاؤں کے نام پر چھوڑا حصہ جو الگ کرتے وہ بھی اشپیری کہلاتا تھا۔ صبح کے کھانے کو سہی، دوپہر کے کھانے کو خپشت، سہ پہر کے کھانے کو مرونج، شام کے کھانے کو بوت، رات کے کھانے کو چھوٹے بوئی، سحری کے کھانے کو زار کہتے ہیں۔ رخصتی کے بعد مختلف تہواروں پر بیٹی کے گھر بھیجے جانے والے کھانوں کو بش، استاد کے لیے شاگرد کی طرف سے سبق کے آغاز پر تیار کردہ کھانے کو صرف کہتے ہیں۔ میت والے گھر میں تین دن بعد کھاڑ پکا کر سوگ ختم کرتے ہیں۔ چرواہے کی پکی روٹی کو اونار کہتے ہیں۔ شکاری کے پکے ہوئے گوشت کو جو وہ دوستوں کو تحفتاً دیتے ہیں اشوماس کہتے ہیں۔ گوشت کے کھانوں میں شاہ دریکی، لاژیک، شولہ، رانڈوبڑو، سنگ تاب، بوڑیان، یوشور پنکی، چھیرہ شاپنک، ریشیکی اہم ہیں، آٹے اور پانی سے تیار کیے جانے والے مخصوص کھانوں میں شوشیت، شوژن، مول، خمیری روٹی نمایاں ہیں۔[145]

یہاں لباس میں سادگی اور پائیداری کو اہمیت دی جاتی ہے۔ چترالی ٹوپی اور چغہ بین الاقوامی اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ روایتی لباس میں اونی کپڑے کی ڈھیلی قمیض داغر، پھکوڑ، اونی چوغہ شوقہ شامل ہیں۔ چترال کے روایتی جوتے چمڑے کے موزے کی وضع کے ہوتے ہیں اور لون کہلاتے ہیں۔ یہ لکڑی کے مخصوص سانچوں کی مدد سے تیار کیے جاتے ہیں۔ یہاں گھٹنوں تک لمبی جرابیں ہوتی ہیں۔ دستانوں کو دستموزہ اور جرسی کو بنیان کہتے ہیں۔ بوجھ اٹھانے کے لیے چمڑے سے دارنگ بنایا جاتا ہے۔ دارنگ کی ایک قسم اوور کوٹ کی طرح ہوتی ہے۔ ہرنوں یا بھیڑوں کے سالم چمڑوں کو جوڑ کر نازک طریقے سے تیار کرتے ہیں۔ یہ وسط ایشیا کے روایتی فرغل کی طرح کا لباس ہے۔ چترالی زیورات میں گلے کا

زیور گرائے، مولا گورستو، سینے پر لٹکانے کا زیور بشاویز، نیکلس کی طرز کا زیور حل، موشی، بازہ لا کیٹر، چھونگپرس، کلنہ، انگی ہانو، شونج ہانو، انگوٹھی یولو نگوشٹم اور چوڑیوں کو ہوست گورو کہتے ہیں۔ گھوڑوں کی آرائش کے لیے چل پوش، چاغیز و باند، باز بائید بنائے جاتے ہیں۔[146]

یہاں بیماریوں کو گرم، سرد، خون اور معدے کی بیماریوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ زخموں کے علاج کو متی کوریک، دھونی دینے سے علاج کو کھوشیک، جوڑوں کے لیے علاج کو ڈپیک، دم کو دم دک، بچے کو رونے پر ٹونے گھول کر پلانے کو تشاؤ کویک، تعویذوں سے علاج کو زنائیت کوریک، آسیب سے علاج کو دیمیتیک، پیاز کے ساتھ علاج کو گازک ملہم، فریکچر وغیرہ کے علاج کو تھپودپ شل دک کہتے ہیں۔[147]

چترال میں ہر محفل میں بڑوں کو آگے جگہ دی جاتی ہے۔ کم عمر کے لوگ درجہ بدرجہ پیچھے بیٹھتے ہیں۔ باہر سے آنے والوں کا کھڑے ہو کر استقبال کرنے کا رواج ہے۔ بیٹھے بیٹھے ہاتھ ملانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ عام بیٹھنے کے لیے بھی ننگے فرش یا ننگی چارپائی وغیرہ پر بٹھانا معیوب سمجھتے ہیں۔ قالین بو ننک وغیرہ بچھانے کا خاص دستور ہے۔ کرسیوں کی جگہ گھروں میں بڑے تخت بنائے جاتے ہیں۔ جن پر قالین، چاندنی وغیرہ بچھا کر بیٹھتے ہیں۔ خوراک کا احترام کرتے ہیں۔ مہمان کے لیے زیادہ اہتمام کرتے ہیں اور گفتگو میں اونچی آواز اور گالی دینا بہت برا سمجھتے ہیں۔[148]

چترال میں بنیادی طور پر دس پیشے مروج ہیں۔ جن میں یژال (چرواہا)، خوراوال (چکی والا)، جولاہا، کمہار، موچی (لوہار)، دار خان (ترکھان)، دشمن (ملا صاحب)، خلفہ (خلیفہ)، استادان (موسیقار)، طبیب (حکیم) شامل ہیں۔ چرواہے کا چترالی معاشرے میں اہم کردار رہا ہے۔ چترالی مہتر کے روایتی لباس میں ٹوپی کے اوپر مرغ زریں کے پر اور ہاتھ میں مخصوص لاٹھی چرواہے کے کردار سے لیے گئے استعارے تھے۔ یہاں سب پیشوں والے اپنے کاموں کا معاوضہ نقدی یا دیگر اجناس کی صورت میں لیتے تھے۔ سنی آبادی میں مولوی کو دشمن کہتے ہیں۔ اسماعیلی مولوی کو خلیفہ کہا جاتا ہے۔ جو خوشی غمی کے موقع پر مذہبی خدمات انجام دینے کے علاوہ تعویذ گنڈے کا دھندا بھی کرتا ہے۔ بچوں کا ختنہ موسیقاروں کے ہاتھوں کرانے کا رواج ہے۔ طبیب نبض، زبان اور دیگر علامات کو دیکھ کر خوراک اور جڑی بوٹیوں سے علاج کرتے ہیں۔ یہاں کی روایتی دستکاریوں اور گھریلو صنعتوں میں شہد کی مکھیاں پالنا، ریشم کے کیڑے پالنا، بارود تیار کرنا، رسی بنانا، چمڑے کا کام، کاغذ بنانا، لوہے کے اوزار بنانا، مٹی کے برتن بنانا، انگوٹھیاں بنانا، لکڑی پر نقش و نگاری کا کام، لکڑی کے برتن بنانا، آلات موسیقی بنانا، قالین اور نمدے کی بنائی اور کشیدہ کاری نمایاں ہیں۔ ہنر ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا تھا۔ سلائی، بنائی، کشیدہ کاری کے شعبوں میں چترالی ہنرمندوں کو شمار سے زیادہ ڈیزائن یاد ہیں۔ یہاں بکری اور خوش گاؤ کے بالوں سے بہت مضبوط رسیاں تیار کی جاتی ہیں۔ پہلے چمڑے کے جوتے، بوریاں، گھوڑے کے لیے چابک وغیرہ سب گھروں میں بنائے جاتے تھے۔ کاغذ سازی بھی قدیم دستکاری ہے۔ کاغذ کی جگہ بھوج

پتر استعمال ہوتا تھا۔ اس موٹے زردی مائل کاغذ پر لکھے 1013ھ اور مابعد کے قلمی نسخے دستیاب ہیں۔ ملکھو کے گاؤں میں اب بھی مٹی کے برتن بنانے کی صنعت زندہ ہے۔ چترال کے علاوہ تورکھو کی مخصوص خوش گاؤ، ہرن اور مارخور کے سینگوں سے خاص ڈیزائنوں کی خوبصورت انگوٹھی بنانا ہے۔ یہ چترال کا خاص تحفہ ہے اور ابھی یہ صنعت ترقی کر رہی ہے۔ لکڑی پر نقش نگاری کا کام بہت اہم رہا ہے۔ یہ رنگ کے استعمال کے بغیر بے حد جاذب نظر ہوتا ہے۔ ایک کمرے کی آرائش میں کم از کم 48 اور زیادہ سے زیادہ 112 ڈیزائن کام آتے ہیں۔ لکڑی کے برتنوں کے لیے بید کے پرانے درختوں کا تنا استعمال ہوتا ہے۔ چترالی آلات موسیقی چترال میں ہی بنتے ہیں یہ بہت نازک اور پیچیدہ دستکاری ہے۔ چترالی پٹی خواتین کھڈی پر تیار کرتی ہیں۔ اس کا دھاگہ بھی چرخے پر خود تیار کرتی ہیں۔ یہ نفع بخش دستکاری ہے۔ کشیدہ کاری خواتین کا اہم ہنر شمار ہوتا ہے۔ اس کے ماہر فنکار ٹوپیاں، سر بند، چادریں، میز پوش، پن پوش، چائے پوش، ٹی کوزی، رومال، گلے، آستین کے ٹکڑے، پرس، گھڑی کے چین اور گڑیاں بناتے ہیں۔[149]

یہاں سفر پر روانگی سے قبل مذہبی پیشوا سے نیک ساعت کے بارے میں رائے لی جاتی ہے۔ مسافر گھر سے نکلنے سے پہلے ہاتھ کے اشارے سے آگ کا طواف کرتا اور کوئی بزرگ دروازے پر اس کے کندھے پر آٹا چھینکتا تھا۔ سفر پر جانے کے دن اس کے گھر کالی چیز، دیگچہ، فتیلہ وغیرہ گھر سے باہر لے جانا برا شگون سمجھتے تھے۔ مصنوعی بھائی چارے کی رسم جھیلوئی میں شوشپ سے تین نوالے متعلقہ شخص کو کھلائے جاتے۔ فصل کی کاشت کے لیے بیج بونے سے پہلے گھر پر بی نیسیک کی رسم ادا کی جاتی تھی۔ فصلوں کے خوشے نکلنے پر روایتی تہوار بھن دھک مناتے۔ اس میں روایتی کھیل اوغ جان بھی کھیلا جاتا تھا، جس میں پانی کے چھینٹے اڑانے کا مقابلہ ہوتا تھا۔ کھلیان سے غلہ گھروں میں جمع کرنے کے بعد ہر خاندان انفرادی طور پر کھول سوئیک مناتا۔ چراگاہوں پر مویشی بھیجنے کا تہوار غازی مینسک، چراگاہ سے مویشی بستی کی طرف واپس لانے پر غازی خومیک منایا جاتا۔ عید الاضحیٰ کو لوٹ نمبشر، عید الفطر کو چیق نمبشر کہتے ہیں۔ عیدین پر خاندان کے بزرگوں کے ایصال ثواب کے لیے مخصوص پکوان پکائے جاتے۔ اسماعیلی آبادی کے مخصوص تہوار پتھک کے دوران بہار میں گھروں کو صاف کرکے آٹے سے دیواروں پر گھوڑوں وغیرہ کی تصاویر بنانے کا رواج ہے۔[150]

بچے کی پیدائش کہ یہاں اژیک یا گوجانی کہتے ہیں۔ بیٹے کی پیدائش کے موقع پر نشانہ بازی کا مقابلہ ہوتا ہے۔ نام رکھنے کو سورک کہتے ہیں۔ رسمی طور پر یہ تمام بچوں کو جمع کرکے مول کھلایا جاتا اور نام کا اعلان کرتے ساتھ بچے دعا کرتے ہیں۔ خواتین سات دن تک زچہ کے ہاں رات گزارنے آتی ہیں۔ اس کے قریب کلہاڑی رکھتے ہیں۔ بچے کے بال کاٹنے کی رسم کو بھور گاپنگ کہتے ہیں۔ اس میں نئے کپڑوں میں ملبوس بچے کے بال مذہبی پیشوا کاٹنا شروع کرتا ہے پھر باری باری سب کاٹتے ہیں اور بچے کو تحائف دیے جاتے ہیں۔ بچے کے دانت نکلنے پر دون بشیک نامی رسم مناتے ہیں۔ نہ منانے پر یہ عقیدہ ہے کہ بچہ قدم قدم پر گرے گا اور دانت ٹوٹ جائیں گے۔ یہاں ختنہ کی رسم کو لوٹ ژیری کہتے ہیں۔

یہ پیدائش کے مقابلے میں بڑی خوشی ہوتی تھی۔ بیل ذبحہ کر کے اس کے گوشت کا کھانا قبیلے والے اپنے گھر لے جاتے۔ رخصتی کو ژور وسینیک کہتے ہیں۔ منگنی کے بعد چادر کی رسم ہے۔ رخصتی سے تین دن پہلے دلہن کو شادی کا جوڑا شابکو ایک پہناتے ہیں۔ پھر دلہن محلے میں سہیلیوں کے ہاں الوداع کے لیے جاتی ہے اور تحائف لیتی ہے۔ بارات کی آمد پر جس بچے کے ہاتھ میں پھینکی گئی چھڑی آئے اسے انعام دیتے ہیں۔ رخصتی سے پہلے دلہن انگیٹھی کے گرد تین چکر لگاتی ہے۔ بزرگ رخصتی کا خصوصی گیت لوک ژور گاتے ہیں۔ آٹا، قرآن کا نسخہ اور ہفت ہیکل دروازے پر لا کر دلہن کو باہر نکالتے ہیں۔ اس کے کندھوں پر آٹا پھینکتے ہیں۔ دلہن کی ماں بیٹی کے ساتھ گھر سے باہر نہیں آتی یہ رواج ہے۔ دلہا دلہن کی روانگی کے بعد ساس کو بر آمدے میں آکر تحفہ دے کر رخصت لیتا ہے۔ ساس بھی اسے ختم برکت دیتی ہے جو دلہن کے لیے ہوتا ہے اور وہ اسے عمر بھر اپنے پاس رکھتی ہے۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر سسر دلہن کو اپنی غیر منقولہ جائیداد میں سے کوئی چیز دینے کا اعلان کرتا ہے۔ یہاں بھی ساس دروازے پر آٹا، ہفت ہیکل اور قرآن لے کر استقبال کرتی ہے۔ دونوں کے کندھوں پر آٹا پھینکتی ہے پھر انگیٹھی کے پاس بٹھایا جاتا ہے۔ اشپیری کھلاتے ہیں۔ پھر محفل موسیقی ہوتی ہے۔ اگلے دن دلہن کے ذمے گھر کے کام کرنے کی رسم ٹیکہ انکیک ہوتی ہے۔ اس میں دلہن توے پر روٹی ڈالتی ہے اور دلہا اسے پلٹ کر پکاتا ہے۔[151] قدیم شادیوں میں قاضی یا مولوی کے سامنے نشست قرار پاتی تھی پھر نکاح کے وقت لڑکے والے بہت سامان لے کر کھانا تیار کر کے لڑکی کے گھر لے جاتے اور لڑکی والوں کے ہاں ایک دن ٹھہر کر لڑکی کو بغیر نکاح کے اپنے گھر لاتے۔ اس کا کوئی قریبی عزیز یا باپ ساتھ آتا تھا۔ یہاں سب مہمانوں کو رخصت کر کے قاضی کو بلا کر نکاح پڑھایا جاتا تھا۔[152]

ماضی میں چترال ہمسایہ ممالک کی نسبت پر امن رہا ہے۔ یہاں شکار اور جنگ کے ہتھیار پرانے زمانے سے مروج رہے ہیں۔ پرانا ہتھیار پتھر ہے۔ اس کے بعد لکڑی، لوہے، سیسے اور بارود کا استعمال رائج رہا۔ ہاتھ سے پتھر مار کر پرندوں کا شکار چترال کا قدیم دستور ہے۔ اسے ہو سکی بوستو کہتے ہیں۔ رسی یا کسی اور لمبی چیز سے بڑا پتھر پھینک کر شکار کرنے کو چونئ کہتے ہیں۔ دشمنوں کے لیے وزنی پتھروں کو استعمال کرنے کا طریقہ چر کول لاکیت ہے۔ کمان کے طرز پر بنا غلیل چھو جھیرہ، تیر کمان درون، چھری کو تیر، بڑی دھار والا ہتھیار نیر نگ، نیزہ، تلوار کھو نگیر، سنگین یا چاقو کیچ، بندوق سیہ کمان اور پستول تو یا نچہ ہتھیاروں کے طور پر مستعمل رہے ہیں۔ یہاں روایتی برتنوں میں پتھر، مٹی اور لکڑی اور پھر پیتل اور تانبے کے برتنوں کا رواج رہا۔ روایتی برتنوں میں پتھر کی ہانڈی تھپک، دارود، ٹو بج (مٹی کی ہانڈی)، غوریز (مٹی کا برا مٹکا)، گرینی (مٹی کی دیگ)، غان لنگری تھاؤشی، پٹھاخ، بٹوڑ، دوری، کپسنی، تھالو وَدوینک (لکڑی کی بالٹی) اور چونے ریت سے بنا مہنگا دیگ نما برتن چدین شامل ہیں۔[153]

چترال میں بچوں بڑوں کے تمام کھیلوں کی تعداد 134 بنتی ہے۔ دنیا کے جدید کھیل سکی انگ، کرکٹ، فٹ بال، ہاکی چترال میں سامان اور طریقہ کار کے تھوڑے اختلاف کے ساتھ قدیم زمانے سے رائج تھے۔ اکثر لوک چترالی کھیلوں کا تعلق زور آزمائی، دفاعی حکمت عملی اور ذہانت کی آزمائش سے ہے۔ جسمانی کرتبوں میں کبڈی اور جوڈو کراٹے بھی قدیم صورت میں یہاں مروج تھے۔ اہم کھیلوں میں گٹ چوکیک (کشتی)، بوخیت نچھیک (گولہ پھینکنا)، بوخت اوسینک (پتھر کے وزن اٹھانے کا مقابلہ)، سیمپنی ژیکیک (رسہ کشی)، موجو ستی چھینک (مخصوص داؤ کے ساتھ ہڈی توڑنا)، استور نماژ (پولو)، نرکشی (ذبحہ شدہ جانور کھال سمیت گھوڑوں پر بیٹھ کر میدان سے باہر لے جانے کا مقابلہ)، پمنو فوتے بچھیک (گھڑسواری پر بندوق سے نشانہ بازی)، بیم بڑاخودک (برف کے گولے بنا کر مارنا)، اوغ جان (ہولی کی طرز پر گرمیوں میں پانی ڈالنے کا مقابلہ)، جوڑا (جمی ہوئی برف پر پھسلنے کا کھیل)، نماژ (ہاکی کی طرز کا روایتی کھیل)، بامپھو نماژ (فٹ بال طرز کا کھیل)، شپر کیڑی (بھیڑیے اور بھیڑ کا کھیل)، ڈانتر (بہت سے پتھر اچھال کر کھیلنے کا مقابلہ)، شید مو (چرواہوں کا مخصوص کھیل)، بوڈی ڈک (کرکٹ طرز کا کھیل)، یائے دریک (بچیوں کا پتھر اچھالنے کا کھیل)، گربولی (گڑیا سے کھیلنے کا رواج) اور دردیتی اشوک (گھر بنا کر سجانا) اہم ہیں۔[154]

چترالی معاشرہ قدامت پسند ہونے کی بنا پر یہاں توہمات اور روایات کی کثرت ہے۔ جن میں مافوق الفطرت عناصر کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں قدیم روایت ہے کہ ہر کام کا ایک پیر ہوتا ہے۔ جس کی روح کو پکارنے سے مدد حاصل ہوتی ہے۔ گھڑسواری کا پیر بابائے قنبر ولی، زراعت کا پیر خواجہ خضر، طب اور حکمت کے پیر لقمان حکیم، شکار اور جنگی پہاڑی کا پیر شاوان نان، گھر کی برکت کے لیے خانگی دیوتا، آگ کے لیے دیوتا بھروتھس، چکی پر جشتان کا قبضہ رہتا ہے۔ لوہار اپنے کام سے پہلے حضرت داؤد کا نام لیتے ہیں۔ بعض توہمات میں بہو کے میکے سے آئی خوراک کھانے سے اس کی بیٹی کا مرنا، گوشت میں لبلبہ کھانے والے کے باپ کا مرنا، زندہ بھائی رکھنے والا ران کا گوشت نہ کھائے، زمین پر لاٹھی مارنے سے ماں کا مرنا، دروازے پر پاؤں رکھنے سے باپ کا مر جانا وغیرہ شامل ہیں۔ چاند رات کے ساتھ بھی کئی توہمات وابستہ ہیں۔ سورج کے طلوع و غروب اور مختلف اوقات پر سایوں پر نظر رکھی جاتی ہے۔ یہاں چاند کی ہر تاریخ کے ساتھ ایک روایت منسوب ہے۔[155] چترالی روایات میں عرس میلوں کا رواج نہیں۔ البتہ مختلف مکاتب فکر کے اولیائے کرام کے تذکرے زبان زد عام اور لوک ورثہ کا حصہ ہیں۔ یہاں بے شمار دیو ہیکل پتھروں کے بارے میں روایات مشہور ہیں کہ مختلف اولیائے کرام نے جنات اور دیوؤں کو سزا دے کر پتھر بنا دیا۔[156]

چترال میں آبادی کی مناسبت سے چودہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ کھوار بڑی زبان ہے اور اکثریتی آبادی کی زبان ہونے کے ناطے رابطے کی زبان بھی ہے۔ یہ چترال کے علاوہ سوات، کالام، غذر، افغان صوبہ کنٹر، نورستان، بدخشاں، پامیر اور سنکیانگ کے مخصوص علاقوں میں بھی بولی جاتی ہے۔ یہاں کھوار قبیلے کی زبان کھو، شین قبیلے کی زبان شینا

(پھلوار) گواری کی گوار بٹی، ڈمیلی کی ڈامیا، پٹھانوں کی پشتو، کلاش کی کلاشہ، منجنی کی یدغہ، بشگاکی کی کسئی، تاجک کی دری، گجر کی گوجری، سریقولی کی سریقولی، واخی کی واخی، کرغیز کی کرغیز، اور سونی قبائل کی اور سونیوار ہے۔ [157] 1917ء میں زیادہ اور 1970ء کے بعد زیادہ تر کھوار میں تحریری متن عربی رسم الخط میں لکھا جانے لگا۔ تقریباً دو سو سال قبل شنا بولنے والے مہاجر جنوب مشرقی چترال میں پھلوار اور مشرقی افغانستان کی قنار وادی میں رسوی زبانیں لے گئے جو شنا کی ہی ذیلی شاخیں ہیں لیکن اب لہجوں کا فرق اتنا زیادہ ہے کہ الگ بولیاں لگتی ہیں۔ [158] کھوار پر سنسکرت کے علاوہ بروشسکی، شنا، فارسی اور ترکی کا اثر ہے۔ اس میں لوک کہانیوں، گیتوں، کہاوتوں اور پہیلیوں پر مشتمل بہت مواد ہے۔ اسکی جامع لغت پر بھی کام ہو رہا ہے۔ ڈامیلی کافر گروپ کی شاخ ہے۔ یہ تحریری صورت میں وجود نہیں رکھتی، لوک گیتوں کے ذخیرے کی حامل ہے۔ [159] چترال کی نمایاں ادبی و ثقافتی شخصیات میں، یر محمد شکور غریب، بیگال، مرزا محمد سیئر، روشن علی خان، محمد رفیع، زیارت خان زیرک، گل اعظم خان، شیر منک، امان، جمیسال، شاہ گلی داد، محمد عیسیٰ، دانیاز بیگ، عمرا خان لال، شہزادہ محمد حسام ملک، علی ظہور، امیر گل اور پستہ گل نمایاں ہیں۔ [160] یہاں کی لوک داستانوں میں جادو منتر، مافوق الفطرت کردار لازمی ہیں۔ داستان کا آغاز اور اختتام رٹے رٹائے جملوں کو دہرا کر کرتے ہیں۔ داستانوں کو شلوغ کہتے ہیں۔ ان میں بڑھیا، طوطا، شہزادہ، گھوڑا، کتا اور لومڑی کے کردار معاشرے سے لیے جاتے ہیں۔ لوک داستانوں میں کٹونانگ، کذیم کذاک، یورمس بی بی کی رومانی کہانی زیادہ مشہور ہیں۔ [161]

دور افتادہ اور دشوار گزار خطہ چترال لوک گیتوں کا علاقہ ہے۔ اس کا روایتی ورثہ صدیوں پر پھیلا ہے۔ ان کہانیوں میں ایک فطری سچائی ہے۔ یہ چترال کی سرزمین کا سچا عکس ہیں۔ چترالی ابھی مصنوعی تہذیب و تمدن سے آلودہ نہیں ہوئے اس لیے ان کہانیوں میں صدیوں کی لوک روایات سانس لیتی محسوس ہوتی ہیں۔ [162] چترالی لوک کہانیوں میں ہاشم بیگم، مرزا سیار، شیر ملک گدیری لال، رستم خان، بیگال، لوک ژور، ڈوک نچدیر، فردو شوشہ پھوری، نالوشان، یورمس بیگم، سیخو ملنگ، جوش بیگم، گل اعظم خان، زیارت خان گدیری، سیدوغ شامل ہیں۔ ہاشم بیگم دراصل گوپس کے حکمران کی اکلوتی بیٹی کی کہانی ہے جسے دھوکے سے چترال کے بیمار شہزادے سے بیاہا جاتا ہے تو وہ فرار ہوتے ہوئے گھوڑے سے گر کر کھائی میں گرنے کے باعث مر جاتی ہے۔ [163] مرزا سیار کا رومان سادہ ہے۔ وہ عشق مجازی سے عشق حقیقی تک گئے۔ "یار من ہمیں" ان کی داستان کے بہت مشہور اشعار ہیں۔ بیگال پولو کا نامور کھلاڑی تھا جسے مہتر نے دھوکے سے قتل کرا دیا۔ اس کی بوڑھی ماں نے اس کی یاد میں اس گیت کو جنم دیا۔ [164] لوک زور اور نان دوشی گیت میں ناموں کا فرق ہے ورنہ کہانیاں یکساں ہیں کہ بڑی بیٹی کی شادی طے ہے شادی کے روز اس کے مرنے پر اس کی ماں کسی کو بتائے بغیر اس کی جگہ چھوٹی بہن کو رخصت کر دیتی ہے اور پھر بڑی بہن کی موت کا ماتم گیت میں کرتی ہے۔ [165]

یہاں کے لوک ساز بہت سریلے اور دلچسپ ہیں۔ ان میں چمڑا، لوہا، لکڑی اور تار کی مدد سے موسیقی پیدا کی جاتی ہے۔ مشہور سازوں میں روایتی چترالی ستار، سرنالی، ڈھل، ڈمامہ، دف، غربہ، پیڑو شامل ہیں۔ چترال کی روایتی دھنوں کی چار بڑی قسمیں ہیں۔ نی، ساوز، اشور جان، یار من ہمیں۔ ان میں دنی اور ساوز کی قبیل کی 360 دھنوں پر ناچ ہوتا ہے۔ چترال میں رقص پاؤں کا فن سمجھا جاتا ہے۔[166]

منفرد طرز تعمیر کے باعث چترال ہندوکش میں الگ حیثیت رکھتا ہے۔ ملکیتی زمین کم ہونے کے باوجود ہر گھر چھوٹا صحن اور باغ ضرور رکھتا ہے۔ یہاں باغیچوں کا رواج قدیم عہد سے ہے۔ روایتی چترالی گھر میں بڑا کمرہ کھوار ختان، برآمدہ، شوم، دہلیز وغیرہ ہوتے ہیں۔ دروازے کے پاس کی جگہ شوم کہلاتی ہے یہ مردانہ کاموں کے لیے مخصوص ہے۔ گھر کا اگلا حصہ شوم سے کم بلند ہوتا ہے۔ درمیان میں چمنی کے بغیر انگیٹھی (دھواں مخروطی چھت کے روشندان سے باہر نکلتا ہے) اور بیٹھنے کا حصہ بند ہوتا ہے۔ خواتین کے گھریلو کاموں کے لیے مخصوص حصہ ٹیک کہلاتا ہے۔ ٹیک کے ایک حصے کو نماز کے لیے مخصوص کر کے اب نشیرینی کہتے ہیں۔ چھت مخروطی شکل کی ہوتی ہے۔ دیوار سے دیوار تک دو بڑے شہتیر اور چھ مضبوط ستون مختلف حصوں کو الگ کرتے ہیں۔ دائیں بائیں شوم کی طرح سادہ چھت جبکہ بند اور ٹیک پر مضبوط لکڑیوں کو مرحلہ وار خاص انداز میں رکھنے سے مخروطی چھت بناتے ہیں۔ چھت کے تین مرحلوں کو غیر اروم، کت اور کماڑ کہتے ہیں۔ امیر گھرانوں میں کھانے کے الگ کمرے کو راتھین، بیٹھنے اور سونے کے کمرے کو بائی نش کہتے ہیں۔ جنھیں لکڑی کے خوب صورت کام سے مزین کیا جاتا ہے۔ خاص طرز تعمیر میں دو منزلہ کچے مکانات کا تصور ہے۔ لکڑی اور پتھر کی مدد سے دیواریں اور چھتیں اتنی مضبوط بناتے ہیں کہ ڈیڑھ دو سال تک کام دیتی ہیں۔ چترال میں پرانی مساجد منقش محرابوں اور ستونوں سے مزین ہیں۔ ان میں ہشت پہلو ستون استعمال کیے جاتے ہیں جن پر خراد کا خوب صورت کام ہوتا ہے اور مشاربہ موڑی کہلاتے ہیں۔[167]

کالاش

قدیم تہذیبی ورثے، عقائد، رسوم، دلچسپ و عجیب تہواروں کے باعث کالاش پوری دنیا میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ کالاشہ مذہب کی جڑیں شمالی علاقہ جات اور سوات کے رسم و رواج میں ملتی ہیں۔[168] کالاش ثقافت قدیم ایشیائی اور یورپی ثقافت کی آمیزش ہے۔ اس کی جڑوں میں ہماری زمین کی اصل ہزارہا سالہ پرانی ثقافت پوشیدہ ہے جو اب روبہ زوال ہے۔ باقی علاقوں سے کٹی ہونے کے باعث یہاں بہت تنگ و دو کے بعد چترال سے اشیائے ضرورت پہنچتی ہیں اس لیے مہنگائی بہت ہے۔ علاج معالجے کی سہولتوں کا فقدان ہے۔ ذرائع آمد و رفت نہ ہونے سے بہت سا پھل ضائع ہو جاتا ہے۔ مقامی کالاشیوں کا اپنے مسائل کے بارے میں خود کہنا ہے:

"کالاشیوں کی مادی زندگی شدید افلاس سے عبارت ہے۔ صحت، صفائی، تعلیم، متوازن غذا اور طبی سہولتیں تقریباً عنقا ہیں۔ وادیوں میں بجلی نہیں ہے۔ اوسط کالاش اپنی عمر سے زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس پر متضاد جارحانہ مزاج اور طاقتور پڑوسیوں کا رویہ جو ان کو غلیظ کافر سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ سے کالاشیوں پر شدید جسمانی اور نفسیاتی دباؤ ہے اب وہ خود اپنے تہواروں اور رسوم و رواج کے بارے میں مشکوک ہو گئے ہیں۔ گویا نسلی تفاخر اپنے آپ سے نفرت کے خلاف برسرپیکار ہے۔ بوڈالک کا سماجی ادارہ ختم ہی سمجھیے۔ کالاش قبروں پر حفاظت کے لیے نصب کردہ چوبیں بت چوری ہو گئے ہیں، فروخت یا تباہ کر دیے گئے ہیں اور شراب کے جشن روز بہ روز کم ہوتے جا رہے ہیں۔"[169]

اب کالاش قبائلی بزرگوں نے اپنے لوگوں میں اپنے رسوم و رواج اور ثقافت پر تفاخر کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ کالاش لوگ انتہائی رومانی واقع ہوئے ہیں۔ محبت کے بارے میں آزاد خیال ہیں۔ لڑکی اپنی پسند کے بارے میں باپ، بھائی یا چچا کو بتاتی ہے جو اس کی خواہش پوری کرتے ہیں۔ یہاں لڑکی کو اغوا کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ مگر شادی شدہ عورت کو اغوا کرنے والے کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ بچوں کو جنم دینے کے بعد عورت غیر مرد کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ ناجائز بچوں کی پرورش ان کی ماں کے والدین کرتے ہیں۔ عورت کے مسئلے پر جھگڑتے نہیں۔ جشن کے موقع پر عورتوں کا تبادلہ عام ہے۔ لڑکیوں کو اپنی مرضی سے شوہر منتخب کرنے کی آزادی ہے صرف اتنی پابندی ہے کہ خونی رشتہ داروں سے رشتہ نہیں کرتے۔ ایسی شادی کی صورت میں دلہا اس قبیلے کا نہیں رہے گا بلکہ دادا کے نام سے الگ قبیلہ بنائے گا۔ اکثر رشتے والدین کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ اگر لڑکی والے پیغام قبول کر لیں تو لڑکے والوں کی طرف سے دیگچہ، چولہا، بندوق اور گائے بھجوائی جاتی ہے۔ شادی کے موقع پر لڑکے اور لڑکی کی باراتیں نصف راستے میں ملتی ہیں۔ لڑکی کا لباس خاص نہیں ہوتا صرف زیورات روایتی ہوتے ہیں۔ بارات میں خواتین نہیں جاتیں۔ اس موقع پر ایک بکرا ذبحہ کیا جاتا ہے۔ دو بچے بکرے کا خون ہاتھ سے رنگ کر دلہا دلہن کے منہ پر ملتے ہیں۔ یہی نکاح کی رسم ہوتی ہے۔ یہاں اجتماعی شادیوں کا رواج بھی ہے۔ طلاق کے موقع پر دوگنا سامان واپس کرنا پڑتا ہے۔ شوہر کے مرنے پر بیوہ تین ماہ تک سوگ مناتی ہے۔ نہ کوئی کام کرتی ہے نہ گھر کی کسی چیز کو ہاتھ لگاتی ہے۔ زمین پر سوتی ہے۔ سوگ ختم ہونے پر وہ اپنی مرضی سے شادی کر سکتی ہے۔[170] سات دن تک بیوہ بالکل آسمان نہیں دیکھتی۔ اس کے کھانے کے برتن الگ ہوتے ہیں۔ چالیس دن تک گھر میں اس جگہ رہتی ہے جہاں جوتے رکھے جاتے ہیں۔[171]

کالاشی بیک وقت بت پرست، اجداد پرست اور توہم پرست ہیں۔ یہ سادہ خوراک کھاتے ہیں۔ روٹی، گھی، دودھ، خوبانی یا انگور کے ساتھ کھا لیتے ہیں۔ شراب پنیر، گوشت اور پھل سردیوں کے لیے ذخیرہ کرتے ہیں۔[172]

"کالاش مذہب میں خدا کا تصور ہے مگر ساتھ مختلف دیوتاؤں کی پرستش کی جاتی ہے اور دیوتاؤں کے نام پر قربانیاں دی جاتی ہیں۔ کلاش مذہب میں تہواروں کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ موت کا سوگ ناچ کے ساتھ منایا

جاتا ہے۔ مذہبی اور معاشرتی اقدار میں پاک اور ناپاک کا ایک منفرد تصور پایا جاتا ہے۔ زچگی اور مخصوص ایام میں عورتوں کو گاؤں سے باہر خاص مقام پر رکھا جاتا ہے۔ مرغی کو بھی ناپاک سمجھا جاتا ہے۔"[173]

ابتدا میں یہاں بھیڑ بکریوں کی کھالوں سے بنا لباس مروج تھا۔ اکثر کالے رنگ کی کھالیں استعمال کرتے تھے۔ بعد میں کالے رنگ کی اون کے کپڑے پہننے لگے جو خواتین خود تیار کرتی ہیں۔ مردوں کا لباس شلوار قمیض ہے لیکن عورتیں مخصوص لباس پہنتی ہیں۔ جس میں سب سے دلچسپ ان کی ٹوپی ہے جسے سگھ کہتے ہیں۔ یہ کمر تک لٹکی ہوتی ہے۔ اس پر مونگے، سیپیوں کا خوب صورت کام ہوتا ہے جسے کوپھس کہتے ہیں۔ آٹھ سے دس میٹر کپڑے کا پاؤں تک آتا لمبا فراک پہنتی ہیں۔ کمر کے گرد سفید کمربند استعمال کرتی ہیں۔ کھال کے بنے جوتے یا پلاسٹک کے جوتے استعمال ہوتے ہیں۔ ان کی ٹوپی مختلف دھاتی چمکدار اشیا سے بھری ہوتی ہے۔ یہ بہت وزنی ہوتی ہے اور ان کے مذہب میں عورت کے لباس کا لازمی جزو ہے۔ عورتیں اپنی زیبائش کا مقدور بھر خیال رکھتی ہیں۔ ان کی مینڈھیاں بہت مہارت سے بنی ہوتی ہیں۔ بکریوں کے پاؤں خاص طرح سے جلا کر ان کے پاؤڈر میں کچھ اور چیزیں ملا کر آنکھوں کے گرد لگاتی ہیں۔ خاص قسم کے زرد پھول بھی چہرے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ ان کے زیورات قابل دید ہوتے ہیں۔ عام سی چیزوں سے ٹوپی سجانے کے علاوہ گلے کا خوش نما ہار اور ہاتھ کے کنگن بناتی ہیں۔ ان کے لباس پر مالا نما زنجیریاں کافی تعداد میں ٹانکی جاتی ہیں۔ جن کے ساتھ چھوٹے چھوٹے گھنگرو بھی ہوتے ہیں۔ ان کا لباس اور ٹوپیوں کی سجاوٹ کچھ کچھ لداخ اور تبت کے لوگوں کے قریب ہے۔[174]

بمبوریت، رمبور اور بریر پر مشتمل وادی کالاش میں عورت کو کمتر اور نجس تصور کیا جاتا ہے۔ انھیں مذہب، سیاست، قانون سے باہر رکھا جاتا ہے۔ انھیں مقدس مقامات پر جانے، بھیڑوں کا دودھ دوہنے، ان کے نزدیک جانے، بہتے پانی میں ہاتھ دھوئے بغیر کسی چیز کو چھونے کی ممانعت ہوتی ہے۔ ان کے ہاتھ منہ دھونے کی جگہ الگ ہوتی ہے۔ بکریوں کی حفاظت کرنے والا عورت کے ہاتھ کی چیز نہیں کھاتا۔ اراضی صرف بیٹوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ لڑکیوں کو صرف گائے بکریاں دی جاتی ہیں۔ شادی کے موقع پر لڑکی کے بدلے نقد اور اجناس لی جاتی ہیں۔ عورتیں زچگی اور ماہواری کے ایام بشالینی میں گزارتی ہیں۔ یہاں یہ تصور ہے کہ عورتوں کی وجہ سے موسم خراب ہو جاتے ہیں جب وہ متبرک جگہوں پر پہنچ جائیں۔ عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ سلام ہیں۔ بچے کے دودھ پینے کے دوران عورت مرد کے قریب نہیں جاتی۔ عورت مرد کے برتن میں کھا پی نہیں سکتی۔ قربانی کے جانور کو ہاتھ نہیں لگا سکتی نہ اس کا گوشت کھا سکتی ہے۔[175] کالاشی عورت سخت کوش ہوتی ہے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانا، روٹی پکانا، فصلوں کو پانی دینا، گوڈی کرنا، آٹا پیسنا، زرعی کاموں میں مردوں کا ہاتھ بٹانا، کپڑا بننا، ٹوکریاں تیار کرنا، کپڑوں پر کشیدہ کاری کرنا خواتین کے ذمے ہے۔ پرانے وقتوں میں بیلوں کی جگہ عورتوں کو ہل پر جوتا جاتا تھا۔[176]

عام کالاشی نرم خو ہیں۔ جھگڑے فساد سے ناواقف، جھوٹ نہ بولنے والے، چوری نہ کرنے والے۔ یہ جھوٹی قسموں سے بہت ڈرتے ہیں۔ والدین بچوں کو نہیں مارتے۔ ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں پوری طرح شریک ہوتے ہیں۔ اپنے تہواروں اور مذہب سے بہت سچے ہیں۔ سال بھر کی جمع پونجی تہواروں پر خرچ کر دیتے ہیں۔ قناعت پسند اور مہمان نواز ہیں۔ یہاں مذہبی پیشوا مسائل حل کرتے ہیں۔[177]

پہلے وقتوں میں جب یہاں سب کچھ مشترکہ ہوتا تھا تو دریا سے نکالی گئی کوڑیاں ہی بطور روپیہ استعمال ہوتی تھیں۔ کمہار اور لوہار کی خدمات باہر سے بلوا کر پوری کی جاتی تھیں۔ انھیں سامان کے تناسب سے غلہ دیتے تھے۔ یہاں سال میں صرف ایک فصل بوئی جاتی ہے۔ آب پاشی کا نظام ناقص ہے۔ پھل خاصے ہوتے ہیں۔ سیاہ انگور سے شراب بنانے کے لیے لکڑی کے پرانے برتنوں میں انگور ڈال کر پاؤں سے خوب دباتے ہیں اور رس مٹی کے برتنوں میں محفوظ کرتے ہیں۔ یہ جشن کے موقع پر استعمال کی جاتی ہے۔ یہاں کے لوگوں کی خوراک سادہ ہے۔ جشن کے موقع پر بہتر خوراک کھاتے ہیں۔ گوشت کو ابلی حالت میں کھاتے ہیں۔ پنیر کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ اسے چشمے کے کنارے گہرا گڑھا کھود کر محفوظ کرتے ہیں اور مخصوص نشان لگا دیتے ہیں۔ تاکہ بوقت ضرورت نکال سکیں۔ پرانے پنیر کو بطور دوائی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں لکڑی کی کندہ کاری کا فن قدیم دور میں بہت کامیاب تھا مگر آج کوئی خاص فن نہیں ہے۔ پہلے یہ لکڑی کے مردوں کے مجسمے بناتے تھے۔ اب گھروں کے در و دیوار پر کچھ نمونے ملتے ہیں یا مٹی چونے سے دیواروں پر بیل بوٹے بنائے جاتے ہیں۔ خواتین اپنے فن کا مظاہرہ لباس پر کرتی ہیں۔ وہ خوب صورت ٹوکریاں بناتی ہیں اور مرد کھالوں سے چارپائیاں اور کرسیاں تیار کرتے ہیں۔[178] یہاں کھیل کود کا زیادہ شوق نہیں پایا جاتا کیونکہ ان کا بیشتر وقت تقریبات میں گزر جاتا ہے۔ بالغ افراد برف پر پولو کھیلتے ہیں یا تیر کمان۔ بچے بچیاں لوٹک، چوم چر مونگ گریں، پتنگ اور بھاؤزولی کھیلتے ہیں۔[179]

کالاشیوں کا ہر لمحہ جشن اور تہوار ہے۔ کچھ تہواروں میں سارے کالاشی مجموعی حیثیت میں حصہ لیتے ہیں اور مذہبی تقدس کی طرح مناتے ہیں۔ جن میں بہار میں منایا جانے والا تہوار چلم جوشی ہے۔ گندم کی کٹائی کے موقع پر منایا جانے والا تہوار اوچل ہے۔ ستمبر میں چرواہوں کے واپس آنے اور پھل توڑتے وقت "پوڑ" کا تہوار ہے۔ اس موقع پر بوڈلک کا استقبال کرتے ہیں اور اس کی رسم مناتے ہیں۔ چیڑماس کو چاؤماس بھی کہتے ہیں۔ اس میں نئے سال کی خوشی پر قربانیاں دیتے ہیں۔ تحائف کا تبادلہ کرتے ہیں اور بٹیان آئندہ سال کی پیش گوئیاں کرتے ہیں۔[180]

بوڈلک کے وجود سے لوگ اب انکاری ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ یہ صرف وادئ بریر میں پایا جاتا ہے۔ اب اس کا وجود قصہ پارینہ بن چکا ہے البتہ ماضی میں یہ رواج تھا۔ بوڈلک کو کالاش سماج میں ہیرو کا درجہ حاصل تھا۔ کافرستان کے لوگ اسے دیوتاؤں کا نمائندہ خیال کرتے۔ ماضی میں یہ رسم کالاش نسل کی بقا کی ضامن تھی مگر اب نئی نسل اس رسم

کے خلاف ہے۔ ایک صدی سے یہ تقریباً متروک ہے۔[181] ماضی میں چرواہوں میں سب سے قوی، جوشیلے اور خوب صورت جوان کا انتخاب کر کے موسم گرما میں اسے پہاڑ پر بھیجتے۔ اسے خالص خوراک مہیا کی جاتی۔ چراگاہوں سے مویشیوں کے قافلے واپس آنے کے موقع پر بوڈلک کو پہاڑوں سے نیچے اتار کر گاؤں میں لاتے جہاں وہ ان عورتوں کو جو بچہ جننے کے قابل نہیں اپنی خدمات مہیا کرتا۔ بوڈلک کا انتخاب بہت کٹھن ہوتا تھا۔ قدیم گیتوں میں اس کا بہت تذکرہ ملتا ہے۔ اس کا مقصد خالص جنگجو نسل کے عمدہ افراد پیدا کرنا تھا۔[182]

کافرستان میں ہر گاؤں میں ندی یا دریا کے کنارے ایک مربع نما تاریک کمرہ بشالینی کے لیے مخصوص ہوتا ہے جہاں صرف مخصوص خواتین قیام کرتی ہیں۔ اگر کوئی عورت بشالینی کی بجائے گھر پر رہے تو اسے ناقابل معافی جرم اور کالاش مذہب، قوم سے باہر سمجھا جاتا ہے۔ بشالینی میں صرف ایک تیمادار کو جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ یہاں آنے والی خواتین کی رشتہ دار خواتین خوراک قریبی پتھروں پر رکھ کر چلی جاتی ہیں۔ بشالینی خواتین کی تربیت گاہ کا کام دیتی ہے۔[183]

کافرستان میں موت کی رسوم بہت منفرد ہیں۔ یہ موت کو نقصان نہیں سمجھتے۔ اس لیے رونے کی بجائے خوشی مناتے ہیں۔ رقص کرتے ہیں اور دھوم دھام سے قبرستان جاتے ہیں کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق روح مرنے کے بعد آزاد ہوتی ہے۔ اس موقع پر مرحوم کے اوصاف گاتے ہیں، خیرات کرتے ہیں، مرنے والے کی لاش کو اپنی عبادت گاہ جستک بان میں رکھتے ہیں۔ آگ جلا کر لاش کے گرد رقص کرتے ہیں۔۔ مردوں کے ہتھیار ان کے ساتھ تابوت میں رکھتے ہیں اور عورتوں کے زیورات رکھے جاتے ہیں۔ یہ تابوت کو دفن نہیں کرتے بلکہ قبرستان میں زمین پر ہی رکھ کر ڈھکن پر پتھر رکھتے ہیں۔ غریب لوگ ایک ہی تابوت میں کئی لاشیں رکھ دیتے ہیں۔ پہلی لاش کو پھینکتے نہیں ایک طرف کر دیتے ہیں۔ جس چارپائی پر لاش قبرستان لائی جاتی ہے اسے وہیں توڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ تابوت قبرستان میں تیار کرتے ہیں۔ عورت کی میت پر رقص نہیں کیا جاتا۔ ان کے مذہب میں رقص مقدس عبادت ہے۔ یہ بدروحوں کو بھگانے اور روح کو پاک کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ مارچ، اپریل، مئی کے مقدس مہینوں میں ہونے والی اموات کو مقدس سمجھتے ہیں۔ مئی کے جشن میں مردہ کے رشتہ داروں کو بلا کر اس کی تعریف میں گیت گاتے ہیں۔ سال میں ایک بار قبرستان جاتے ہیں۔ مخصوص ایام کے دوران ہونے والی خواتین کی موت کو نجس تصور کرتے اور ان کے تابوت قبرستان میں الگ طرف رکھتے ہیں۔ قبرستان میں کوئی درخت نہیں کاٹتے ان کے عقیدے کے مطابق ان میں ارواح رہتی ہیں۔[184]

موت کے پہلے دن کالاش روٹی اور پنیر کھاتے ہیں۔ دوسرے دن روٹی اور حلیم جبکہ تیسرے دن صرف گوشت۔ محکمہ صحت کی طرف سے پابندی کے باعث اب مردوں کو کھلے آسمان تلے رکھنے کا رواج ختم ہو چکا ہے، اب

دفن کرتے ہیں۔ جس کالاش کی بیوی مرے وہ چالیس دن تک کسی تقریب میں شرکت نہیں کر سکتا اور خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر کسی کو یہ شخص نظر آئے تو وہ بیمار پڑ جاتا ہے۔[185] کالاشی دیوتاؤں کو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اپنا علاج جڑی بوٹیوں سے لوگ خود کرتے ہیں۔ کوئی زیادہ بیمار ہو تو مالوش دیوتا کے معبد میں نذر دی جاتی ہے۔ زخم کو کوٹنے کے بعد ہلدی سے بھر دیتے ہیں۔ نظر بد کے لیے گلے میں لوہا لٹکاتے ہیں۔ سخت سر درد کی صورت میں زخم کر کے خون بہاتے ہیں۔ سانپ کے کاٹنے کے لیے سینگ لگا کر زہر چوس کر نکالتے ہیں۔[186]

کالاشی عجیب وغریب توہمات کا شکار ہیں۔ ہر گھر میں بکری کے سینگ اور کچھ پتے لٹکے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی انھیں ہاتھ لگائے تو بیمار ہو جاتا ہے۔ مردوں کے ساتھ خوراک رکھی جاتی ہے۔ قربانی کے لیے صرف بکرے ذبحہ کرتے ہیں۔ عورت نر مویشی کا گوشت نہیں کھا سکتی۔ ناچ سے زمین کی ہریالی بڑھتی ہے۔ تہواروں کے موقع پر ارواح کے لیے روٹیاں پکا کر جنگل میں پھینکتے ہیں۔ کسی اہم شخصیت کے مرنے پر سورج گرہن ہوتا ہے۔ عقاب کا احترام کرتے ہیں۔ فصل کاٹتے اور گاہتے وقت قربانی کی رسم ادا کرتے ہیں۔ شام کے بعد چارپائیوں کی جگہ نہیں بدلتے۔ بارش کو کسی خوش قسمت مہمان کی وادی میں آمد سے تعبیر کرتے ہیں۔ پیاز کو جنت کا پھل تصور کرتے ہیں۔ ان کا مقدس دن جمعہ ہے۔ خوش قسمت ہندسہ بیس ہے۔ گھریلو سانپ گھر والوں کو بچا کر رکھتے ہیں۔ عورت کے بالوں کو منحوس سمجھتے ہیں اس لیے گھر میں نہیں رکھتے۔[187]

یہاں تین طرح کی شادیاں ہوتی ہیں۔ کھوجلی جا والدین کی مرضی سے ہوتی ہے۔ اس میں کسی خاص تقریب کا اہتمام نہیں ہوتا۔ محبت کی شادی کو اڑاشنگ جا کہتے ہیں۔ لڑکی لڑکے کی محبت میں مبتلا ہو کر فرار ہوتی ہے۔ والدین اسے گھر نہیں لاتے باہر ہی مل لیتے ہیں، تین ماہ بعد میکے لاتے ہیں۔ تب مالوش دیوتا کے حضور بکریاں قربان کرتے ہیں۔ والدین اسے مال مویشی اور گھریلو سامان دیتے ہیں۔ اڑاشنگ انوکھی طرز کی شادی ہے جس میں شادی شدہ عورت کسی غیر مرد کے ساتھ بھاگ جائے تو پرانے شوہر کو نیا شوہر اس رقم کا دوگنا ادا کرتا ہے جو پچھلے شوہر نے شادی پر خرچ کی تھی۔ اس کو دوگ کہتے ہیں۔ دوگ کی ادائیگی کے بعد دونوں فریقوں میں لڑائی نہیں ہوتی۔ کالاش میں کئی خواتین مسلسل شوہر بدلتی ہیں یوں دوگ کی رقم لاکھوں تک پہنچتی ہے۔[188]

کلاشہ زبان کو ماہر لسانیات دردی گروپ میں کافر زبانوں کی ذیل میں رکھتے ہیں۔ ان کے لوک گیتوں میں قدیم مذہب، زبان اور رسم ورواج کے آثار ملتے ہیں۔ قدیم وطن، فتوحات اور بادشاہوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان کے خوشی، غمی، رقص، اور مختلف تہواروں پر گائے جانے والے گیت ہیں۔[189] رقص و موسیقی ان کی پہچان ہے۔ ان کی تفریح ہے اور عبادت ہے۔ جشنوں اور تہواروں کے علاوہ رات کو گاؤں میں اکٹھا ہو کر موسیقی کے ساتھ دائرے میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر رقص کرتے ہیں۔ آلات موسیقی میں ایک بانسری اش یوئیس، چھوٹا ڈھول واچ اور بڑا ڈھول داؤں ہوتا

ہے جو ہر کوئی بجا سکتا ہے۔ ان میں پیشہ ور موسیقار، سازندے اور رقاص نہیں ہوتے۔ ان کا سب سے بڑا ثقافتی رقص گورما ہے جسے یہ گھر پر ہی کرتے ہیں۔ کالاش اپنے احساس برتری کی تسکین کے لیے اپنے آباؤ اجداد کے پتلے بناتے ہیں۔ کسی بڑھئی سے اپنے باپ کا پتلا بنوا کر جلوس کی شکل میں اسے راستے پر گاڑتے ہیں جو گاؤں کی طرف جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کا احترام کریں۔ اس موقع پر بڑی ضیافت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مرنے کے ایک سال بعد بت کھڑا کرنے کی رسم ادا کرتے ہیں۔ مجسموں کی گردنوں میں ہار بھی ڈالتے ہیں۔ یہاں یہ عقیدہ ہے کہ پتلا بنانے سے مردے کی روح خوش ہوتی ہے۔[190]

سوات

سوات قدیم زمانے سے آباد ہے اور بدھ مت کا بڑا مرکز رہا ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ اس کے قدیم شاندار تمدن کی نشاندہی کرتے ہیں:

> "سکندر اعظم کے حملے سے قبل اوڈیگرام بہت بڑا شہر تھا۔ اٹلی کے ماہرین آثار قدیمہ کی کھدائی اور تحقیق کے مطابق اوڈیگرام کا قلعہ اور اس کے نیچے ہموار میدان میں بہت بڑے بازار کے آثار ملے ہیں۔ یہاں کا آثار قدیمہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اوڈیگرام کے لوگ سینکڑوں سال پہلے صحت، صفائی، اور بہترین شائستہ زندگی گزارنے کے اصولوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے ہاں بڑے پیمانے پر تجارت ہوتی تھی۔ اس کے لیے بازار تھے، منڈیاں تھیں، مذہبی خانقاہیں تھیں اور ایک منظم سٹی حکومت تھی۔ شہر کے گلی کوچے پختہ تھے اور پختہ راستے ہر ایک گھر تک پہنچائے گئے تھے۔ وہ فن تعمیر میں یکتائے روزگار تھے۔"[191]

یہاں کی چٹانوں پر کندہ قدیم فن تحریر "ہیروغلافی" ظاہر کرتا ہے کہ یہ ہزاروں سال قبل فن تحریر سے آگاہ تھے۔ یہ زراعت پیشہ تھے اور بعد از مرگ کے عقیدے پر یقین رکھتے تھے۔ شاہی سواری کے لیے رتھ استعمال کرتے تھے۔ سوات کے غالیگی غار کی کھدائی سے حجری دور سے لے کر آج کے دور کی پوری تاریخ ملی ہے درمیان سے کہیں کوئی کڑی غائب نہیں اس لیے یہ انسانی تہذیبی معاشرتی ارتقا پر روشنی ڈالنے میں کافی معاون ہے۔[192] یہاں کے قدرتی چشموں کا پانی صاف، شفاف اور صحت بخش معدنیات ملا ہے۔ دریائے سوات کا ٹھنڈا پانی ٹراؤٹ کی افزائش کے لیے بہت موزوں سمجھا جاتا ہے۔ یہاں ٹراؤٹ ایک انڈسٹری کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ 1960ء میں مدین کے مقام پر پہلی ہیچری بننے کے بعد مقامی لوگوں نے بھی بہت بنائی ہیں۔ سوات سے قدرتی برف بہت بڑی مقدار میں راولپنڈی اور پشاور پہنچائی جاتی ہے۔[193] سوات اپنے جنگلات قیمتی لکڑی اور قیمتی پتھروں کے باعث بہت مشہور ہے۔ ایران کے شہنشاہ دارا کے محلات کے لیے لکڑی اور پتھر سوات سے گیا تھا۔ یہاں کے پتھروں سے سنگ مرمر اور چپس تیار کیا جاتا ہے۔ ٹیکسلا میں مصنوعی بت سازی کے لیے شسٹ کا پتھر سوات سے حاصل کیا جاتا ہے۔ زمرد جیسے قیمتی پتھر کی کانیں یہاں ہیں۔ عام لوگ زمرد کی کانوں کا ملبہ خرید لیتے ہیں اور پھر اسے دریائے سوات کے کنارے دھو کر چھانتے ہیں تو ان

کی روٹی کا وسیلہ چلتا ہے۔ زمرد کے علاوہ یہاں کے بازاروں میں پکھراج، یاقوت، لاجورد، نیلم جیسے قیمتی پتھروں اور نگینوں سے بنے زیورات ملتے ہیں۔ سواتی زمرد کا رنگ ساری زندگی پھیکا نہیں پڑتا۔[194]

سواتی اونی اور ریشمی شالیں ملک اور بیرون ملک بہت مقبول ہیں۔ بہترین ریشم، اعلیٰ اون کاری گروں کی مہارت کے باعث ان کی مانگ میں روزبروز اضافہ ہو رہا ہے۔ راجہ اشوک اپنے رتھ پر بچھانے کے لیے سوات سے شال منگواتا تھا۔ یہاں کے اونی کمبل، ٹوپیاں، کوٹ، واسکٹیں بھی مقبول ہیں۔ سوات گندھارا آرٹ کا خالق ہے۔ صنم تراشی کا فن بدھ مت کے زوال کے بعد زوال پذیر ہو گیا۔ لیکن گندھارا کا قدیم لازوال فن سوات کے مختلف فنون کے فنکاروں نے کھالوں، لکڑیوں، لوہے، مٹی، اون، ریشم، پتھر اور کپڑے میں بدستور قائم رکھا۔ بدھ دور کا آثار قدیمہ جو غاروں اور زیر زمین پہاڑوں میں دفن رہا، مقامی لوگوں نے غیر قانونی طریقے سے کھود کر بازاروں میں بیچ ڈالا۔ لکڑی پر خوب صورت کام کے فن پارے جو گھروں، مسجدوں، حجروں میں موجود تھے لوگوں نے دکان داروں کی نذر کر دیے۔ اس طرح گھریلو اشیا بھی بازاروں کی زینت بن گئیں۔ اس لیے اب سوات لینٹیک کی فراہمی کا بڑا مرکز ہے۔ اسے جیتا جاگتا گندھارا بھی کہتے ہیں۔ اس کے آثار قدیمہ سے لندن، جرمنی، اٹلی، جاپان، کوریا، ہندوستان اور پاکستان کے عجائب گھر مزین ہیں۔ مینگورہ بڑھتی آبادی کے لحاظ سے پورے ایشیا میں سرفہرست ہے۔ یہاں سلک انڈسٹری خاصی ترقی کر چکی ہے۔ سوات عمارتی لکڑی کا خطہ ہے، اس لیے ملک بھر میں یہاں سے لکڑی فراہم کی جاتی ہے۔[195]

سوات کے لوک گیتوں اور کہانیوں کا بغور جائزہ بتاتا ہے کہ قدیم وقتوں میں یہ علاقہ جادو کا مسکن تھا۔ آتش پرستوں کا ٹھکانہ بھی رہا۔ پھر سورج کی پرستش ہوتی رہی۔ ایک دور میں سانپوں اور اژدھوں کو بھی پوجتے تھے۔[196] سوات کوہستان اور دیگر سوات کے باشندے رسم و رواج اور معاشرتی زندگی کے حوالے سے یکساں ہیں۔ باہمی رشتے کرتے ہیں۔ یہاں مختلف قبیلے آباد ہیں۔ مثلاً گاروی، قاشقاری، گوجری، توروالی اور پشتو بولنے والے۔ گندھارا آرٹ نے یہیں عروج پایا۔[197] سوات نے کئی تہذیبوں کو جنم دیا۔ یہاں کی اہم دستکاریوں میں لکڑی کا کام، کپڑے کا کام، ٹوکریاں، مٹی کا کام، اون کا کام، مٹی کی گلکاریاں شامل ہیں۔ یہاں قبروں کے کتبوں اور جنگلوں، مسجدوں کے میناروں، آتش دانوں، دروازوں، کھڑکیوں، غلہ ذخیرہ کرنے کے صندوقوں اور برتنوں پر لکڑی کا کام ملتا ہے۔ یہاں سیاہ کپڑا زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس پر کشیدہ کاری کے عمدہ نمونے مختلف شکلوں میں دستیاب ہیں۔ درختوں کی نرم ٹہنیوں سے مختلف رنگوں کی بنی ٹوکریاں بیچی جاتی ہیں۔ یہاں کی خواتین مٹی کو زبان دیتی ہیں۔ چولہوں، تنور، گھڑوں، کٹوروں پر عمدگی سے ڈیزائن بناتی ہیں۔ بکری کے بالوں سے یہاں مقامی قالین اور رسیاں بنتی ہیں۔ اونی ٹوپیاں، جرابیں، دستانے، کمبل بھی بنائے جاتے ہیں۔ یہاں کی خواتین منفرد انداز سے مٹی، چونے اور مختلف رنگوں کی آمیزش سے گھروں کی

دیواروں، چھتوں، شہتیروں، اور ٹوکریوں پر نقاشی کرتی ہیں۔ یہاں جانوروں کی کھالوں سے تسمے تیار کر کے چارپائیاں اور کرسیاں بھی بنائی جاتی ہیں۔[198]

سیاحت یہاں بڑی صنعت کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ سوات کا امن، انسان دوستی، مسافر نوازی قدیم عہد سے مشہور ہے۔ یہاں آئے سیاحوں کو گاہک نہیں مہمان تصور کیا جاتا ہے۔ سیاحت کی افادیت کے پیش نظر یہاں گلی باغ کے مقام پر سیاحت سے متعلقہ تمام امور کی تربیت کا ادارہ آسٹریا کے تعاون سے قائم کیا گیا۔ سوات کی زمین چائے کی کاشت کے لیے بہت موزوں ہے۔ اس کے علاوہ زیتون، بانس، زعفران، صندل اور مشروم کی کاشت کے حوالے سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ماضی میں یہ چیزیں یہاں موجود تھیں۔[199]

دیر کوہستان کا سب سے بڑا قبیلہ یوسف زئی ہے جو آپس میں کئی خیلوں میں منقسم ہے۔ کوہستانیوں اور پشتونوں میں خوشگوار تعلقات رہے ہیں۔ یہاں جرگوں کے ذریعے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ دیر کے عجائب گھر میں یہاں کی کھدائی سے برآمد ہونے والی اشیا بھی رکھی گئی ہیں۔ اس کی گندھارا گیلری میں بدھ کی تمام کہانی موجود ہے۔ عمارت مقامی طرز تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ مالاکنڈ کے پہاڑوں کا مشہور اور کمیاب پتھر اس کی تعمیر میں استعمال ہوا ہے۔ وہ تاریخی برج بھی بنائے گئے ہیں جو یہاں کی صدیوں پرانی مقامی طرز تعمیر کا خاصہ ہیں۔ آثار قدیمہ کے شواہد کے مطابق مساگا کا وہ قلعہ بھی یہیں تھا جہاں کی خواتین سکندر کے خلاف خود جنگ میں کود پڑی تھیں۔[200]

دیودار جسے کالا سونا کہا جاتا ہے دیر کے جنگلات کے حوالے سے خاصا اہم ہے۔ یہاں زمینوں کی تقسیم کا طریق کار مقامی ہے۔ باہر کے لوگوں کو زمینوں کی فروخت منع ہے۔ آب پاشی کے لیے یہاں اوپر کے علاقوں کے کھیتوں کو صبح اور نچلی زمینوں کو شام کو پانی دیتے ہیں۔ مرد اور عورتیں مل کر کام کرتے ہیں۔ یہاں خواتین کو تورسرے کہا جاتا ہے اور احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہاں کم عمری میں شادی کا رواج ہے۔ ایک سے زائد شادیاں بھی کی جاتی ہیں۔ شادی میں لڑکی کی مرضی کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ خواتین کو جائیداد میں حصہ ملتا ہے مگر مکانوں اور مویشیوں میں نہیں۔ لکڑی کی فراوانی کے باعث دیر کوہستان کے گھروں میں بنیاد سے لے کر چھت تک سارا کام لکڑی کا ہوتا ہے۔ سخت سردی اور دشمنی کے باعث گھروں میں کھڑکیوں اور روشندانوں کا رواج نہیں۔ دھواں چھت سے باہر ایک سوراخ کے ذریعے نکالتے ہیں۔ گھروں میں صحن بھی نہیں چھوڑا جاتا کیونکہ اوپر نیچے گھر بناتے ہیں۔ پہاڑی نالوں کے قریب گھر بناتے ہیں جن کی چھتیں بہت مضبوط ہوتی ہیں۔ مکئی کی فصل چھت پر بیلوں کے ذریعے گاہتے ہیں۔ ان میں پیشہ ور لوگ نہیں ہوتے۔ کمہار کا کام خواتین کرتی ہیں۔ موسیقی کے حوالے سے یہ تہی دست ہیں، پشتو موسیقی ہی سنتے ہیں۔ محدود آلات موسیقی میں بانسری، گھڑا اور تمبل شامل ہیں۔ دیر کوہستان کی بولی کو بشکارک بھی کہتے ہیں کیونکہ عہد قدیم میں یہ علاقہ باشکار کہلاتا تھا۔[201]

زبان، رہن سہن، رسم و رواج ایسی خصوصیات قوموں کی اجتماعی زندگی تشکیل دینے کا سبب بنتی ہیں۔ کاغان کے تمام خاندان ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ ان کے لباس، چال ڈھال، بول چال، رسم و رواج اور طور طریقے ایک جیسے ہیں۔[202] کاغان کی کثیر آبادی گوجروں پر مشتمل ہے۔ ان میں کچھ زراعت پیشہ جبکہ زیادہ تر گلہ بانی سے وابستہ ہیں۔ کچھ مستقل سکونت رکھتے ہیں جبکہ گلہ بان خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنا جداگانہ تشخص رکھتے ہیں۔ انھیں آجڑی، بکر وال، کاغانی اور مقدم کے ناموں سے بھی پکارا جاتا ہے۔ بعض روایات کے مطابق یہ لوگ پتھر اور دھات کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی طرح قدیم اطوار کی قومیں دنیا میں کم آباد ہیں۔ ان کی ثقافت، رسم و رواج، طرز معاشرت میں عجب رنگا رنگی، تنوع اور انوکھا پن ملتا ہے۔ جو بیک وقت پر تحیر، پر کشش اور خوب صورت بھی ہے۔ صدیوں بعد آج بھی یہ قوم ابتدائی فطری شکل میں دکھائی دیتی ہے۔[203]

ان کی نقل مکانی ان کا تشخص بن گئی ہے۔ ان کی زندگی کٹھن ہے۔ اجنبی راستوں پر سفر کرنا، ویران جگہوں پر قیام کرنا، موسم کی سختیاں جھیلنا، مکانوں سے بے نیاز کھلے آسمان کے نیچے گزارا کرنا پڑتا ہے۔ ان میں تحمل برداشت بے حد ہے کسی سے الجھتے نہیں۔[204] کاغان میں خاص افغانی قبیلے پاؤندوں کے بارے میں شیخ نوید اسلم کہتے ہیں:

> "یہ ان جنگجوؤں کی پشتوں میں سے ہیں جنھوں نے کابل اور خیبر پاس میں لڑائیوں میں حصہ لیا۔ ان کے قافلے لمبے چوڑے ہوتے ہیں اور اپنے لباس اور حلیے کی وجہ سے مقامی لوگوں سے بالکل الگ تھلگ لگتے ہیں۔ عورتیں رنگا رنگ بھڑکیلے کپڑوں کے اوپر بھاری زیورات پہنتی ہیں۔ مرد چغے پہنتے ہیں اور ان کے چھوٹے بچے خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں کوئی نہ کوئی زیور پہنے رکھتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں تجسس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ وادیٔ کاغان میں پاؤندے سب سے خوب صورت مسافر ہیں۔"[205]

کاغان کی سب سے عمدہ چیز شہد اور گائے کا گھی ہے۔ یہاں کی مکئی موٹی اور لذیذ ہوتی ہے۔ یہاں کچے مکانوں کی چھتوں پر لکڑی کے برج بنائے جاتے ہیں تاکہ مکئی کے بھٹے ذخیرہ کیے جا سکیں۔[206] جھیلوں کی سرزمین کاغان میں نو جھیلیں ہیں اور ہر جھیل انفرادیت کی حامل اور اپنے سے کوئی داستان وابستہ رکھتی ہے۔ یہاں لالہ زار نامی علاقے سے مقامی لوگ ایک رومانی داستان وابستہ کرتے ہیں کہ سوہنی نامی دوشیزہ لالہ افغانی کے عشق میں مبتلا تھی۔ لالہ افغانی عشق میں قربان ہو گیا۔ اس لیے اس علاقے کا نام لالہ زار پڑ گیا۔ قریب سوہنی کا جنگل بھی موجود ہے۔[207]

یہاں مقامی لوگ سانپ کی کینچلی کو اکٹھا کر کے اس کی دھونی سے نظر بد کا علاج کرتے ہیں۔[208] مقامی بچے بھونروں کو ماچس کی ڈبیا میں بند کر کے راگ سنتے ہیں اور کہتے ہیں یہ زیور ہے۔ بچوں کا تتلیاں پکڑنا بھی عام ہے۔[209] گوجروں کے مکان گھاس پھوس کے ہوتے ہیں۔ کھڑکیاں یا روشن دان کم ہوتے ہیں۔ مکان اندر سے دھوئیں کے باعث سیاہ ہوتے ہیں۔ پہاڑوں پر ان کی ماہلیاں ہوتی ہیں۔ گرمیوں میں مال مویشی کے ساتھ ان کا رخ کرتے ہیں۔ برف پڑنے

پر میدانوں میں آجاتے ہیں۔ ان کے ساتھ بکریوں، بھیڑوں کا الگ الگ ریوڑ، گھوڑوں کا جتھا الگ ہوتا ہے۔ گھوڑوں، خچروں پر گھر کا سامان، کمبل، برتن وغیرہ لادتے ہیں۔ ہر آدمی نے کمبل دوہرا کر کے پیچھے ڈالا ہوتا ہے، اس کے سرے ہاتھ میں آگے ہوتے ہیں۔ اس کمبل میں بکریوں کے نوزائیدہ میمنے ہوتے ہیں۔ یہ سب جہاں بھی جائیں اکٹھے خیمے لگاتے ہیں۔ یہ مختصر سامان خورونوش رکھتے ہیں۔ خیمے عموماً پانی کے نزدیک لگاتے ہیں۔ تین پتھر تلاش کر کے چولھے بناتے ہیں۔ توا رکھ کر آٹے کو دودھ میں گھول کر توے پر ڈال کر روٹی تیار کرتے ہیں۔ جسے مانی کہتے ہیں۔ توے کے بغیر پتھروں کے ساتھ بھی روٹی پکا لیتے ہیں۔ دودھ بلونے کے لیے مشکیزے میں ڈالتے ہیں۔ گوجر بھیڑ بکریوں کے ساتھ مخصوص بولی بولتے ہیں۔ جتنا بھی بڑا ریوڑ ہو ہر بھیڑ بکری کا انھوں نے الگ نام رکھا ہوتا ہے۔ یہ چلتے ہوئے متحرک ریوڑ کی بکریاں گن لیتے ہیں۔ جڑی بوٹیوں سے اپنا اور بکریوں کا علاج کرتے ہیں۔[210]

گوجروں کے لباس کی رنگت اور تراش خراش دیگر اقوام سے مختلف ہے۔ نوجوان الگ الگ رنگوں کی شلوار قمیض پہنتے ہیں۔ بڑے لوگ سر پر پگڑی باندھتے ہیں۔ ان کے سر کے درمیان کی جگہ خالی رہتی ہے، ارد گرد پگڑی باندھتے ہیں۔ عورتیں میل خورا پھولدار لباس پہنتی ہیں۔ بہت زیادہ کھلے کپڑے پر محیط ان کی قمیض ہوتی ہے۔ گلے میں نقلی موتیوں کے ہار پہنتی ہیں۔ موٹے کڑوں کا رواج ہے۔ بوڑھی عورتیں مینڈھیاں کر کے بال ایسے سمیٹتی ہیں کہ ان کا سر کشیدہ کاری کا اعلیٰ نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ سر پہ خاص قسم کی ٹوپی لچکا پہنتی ہیں۔ عورتیں اخروٹ کے چھلکے سے ہونٹ رنگتی ہیں اور بعض اوقات بہت زیادہ وزن اٹھاتی ہیں۔ بعض گھوڑوں پر سواری کرتی ہیں۔ برفانی علاقوں میں سفر کے دوران گوجر دھان یا مٹی کے بنے جوتے استعمال کرتے ہیں۔ سنگلاخ پہاڑوں پر چلتے وقت کھیڑی پہنتے ہیں جو بہت بھاری جوتے ہوتے ہیں ان کے نیچے موٹے کیل لگے ہوتے ہیں۔[211]

گوجروں کے معروف کھیل پٹھو گرم یا کولڑہ چھپائی، بلورین چھپن چھپائی، گلی ڈنڈا، جیجو ڈوگہ (سٹاپو کی طرح) اور کبڈی شامل ہیں۔ ماہرین ریاضی متفق ہیں کہ گنتی چرواہے کی ایجاد ہے۔ وہ کنکریوں کے ساتھ بکریاں گنا کرتا تھا۔ آگ اور مقناطیس کا موجد بھی گڈریے کو کہا جاتا ہے۔ انھیں جڑی بوٹیوں کے متعلق بھی بہت علم ہوتا ہے۔[212]

گوجروں کی زبان گوجری دنیا کی قدیم ترین زبان ہے۔ اسے کھڑی بولی کی بیٹی اور اردو کی ماں کہا جاتا ہے۔ اردو کو پہلے گوجری بھی کہا جاتا تھا۔ عوامی ادب کے لحاظ سے گوجری شاہکار زبان ہے۔ وادئ کاغان کے گوجروں کی زبان انھیں دوسروں سے ممتاز کر دیتی ہے۔ گوجری کے قواعد مرتب ہو چکے ہیں۔ اسرائیل مجہور اس کے پہلے شاعر ہیں۔ اس کا بڑا ذخیرہ گوجری گیت ہیں جو کاغان ثقافت کا حصہ ہیں۔[213] یہاں ہندکو اور گوجری میں لوک کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ جن میں مریم کی داستان، منشی اور درویشی کی داستان، پری بدیع الجمال اور شہزادہ سیف الملوک کی داستان، لالہ افغانی اور

سوہنی کی داستان نمایاں ہیں۔ گیت علاقائی ثقافت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ وادئ کاغان کے مشہور گیتوں میں دکھ، درد، تازگی، تراوت، شوخی، شرارت، غم، بہار، ماحول، تہذیب، تڑپ، انتظار، عشق سب کچھ ہے۔

> "گوجر شہری تعلیم اور تہذیب سے دور ہیں اس لیے ان کے لوک گیتوں میں پہاڑوں کی عظمت، پھولوں کی خوشبو، جھرنوں کے نغمے اور تتلیوں کے رنگ ہیں۔ بھیڑ بکریوں کی معصومیت ہے۔ گائے بھینسوں کی سپردگی ہے اور خالص دودھ کی مٹھاس اور نور ہے۔"[214]

حواشی

1. شیخ محمد اکرام، پاکستان کا ثقافتی ورثہ، مترجم: افتخار احمد شروانی (لاہور: مکتبہ جدید پریس، 2000ء)، ص5۔
2. عکسی مفتی (دیباچہ)پاکستان کا ثقافتی انسائیکلو پیڈیا شمالی علاقہ جات(جلد اول) مرتب:سید محمد علی(اسلام آباد:لوک ورثہ،2004ء)
3. عثمان علی، پروفیسر،خطہ قراقرم زبانیں اور معاشرہ (لاہور:مقبول اکیڈمی،1996ء)، ص23 تا26۔
4. Gerard Fussman, "Language as a source for History", In *History of Northern Areas of Pakistan (Upto 2000 AD)*, ed. Ahmed Hassan Dani, (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2007), 52.
5. عثمان علی، پروفیسر، محولہ بالا، ص34۔
6. عظمیٰ سلیم،ڈاکٹر،شمالی علاقہ جات میں اردو زبان و ادب (اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان، 2008ء)، ص69۔
7. ایضاً: ص71۔
8. شیر باز علی خان برچہ،عکس گلگت بلتستان (گلگت:نارتھ بکس،2013ء)، ص95۔
9. جمشید خان دکھی، "گلگت، غذر، دیامر"، مشمولہ پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا شمالی علاقہ جات(جلد اول)مرتب:سید محمد علی(اسلام آباد:لوک ورثہ،2004ء)، ص12۔
10. عظمیٰ سلیم،ڈاکٹر، محولہ بالا، ص45 تا46۔

11. لعل بانو، "خشک مغز و خشک تار و خشک پوست، خطہ شمال کی موسیقی، مشمولہ، شمالی پاکستان کی تاریخ و ثقافت، مرتبہ: نوین غلام حیدر علی (لاہور فکشن ہاؤس، 2015ء)، ص110۔

12. ایضاً: ص112۔

13. ایضاً: ص120۔

14. عظمیٰ سلیم، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص48۔

15. سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا (کراچی: مکتبہ دانیال، طبع ہشتم، 1989ء)، ص32۔

16. جمشید خان دکھی، "گلگت، غذر، دیامر"، محولہ بالا، ص59 تا 61۔

17. ایضاً: ص70 تا 71۔

18. ایضاً: ص73 تا 74۔

19. ایضاً: ص80 تا 81۔

20. ایضاً: ص23 تا 30۔

21. ایضاً: ص29۔

22. ایضاً: ص152 تا 156۔

23. ایضاً: ص108۔

24. ایضاً: ص23۔

25. ایضاً: ص109 تا 113۔

26. ایضاً: ص49۔

27. عظمیٰ سلیم، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص52۔

28. جمشید خان دکھی، "گلگت، غذر، دیامر"، محولہ بالا، ص51 تا 58۔

28-1 محمد جان، وادی اشکومن تاریخ کے آئینے میں (گلگت: نارتھ پبلی کیشنز، 2010ء)، ص55۔

29. عثمان علی، پروفیسر، محولہ بالا، ص100۔

30. جمشید خان دکھی، "گلگت، غذر، دیامر"، محولہ بالا، ص81 تا 85۔

31. ایضاً: ص78 تا 93۔

32. عثمان علی، پروفیسر، محولہ بالا، ص111۔

33. جمشید خان دکھی، "گلگت، غذر، دیامر"، محولہ بالا، ص96 تا 107۔

34. ایضاً: ص140 تا148۔

35. ایضاً: ص150 تا152۔

36. عثمان علی، پروفیسر، محولہ بالا، ص126۔

37. Karl Jettmar, "Northern Areas of Pakistan-An Ethnographic Sketch", In *History of Northern Areas of Pakistan (Upto 2000 AD)*, ed. Ahmed Hassan Dani, (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2007), 71-72.

38. جمشید خان دکھی، "گلگت، غذر، دیامر"، محولہ بالا، ص118 تا122۔

39. ایضاً: ص14۔

40. ایضاً: ص14۔

41. عظمیٰ سلیم، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص61۔

42. جمشید خان دکھی، "گلگت، غذر، دیامر"، محولہ بالا، ص72 تا74۔

43. ایضاً: ص13۔

44. ایضاً: ص76۔

45. ایضاً: ص34۔

46. ایضاً: ص65 تا70۔

47. رشید اختر ندوی، شمالی پاکستان (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2002ء)، ص66۔

48. ایضاً: ص191۔

49. شیر باز علی خان برچہ، "بروشال، ہنزہ، نگر"، مشمولہ پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا شمالی علاقہ جات (جلد اول) مرتب: سید محمد علی (اسلام آباد: لوک ورثہ، 2004ء)، ص191۔

50. امر سنگھ چوہان، ڈاکٹر، تاریخ گلگت، مترجمین: عظمیٰ سلیم، ڈاکٹر، شیر باز علی خان برچہ (لاہور: کمہوری پبلی کیشنز، 2012ء)، ص16۔

51. جمشید خان دکھی، "گلگت، غذر، دیامر"، محولہ بالا، ص71۔

52. ایضاً: ص20۔

53. ایضاً: ص23۔

54. ایضاً: ص87 تا90۔

55. ایضاً: ص97۔

56. ایضاً: ص107۔

57. ایضاً: ص49۔

58. ایضاً: ص68۔

59. Karl Jettmar, "Northern Areas of Pakistan-An Ethnographic Sketch", In *History of Northern Areas of Pakistan (Upto 2000 AD)*, ed. Ahmed Hassan Dani, (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2007), 73.

60. ایضاً: ص57۔

61. جمشید خان دکھی، "گلگت، غذر، دیامر"، محولہ بالا، ص74۔

62. محمد حسن حسرت، (تقریظ)ہنزہ کے قدیم تہوار اور رسوم و رواج، عبداللہ جان ہنزائی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2000ء)، ص7۔

63. عبداللہ جان ہنزائی، ہنزہ کے قدیم تہوار اور رسوم و رواج، محولہ بالا، ص12۔

64. شیر باز علی خان برچہ، "بروشال، ہنزہ، نگر"، محولہ بالا، ص189۔

65. ایضاً: ص169 تا175۔

66. ایضاً: ص176۔

67. ایضاً: ص194 تا195۔

68. ایضاً: ص196۔

69. ایضاً: ص187 تا188۔

70. نیت شاہ، "ہنزہ سیاسی تاریخ اور تحریک آزادی"، مشمولہ شمالی پاکستان تاریخ و ثقافت، مرتبہ: نوین غلام حیدر علی، محولہ بالا، ص77 تا79۔

71. عبداللہ جان ہنزائی، ہنزہ کے قدیم تہوار اور رسوم و رواج، محولہ بالا، ص145 تا146۔

72. رشید اختر ندوی، محولہ بالا، ص109 تا110۔

73. شیر باز علی خان برچہ، "بروشال، ہنزہ، نگر"، محولہ بالا، ص176 تا179۔

74. عبداللہ جان ہنزائی، ہنزہ کے قدیم تہوار اور رسوم و رواج، محولہ بالا، ص18۔

75. شیر باز علی خان برچہ، "بروشال، ہنزہ، نگر"، محولہ بالا، ص180۔

76. عبداللہ جان ہنزائی، محولہ بالا، ص76۔

77. شیر باز علی خان برچہ، "بروشال، ہنزہ، نگر"، محولہ بالا، ص183 تا 185۔

78. ایضاً: ص186 تا 188۔

79. عبداللہ جان ہنزائی، محولہ بالا، ص53 تا 55۔

80. ایضاً: ص56 تا 68۔

81. ایضاً: ص73۔

82. جمشید خان دکھی، "گلگت، غذر، دیامر"، محولہ بالا، محولہ بالا، ص52۔

83. شیر باز علی خان برچہ، "بروشال، ہنزہ، نگر"، محولہ بالا، ص205 تا 209۔

84. ایضاً: ص198 تا 200۔

85. Karl Jettmar, "Northern Areas of Pakistan-An Ethnographic Sketch", In *History of Northern Areas of Pakistan (Upto 2000 AD)*, ed. Ahmed Hassan Dani, (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2007), 72.

86. شیر باز علی خان برچہ، "بروشال، ہنزہ، نگر"، محولہ بالا، ص189۔

87. عبداللہ جان ہنزائی، محولہ بالا، ص158۔

88. Gerard Fussman, "Language as a source for History", In *History of Northern Areas of Pakistan (Upto 2000 AD)*, ed. Ahmed Hassan Dani, (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2007), 59-61.

89. عظمیٰ سلیم، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص61۔

90. شیر باز علی خان برچہ، "بروشال، ہنزہ، نگر"، محولہ بالا، ص190 تا 193۔

91. ایضاً: ص203۔

92. ایضاً: ص203 تا 204۔

93. ایضاً: ص204 تا 205۔

94. عبداللہ جان ہنزائی، محولہ بالا، ص125 تا 126۔

95. شیر باز علی خان برچہ، "بروشال، ہنزہ، نگر"، محولہ بالا، ص201 تا 202۔

96. رشید اختر ندوی، محولہ بالا، ص77۔

97. محمد حسن حسرت،بلتستان تہذیب و ثقافت(راولپنڈی:ٹی ایس پرنٹرز،1995ء)،ص7تا9۔

98. ایضاً:ص20تا21۔

99. ایضاً:ص29تا30۔

100. محمد حسن حسرت،"بلتستان"،مشمولہ پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا شمالی علاقہ جات (جلد اول)مرتب:سید محمد علی(اسلام آباد:لوک ورثہ،2004ء)،ص214-215۔

101. ایضاً:ص220۔

102. ایضاً:ص220تا221۔

103. ایضاً:ص224۔

104. ایضاً:ص249۔

105. ایضاً:ص223تا224۔

106. محمد حسن حسرت، محولہ بالا،ص47تا48۔

107. محمد حسن حسرت،"بلتستان"، محولہ بالا،ص221تا223۔

108. ایضاً:ص304۔

109. ایضاً:ص304تا305۔

110. محمد حسن حسرت، محولہ بالا،ص43۔۔

111. محمد حسن حسرت،"بلتستان"، محولہ بالا،ص235۔

112. ایضاً:ص237۔

113. ایضاً:ص237تا238۔

114. ایضاً:ص238۔

115. رشید اختر ندوی، محولہ بالا،ص176۔

116. Karl Jettmar, "Northern Areas of Pakistan-An Ethnographic Sketch", In *History of Northern Areas of Pakistan (Upto 2000 AD)*, ed. Ahmed Hassan Dani, (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2007), 91.

117. محمد حسن حسرت،"بلتستان"، محولہ بالا،ص228تا233۔

118. ایضاً:ص238۔

119. ایضاً:ص239۔
120. ایضاً:ص240تا243۔
121. ایضاً:ص253تا255۔
122. ایضاً:ص256تا260۔
123. ایضاً:ص308تا310۔
124. ایضاً:ص314۔

125. Karl Jettmar, "Northern Areas of Pakistan-An Ethnographic Sketch", In *History of Northern Areas of Pakistan (Upto 2000 AD)*, ed. Ahmed Hassan Dani, (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2007), 72.

126. محمد حسن حسرت، "بلتستان"، محولہ بالا، ص244۔
127. ایضاً:ص244تا248۔
128. ایضاً:ص316۔
129. عظمیٰ سلیم،ڈاکٹر، محولہ بالا، ص60۔
130. محمد حسن حسرت، "بلتستان"، محولہ بالا، ص219۔
131. ایضاً:ص233تا234۔
132. ایضاً:ص261۔
133. ایضاً:ص262تا269۔
134. ایضاً:ص:290تا291۔
135. ایضاً:ص296۔
136. ایضاً:ص300۔
137. رشید اختر ندوی، محولہ بالا، ص176۔
138. محمد حسن حسرت، "بلتستان"، محولہ بالا، ص224تا225۔
139. ایضاً:ص226۔
140. ایضاً:ص226تا228۔

141. شیخ نوید اسلم، شمالی علاقہ جات اور پاکستان (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2013ء)، ص 146۔

142. عنایت اللہ فیضی، "چترال"، مشمولہ پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا شمالی علاقہ جات (جلد اول) مرتب: سید محمد علی (اسلام آباد: لوک ورثہ، 2004ء)، ص 325۔

143. عنایت اللہ فیضی، چترال (اسلام آباد: لوک ورثہ اشاعت گھر، 1989ء)، ص 56۔

144. عبدالرحمٰن، پروفیسر، چترال چترال ہے (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، 2009ء)، ص 122۔

145. عنایت اللہ فیضی، "چترال"، محولہ بالا، ص 326 تا 328۔

146. ایضاً: ص 341 تا 343۔

147. ایضاً: ص 343 تا 345۔

148. ایضاً: ص 332۔

149. ایضاً: ص 330 تا 332۔

150. ایضاً: ص 336 تا 338۔

151. ایضاً: ص 339 تا 340۔

152. منشی عزیزالدین، تاریخ چترال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1991ء)، ص 32۔

153. عنایت اللہ فیضی، "چترال"، محولہ بالا، ص 351 تا 352۔

154. ایضاً: ص تا 357353۔

155. ایضاً: ص 357 تا 358۔

156. ایضاً: ص 319 تا 320۔

157. ایضاً: ص 323۔

158. Gerard Fussman, "Language as a source for History", In *History of Northern Areas of Pakistan (Upto 2000 AD)*, ed. Ahmed Hassan Dani, (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2007), 56-57.

159. عنایت اللہ فیضی، "چترال"، محولہ بالا، ص 323 تا 324۔

160. ایضاً: ص 333 تا 334۔

161. ایضاً: ص 359 تا 360۔

162. غلام عمر،چترال کی لوک کہانیاں(اسلام آباد:لوک ورثہ اشاعت گھر، طبع دوم،1987ء)،ص6۔

163. ایضاً:ص32۔

164. ایضاً:ص88۔

165. ایضاً:ص105۔

166. عنایت اللہ فیضی،"چترال"، محولہ بالا،ص324۔

167. ایضاً:ص335تا336۔

168. محمد پرویش شاہین،کافرستان :تاریخ، نسل، زبان، ثقافت اور سیاحتی جائزہ (لاہور: مکتبہ جمال،2014ء)،ص21۔

169. ایضاً:ص66۔

170. ایضاً:ص89تا92۔

171. عبدالرحمٰن،پروفیسر،چترال چترا ل ہے (اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،2009ء)،ص123۔

172. محمد پرویش شاہین،کافرستان کے رسم و رواج (لاہور:مکتبہ جمال،2014ء)،ص28تا29۔

173. عنایت اللہ فیضی،"چترال"، محولہ بالا،ص321۔

174. محمد پرویش شاہین،کافرستان :تاریخ، نسل، زبان، ثقافت اور سیاحتی جائزہ ، محولہ بالا، ص74تا77۔

175. ایضاً:ص117تا119۔

176. ایضاً:ص122۔

177. محمد پرویش شاہین،کافرستان کے رسم و رواج(لاہور:مکتبہ جمال،2014ء)،ص40۔

178. محمد پرویش شاہین، کافرستان :تاریخ، نسل، زبان، ثقافت اور سیاحتی جائزہ، محولہ بالا، ص138تا145۔

179. ایضاً:ص78۔

180. ایضاً:ص112۔

181. عبدالرحمٰن، پروفیسر، محولہ بالا، ص140تا142۔

182. محمد پرویش شاہین،کافرستان :تاریخ، نسل، زبان، ثقافت اور سیاحتی جائزہ، محولہ بالا، ص138تا145۔

183. ایضاً: ص152 تا 155۔

184. ایضاً: ص97 تا 98۔

185. عبدالرحمٰن، پروفیسر، محولہ بالا، ص105 تا 106۔

186. محمد پرویش شاہین،کافرستان :تاریخ، نسل، زبان، ثقافت اور سیاحتی جائزہ، محولہ بالا، ص138105 تا 106۔

187. ایضاً: ص125 تا 134۔

188. عبدالرحمٰن، پروفیسر، محولہ بالا، ص139 تا 140۔

189. محمد پرویش شاہین،کافرستان :تاریخ، نسل، زبان، ثقافت اور سیاحتی جائزہ ، محولہ بالا، ص104۔

190. ایضاً: ص100 تا 103۔

191. محمد پرویش شاہین،مشرق کا سوئیٹزر لینڈ وادئ سوات(لاہور: مکتبہ جمال،2009ء)، ص50۔

192. ایضاً: ص51 تا 52۔

193. ایضاً: ص35 تا 36۔

194. ایضاً: ص36 تا 37۔

195. ایضاً: ص37 تا 42۔

196. محمد پرویش شاہین،سوات کوہستان(لاور: مکتبہ جمال،2011ء)، ص23 تا 24۔

197. ایضاً: ص32۔

198. ایضاً: ص35 تا 36۔

199. ایضاً: ص43 تا 44۔

200. ایضاً: ص63 تا 66۔

201. ایضاً: ص83 تا 85۔

202. منصف خان سحاب، وادئ کاغان: تاریخ، لوگ، ثقافت، سیاحت (لاہور: مکتبہ جمال، 2011ء)، ص127۔

203. ایضاً: ص144۔

204. ایضاً: ص145۔

205. شیخ نوید اسلم،شمالی علاقہ جات اور پاکستان (لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2013ء)، ص63۔

206. منصف خان سحاب، محولہ بالا، ص73 تا74۔

207. ایضاً: ص75۔

208. ایضاً: ص104۔

209. ایضاً: ص107۔

210. ایضاً: ص147 تا148۔

211. ایضاً: ص146 تا147۔

212. ایضاً: ص151۔

213. ایضاً: ص145 تا146۔

214. ایضاً: ص155۔

باب چہارم

شمال کے اردو سفر نامے: قیام پاکستان سے قبل

باب چہارم

شمال کے اردو سفر نامے: قیام پاکستان سے قبل

اردو نثر کا فروغ سترھویں صدی سے شروع ہوا۔ تمثیلی داستان، قرآن پاک کے تراجم، صوفیائے کرام کے ملفوظات، مذہبی کتب، چند فارسی داستانوں کے تراجم فورٹ ولیم کالج کے قیام تک اردو کا نثری سرمایہ تھا۔ انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج کی طرف سے شائع کردہ آسان اور عام فہم کتب کے بعد مرزا غالب کے مکتوبات اردو نثر کے ارتقا میں اہم سنگ میل رہے۔ غالب کے بعد سر سید اور ان کے رفقا نے صحیح معنوں میں اردو نثر کو ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا۔ اسی دور میں اردو نثر میں متعدد نئی اصناف نے جنم لیا۔ جہاں تک سفر نامے کی بیانیہ صنف کا تعلق ہے اس کی اولین روایت نے بالواسطہ طور پر فورٹ ولیم کالج کے مصنفین سے جنم لیا۔ جن کی مشرقی زبانوں کی سفری داستانوں کے تراجم میں اس صنف کے ابتدائی نقوش تھے۔ اردو کا پہلا سفر نامہ یوسف خان کمبل پوش کا "عجائبات فرنگ" شمار ہوتا ہے۔ اردو سفر نامے کی روایت آگے بڑھنے پر دیار غیر اور حج کے سفر ناموں کا رجحان بڑھا۔ برصغیر کے اندرون کے اردو سفر نامے بہت کم تعداد میں لکھے گئے۔ ان میں بھی قیام پاکستان سے قبل تک بطور خاص شمالی علاقوں کا کوئی سفر نامہ موجود نہیں۔ انگریز عہد کے دوران ان علاقوں کا الحاق کشمیر سے رہا ہے اس لیے اس دور کے کشمیر کے اکا دکا اردو سفر نامے ملتے ہیں جو اب با آسانی دستیاب نہیں ہیں۔ شمالی علاقہ جات کے بارے میں اردو سفر ناموں کا آغاز قیام پاکستان کے بعد ہی ہوا۔

البتہ ان علاقوں کا ذکر قدیم ہندوستانی سفر ناموں میں ملتا ہے جو غیر ملکی سیاحوں نے غیر ملکی زبانوں میں لکھے۔ برصغیر قدیم دور میں اپنے اسرار کے باعث غیر ملکی سیاحوں کے لیے بہت پر کشش رہا ہے۔ یہاں بدھ مت کا فروغ قدیم سیاحوں کے متوجہ ہونے کا سبب بنا۔ میگستھینز، فاہیان اور ہیونگ سانگ کے سفر نامے بدھ مت کے مقدس مقامات کی زیارت کا درجہ رکھتے ہیں۔[1] شمالی پاکستان کے علاقہ جات کا مختصر احوال ہندوستان کے غیر زبانوں میں لکھے سفر ناموں میں بھی کم ہی ملتا ہے۔ چینی سیاحوں کے علاوہ عرب سیاح اور بعد ازاں انگریز سیاحوں کے سفر نامے موجود ہیں۔ انیسویں صدی میں چند انگریزوں نے بطور خاص ان علاقوں کا سفر کر کے انگریزی میں اپنی یادداشتیں مرتب کیں۔ جن میں فریڈرک ڈریو (دی جموں اینڈ کشمیر)، بڈلف (ٹرائبز آف ہندوکش)، ای او لوریمر (لینگوئج ہنٹنگ ان دی قراقرم)، ای ایف نائٹ (وئیر تھری امپائرز میٹ)، آر سی سچومبرگ (بٹوین آکس اینڈ انڈس) اور بربرہ مونز (ہائی روڈ ٹو ہنزہ) شامل ہیں۔

قیام پاکستان سے قبل ہندوستان کی سیاحت پر مبنی جو اردو سفر نامے لکھے گئے ان میں شمالی علاقہ جات کا ذکر نہیں ملتا۔ حافظ عبد الرحمان امر تسری کا سفر نامہ "سیاحت ہند"[۲] پنجاب، سندھ، بمبئی، گجرات و وسط ہند، آگرہ و اودھ، بنگال اور دکن کے سات سفروں کے احوال پر مبنی ہے۔ اس میں ان شہروں کے ۱۹۰۸ء تک کے تاریخی کوائف، چشم دید واقعات اور تمدنی ترقی کا احوال قلمبند ہے۔ انھوں نے تمام شہروں کا سفر ریل کے ذریعے کیا۔ اس سفر نامے میں شمالی علاقہ جات کا کہیں تذکرہ نہیں۔

زیر نظر مقالے کا یہ باب شمالی علاقہ جات کے قیام پاکستان سے پہلے تک کے اردو سفر ناموں میں مقامی تہذیب و ثقافت کی عکاسی جانچنے کے لیے مختص ہے۔ مگر چونکہ اردو کے بالخصوص ان علاقوں کے سفر نامے قیام پاکستان سے قبل تک لکھے ہی نہیں گئے اس لیے غیر ملکی زبانوں کے سفر ناموں میں ان علاقوں کی پیش کردہ تہذیب و ثقافت کے مختصر جائزے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اپنے ملک یا علاقے کی چیزوں کو سرسری طور پر لیا جاتا ہے مگر غیر ممالک کی چھوٹی چھوٹی رسوم بھی سیاح کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتی ہیں۔ اس لیے سیاح انھیں باریک بینی سے تحریر کرتے ہیں۔ اس لیے برصغیر کے مقامی لوگوں نے تو اپنی قدیم روایات کو محفوظ نہیں کیا مگر بیرونی سیاحوں کے قدیم سفر ناموں میں ہندوستان کی معروضی تصویر مل جاتی ہے۔

قدیم ہندوستانی سفر ناموں میں فاہیان (Faxian, 337-440AD) کا سفر نامہ ہند اولیت اور قدامت کے باعث اہمیت کا حامل ہے۔ یہ چینی سیاح فاہیان کی چوتھی صدی عیسوی کے سفر کی دلچسپ روداد ہے۔ بدھ آثار کی تلاش اور زیارت پر مبنی اس سفر نامے میں مقامات کے قدیم نام ملتے ہیں جو چوتھی صدی میں رائج تھے۔ متعدد مقامات کی وضاحت مترجم یاسر جواد نے حواشی میں کی ہے۔ ہمالیہ اور تبت کے پہاڑوں کی زہریلی تبخیر کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے کہ زہریلے اژدھے موجود ہیں جو خفا ہونے پر زہر تھوکتے ہیں۔ بارش، برف، اڑتی ریت اور گول پتھر سفر میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو اس نے برفانی پہاڑوں کے لوگ قرار دیا۔ ہندوستان کے شمال میں داخل ہوتے ہی تولائی کی بادشاہت کا ذکر کیا جہاں اکثریتی آبادی بھکشویان فرقہ پر مشتمل تھی۔ لوہان کی روایت کے بیان میں اس کی مافوق الفطرت قوتوں کا ذکر ہے۔ بادشاہ می لے فوسا کے مجسمے کو چڑھاوے چڑھاتے تھے۔[۳] می لے فوسا کے مجسمے کے کھڑا ہونے کے بعد ہی ہندوستان میں شاکیہ منی کا قانون پھیلنا شروع ہوا۔ اس علاقے کی دشواری کے بارے میں فاہیان بتاتا ہے:

> "وہ پندرہ روز تک جنوب مغرب کی سمت میں اس سلسلہ کوہ پر چلتے رہے۔ سڑک نہایت دشوار گزار ہے اور راہ میں بکثرت خطرناک ڈھلانیں آتی ہیں۔ ان پہاڑوں میں آٹھ ہزار فٹ بلند چٹانوں کے ٹکڑے بھی نظر آتے ہیں جن پر تصاویر بنی ہیں۔ نزدیک جانے پر کوئی تصویر نظر نہیں آتی اور اگر ان جگہوں پر مسافر کا پاؤں پھسل جائے تو دنیا کی کوئی چیز اسے نہیں بچا سکتی۔"[۴]

انھی پہاڑوں کے دامن میں فاہیان نے دریائے سندھ کے شروع ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ قدیم لوگوں نے چٹانوں کو توڑ کر سات سو سیڑھیوں پر مشتمل راستہ بنایا۔ جن سپہ سالاروں کے ذریعے چین کو ہندوستان کے بارے میں ابتدائی معلومات حاصل ہوئیں ان کے دریائے سندھ تک پہنچنے کا ذکر بھی کیا ہے۔ حواشی میں فراہم کردہ معلومات کے مطابق ۱۲۱ قبل مسیح میں بدھ کے مجسمے کی پرستش کا آغاز ہوا۔ سندھی بودھیوں کا عقیدہ تھا کہ مجسمہ ایستادہ ہونے کے بعد ہندوستانی بھکشوؤں کی کاوشوں سے اس خطے میں بدھ مت پھیلا۔ فاہیان کی بتائی ہوئی جگہوں کے تعین میں اس لیے مشکل پیش آتی ہے کہ قدیم نقشوں میں بہت تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ اوچنگ نامی جس علاقے کا تذکرہ فاہیان نے کیا ہے وہ کشمیر سے متصل ہے۔ پولولو بلور کا چینی تلفظ ہے جو تبت خورد ہے۔ اس سفر نامے میں زیادہ تر مختلف مقامات پر بدھ آثار کی نسبت سے بدھ روایات کا تذکرہ ہے۔

ہیون سانگ (Xuanzang,602-664) کے وسط ایشیا اور ہندوستان کے سفر کا مقصد چینی بدھ مت کو ہندوستان میں دیکھے ہوئے بدھ مت سے مطابقت میں لانے کی کوشش تھا۔ اس نے ستر سے زائد بدھ کتب کا ترجمہ کیا۔ اس کا ہندوستان کا سفر ۶۲۹ء تا ۶۴۵ء کے زمانے پر محیط ہے۔ سیاسی، مذہبی، معاشرتی آئین و قوانین کے بیان کے ساتھ ساتھ قدیم روایات کو ہیون سانگ نے اپنی کتاب میں محفوظ کیا۔ ہند کا چینی نام تیئن چو تھا۔ ہیون سانگ نے اپنے سفر نامے میں ہندوستان کی وسعت، آب و ہوا، لمبائی کے پیمانے، علم نجوم، کیلنڈر، اہم شہر، عمارات، زمینی نشست، لباس، عادات، صفائی و طہارت، انداز تحریر، زبان، کتب وید، بدھ مکتب کی کتب، نظم و ضبط، ذاتیات، شادی بیاہ کی رسوم، شاہی خاندان، افواج، ہتھیار، آداب معاشرت، انتظامی قوانین، آزمائش اور سزائیں، طریقہ علاج، آخری رسومات، سول انتظامیہ، محصولات، میوے، درخت، غذا اور تجارتی لین دین کا ذکر کیا ہے۔

پولیولو (موجودہ بلتستان) کے بارے میں ہیون سانگ کا کہنا ہے:

> ”پو۔لیو۔لو ملک کا رقبہ ۴۰۰۰ لی ہے۔ یہ عظیم برفیلے پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ یہ شرقاً غرباً لمبا اور شمالاً جنوباً تنگ ہے۔ یہ گندم اور دالیں، سونا اور چاندی پیدا کرتا ہے۔ سونے کی وسیع مقدار کی بدولت ملک میں بہت سا سونا موجود ہے۔ موسم متواتر سرد رہتا ہے۔ لوگ اپنے کردار میں غیر مہذب اور کرخت ہیں۔ ان کے ہاں انسانیت یا انصاف بہت کم ہے اور کریم النفسی کا تو انھوں نے نام تک نہیں سنا۔ وہ ظاہری شکل و صورت میں قابل نفرت اور بد صورت ہیں۔ وہ اون سے بنے کپڑے پہنتے ہیں۔ ان کے حروف تقریباً ہند جیسے ہیں اور زبان کچھ مختلف۔ اس ملک میں تقریباً ایک سو آشرم ہیں جہاں کوئی ۱۰۰۰ بھکشو رہتے ہیں۔ انھیں علم حاصل کرنے کا کوئی زیادہ جوش و شوق نہیں اور اپنے اخلاقی رویہ میں بھی بے احتیاط ہیں۔“[۵۰]

ادیان کو مترجم نے دریائے سندھ کے کنارے واقع قرار دیا ہے تب یہ نام ہندوکش کے جنوبی کوہستانی خطہ اور چترال سے لے کر سندھ تک کے علاقے کے لیے مختص تھا۔ ہیون سانگ نے دریائے سوات کے کنارے آبادی اور ان

علاقوں میں بدھ مت کے فروغ کا ذکر کیا ہے۔ یہاں کی فصلوں، موسم اور پیداوار کے متعلق بتاتے ہوئے اس کا کہنا ہے کہ زمین سونا اور لوہا پیدا کرتی ہے، ہلدی کاشت ہوتی ہے۔ لوگ نازک اور زن صفت ہیں، فریبی مزاج کے حامل ہیں۔ علم سے محبت کرتے ہیں مگر استعمال نہیں کرتے۔ منتروں کا بطور فن استعمال کرتے ہیں اور بدھ دھرم کو بہت تعظیم دیتے ہیں۔[٦] اس سفر نامے میں اس خطے میں جابجا پھیلے ہوئے بدھ آشرم، ستوپے اور ان کی تعمیر کا پس منظر اور دیگر بدھ آثار کی تاریخی تفصیلات بھی شامل ہیں۔

عرب سیاح ابن بطوطہ[7] (Ibn Battuta,1304-1377) نے پچیس سال تک سیاحت کے بعد اپنی سفری یادداشتوں کو مرتب کیا۔ اس نے بلاد اسلامیہ، عرب ممالک، ہندوستان، انڈونیشیا، کمبوڈیا اور چین کی سیاحت کی۔ ابن بطوطہ جس دوران برصغیر میں رہا تب یہاں محمد تغلق کی حکومت تھی۔ ابن بطوطہ اپنے سفر کی معمولی معمولی جزئیات بھی بیان کرتا ہے اور کسی واقعے کے بیان میں کوئی پہلو نظر انداز نہیں کرتا۔ ہندوستان کے جن علاقوں سے اس کا گزر ہوا اور اس نے وہاں رہائش اختیار کی ان میں سندھ کے علاقے، سیہون، بھکر، اوچ، ملتان، پاک پتن، دہلی، مالابار، مغربی گھاٹ، کالی کٹ وغیرہ شامل ہیں۔ وہ بادشاہ کی طرف سے چین کی طرف بھیجی جانے والی سفارت میں شامل تھا مگر شمالی علاقہ جات کا ذکر اس کے سفر نامے میں نہیں ہے۔ البتہ قیام دہلی کے واقعات اور دہلی کے حکمرانوں کی مفصل تاریخ اس نے اپنے سفر نامے میں شامل کی ہے۔

فرانسس برنیئر (François Bernier,1620-1688) نے مغل بادشاہ شاہ جہان اور اورنگ زیب کے عہد حکومت میں برصغیر کا سفر کیا۔ اسے بادشاہ کے لشکر کے ساتھ کشمیر تک کے سفر کا موقع ملا۔ (Travels in the Mogul Empire ,A.D. 1656-1658) اس نے لاہور سے کشمیر کی طرف سفر کا احوال لکھا ہے کہ کس طرح بادشاہ کے ساتھ امرا، وزرا، بڑے عہدیدار شامل تھے۔ یہ سفر بادشاہ کے موسم گرما کشمیر میں گزارنے کی غرض سے تھا۔ اس سفر میں باربرداری کے لیے ہزاروں مزدور شامل تھے۔ ہاتھیوں کے ذریعے سواری کا کام لیا گیا تھا۔ کشمیر کی قدیم تاریخ، طول و عرض، حدود اربع، سرسبز چراگاہوں، مویشیوں، موذی جانوروں کے کم ہونے، دریاؤں، چشموں، سبزیوں، پھلوں، ڈل جھیل کی تفصیل، کشمیریوں کے تعمیرات میں پتھر کی جگہ لکڑی کو ترجیح دینے کی وجہ، تفریحی کشتیوں اور برفیلی پہاڑی چوٹیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ مصنف نے مختلف مقامات سے منسوب روایات کو بھی بیان کیا ہے۔ ایک مقامی شخص کی زبانی بتایا ہے کہ کشمیر سے آگے کے کوہستانی علاقوں میں اس کا گزر ایک خوشنما چھوٹے ضلع میں ہوا۔ جہاں اس کے خاندانی شرف سے مطلع ہوتے ہی لوگ بہت خلوص اور عقیدت سے پیش آئے اور نذرانوں کے انبار لگا دیے۔ شام کو اپنی خوبصورت ترین لڑکیاں اس کی خدمت میں پیش کیں کہ کسی کو پسند فرمالیں تاکہ اس ملک کو اس کی نسل سے فخر حاصل ہو۔[٨]

اس وقت بلتستان کو تبت خورد کہا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں برنیئر اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے کہ کشمیر کی سرحد پر واقع چھوٹی تبت کے حکمرانوں میں چند سال قبل تنازعات ہوتے رہے۔ حکومت وریاست کے دعویدار ایک شخص نے خفیہ طور پر کشمیر کے صوبیدار سے مدد کی درخواست کی، شاہجہاں نے مدد کرنے کا عندیہ دے دیا۔ صوبیدار نے وہاں حملہ کیا اور مدد مانگنے والے شخص کو اس شرط کے ساتھ تخت پر بٹھایا گیا کہ وہ سالانہ مشک اور شال بنانے کی اون بطور خراج ادا کرے گا۔ جب وہ شخص اورنگ زیب کے قیام کشمیر کے دوران بذات خود مطلوبہ اشیا دینے کے لیے اس کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے اپنے علاقے کے حالات مصنف کو بتائے۔

"۔۔۔ چنانچہ اس نے ہم سے بیان کیا کہ بڑی تبت میری ریاست کی حد شرقی ہے اور اس کا عرض قریب نوے یا ایک سو بیس میل کے ہے اور کہا کہ گو ہمارے ہاں بلور، مشک اور پشم یہ اشیا بہم پہنچتی ہیں مگر میں چنداں متمول نہیں ہوں اور لوگوں کا یہ عام گمان کہ میرے قبضہ میں سونے کی کانیں ہیں بالکل غلط ہے۔ اس نے یہ بھی بیان کیا کہ اس کے ملک سے بعض اضلاع میں عمدہ عمدہ میوے پیدا ہوتے ہیں خصوصاً خربوزہ جو کئی قسم کا ہوتا ہے۔ مگر کثرت برف کے باعث جاڑا بڑی شدت سے پڑتا ہے۔ اور وہاں کے باشندے پہلے بت پرست تھے مگر اب اکثر مسلمان ہو گئے ہیں۔ چنانچہ میں بھی مسلمان ہوں اور شیعہ ہوں۔"[9]

برنیئر نے تبت خورد میں کشمیر کی طرف سے مداخلت، حکومت کو خراج ادا کرنے، وہاں کے شدید موسم، فصلوں، لوگوں، مذہب کا ذکر کیا ہے۔ تبت عظیم کے کشمیری راجہ کی طرف سے کشمیر کی تسخیر کی ناکام کوشش کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اورنگ زیب کی فوج کشی سے بچنے کے لیے وہاں کے رئیس نے اپنے سفیر کے ہاتھ مختلف تحائف بھجوائے۔ مصنف نے کشمیر سے ملحقہ تبت اور کاشغر کے حالات بھی قلمبند کیے ہیں۔

بیرن چارلز ہیوگل (Baron Charles Von Hugel,1795-1870) کے سیاحت نامہ کشمیر و پنجاب (Travels in Kashmir and the Punjab) کا تعلق ایسٹ انڈیا کمپنی کی توسیع پسندانہ پالیسی کے شمال مشرق کی طرف تیزی سے پھیلنے کے زمانے سے ہے۔ جب رنجیت سنگھ پنجاب میں مستحکم حکومت کے بعد اپنی سلطنت کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے کشمیر پر قبضہ کر چکا تھا۔ یہ سفر نامہ کشمیر کے سیاسی حالات اور سکھوں کے ستائیس سالہ دور حکومت میں وہاں روا رکھے جانے والے مظالم کی عینی شہادت ہے۔ اس کے سفر کا مقصد فوجی ٹھکانوں کی معلومات، برطانوی عملداری سے براہ راست کشمیر کشمیر کی طرف راستے کا جائزہ اور کشمیر کی داخلی صورت حال جاننا تھا۔ یہ سفر نامہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کی داخلی سرگرمیوں کا سراغ لگانے میں معاون ہے۔ اس کے سفر میں تین اہم ملازموں سمیت سینتیس ملازم، ساٹھ مزدور اور سات جانور ہمراہ تھے۔

ہیوگل نے اپنا سفر نامہ تاریخ وار مرتب کیا ہے۔ یہ مختلف مقامات پر پہنچنے کی تاریخ وار روداد ہے۔ تب ہندوستان میں کشمیر کی طرف سفر کرنے کے لیے مہاراجہ کشمیر کی طرف سے اجازت نامے کا حصول لازمی تھا جس کی

حیثیت پاسپورٹ کی سی تھی۔[۱۰] پیر پنجال کے علاقوں میں سفر کے دوران مقامی لوگوں کے خوف اور بحفاظت پہنچنے پر دعا مانگنے کے طریقے کے بارے میں بتایا ہے کہ انھوں نے اس پہاڑ پر کوڑیاں اور گھونگے نچھاور کیے جو ہندوستان کا ادنیٰ تری سکہ سمجھا جاتا تھا۔ ہمالیہ کی وادیوں میں سے گزرتے ہوئے اسے جذام کا مرض متواتر دیکھنے میں آیا۔ سکھوں کی بدولت سکردو کے حکمرانوں کو درپیش مشکلات کے بارے میں ہیوگل نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے:

"احمد شاہ اسکردو کا موجودہ حکمران شہزادہ آج کل کچھ پریشانی کی حالت میں مبتلا ہے۔ شمال مغربی ہندوستان میں سکھ گزشتہ چالیس سال کے دوران میں قریباً گمنامی کی حالت سے ترقی کرکے اب اتنی طاقت پکڑ چکے ہیں کہ ملک کا بیشتر حصہ ان کی حکمرانی میں ہے۔۔۔۔ کشمیر کے مشرق، مغرب اور جنوب کے پہاڑی علاقوں کے چھوٹے چھوٹے حکمران اس کے معاون ہو گئے ہیں۔ جو شرائط ماننے سے انکار کرتے ہیں انھیں کسی لمبے چوڑے تکلف کے بغیر اپنے مقبوضات سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ شمالی علاقے میں اب اس کی فتوحات کی کارروائیاں ہونے والی تھیں۔ لداخ فتح ہو چکا تھا۔ احمد شاہ اس سیلاب کو آہستہ آہستہ اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور اس کے سدباب کی اسے کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ البتہ وہ بدترین صورتحال کے لیے تیار تھا۔ اسکردو میں اتنے عرصے تک تو امن وامان رہا تھا۔ یہاں کے افلاس نے اسے لٹیروں کی دست برد سے بچائے رکھا تھا۔ اس کے ہمسایوں کی نظر میں اس کے علاقے بالکل بیکار تھے یہاں کے لوگ جنگی مہارت کے خلاف دفاعی صلاحیت سے بالکل عاری تھے۔"[۱۱]

مصنف کے خیال میں اہل سکردو کا رنجیت سنگھ کی منظم و تربیت یافتہ فوج کے مقابلے میں کھلے میدان میں ٹھہرنا محال تھا۔ دشوار گزار پہاڑی علاقوں کی وجہ سے وہ حملہ آوروں کی پیش قدمی روک دیتے تھے۔ مصنف کو کشمیر کے ایک پہاڑ دیامل سے نانگا پربت بھی نظر آئی۔

رشید اختر ندوی نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک شمالی علاقہ جات پہنچنے والے انگریز سیاحوں کے سفری احوال کو اختصار سے اپنی تصنیف "شمالی پاکستان" میں جگہ دی ہے۔ ان کے مطابق فریڈرک ڈریو (Frederick Drew, 1836-1891) نے ۱۸۷۵ء میں جموں کشمیر پر کتاب (The Jummoo and Kashmir Territories: a Geographical Account) لکھی۔ وہ لداخ کے راستے بلتستان میں داخل ہوا تھا۔ اس نے بلتیوں کے تورانی الاصل ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کے حلیے اور قد و قامت کی تفصیلات دی ہیں۔ ان کے لباس، رہن سہن، پیشوں اور جغرافیائی صورتحال پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ شگر کی خوبانی کو اس نے سارے بلتستان کی خوبانیوں سے لذیذ قرار دیا ہے۔[۱۲] فریڈرک ڈریو نے گلگت، بونجی، پنیال کے حالات بھی لکھے ہیں۔ دردوں کے لباس کے متعلق اس کا کہنا ہے کہ ادنیٰ لباس پہنتے ہیں۔ اعلیٰ طبقے کے چند لوگ گرمیوں میں سوتی لباس پہنتے ہیں۔ لباس میں چوغے پاجامے کے ساتھ کمر پر ایک پٹی بھی لپٹی ہوتی ہے۔ ٹوپی کو سر پر لپیٹ کر پہنا جاتا ہے۔ یہاں بسنے والے

ڈوم کو اس نے آریا کی آمد سے قبل ہندوستان میں بسنے والے اصلی باشندے قرار دیا ہے جو آریا کے تسلط کے باعث پہاڑوں میں چلے گئے تھے۔[۱۳]

بڈلف (John Biddulph,1840-1921) نے اپنی تصنیف "ٹرائبز آف ہندوکش" (Tribes of the Hindoo Koosh) کے لیے 1878ء بونجی سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ پہلے بونجی خوب آباد تھا، اس کی آبادی تین ہزار تھی۔ لیکن چترال اور یاسین کے حکمرانوں کی لڑائیوں کے باعث بونجی کی خوشحالی اور آبادی پر برے اثرات پڑے۔ ۱۸۴۱ء میں یہاں صرف دو سو گھر باقی بچے تھے۔ اس سفر نامے میں گلگت کی قدیم تاریخ اور جغرافیائی صورتحال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ گلیشئروں کے کیچڑ میں سونے کی مقدار ملنے سے مقامی لوگوں کو یقین ہے کہ گلیشیر سونے کی تخلیق کا موجب ہیں۔[۱۴] بڈلف کے مطابق گلگت، نگر، استور کے لوگ مسلمان ہونے کے باوجود گائے کا گوشت نہیں کھاتے۔ اس سے ان کے ہندو الاصل ہونے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ نگر کے لوگوں کو مصنف نے دیگر علاقوں سے چھوٹے قد کا قرار دیا ہے اور یہ امن پسند ہیں۔ بڈلف نے مختلف علاقوں کے باشندوں کی ذاتوں پر تاریخی حوالے سے بحث کی ہے۔

ای او لوریمر (Emily Overend Lorimer,1881-1949) کا سفر نامہ "لینگوایج ہنٹنگ ان دی قراقرم" ((Language Hunting in the Karakoram)) 1939ء میں شائع ہوا۔ اس کے سفر کے دوران یہاں ڈوگروں اور انگریزوں کی حکومت تھی اس لیے اس نے انگریز مہمان افسر کی حیثیت سے سفر کیا۔ وہ برزل اور چلم کے راستے گلگت آیا حالانکہ ان دنوں دیوسائی والا راستہ عام استعمال ہوتا تھا۔ علی آباد میں لوریمر کو لوگوں کے سروں اور پشتوں پر جانوروں کے لیے خوراک کے گٹھے یا پھلوں کی لدی ٹوکریاں نظر آئیں۔ کھیتوں میں کٹ جانے والی فصلوں کو بوڑھے بچے سب اپنے پاؤں سے برابر کر رہے تھے۔[۱۵] لوریمر کے مطابق ہنزہ کی گائیں دودھ کم دیتی ہیں اس لیے یہاں مقامی خوراک میں دودھ شامل نہیں۔ وہاں روشنی کے لیے مٹی کا تیل گلگت سے لایا جاتا تھا اور مویشیوں کے ذریعے بھی فصل سے غلہ الگ کیا جاتا تھا۔ ہنزہ کی صنعتوں، پیداوار اور لوگوں کے بارے میں بھی مصنف نے وضاحت سے لکھا ہے۔ ہنزہ اور نگر کے فرق کی نشاندہی بھی کی ہے۔ مصنف نے ہنزہ میں وراثت کا عجیب قانون دیکھا۔ اگر جوان بچوں کا باپ دوسری شادی کرے تو اسے جائیداد میں ایک بیٹے کے برابر حصہ ملے گا اور اس کی اولاد پوتے کی وراثت کی حقدار ہوگی۔ بیوی اور شوہر کے خاندان ایک دوسرے کے ساتھ پھلوں اور دیگر اشیا پر مشتمل تحائف کا تبادلہ کرتے رہتے ہیں۔ وہاں نکاح کے وقت دلہا دلہن کے لیے پانی کے کٹورے پر جو ریشمی رومال ڈھکا ہوتا تھا وہ خلیفہ یا نکاح خوان کی ملکیت ہوتا اور گردش میں رہتا۔ خلیفہ اس کی اجرت وصول کرتا تھا۔ مصنف نے ان علاقوں کے تہواروں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

ای ایف نائٹ(Edward Frederick Knight,1852-1952) کا سفر نامہ "وئیر تھری امپائرز میٹ"(WhereThree Empires Meet) ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔ وہ وادی سندھ سے گزر کر بلتی تاجروں کے قدیم زمانے میں استعمال ہونے والے راستے تک پہنچا۔ اس نے بلتیوں کی ملنساری اور خوش اخلاقی کو سراہا ہے۔ اس نے سری نگر کے بعد چھوڑبٹ پہلا پڑاؤ دیکھا۔ سری نگر سے بلتستان آنے والے قافلوں کے لیے یہ پہلا پڑاؤ تھا۔ اسے یہاں باہر کوئی عورت دکھائی نہیں دی۔ شیوق کے پھل اسے بہت پر لطف لگے مگر خپلو کو وہ بلتستان کی جنت قرار دیتا ہے۔ اسے وہاں کے لوگوں میں یونانی اور منگولی مشابہت نظر آئی۔ دریائے شیوق کو پار کرنے کے لیے مشکیزہ نما کشتیاں استعمال ہوتی تھیں۔ استور اور گلگت کو ملانے والی سڑک کی تعمیر کے لیے ڈوگرے زبردستی مقامی مزدوروں کو پکڑ کر لائے تھے۔

> "نائٹ نے کہا ہے کہ یہ مزدور اس قدر بدنصیب تھے کہ انھیں گھر واپس جانے کی مہلت نہ ملتی، چونکہ ڈوگرے ان سے حد درجہ بدسلوکی کرتے، انھیں نہ پیٹ بھر کر کھانے کو روٹی دیتے اور نہ لباس اس لیے وہ یہیں مر کھپ جاتے۔"[۱۶]

مصنف نے گلگت میں وسیع پیمانے پر ہونے والی زراعت کا بتایا ہے۔ یہاں وافر پانی کی بدولت چاول اور دوسری اجناس بھی بوئی جاتی ہیں۔ پھلدار درخت وافر تھے، انگوروں کے باغات کا کوئی شمار نہ تھا۔

آر سی سچومبرگ(Reginald Charles Francis Schomberg) نے اپنے سفر نامہ "بیٹوین آکس اینڈ انڈس"(Between the Oxus and the Indus) کی تصنیف کے لیے ۱۹۳۴ء میں کشمیر سے درہ برزل، استور اور گلگت تک آتی سڑک کے ذریعے سفر کیا۔ اسے درہ برزل سے استور، رام گھاٹ، ہتو پیر اور پرتاپ پل کے ذریعہ گلگت کا راستہ ناپسند آیا۔ البتہ گلگت کی بستی اسے بہت پسند آئی صرف اس کے گرد پہرہ دیتے ننگے بچے پہاڑ اسے بدرنگ اور برے لگے۔ سچومبرگ کے مطابق گلگت میں برف کم پڑتی ہے اس نے یہاں کے پھلوں، میوں کی فراوانی کی تعریف کے ساتھ روزگار کی کمی کے مسئلے کی بھی نشاندہی کی ہے۔ یہاں تجارت بھی ناکافی ہے اسے یہاں غربت وافلاس دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ پنیال کی طرف جاتے ہوئے سچومبرگ کو ایک جگہ ببر گاؤں میں لوگ پہاڑ کے اوپر سے پتھر گراتے ہوئے نظر آئے تاکہ ہموار جگہ کر کے کھیت تیار کر سکیں۔ عورتیں ریت میں سونے کے ذرات چن کر پانی سے صاف کر رہی تھیں۔[۱۷] سچومبرگ نے کوہ غذر میں روشن نامی گاؤں میں پرانے قلعے کے کھنڈرات دیکھے۔ سچومبرگ کو غذر اور گوپس کے لوگ اہل ہنزہ کی نسبت محنت سے جی چرانے والے لگے۔ اس لیے یہاں افلاس زیادہ نظر آیا۔ پانی وافر ہونے پر بھی یہاں کم کھیتی باڑی پر اسے تعجب تھا۔ پنڈور جھیل کے ارد گرد کے علاقے کو مقامی لوگ چھوٹا کشمیر کہتے تھے۔ یاسین میں چراگاہیں کم تھیں اور کاشتکار تین سال میں ایک فصل بوتے تھے۔ اس نے یاسین کی خوشنمائی کے لیے تجاویز بھی دی ہیں کہ راستے ٹھیک ہوں تو تجارت سے خوشحالی آسکتی ہے۔ اس کے علاوہ راجہ پولو کھیلنے کے لیے بے شمار

مہمان بلاتا ہے ان کی میزبانی و رہائش پر بہت اخراجات اٹھتے ہیں۔ اگر یہ تعداد کم ہو تو خاصی گندم کاشتکار کے کام آ سکتی ہے۔ بشوک میں مصنف کے ساتھیوں نے کمبل کے ذریعے مچھلی کا شکار کیا۔ اس نے داریل و تانگیر کے لوگوں اور فن تعمیر کا بھی بتایا ہے۔ چترالی حکمران دعویٰ کرتے رہے کہ نگر، یاسین، ہنزہ و گلگت ان کی ملکیت ہیں۔ مصنف نے ان علاقوں میں ہونے والی یورشوں کی تفصیل بھی دی ہے۔

بربرہ مونز (Barbara Mons,) نے "ہائی روڈ ٹو ہنزہ" (High Road to Hunza) میں میر ہنزہ کا تذکرہ کیا ہے۔ حسن آباد سے آگے جاتے ہوئے ان کے قافلے کو کھیتوں میں کام کرنے والے مقامی باشندوں نے اپنی دو انگلیوں کو پیشانیوں تک لے جا کر سلامی دی کہ وہ محکوم تھے اور انگریز حاکم۔ بربرہ کے مطابق انیسویں صدی میں ہنزہ و نگر کے حکمران مہاراجہ کشمیر کو بیس اونس سالانہ سونا بطور خراج ادا کرتے تھے۔ ملت ور میئون ہنزہ اور نگر کی ریاستوں کے دروازے ہیں۔ ان کے دونوں اطراف قلعے بنے ہیں۔ التت میں اس نے ایک جولاہے کو دیسی کھڈی پر کپڑا بنتے پایا۔ میر صاحب نے اسے بتایا کہ انھوں نے بروچہ قوم کے بچوں کی سکول میں تعلیم پر پابندی لگا دی ہے کیونکہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد لوہاروں کا آبائی پیشہ چھوڑ دیتے تھے۔ مصنف کو وہاں لوہاروں، ترکھانوں اور سناروں کو کام کرتے اور ان کی مصنوعات کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔[۱۸]

چونکہ شمالی پاکستان کے اردو سفرنامے قیام پاکستان سے پہلے نہیں لکھے گئے تھے اس لیے مندرجہ بالا چند غیر ملکی سفرناموں کے جائزے سے مقامی تہذیب و ثقافت کے بارے میں جو باتیں سامنے آتی ہیں ان کے مطابق یہاں کا معاشرہ جمود کا شکار تھا۔ قدیم سفرنامے یہاں کے لوگوں کے مذہب، انداز و اطوار، تاریخ اور جغرافیہ کے متعلق بیش بہا معلومات مہیا کرتے ہیں۔ چینی سیاحوں، فاہیان اور ہیون سانگ کے سفر بدھ مت کے آثار کی تلاش کے لیے زائر کی حیثیت سے تھے۔ اس لیے اس زمانے (فاہیان چوتھی صدی عیسوی اور ہیون سانگ ساتویں صدی عیسوی) کے مذہبی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ فاہیان نے راستے کی خطرناکی اور زیادہ تر بدھ آثار سے منسوب روایات کے بیان تک خود کو محدود رکھا۔ جبکہ ہیون سانگ نے بلتستان کے محل وقوع، پیداوار، سونے چاندی کی فراوانی، شدید سرد موسم اور لوگوں کے کرخت اور غیر مہذب ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اسے یہاں آشرموں میں رہنے والے بھکشوؤں میں علم حاصل کرنے کی لگن دکھائی نہیں دی۔ دریائے سوات کے گرد پھیلی آبادی کے لوگوں کو اس نے نازک اور فریبی قرار دیا ہے جو علم سے محبت کے باوجود اسے استعمال نہیں کرتے، منتروں کو بطور فن استعمال کرتے ہیں۔ ہیون سانگ کے سفرنامے میں فاہیان کے سفرنامے کی نسبت اس زمانے کی تہذیب و ثقافت کی عکاسی نسبتاً زیادہ نظر آتی ہے۔ فرانسس برنیئر کے سفرنامے میں اورنگ زیب کے عہد میں کشمیر سے ملحقہ علاقوں کا مختصر احوال ملتا ہے۔ کس طرح کشمیر کی حکومت نے ان علاقوں میں مدد کی درخواست پر مداخلت کی اور بدلے میں سالانہ خراج کا مطالبہ کیا۔ وہاں کی فصلوں، پیداوار، موسم

اور مذہب کے بارے میں مختصر معلومات برنیئر کے سفر نامے میں ملتی ہیں۔ کشمیر میں رنجیت سنگھ کی حکومت کے دور کے حالات بیرن چارلز ہیوگل کے سفر نامے میں ملتے ہیں۔ اس نے تب سکھوں کی وجہ سے سکردو کے حکمرانوں کو درپیش مشکلات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ سکردو کے لوگ دفاعی صلاحیت سے عاری تھے اور کھلے میدان میں سکھوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت سے محروم تھے۔ سکردو کے افلاس نے اسے بہت عرصہ لٹیروں کی دست برد سے بچائے رکھا کہ ہمسایوں کی نظر میں یہ بالکل بیکار علاقے تھے۔

رشید اختر ندوی کی تصنیف "شمالی پاکستان" میں انگریز سفر نامہ نگاروں کے ان علاقہ جات کے جن سفروں کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے ان کا زمانہ انیسویں صدی کے آخر سے لے کر بیسویں صدی کے تیسرے عشرے تک محیط ہے۔ ان سفر ناموں میں ماضی قدیم کے سیاحوں کے سفر ناموں کی نسبت زیادہ مفصل معلومات ملتی ہیں۔ ان تمام علاقوں کے بارے میں راستوں کی مشکلات، جغرافیہ، محل وقوع، آب و ہوا، اجناس کی پیداوار، پھل، پیشے، لوگوں کا رہن سہن، لباس، پیشے، عادات واطوار، مویشیوں، کھیتی باڑی کے طریقے، ذاتوں کے حوالے سے تاریخی معلومات، لسانی معلومات، فن تعمیر، حکمرانوں کی تاریخ، حملہ آوروں کی تاریخی تفصیلات، مقامی لوگوں کی مشکلات وغیرہ کا بیان اس دور کے لکھے جانے والے انگریز سیاحوں کے سفر ناموں میں واضح ہے۔ بعد کے زمانے میں سیاحوں کی رسائی نسبتاً آسان ہوتی گئی تو سرسری معلومات کی بجائے مفصل معلومات کی فراہمی کا رجحان بڑھا۔ لیکن یہاں معاشرہ جمود کا شکار تھا اور بیرونی دنیا کی نسبت بہت سادگی تھی۔ وسائل محدود تھے۔ سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ موسموں کی سختی کے باعث ذرائع آمد و رفت بھی محدود تھے۔ کچھ علاقوں کے لوگ تو شدید موسم کے دوران طویل عرصے کے لیے محصور ہو جاتے تھے اور ان کا باقی علاقوں سے رابطہ کٹ جاتا تھا۔ ان سفر ناموں میں اس وقت تک یہاں مروج تہواروں کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ تب یہاں بیرونی ثقافتی یلغار نہ ہونے کے برابر تھی۔ لوگ اپنے آبائی پیشوں تک محدود رہتے تھے۔

حواشی

1. انور سدید،ڈاکٹر،اردو ادب میں سفر نامہ(لاہور:مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۱۹۸۷ء)،ص:۵۵۔
2. حافظ عبدالرحمان امرتسری،سیاحت ہند(لاہور:نور مطبع رفاہ عامہ،۱۹۰۹ء)
3. فاہیان،فاہیان کا سفرنامہ ہند،مترجم:یاسر جواد(لاہور:تخلیقات،۲۰۰۰ء)،ص:۳۹۔
4. ایضاً،ص:۴۴۔
5. ہیون سانگ،ہیون سانگ کا سفرنامہ ہند،مترجم:یاسر جواد(لاہور:تخلیقات،۲۰۰۶ء)،ص:۱۰۴۔
6. ایضاً،ص:۹۵۔
7. ابن بطوطہ،سفرنامہ ابن بطوطہ،مترجم:رئیس احمد جعفری(کراچی:نفیس اکیڈمی،۱۹۶۱ء)
8. فرانسس برنیئر، برنیئر کا سفرنامہ ہند،مترجم:خلیفہ سید محمد حسین(لاہور:تخلیقات،۲۰۰۰ء)، ص:۳۵۶۔
9. ایضاً،ص:۳۵۷۔
10. بیرن چارلز ہیوگل،سیاحت نامہ کشمیر و پنجاب،مترجم:محمد حسن صدیقی(لاہور:مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۰ء)،ص:۸۔
11. ایضاً،ص:۱۰۸۔
12. رشید اختر ندوی،شمالی پاکستان(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء)،ص:۱۷۸۔
13. ایضاً،ص:۱۹۶۔
14. ایضاً،ص:۲۰۵۔
15. ایضاً،ص:۲۲۹۔
16. ایضاً،ص:۲۵۹۔
17. ایضاً،ص:۲۶۵۔
18. ایضاً،ص:۳۱۳۔

باب پنجم

شمال کے اردو سفر نامے: قیامِ پاکستان کے بعد

باب پنجم

شمالی پاکستان کے اردو سفر نامے: قیام پاکستان کے بعد

قیام پاکستان کے بعد ابتدا میں شمالی علاقہ جات کے اردو سفر نامے نہ ہونے کے برابر تھے۔ کچھ غیر ملکیوں کے ان علاقوں کے سفر ناموں کے اردو تراجم شائع ہوئے۔ اردو میں زیادہ ترجح اور دیگر ممالک کے سفر نامے لکھے جاتے تھے۔ بیسویں صدی کی 80ء کی دہائی میں شمالی علاقہ جات کے اردو سفر ناموں کا رواج ہوا اور اکیسویں صدی میں اس رجحان میں تیزی آئی۔ مستنصر حسین تارڑ نے سب سے زیادہ شمالی پاکستان کے سفر نامے لکھے ہیں جن کی تعداد درجن سے زائد ہے۔ نئے سفر نامہ نگاروں نے ان کے رنگ کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں شمالی پاکستان کے اردو سفر ناموں کا جائزہ ان میں پیش کی جانے والی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے لیا گیا ہے۔ تہذیب و تمدن کے مختلف مظاہر یا ان علاقوں کے کسی بھی ثقافتی پہلو کو جو ان سفر ناموں میں پایا گیا، کا احاطہ کیا گیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ اردو ادب میں بحیثیت ناول نگار، سفر نامہ نگار اور کالم نویس اپنی ممتاز شناخت رکھتے ہیں۔ 1984ء میں پہلے سفر شمال کے بعد سے 2017ء تک ان کے متعدد سفر نامے منظر عام پر آ چکے ہیں جن میں ہنزہ داستان، سفر شمال کے، چترال داستان ، نانگا پربت بلتستان داستان، کے ٹو کہانی، یاک سرائے، سنو لیک، دیوسائی، شمشال بے مثال، برفیلی بلندیاں، رتی گلی، راکاپوشی، حراموش ناقابل فراموش شامل ہیں۔ انھیں منظر نگاری میں کمال حاصل ہے۔ ذیل میں جو سفر نامے زیر بحث لائے جائیں گے ان کی ترتیب ان کی اشاعت کے سال کی بجائے سفر کے سال کو مد نظر رکھتے ہوئے کی گئی ہے۔

ہنزہ داستان (1984ء)، مستنصر حسین تارڑ

مستنصر حسین تارڑ کا شمال کا پہلا سفر نامہ ہنزہ داستان 1984ء کے گلگت اور ہنزہ کے سفر کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ ہنزہ کے سفر کے لیے مصنف کو گلگت جانے والی ویگن کے ٹائر خراب لگ رہے تھے مگر مقامی ڈرائیور کا کہنا تھا وہ ہر ہفتے ویگن کے راولپنڈی سے گلگت کے دو چکر انھی پہیوں پر لگاتا ہے۔ ویگن میں بیٹھنے والے مقامی مسافروں میں ایک سوست میں چینی سرحد کے قریب پسو چوکی پر تعینات کسٹم آفیسر تھا۔ سوست میں ہر سال ہزاروں چینی مسلمان داخل ہو کر گلگت سے اسلام آباد کراچی اور پھر مکہ جاتے تھے۔ حج کے بعد اسی راستے سے چینی ترکستان واپس چلے جاتے۔[1] ٹیکسلا سے گزرتے ہوئے قدیم چٹانوں کو توڑ کر بجری میں تبدیل کرنے پر مصنف نے دکھ کا اظہار کیا ہے کیونکہ یہاں قدیم مجسمے بکثرت ہیں۔ وہاں ایک قدیم سڑک کی باقیات بھی تھیں جس کے متعلق ایک بورڈ پر عبارت درج تھی کہ وہ مغلیہ عہد کی ہے اور بنگال تک جاتی تھی۔

سری کپ میں گندھارا عہد کے مجسمے اور سٹوپے مصنوعی طور پر تیار کر کے بیچے جاتے ہیں۔ مانسہرہ سے گزرتے ہوئے پرانے سفر کے دوران وہاں موجود اشوکا کی چٹانیں دیکھنے کا ذکر کیا ہے جہاں اشوک کے فرمان کندہ تھے کہ رعایا ان پر عمل کر سکے۔ اسی سفر کے دوران مانسہرہ میں ایک حویلی کا ذکر کیا ہے جس میں ایک چینی صندوق تھا جس کی سیاہ لکڑی پر سنہری اژدھے بنے تھے۔ چینی لوگ ایسے صندوقوں میں اپنے مردے دباتے تھے۔

شاہراہ قراقرم پر سفر کے دوران مصنف نے اس کی تعمیر، تاریخ اور تعمیر کے دوران جاں بحق ہونے والے افراد کے بارے میں معلومات دی ہیں۔ تقریباً ہر فی کلومیٹر ایک انسانی جان کا نقصان ہوا۔ اس وقت کے بشام کے بازار اور ہوٹلوں کے بارے میں مصنف نے بتایا کہ سامنے ایک اداس سے بازار میں غلیظ ہوٹل تھے پٹرول اور گریس کی بو میں بسی ورکشاپیں تھیں۔ دریائے سندھ کی ہوا بھی بدبودار ہو رہی تھی۔[2] ترکی زبان میں قراقرم سیاہ بھر بھری چٹانوں کو کہا جاتا ہے۔ ویگن میں ایک مقامی کوہستانی نے بتایا کہ وہ داسو میں دیودار کا گھنا جنگل خریدنے جا رہا ہے۔ اس نے اپنے کوہستان کی خصوصیات بتاتے ہوئے کہا:

> "نہیں میں کوہستانی ہوں۔ لیکن ادھر کوہستان میں نہیں رہتا۔ صاحب یہ علاقہ انسانوں کے رہنے والا نہیں ہے۔ نرا خوف ہی خوف۔ بھوک، بیماری اور جہالت۔ نہ خوراک نہ کھیت۔ بس بھر بھری مٹی کے پہاڑ ہیں جن میں صدیوں سے لوگ رہتے چلے آئے ہیں۔ انھیں باہر کی دنیا کا کچھ پتہ نہیں۔ غیر قوموں کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں اس لیے کچھ نہیں سیکھ سکے۔ ذاتی دشمنیاں اس حد تک ہیں کہ ہم لوگ رات کو ایک جگہ پر نہیں سوتے۔۔۔ اور جگہ بدل لیتے ہیں تا کہ سوتے میں کوئی دشمن وار نہ کر جائے۔ اپنے چہرے چھپا کر رکھتے ہیں تا کہ کوئی پہچان نہ لے۔"[3]

شاہراہ قراقرم پر پتھر گرنے اور لینڈ سلائڈنگ کی وجہ سڑک کی تعمیر کے دوران ڈائنامائٹ سے پہاڑوں کو توڑنے سے پورے سلسلہ ہائے کوہ میں شگاف اور دڑاروں کا پڑنا ہے۔ تہذیب کے دھارے سے کٹے ہوئے پہاڑی سلسلے کے لوگ آسانی سے دوست نہیں بنتے۔ ان کے مزاج میں صرف شک اور خوف ہے۔ لینڈ سلائیڈ والے علاقے میں باہر موجود کوہستانیوں نے اجنبی مسافروں کو دیکھ کر کسی تعجب، خوشی یا دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ راستے میں ویگن ڈرائیور نے چلاس پہنچنے پر بازار اور ہوٹل موجود ہونے کی نوید سنائی تھی لیکن وہاں بازار کے نام پر دو تین بوسیدہ دکانیں بند تھیں۔ کھانے کی کوئی چیز میسر نہیں تھی۔ جگلوٹ کے قریب ایک گاؤں گور نام کا ہے اس کے قریب دیوسائی تک راستہ جاتا ہے۔ وہاں سولہ ہزار فٹ بلند ایک مقام سے کے ٹو، راکاپوشی، نانگا پربت نظر آتی ہیں۔

پھنڈر کو شمالی علاقوں میں چھوٹا کشمیر کہا جاتا ہے۔ مصنف گلگت کو بلند پہاڑوں میں گھرا ایک جزیرہ قرار دیتے ہیں لیکن یہ ہمیشہ سے ایک سحر انگیز نام رہا ہے۔ بہت سے قدیم بدھ آثار شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے دوران ڈائنامائٹ اور بارود کی نذر ہوئے، قدیم خانقاہیں اور مجسمے معدوم ہوئے پھر بھی کچھ آثار محفوظ رہے۔ 250 قبل مسیح میں بدھ مت

یہاں پھیلا اور اگلے 1200 سال تک یہاں لوگ بدھ مت کی تعلیمات پر عمل پیرا رہے۔ گلگت کی جغرافیائی اہمیت بہت ہے اس کی قربت میں بلند ترین اور خوبصورت ترین چوٹیاں ہیں۔ مشہور اور طویل ترین گلیشیر ہیں۔ گلگت میں لوگوں کا محبوب ترین موضوع یہ ہوتا کہ جہاز کب آئے گا۔ دکان دار آسمان کو دیکھ کر چیزوں کی قیمتیں بتاتے۔ جہاز آنے کا امکان ہو تو مناسب قیمت ورنہ مرضی کے دام۔ اس زمانے میں گلگت میں کوئی ٹیلی ویژن نہیں تھا۔ گلگت ایسی تہذیب تھی جو کسی حد تک جدیدیت کے رنگ سے بچی ہوئی تھی۔ گلگت بازار میں پہنچ کر مصنف کو احساس ہوا کہ یہاں بہت مختلف قسموں کی آبادی ہے۔ پٹھان، چینی، کرغیز، کوہستانی، بلتی لداخی اور کئی قسموں کے خون کی آمیزش سے مخلوط قسم کی آبادی وجود میں آئی۔[4] مستنصر نے گلگت کے ایک مقامی کتب فروش جی ایم بیگ کا تذکرہ کیا ہے جو شمالی علاقوں کا انسائیکلو پیڈیا کہلاتے ہیں اور گلگت میں بہت معروف ہیں۔

ہنزہ کے بارے میں جغرافیائی معلومات، اس کی آبادی اور یہاں بولی جانے والی زبانوں کے بارے میں بتایا ہے۔ ہنزہ بالائی گوجال کو کہتے ہیں۔ مرکزی ہنزہ بروشال اور زیریں ہنزہ شناکی ہے۔ گوجال میں زیادہ واخی لوگ آباد ہیں۔ مرکزی ہنزہ میں مخلوط خون ہے۔ ان میں سب سے اہم قبیلہ دار میتنگ ہے۔ مکان کی بنیاد رکھتے یا نہر کی کھدائی کا آغاز کرنے کے لیے ان کے کسی فرد کو بلایا جاتا ہے۔[5]

ہنزہ کی روایتی طویل العمری کے بارے میں جی ایم بیگ کا کہنا تھا کہ اب دودھ، مکھن اور خوبانی کے تیل کی بجائے ڈالڈا اور چائے سگریٹ آنے سے وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی۔ شاہراہ قراقرم نے ان علاقوں کی ترقی میں تو اہم کردار ادا کیا ہے مگر اچھی صحت اور خوبصورتی اسی راستے سے رخصت ہو گئی۔[6] مقامی لوگوں کا کہنا تھا پولو صرف سردیوں میں کھیلی جاتی ہے گرمیوں میں پولو کے گھوڑے آرام کرتے ہیں۔ لیکن وہاں ایک پولو میچ ہو رہا تھا۔ پولو میچ کے دوران موسیقاروں کی موجودگی کی بابت مصنف بتاتے ہیں:

> "پتھر کی چار دیواری پر گلگتی چوغوں اور اونی ٹوپیوں میں ملبوس مقامی موسیقاروں کا ایک گروہ آلتی پالتی مارے بیٹھا پورے جوش و خروش سے اپنی سانسیں اور اپنے ہاتھ چلا رہا ہے۔"[7]

مقامی پولو میچ وقفے کے بغیر ہار جیت کے فیصلے تک جاری رہتا ہے۔ جی ایم بیگ کی دکان پر یاک کے بالوں کے بنے نمدے پر بیٹھنے سے مصنف کے بیٹے کو بکرے کی بو آئی۔ یاک صرف سردیوں میں ان علاقوں میں نظر آتے ہیں گرمیوں میں انھیں بلند چراگاہوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ تب چنار ان ہوٹل بجلی کے بغیر تھا۔ شمالی علاقوں میں لباس سے کسی انسان کی سماجی یا معاشی حالت کا پتہ نہیں چلتا۔ جیسے مصنف نے کوسٹر کے مالک کو حلیے سے ڈرائیور سمجھ لیا۔ وہاں مقامی ڈرائیور گلگت سے ہنزہ جاتے ہوئے راستے میں لوگوں کی بھیجی چیزیں رضاکارانہ طور پر کرائے کے بغیر پہنچاتے

جاتے ہیں۔ ہنزہ کے بہت لوگ گلگت میں روزگار کے سلسلے میں مقیم ہیں۔ اس لیے وہ اپنے عزیز واقارب کو چیزیں بھیجتے رہتے ہیں۔ ہنزہ کے قریب ایک جگہ ایک قصائی آبشار کے قریب چٹان کے نیچے گوشت ذخیرہ کر رہا تھا۔[8]

ہنزہ کا قدیم راستہ بہت دشوار تھا۔ اس پر صرف مقامی لوگ ہی چل سکتے تھے اس لیے یہ بہت عرصے تک دنیا سے کٹا رہا۔ ایک طرف کلک، منتکا، خنجراب اور شمشال کے ناقابل عبور درے تھے دوسری طرف چین تھا۔ اہل ہنزہ تب گلگت کا رخ کم کرتے تھے چین کی طرف زیادہ جاتے تھے۔

ہنزہ اور نگر کا تقابل کرتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے:

> ”کہا جاتا ہے کہ ایک ہی آب و ہوا میں رہنے اور ایک ہی نسل سے متعلق ہونے کے باوجود اہل ہنزہ کی جانب سورج سارا دن چمکتا ہے۔ جب کہ نگر پہاڑوں کی اوٹ میں واقع ہونے کی وجہ سے نیم تاریک رہتا ہے اور یہ نیم تاریکی نگر والوں کے مزاج میں شامل ہو چکی ہے۔ ہنزہ اور نگر کی ریاستوں کی دشمنی روایتی ہے اور ہمیشہ سے ہے۔“[9]

اہل ہنزہ کے نگر والوں کو غلام بنا کر فروخت کرنے کی بھی روایات ہیں۔ سوست سے ان علاقوں میں داخل ہونے والے چینی حاجیوں کے پاس خاص قسم کی چینی روٹی ہوتی ہے جسے وہ گرم قہوے میں بھگو کر کھاتے ہیں۔ اس روٹی کی نصف مقدار وہ ساتھ لے جاتے ہیں باقی واپسی کے سفر کے لیے گلگت چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ سخت بند نما روٹی ہوتی ہے لیکن منہ میں رکھ کر گھل جاتی ہے۔[10]

گنیش میں قدیم بدھ آثار اور علتت کے پرانے قلعے کا ذکر کیا ہے۔ گلگت سے آگے چین کی طرف شاہراہ قراقرم پر تمام پل چینی طرز کے ہیں۔ ان معلق پلوں پر چینی شیروں کے سنہری مجسمے بنے تھے۔ مقامی پورٹر اور گائیڈ ہنر بیگ نے راستے میں اہم مقامات کے بارے میں معلومات دیں۔ گلمت کا مطلب پھولوں کا باغ ہے۔ وہاں سے افغانستان کی طرف بہت سے راستے جاتے ہیں۔ پسو گاؤں میں ہوٹل میں سامان رکھنے کے بعد ہنر بیگ کا گھر تلاش کرتے ایک لمبے چوغے اور رنگ دار چوکور ٹوپی میں مقامی خاتون نظر آئی جس کے نقوش چینی تھے۔ ہنر بیگ کے گھر دو تین کمروں کے بعد بل کھاتے کشادہ کمرے میں چھت پر چوکور روشن دان تھا۔ اس کے گرد لکڑی کے چار ستون تھے۔ ایسے کمرے سطح مرتفع پامیر، قراقرم، ترکستان اور واخان راہداری میں بسنے والے سیکڑوں سال سے شدید سردی سے بچاؤ کی خاطر استعمال کرتے ہیں۔ چوکور آتشدان کے گرد سب اہل خانہ بیٹھتے ہیں، آرام کرتے ہیں۔ ایک طرف مرد اور دوسری طرف عورتیں اور بچے۔ آتشدان کا دھواں چمنی کے ذریعے روشندان سے باہر نکالا جاتا ہے۔ پاکستان کی اہم چوٹیوں کو سر کرنے والے اشرف امان، نذیر صابر بھی عام پورٹرز کی طرح رہنے پر مجبور تھے۔ انھیں ہیرو کا درجہ نہیں دیا جاتا۔ کوہ پیمائی مشکل کھیل ہے مگر اسے پاکستان میں اتنی اہمیت نہیں دی جاتی جتنی بقول ہنر بیگ زنانہ کھیلوں کرکٹ اور ہاکی وغیرہ

کو دی جاتی ہے۔ماسٹر حقیقت نے بتایا کہ باہر والے گوجال کے علاقے کو بھی ہنزہ میں شمار کرتے ہیں حالانکہ ان کی زبان واخی بالکل مختلف ہے۔ان کی رسوم وروایات بھی ہنزہ سے الگ ہیں۔[11]

شیسپر ویو ہوٹل کے مالک عظیم کا کہنا تھا ایک زمانے میں پسو میں جرم کرنے والوں کو سزا کے طور پر کسی دور کی وادی میں بھیجا جاتا وہ اپنا ہل بیج اور کھیتی باڑی کا سامان ساتھ لے جاتا اور وہاں جا کر ایک کھیت بنا کر رہنے لگتا۔اس طرح کئی وادیاں آباد ہوئیں۔[12] پسو میں غیر ملکی کوہ پیماؤں سے خریدے رک سیک کھیتوں سے چارہ لانے اور سامان ڈھونے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔وہاں مقامی نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اپنے علاقوں میں کھیتوں سے چارہ لانے جیسے کاموں کو عار نہیں سمجھتے۔

کنجوت کا نام بدل کر بلتت پھر کریم آباد رکھا گیا جو ہنزہ کا صدر مقام ہے۔وہاں بکثرت باہمی شادیوں کی وجہ سے بہت سے بچے ذہنی طور پر تندرست نہیں ہوتے۔"ہنزہ ان" کے نزدیک سارے دن میں سڑک سے دو تین جیپوں، پانچ سات سیاحوں اور چند مقامی باشندوں کا گزرنا تھوڑی بہت ٹریفک تھی۔اہل ہنزہ کی قابل رشک صحت کا راز معدنیات کی آمیزش والا پانی سمجھا جاتا ہے۔وہاں نہر کے اوپر شہتیر رکھ کر ٹوکریاں باندھ کر پانی میں ڈبوئی تھیں۔ان ٹوکریوں میں بوتلیں وغیرہ رکھ کر ٹھنڈی کی جاتی تھیں۔وہ ان کا فریزر تھا۔ہنزہ میں باہر کے لوگوں کا جائیداد خریدنا پسند نہیں کیا جاتا تھا:

> "ہنزہ مین زمین اور جائیداد صرف مقامی باشندوں کے مابین ہاتھ بدلتی ہے اور وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ باہر سے تجارت پیشہ لوگ آکر ان کی وادی کو ایک تجارتی منڈی بنا کر وہاں کاروبار شروع کر دیں۔"[13]

کسی زمانے میں ہنزہ کے گھوڑے اور پولو کے کھلاڑی بہت مقبول تھے۔پھر نئے زمانے کے ساتھ سڑکوں کی تعمیر سے لوگوں نے پولو کے گھوڑے بیچ کر جیپیں خرید لیں۔پولو کے میدان اب بھی موجود ہیں مگر صرف تقریبات کے انعقاد کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔اہل ہنزہ کی خاص خوراک خوبانی ہے۔تازہ ہوں پھل کے طور پر، پھر سکھا کر آٹا پیس کر روٹی بناتے ہیں، خوبانی کی گری کے تیل سے روغن بناتے ہیں۔پہلے وقتوں میں اس سے نیم نشہ آور مشروب بھی تیار کیا جاتا تھا۔ہنزہ میں تمام گھروں کے ساتھ برفانی نہریں بہتی ہیں جس میں سے حسب ضرورت گھر کے اندر باغ اور غسل خانے تک پانی پہنچانے کا انتظام تھا۔ان نہروں کی ہفتہ وار صفائی کی وجہ سے ہنزہ کے راستوں گلیوں میں ریت دکھائی دیتی ہے۔بلتت میں ہر جگہ ان برفیلی نہروں کے چلنے اور ان میں سے نکلنے والے آبی راستوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ہنزہ کی خواتین سیاحوں کو نظر انداز کیے کھیتوں میں کام میں مصروف رہتی تھیں۔روایتی لباس میں ملبوس، لمبا گھیر دار چوغہ، رنگین شلوار اور سر پر رنگ برنگی کڑھائی والی چوکور ٹوپی جس پر پنوں کی مدد سے دوپٹے کو لگایا جاتا تھا۔یہ ٹوپی صرف عمر

رسیدہ عورتوں کے سر پر نظر آئی نوجوان نسل اسے ترک کر رہی ہے۔ ہنزہ کی عورت مشقت کی عادی اور پر اعتماد تھی سر اٹھا کر چلتی تھی۔[14]

عورتوں کی طرح مرد بھی ہنزہ میں بیکار نہیں رہتے۔ وہ معاشرتی ذمہ داریوں کو اپنے فرائض میں شامل کرتے ہیں۔ جیسے راہ چلتے کسی کے کھیت کے گرد بنی پتھر کی دیوار میں چند پتھر ادھر ادھر ہوں تو اٹھا کر رضاکارانہ طور پر ٹھیک کر دیتے ہیں۔ دوسروں کا کام بانٹ لیتے ہیں۔ ہنزہ کا حسن قدرتی ہے لیکن اس کی خوشحالی یہاں کے باشندوں کی محنت اور تنظیم کی بدولت ہے۔ نگر میں یہی آب و ہوا اور یہی حالات ہیں مگر وہ اہل ہنزہ کی طرح محنتی نہیں اس لیے خوشحالی نہیں۔[15]

پولو گراؤنڈ کی طرف جاتے ایک جگہ سایہ دار درختوں کے نیچے متعدد پتھر رکھے تھے جو اہل ہنزہ کا ڈرائنگ روم کہلاتا ہے۔ اکثر بوڑھے یہاں بیٹھ کر گپیں ہانکتے ہیں۔ پرنس کریم کے لیے اہل ہنزہ کی عقیدت ان کے گھروں اور دکانوں میں آویزاں تصاویر سے نظر آتی ہے۔ اہل ثروت حضرات اپنے گھروں میں ایک کمرہ مسجد کے لیے مخصوص کرتے ہیں۔ اہل ہنزہ کی کشادہ دلی اور مذہبی رواداری حیران کن ہے۔ ہنزہ میں کسی بھی شخص کو سلام کیے بغیر ہاتھ ملائے بغیر گزرنے کا رواج نہیں ہے۔ ہنزہ کا وہ ڈرائنگ روم مقامی مرکز اطلاعات کا کام دیتا تھا۔ التر گلیشیر اور قلعے کی طرف جانے والے سیاح ادھر سے ہی گزرتے اس لیے مقامی بوڑھوں کو سب خبریں ملتی رہتیں۔

بلتت قلعے کی دیواروں کی چنائی اینٹوں کی بجائے متعدد شہتیر چٹان میں گاڑ کر ان کے اندر پتھر اور مٹی کی بھرائی سے کی گئی۔ ہنزہ کے بچے مشکل پر خطر راستوں پر بھی با آسانی اچھلتے کودتے نظر آتے ہیں وہاں ایک مقامی کہاوت ہے:

> "ایک مقامی کہاوت کے مطابق ہنزہ کی ماں یہ کبھی نہیں کہتی کہ بچو ادھر مت جاؤ وہاں کھائی ہے، اس چٹان پر نہ چڑھو گر جاؤ گے کیونکہ جن بچوں نے گرنا تھا وہ گر چکے اور اب وہ بچے پیدا نہیں ہوتے جو بلندیوں سے نیچے گر سکتے ہیں۔"[16]

ہنزہ کی ساری آبادی باہمی شادیوں کی بدولت آپس میں کسی نہ کسی رشتے میں منسلک ہے۔ وہاں بجلی صرف رات نو بجے تک ہوتی تھی۔ ہنزہ کی خاص چیز ڈاؤ ڈاؤ سمجھی جاتی ہے جو مقامی سوپ ہے۔ ہنزہ میں صرف بے وقوف اور سیاح سیب خریدتے ہیں ورنہ کسی باغ کے باہر کھڑے ہو کر مانگ لیں مفت مل جائیں گے۔ ہنزہ کے لوگوں نے بہت مشقت سے التر گلیشیر میں سے کُل نکالے۔ وہ شہتوت کی ٹہنیوں سے بنی ٹوکری میں بیٹھتے اور ان کے ساتھ انھیں یاک کے بالوں سے بٹے رسے سے باندھ کر چٹان کی چوٹی سے لٹکا دیتے وہ اسی طرح لٹکے ہوئے مارخور کے سینگوں کے ساتھ چٹانوں کو کرید کر نہریں بناتے تھے۔ بڑے کُل سے چھوٹی کئی کُل نکال کر گھروں اور کھیتوں تک لے جائی جاتیں۔ ان کی حفاظت اہل ہنزہ بالکل اپنے گھروں کی طرح کرتے ہیں۔ لوگوں نے اپنے اپنے علاقے بانٹ رکھے ہیں وہ اپنے علاقوں

سے گزرتے قل کا دھیان رکھتے ہیں، صفائی کرتے ہیں، ریت نکالتے ہیں، کناروں کی مرمت کرتے ہیں۔ یہ سب وہ رضاکارانہ طور پر کرتے ہیں۔[17]

ہنزہ میں نئی نسل میری نظام کی شدید مخالف تھی جبکہ بوڑھے اسے پسند کرتے تھے کہ پہلے جھگڑے مقامی طور پر نمٹا لیے جاتے تھے اب پولیس عدالتوں کے چکر شروع ہو گئے ہیں۔[18] ایک جگہ ایک مقامی بوڑھا چار گھنٹے پتھر اٹھاتا تھا اور ایک گھنٹہ آرام کرتا تھا۔ اس 82 سالہ بوڑھے نے 30 کلو وزنی پتھر آرام سے اٹھالیا تھا۔ علتت میں لمبی دم والے مقامی پرندے غشپ کا ذکر مصنف نے کیا ہے۔ ایک مقامی عورت نے اپنی ہنڈیا کو قل کے کنارے ایک چھوٹے گڑھے میں رکھ کر اسے ڈھانپ دیا تھا وہ اس کا ذاتی فریج تھا جو قل کی موجودگی میں خوراک کو محفوظ رکھتا تھا۔ بازار سے ایک پتھر کی ہنڈیا خریدنے پر دکاندار نے مصنف کو مشورہ دیا کہ یہ کچا پتھر ہے احتیاط سے استعمال کریں تو مصنف نے اس کے بارے میں یہ رائے قائم کی۔

"اہل ہنزہ کی اکثریت کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی لالچ کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ درست قیمت لے کر درست مشورہ دے رہا تھا۔"[19]

سفر شمال کے (1986ء)، مستنصر حسین تارڑ

سوات اور درہ خنجراب کا سفر مستنصر حسین تارڑ نے اپنے اہل خانہ کے ہمراہ 1986ء میں کیا۔ سوات میں مستنصر حسین تارڑ کو شنکر در سٹوپا کے آس پاس پتھر کا ایک ٹکڑا ملا جو دراصل بدھ کی اندراسالا کی کہانی تھی جو بدھ اور دیوتا اندر سے متعلق ہے۔ وہ ٹکڑا پونے دو ہزار سال قدیم تھا۔ سوات میں بیشتر مساجد کو جدید کیا جا رہا ہے پہلے آٹھ فٹ بلند منقش ستونوں پر چھت ڈالی جاتی تھی اب ستون نکال کر لینٹر کی چھت ڈالی جاتی ہے۔ یہ قدیم منقش ستون اور سواتی فن غیر ملکی سیاحوں کی بدولت یورپ اور امریکہ منتقل ہو گیا۔[20]

مصنف نے سوات کی اہمیت بتاتے ہوئے دیگر ادیبوں اور غیر ملکی سیاحوں کی سوات سے متعلق آرا اپنے سفر نامے میں شامل کی ہیں۔ تاریخی طور پر سوات بہت طاقتور رہا ہے۔ ٹیکسلا کے پتھروں سے اب مجسمے نہیں تراشے جاتے بلکہ گملے اور کونڈیاں تیار ہوتی ہیں۔ گندھارا میں بدھ ازم تیسری صدی قبل مسیح میں آیا۔ گندھارا مجسموں پر یونانی اثرات ہیں لیکن گندھارا کے تراشتہ مجسموں میں تفصیل بہت ہے یہاں ناخن جتنے پتھر سے شاہکار تخلیق کیے گئے جبکہ یونانی بہت بڑے اونچے مجسمے بناتے تھے۔ ٹیکسلا کے ماضی میں آباد تینوں شہروں کے بارے میں مصنف نے معلومات دی ہیں۔ ٹیکسلا کی درسگاہوں میں قانون، تاریخ، فلسفہ وغیرہ کے علاوہ ہاتھیوں پر سواری کا فن بھی پڑھایا جاتا تھا۔[21]

کنند کے مقام پر مصنف کو پتھر کے بنے بے شمار گھر نظر آئے۔ نوشہرہ بڑا شہر تھا۔ درہ مالاکنڈ پر ایک موڑ پر ایک دکاندار سڑک پر کھڑا ہو کر دکانداری کر رہا تھا۔ اس کی دکان اوپر چٹان پر تھی۔ مطلوبہ چیزیں لینے اسے چٹان تک جانا پڑتا تھا۔ مالاکنڈ ٹاپ پر انگریزوں کے زمانے کا ایک قلعہ تھا۔ بٹ خیلہ بڑی آبادی والا وسیع قصبہ تھا۔ سوات میں جنگلی گلاب جابجا تھے۔ لنڈاکے علاقے میں قبروں پر لوگ خود پھول اگاتے ہیں اس عقیدے کے تحت کہ یہ مرنے والے کے لیے دعا کرتے ہیں اور جب کوئی قبرستان کے قریب سے گزرے تو پھولوں کو دیکھ کر مرنے والے کے لیے دعا کرتا ہے۔ خالی قبر دیکھ کر کوئی نہیں رکتا پھول دیکھ کر رکتے ہیں۔[22] سوات کے قصبے بری کوٹ اور اودے گرام کے یونانی نام بزیرہ اور اوراتھے۔ 327 قبل مسیح میں سکندر اعظم نے بذات خود ان قلعوں کا محاصرہ کیا تھا۔

مینگورہ شہر کی سعت دیکھ کر مصنف کو تعجب ہوا۔ پامیر ہوٹل کے مالک نے مصنف کو کہا آپ ہمارے مہمان ہیں کرائے کی فکر نہ کریں۔ وہاں ایک کیفے کا نام "کہکشاں کیفی" پختونوں کی مذکر کو مونث بنانے کی مثال تھا۔ بت کدہ کا نیا نام گل کدہ تھا۔ بت کدہ کہہ کر راستہ پوچھتے تو مقامی لوگ برا مناتے۔ مقامی بچے انگریزی میں پیسے مانگ رہے تھے۔ یہاں 2300 برس قدیم اشوک اعظم کا تعمیر کردہ معبد تھا جس میں ایک بڑا سٹوپا اور چالیس چھوٹے سٹوپے تھے۔ سٹوپوں میں دراصل مہاتمابدھ کی خاک دفن ہوتی ہے اور ان کے گرد آویزاں مجسموں پر مہاتمابدھ کی زندگی کے مختلف ادوار بیان کیے جاتے ہیں۔ انھیں بدھ کی زندگی کی پتھریلی کتاب کہا جاسکتا ہے۔[23]

اطالوی مشن نے 1956ء سے 1961ء تک بت کدہ کو کھودا تو بہترین اور مکمل مجسمے اپنے ساتھ لے گیا باقی چند ایک سوات میوزیم میں ہیں۔ مرغزار والی سوات کا گرمائی محل تھا۔ والی سوات کا ذکر مقامی لوگ بہت محبت سے کرتے تھے:

> "لیکن سوات میں میں نے ایک عجیب بات دیکھی، وہاں کے لوگ اپنے والی کو محبت کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ وہ ایک داستانوی شخصیت بن چکے ہیں اور ان کے حسن عدل کے قصے زبان زد عام ہیں۔"[24]

مینگورہ میں بجلی کی تاروں پر سفید ابابیلیں بکثرت بیٹھی تھیں۔ سوات میں سیاحوں میں پرانے سامان کی بڑھتی مانگ کی وجہ سے دکاندار دور دراز علاقوں میں پرانے سامان کے بدلے نیا فروخت کر کے کئی سو برس پرانا گھریلو سامان منہ مانگے داموں سیاحوں کو فروخت کرتے ہیں۔ میاندم میں لوگ صبح سویرے آلو کے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ وہاں ایک گنہگار نامی پہاڑ تھا۔ لوگ خوش حال تھے۔ ایک گھر میں شادی کی تیاری کے لیے خواتین دیوار پر بیل بوٹے بنا رہی تھیں۔[25]

ایک مقامی قبرستان میں جگہ جگہ لکڑی کے منقش پائے گڑے ہوئے تھے۔ یہ پایہ نمانشان خزی کہلاتے ہیں۔ یہ اس دور کی یاد دلاتے ہیں جب یہاں مظاہر فطرت کی پرستش ہوتی تھی۔ اسے خصوصی سرخ لکڑی سے بنایا جاتا تھا

جس پر بارش اور برف زیادہ اثر نہ کرے۔ سوات میں یہ محاورہ عام ہے کہ اصل سوات تو کالام کے بعد شروع ہوتا ہے۔ بحرین میں سیاحوں کی زیادتی سے مہنگائی بڑھنے پر مصنف نے دکھ کا اظہار کیا ہے:

"۔۔۔لیکن مجھے بحرین کے اس کمرشلزم پر سکھ ہوا اور یہ کمرشل رویہ ہر جگہ موجود تھا دکانوں میں، ہوٹلوں میں اور لوگوں میں۔"[26]

بنک کے سامنے کار پارک کرنے پر ایک شخص نے یہ جگہ میری ہے کہہ کر پارکنگ کے پانچ روپے لیے۔ بحرین کے بعد شروع ہونے والے کوہستانی علاقے سے خطرناک کہانیاں وابستہ ہیں۔ لائی کوٹ میں قدیم ستونوں والی لکڑی کی مسجد تھی جس کے صحن میں قبرستان میں چوبی صلیب نما کتبے تھے۔ سوات کے علاقوں میں رواج ہے کہ بلندی سے آنے والی تمام ویگنیں، جیپیں گاڑیاں چیڑھ اور دیودار کی ٹہنیوں سے ڈھکی ہوتی ہیں یہ ایک قابل فخر علامت سمجھی جاتی ہے کہ ہم اونچائی پر جنگلوں سے آرہے ہیں۔[27] کالام میں مصنف کو خاندان کے ہمراہ ہونے پر کوہستانی لوگوں کے بارے میں ڈرایا گیا۔ وہاں دکانوں میں بندوقیں اور کارتوس عام بک رہے تھے۔ مقامی دکاندار نے کالام کی خطرناکی کے حوالے سے کہا:

"قسم سے یہ ہم کو بدنام کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ آپ اگے جاؤ اشو، گبرال کہیں بھی جاؤ کوئی خطرہ نہیں۔ چند سال پہلے ایک چھوٹا سا مسئلہ ہوا تھا لیکن اس میں بھی مقامی لوگ ملوث نہیں تھے۔"[28]

کالام کی قدیم مسجد کی لکڑی کی چھت تبدیل کر دی گئی۔ مصنف نے اس کی قدامت بحال کرنے پر زور دیا۔ مالم جبہ میں آسٹرین حکومت کے تعاون سے ایک سکی انگ مقام بن رہا تھا۔ تب مالم جبہ ویران تھا صرف ایک ہوٹل کا ڈھانچہ اور بھاری مشیری تھی۔ مصنف نے سکی ریزورٹ کی تعمیر کے حوالے سے خدشات کا اظہار کیا کہ شاید یہ منصوبہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو۔ جہان آباد کی چٹان پر بدھ سٹوپا کے معجزاتی طور پر ظہور میں آنے کی روایت ہے۔ اودے گرام اور گوگرہ میں آثار قدیمہ کی کھدائی کا کام جاری تھا۔

اسی کتاب میں شامل دوسرا سفر درہ خنجراب کا ہے۔ اس کی ذیل میں مانسہرہ کے حوالے سے مصنف کا کہنا ہے کہ یہ ایک کراس روڈ ہے جہاں سے خوب صورت مقامات کے لیے راستے جدا ہوتے ہیں۔ مصنف نے مانسہرہ سے مظفر آباد، گڑھی حبیب، بالاکوٹ کے راستوں کے بارے میں جغرافیائی معلومات دی ہیں۔ مانسہرہ جیسی خوبصورت وادی کے گیت سیاحوں نے نہیں گائے، نہ یہاں سیاحوں کی یلغار ہوتی ہے حالانکہ خوبصورتی میں یہ بے مثال ہے۔ تھاکوٹ کے نزدیک ایک چٹان پر سکندر اعظم کے قلعہ فتح کرنے کی روایت ہے۔ تھاکوٹ سے اصل شاہراہ ریشم کا آغاز ہوتا ہے۔ اب بشام پر رونق علاقہ تھا۔ مصنف نے بتایا ہے کہ پچھلے سفر کے دوران تین برس پیشتر یہ ایک ویرانہ تھا۔ بشام سے داسو تک شاہراہ قراقرم بہت بل کھاتی ہے اس لیے ڈرائیونگ مشکل ہے۔ آگے نسبتاً آسان ہے۔ شاہراہ قراقرم کی دیکھ بھال

پر مامور سپاہیوں کے پنجابی ہونے کی بنا پر اس پر سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان پنجابی ہے۔[29] دریائے سندھ کے کنارے سونا نکالنے والوں کے رہنے کی وجہ سے ایک گاؤں کا نام ہی سونے وال ہے۔

نلتر کے راستے میں مقامی جیپ ڈرائیور نے انجن گرم ہونے سے بچانے کے لیے ندی کنارے کی گیلی گھاس کو انجن کے گرد لپیٹ دیا۔ نلتر میں لوگ کم جاتے تھے۔ یہاں پی ای ایف کا ٹریننگ سنٹر اور سکی انگ سنٹر موجود ہے۔ نلتر میں اکلوتا ہوٹل پرنس ہوٹل دو کمروں پر مشتمل تھا جو نلتر کے باسیوں کا میٹنگ پوائنٹ تھا ائیر فورس والوں نے ایک جگہ دو مارخور رکھے ہوئے تھے جن کے سینگوں کی خوب صورتی مبہوت کر دینے والی تھی۔ بلتی شاعری میں مارخور کے سینگوں کا ذکر اکثر ملتا ہے۔[30] نلتر ریسٹ ہاؤس میں نلتر نالے پر قائم دیسی بجلی گھر سے بجلی آتی تھی اس لیے فالتو بلب بھی جلتے رہتے تھے۔ چوکیدار کا کہنا تھا ادھر بجلی زیادہ ہے بلب کم ہیں۔ ہنزہ میں نسل در نسل شادیوں کے نتیجے میں خاصے لوگ ذہنی طور پر پسماندہ رہ گئے ہیں۔ گنیش میں ہنزہ کی مقدس چٹانیں ہیں جن پر قبل از تاریخ کے مصوری کے شکار کے مناظر اور جانور کھدے ہوئے تھے۔ پسو کے ماسٹر حقیقت ایک ہمہ جہت شخصیت، واخی زبان کے ماہر اور آلو اگانے والوں کی ایسوسی ایشن کے صدر ہیں۔ غل کن کے قصبے میں چھوٹی سی لائبریری میں مصنف کو اپنی کتاب دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ پسو میں بتورا گلیشیر کے ٹکڑے پگھل کر دریا میں آتے ہیں جہاں سے مقامی لوگ اس برف کو پکڑ کر پانی ٹھنڈا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ پسو میں اگنے والی ایک بوٹی اور پتوں کو ابال کر گرم گرم پیا جاتا ہے اسے چومورو کہتے ہیں۔ جو خوراک ہضم کرنے کے لیے مفید ہے۔[31]

شمشالی نوجوان نے مصنف سے ملاقات میں شمشالیوں کی مصیبتوں کا ذکر کیا کہ سڑک نہ ہونے سے انھیں بہت مشکل ہوتی ہے۔ کوئی بیمار ہو تو تین دن اسے شاہراہ تک لانے میں لگتے ہیں۔ لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت پسو سے شمشال کی طرف سڑک کی تعمیر شروع کر رکھی ہے۔ پسو گلیشیر کے دامن میں ایک گمنام جھیل کے لیے ماسٹر حقیقت نے تارڑ جھیل کا نام تجویز کیا۔ ماسٹر حقیقت پسو کو سیاحوں کا مرکز بنانے، یہاں کی ترقی اور یاکوں کا فارم ہاؤس بنا کر یاک کارواں چلانے کے خواب دیکھتے تھے۔ پسو گاؤں کی چراگاہ بتورہ گلیشیر کے دامن میں ہے۔ اس کا نام ویزوک یرت ہے۔ دوسری چراگاہ یاش یرت اور تیسری کوک ہل ہے۔ یاک انھی علاقوں کا باشندہ ہے مگر ماضی میں سنکیانگ اور پامیر سے درآمد کیا جاتا تھا۔ ماسٹر حقیقت کے گھر میں برآمدے میں یاک کے بالوں کے غالیچے بچھے تھے۔ ان کی معمر والدہ ہنزہ کے روایتی ملبوس اور سر پر رنگین ٹوپی پہنے تھیں۔

مصنف کے اس سفر کے زمانے سے کچھ عرصہ پہلے غیر ملکی سیاحوں کو بتورا برج سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ بتورا گلیشیر کی رنگت سیاہ ہے۔ گلیشیر کے سامنے کے حصے میں ریت اور پتھر جمع ہونے سے اس کی رنگت سیاہ ہوتی ہے۔ سوست میں نئے تعمیر شدہ ہوٹل کے حوالے سے مصنف کا کہنا ہے:

"۔۔۔دائیں ہاتھ پر ایک نو تعمیر کردہ ہوٹل نظر آتا تھا۔ سیاحوں کی آمدورفت کی وجہ سے حکومت ان علاقوں کے مکینوں کو بڑی فراخدلی سے تعمیری قرضے فراہم کر رہی ہے تاکہ وہ ہوٹل اور ریستوران وغیرہ بنالیں۔"[32]

درہ خنجراب کے راستے میں خنجراب نالے میں پانی چڑھنے کے باعث شاہراہ قراقرم کا حصہ بھی خاصا ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ پچھلے پہر یہ علاقہ جھیل میں بدل جاتا تھا اسے پار کرنے کے لیے یہاں چند کشتیاں بھی موجود تھیں۔ خنجراب نالے کے کنارے خانہ بدوشوں کی بستی تھی۔ خنجراب نیشنل پارک میں مصنف کو یاک اور مارموٹ نظر آئے۔ واپسی پر ماسٹر حقیقت کے ہاں کھانے میں ترکستان کی مہمان نواز روایت کا ذائقہ تھا۔ شمالی علاقوں میں زیادہ تر آبادیاں یا کسی دریا کے کنارے واقع ہوتی ہیں یا کسی گلیشیر کے اختتام پر جہاں پانی کی فراوانی ہو۔ قمریس ایک برفانی تودے کے پاس بلند قصبہ تھا۔ وہاں ہنزہ گوجال کے واحد فنکار سے مصنف کی ملاقات ہوئی۔ قمریس میں موسم کی شدت سے بچاؤ کے لیے بند ڈربہ نما مکان ساتھ ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ ایک مقامی مخصوص ترکستانی طرز کے گھر کی تعمیر کے بارے میں مصنف بتاتے ہیں:

"نور امان گوجال کے مخصوص ترکستانی طرز کے گھر میں رہتا تھا۔ دو تین دروازوں کے اندر برفیلی ہواؤں سے بچاؤ کے لیے کھڑکیوں اور روشندانوں کے بغیر چوبی ستونوں والا ایک بڑا کمرہ جس کے ایک حصے میں خوراک پکائی جاتی ہے۔ ایک حصے میں مہمانوں کو بٹھایا جاتا ہے اور ذرا بلند حصہ سونے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔"[33]

روایتی مہمان نوازی کے طور پر پہلے مہمان کے ہاتھ دھلائے جاتے ہیں۔ قمریس میں کمرشلزم نہ ہونے کی وجہ سے مہمانداری کی قدیم روایات باقی تھیں۔

ہنزہ میں التت قلعے کی ٹکٹ کی قیمت مصنف کو بہت زیادہ لگی کہ وہ غیر ملکی سیاحوں کو مدنظر رکھ کر طے کی گئی۔ ہنزہ میں اب غیر ملکیوں پر زیادہ توجہ دی جاتی۔[34] ہنزہ اور نگر کا تقابل کرتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے یہاں سیاح کم آتے ہیں۔ نگر کے شیعہ مسلمان زیادہ بنیاد پرست ہیں۔ ایک جگہ نگر کے حاجیوں کو جلوس کی صورت واپس لایا جارہا تھا۔ ہسپر گلیشیر کے قریب ہلٹن ان میں ایک رات گزارنے کے لیے چارپائی اور سلیپنگ بیگ تیس روپے میں مہیا کیا جاتا تھا۔[35]

التر گلیشیر کے راستے میں ایک بوسیدہ کمرے میں مقامی شخص نے مارخوروں کو شکار کر کے بھس بھر کے رکھا ہوا تھا۔ شام کے وقت گھروں میں چھتوں پر سوکھتی خوبانیوں اور شہتوتوں کو اکٹھا کر کے روشندانوں سے نیچے کمروں میں فرش پر بچھی چادروں پر پھینکا جاتا تھا۔ آغا خان کی تاجپوشی کی سالگرہ ہنزہ میں خاصے اہتمام سے منائی جارہی تھی۔ بازاروں، گھروں جماعت خانوں میں خوب سجاوٹ تھی۔ اس جشن میں چراغاں کرنے کے لیے مختلف ٹیمیں تیل اور پرانے کپڑے لے کر صبح سویرے بلندیوں پر جاتی تھیں۔ رات کے وقت چراغاں کا منظر بہت خوب صورت لگتا اور آگ کے گولے جو دور سے لڑھکتے نظر آتے دراصل ٹائروں کو آگ لگا کر بلندی سے لڑھکایا جاتا تھا۔[36]

چترال داستان (1989ء)، مستنصر حسین تارڑ

"چترال داستان" 1989ء میں مستنصر حسین تارڑ کے چترال کے اس سفر کا تذکرہ ہے جس کی یاد ان کے ذہن میں تازہ تھی، اسے کتابی شکل میں دیر سے پیش کیا گیا۔ اس سفر میں مصنف نے اپنے اہل خانہ کے ہمراہ گلگت سے درہ شندور عبور کر کے چترال اور کافرستان کا سفر اختیار کیا تھا۔ ٹھنڈیانی کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اس کی شہرت زیادہ ہے مگر شکل واجبی۔ شاہراہ قراقرم پر سندھ کنارے قدیم بستی پتن آباد ہے۔ اس کے قبرستان کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے یہ ہزاروں برس قدیم ہے۔ یہ باقاعدہ مذہب کی آمد سے پہلے مظاہر قدرت کی پرستش کرنے والوں کے قدیم دور کا ہے۔ کیونکہ یہاں اب تک منقش لکڑی کی ڈولیاں قبر پر رکھنے کا رواج ہے۔ جن کے نقش بہت بت پرست اور مظاہر پرست دکھتے ہیں۔[37] پتن کی وجہ شہرت ایک بوڑھی عورت کو ہزاروں سال قدیم ستره کلووزنی سونے کا ہار ملا تھا، جس پر عجیب و غریب نقش اور صورتیں کنندہ تھیں۔ اس کے ٹکڑوں پر مارخوروں اور اونٹوں کی شبیہیں نقش تھیں۔

گوپس کے راستے میں ایک گاؤں کا نام خاتون تھا۔ گوپس ایک تنگ نظر وادی تھی۔ مصنف شمالی دیومالا کو یکسر مسترد نہیں کرتے۔ ہوشے میں لوگ اب بھی مشابرم کی ہواؤں میں جنات اور پریوں کی صدائیں سنتے ہیں۔ گوپس میں دریائے اشکومن پر بلند ہوتے پہاڑ پر لکیروں کے بارے میں روایت ہے کہ ایک اژدھے کی ہیں جو ایک بلا تھی۔ بہت سال پہلے لمبی دم والی یہ عفریت اتر کر وادی میں آتی تھی اور ہر رات نوجوانوں کو ہڑپ کر کے واپس چلی جاتی تھی۔ ایک بزرگ نے اسے بھسم کر ڈالا، یہ لکیریں اس عفریت کی نشانیاں ہیں۔ مقامی لوگوں کے بقول انھوں نے بلندی پر بھیڑ بکریاں چراتے وقت عجیب و غریب بڑے جانوروں کی ہڈیاں دیکھی ہیں جو اب بھی موجود ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ آثار قدیمہ کی تحقیق کے لیے شمالی علاقوں کی اہمیت پر بہت زور دیتے ہیں کہ یہ ہڑپہ اور موہنجوڈارو سے زیادہ قدیم اور شاندار تہذیب کے حامل ہیں۔ امت کے قدیم قبرستان سے چرواہوں کو سکے اور نوادرات ملتے رہتے ہیں۔ ان آثار میں سونے کے زیورات، کنگن، بندے اور سونے کے چھوٹے چھوٹے پرندے شامل تھے۔ ہزاروں برس قبل لوگ یہاں اپنے عہد کی نشانیوں کے ساتھ قبروں میں دفن ہوئے۔[38]

وادیٔ یاسین تک تب صرف جیپ جاتی تھی۔ اس کے تقریباً چھ سال بعد مصنف پامیر واخان ٹریک کے دوران جب درہ درکوت پار کر کے وادیٔ یاسین سے گزر کر گوپس گئے تو یہاں بھاری ٹرک اور بسیں چلتی تھیں۔ چوڑی سڑک کے دونوں طرف سپر مارکیٹیں تھیں۔ جدید طرز تعمیر کے گھر اور اور ویڈیو گیم کی دکانیں تھیں۔ وادیٔ یاسین وادی ہنزہ کے ہم پلہ ہو چکی تھی۔ جبکہ پہلے وہاں صرف ایک مسجد، ایک مہمان خانہ، ایک قدیم حفاظتی مینار اور چنار تھے۔ یاسین

میں گوہر امان کے تاریخی قلعے کا تذکرہ کیا ہے۔ یہاں مہمان نوازی کی قدیم روایت کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے:

"مجھے ان خطوں کی مہمان نوازی کی یہ روایت بے حد بھلی لگی کہ خاتون خانہ ایک بڑا آفتابہ اٹھائے ایک چلمچی آپ کے آگے رکھتی ہے۔۔۔اور آپ کے ہاتھ دھلاتی ہے اور پھر جھک کر طعام کی جانب اشارہ کرتی ہے۔"[39]

دستر خوان پر موجود خوراک کا ذائقہ ازبکستان کی خوراک کے قریب تھا۔ براندس پل کے نیچے درکوت، تھوئی دریا اور یاسین دریا کا سنگم تھا۔ ان علاقوں میں نسل در نسل آپس کی شادیوں کی بدولت دیوانے موجود تھے۔[40]

وادیٔ پھنڈر تب تک اتنی مشہور نہیں ہوئی تھی اور بغیر تراش کے ہیرے کی مانند تھی۔ خلطی جھیل کے پانی شیشے کی طرح شفاف تھے اور اپنے پر جھکے منظروں کو منعکس کرتے تھے۔ یہ حادثاتی طور پر وجود میں آئی۔ 1989ء سے پہلے یہاں ساٹھ چولہوں کا گاؤں تھا۔ 1989ء میں سیلاب سے پہاڑ کے پتھروں نے دریا میں گر کر پہاڑ کا راستہ روک دیا تو گاؤں پانیوں کے نیچے چلا گیا۔[41] پنگل نامی گاؤں میں تمام لڑکیوں کے چہروں پر کالاش لڑکیوں کی مانند سرمے سے بنے نقوش تھے۔ چہروں پر یوں نقش و نگار بنانا کافرستان کی قدیم تہذیب کا حصہ ہے۔ یہ ان وادیوں کی بھی ثقافت میں شامل ہے۔ ان کے چہرے حنائی اور سیاہ رنگوں سے پینٹ شدہ تھے۔[42] پھنڈر میں مصنف کو کمرے کی کھڑکی ایک فریم شدہ تصویر کی مانند لگی۔ پھنڈر کو چھوٹا کشمیر بھی کہا جاتا ہے پھنڈر جھیل کے کناروں اور پانی میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔ ایک مقامی شخص کا کہنا تھا کہ وادیٔ پھنڈر کا میدان بائر کا میدان کہلاتا تھا جو کسی زمانے میں راجاؤں کی ملکیت ہوتا تھا۔ ٹیرو نامی گاؤں سے درد علی ٹریک کو راستہ جاتا تھا اور ہندرب جھیل تک بھی جہاں چترالی شہزادے خیمہ زن ہو کر پکنک مناتے تھے۔ درہ شندور سے پہلے بارست نامی جگہ کھارے پانی کا چشمہ ہے جس کا پانی ہاضم ہے اس کا ذائقہ سوڈے سے ملتا ہے۔[43] چترالی شہزادے ہنڈرب جھیل کے راستے میں جہاں پڑاؤ کرتے تھے اس مقام کا نام لنگر مشہور ہو گیا۔ لنگر سے شندور ٹاپ تیس فٹ کی مسافت پر تھا۔ وہاں صرف ایک قیام گاہ شندور ہٹ تھی۔ جہاں کی تصویر اتارنا بھی عام آدمی کے لیے منع تھا۔ شندور میں ہر جگہ سنہری گھاس تھی اور شندور جھیل تھی۔ شندور ہٹ جہاں کے لیے مصنف کی بکنگ تھی وہاں کے رکھوالے نے انتہائی حقارت سے کہا آپ لوگ یہاں چائے نہیں پی سکتے۔[44]

سوات سے کچی کہانی ٹریک سے گزر کر سرلاس پور نامی قصبے میں پہنچا جاتا ہے۔ جیپ ڈرائیور گلگت کا مقامی تھا وہ چترال کو اور ملک قرار دے رہا تھا اس لیے یہاں رہائش کی سہولتوں سے ناواقف تھا۔ ہرچین میں صوبیدار گل ولی خان نے مصنف کی میزبانی کی۔ ان کے سب بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور آغا خان فاؤنڈیشن جیسے اہم محکموں میں اہم عہدوں پر فائز تھے۔ شام کی چائے پر وہ چترالی مہمان نوازی کی فراخ دلی سے آگاہ ہوئے۔ وہاں یہ دستور ہے کہ مہمان کے لیے سجائی گئی میز کا کوئی حصہ اگر خالی رہ جائے تو میزبان اسے اپنی بے عزتی سمجھتا ہے۔ ناشتہ ہو یا شام کی چائے پوری میز کا

خوراک سے ڈھکا ہونا لازمی ہے۔ پھر بھی اہل چترال اپنی میزیں طویل رکھتے ہیں۔[45] رات کے کھانے میں بھی دم پخت کی مرغی، پنیر اور مکھن کی تیار کردہ روٹیاں، قیمے اور مقامی جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ پیزا نما شے، سلاد، مچھلی اور دیگر لوازمات تھے۔ ان کے آبائی قلعے میں اندھیری کوٹھریاں تھیں۔ ایک چھوٹے کمرے کی کچی چھت میں پوشیدہ شہتیر تھے۔ کمرے کی کچی دیواروں پر توڑے دار زنگ آلود بندوقیں لٹک رہی تھیں۔ دیواروں پر قدیم تصاویر تھیں۔ جن میں طویل چوغوں، لمبے بالوں اور کمر سے بندھی تلواروں والے بے ترتیب داڑھیوں اور یاک کی کھالوں میں لپٹے لوگ تھے۔ مصنف کو چترال کے خاص سفید رس بھرے شہتوتوں کا رس پیش کیا گیا۔[46] مستنصر نے سفرنامے میں مستوج کے قلعے کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ مستوج سے وادی بروغل کو بھی راستہ جاتا ہے۔ دریائے رامن پر کوراغ نامی پل پار کر کے آگے چترال کا علاقہ تھا۔ گلگت اور چترال کی لینڈ سکیپ کا فرق واضح کرتے مصنف کا کہنا ہے کہ گلگت میں سبزہ، آبشاریں، ندیاں باغ تھے۔ یہاں چترال میں خشک موسم، بیابانی اور چٹیل وسعت تھی۔ یہاں منظر پر شکوہ تھے۔ ان دنوں کے مزاج جدا جدا تھے۔ ترچ میر ایسا پہاڑ تھا جو چترال کی شناخت ہونے کے باوجود اس سے جدا لگتا تھا۔ وادیٔ اویری سے ترچ میر کی وادی کو راستہ جاتا تھا۔ مصنف نے ترچ میر کے سنے ہوئے قصے اپنے سفرنامے میں بھی شامل کیے ہیں۔ ایک قصے میں ایک کوہ پیما چوٹی فتح کرنے کے بعد ہوا سے پیچھے افغانستان کی طرف جا گرا۔ ان میں ترچ میر کے تابوت کا ایک قصہ مصنف کو بہت متاثر کن لگا۔

برانس سے آگے سڑک کنارے بابا سیار کا مزار تھا۔ جنھیں چترال میں بہت اہم مقام حاصل ہے۔ ریشین نامی گاؤں میں ورکشاپیں بکثرت تھیں۔ کوغزی مصنف کا سب سے دلپسند چترالی گاؤں تھا۔ وہاں ایک مختصر مسجد تھی جس کے صحن میں ایک چشمہ بہتا تھا۔ مسجد میں لکڑی کا دلکش کام ہوا تھا۔ کوغزی کو مصنف نے چترال کی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے۔ چیوپل کے پار چترال شہر تھا۔ دریائے چترال ریتلا گدلے پانی کا دریا تھا۔ شاہی بازار نے بھی مصنف کو مایوس کیا۔ اس کی جھلک مصنف اس طرح دکھاتے ہیں:

> "شاہی بازار بھی ایسا کچھ شاہی نہ تھا۔ وہاں افغانوں اور پٹھانوں کے خوانچے، سبزی کے ٹھیلے، پرانے کپڑوں کے ڈھیر اور چائے خانے تھے اور ویگن سٹینڈ تھے۔ دکانیں تھیں، کچھ ہوٹل تھے۔ ایک پولیس کانسٹیبل تھا اور اس تنگ بازار میں دندناتی فل سپیڈ میں لڑھکتی جیپیں اور ان سے بچتے راہگیر تھے۔ بازار میں جو چہرے تھے ان میں بھی اجنبیت اور کوئی کشش نہ تھی۔ موسم میں بھی کوئی خاص رنگ نہ تھا۔"[47]

چترال میں چترالیوں کی آرام طلبی کے بارے میں مقامی روایت ہے کہ اگر ایک چترالی ایک دن میں بیس روپے کما لے تو وہ سارے خرچ ہونے تک دوبارہ کام پر نہیں جاتا۔ بچت نہیں کرتا۔ چترال میں محنت والے سارے کام پٹھان اور افغان کرتے ہیں۔ چترالیوں کے فخر کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ کھوار بولتے ہیں اور اس دھرتی کے بیٹے ہیں۔ چترالی ثقافت پر بیرونی اثرات کم ہیں۔[48]

لواری اہل چترال کے لیے بیرونی دنیا سے رابطے کا سہولیات و ضروریات کے حصول کا واحد راستہ ہے۔ لواری سرنگ کا معاملہ ان کے لیے مذہبی تقدس کا حامل ہے جو ہر موسم میں انھیں باقی دنیا سے جوڑے رکھے۔ چترال میں پیپلز پارٹی کی مقبولیت کی وجہ لواری سرنگ کا بھٹو کی طرف سے آغاز تھا۔ اس لیے اکثر چترالی دکان داروں نے بھٹو یا بیگم بھٹو کی تصاویر آویزاں کی ہوتی ہیں۔[49] چترال اور گلگت کے درمیان مخاصمت ہمیشہ سے رہی ہے۔ چترال زبان و ثقافت کے حوالے سے خود کو برتر سمجھتا ہے اور گلگت کو غیر مہذب قرار دیتا ہے۔ قدیم وقتوں میں چترال پر امن تھا تب گلگت کی کوئی شناخت نہ تھی۔ چترالی سیون اپ چشمے اور درہ شندور کو اپنی ملکیت بتاتے ہیں جو آدھا چترال اور آدھا گلگت کا ہے۔ پولو ٹورنامنٹ میں بھی دونوں ٹیموں کا جوش دیدنی ہوتا ہے۔ درہ بروغل ہزاروں برس سے تہذیبوں کے میل جول کا سنگم رہا ہے۔ چترال میں بچھو بکثرت تھے۔

چترال کے قدیم قلعے میں ایک متروک شدہ رہائش گاہ تھی۔ قلعے میں ایک وسیع باغ تھا۔ جہاں چترال کے تمام سرکردہ افراد مدعو تھے، نئے ڈپٹی کمشنر کے اعزاز میں اہتمام تھا۔ گرم چشمہ کا شمار نامور چترالی بستیوں میں ہوتا ہے۔ وہاں ایک خوب صورت جھیل بھی ہے۔ راستے میں ایک خاندان گھوڑے پر سوار تھا۔ بھاپ اڑاتے گرم چشمے کے ساتھ ایک ہوٹل اور چند عمارتیں تھیں۔ مقامی شخص کے بقول کچھ عرصہ قبل یہ بہت آباد مقام تھا۔ یہاں سے افغان جنگ کے لیے ہتھیار فراہم کیے جاتے تھے۔ ہزاروں بدخشانی ہجرت کر کے دریا کے کنارے بستی آباد کر چکے تھے اب بیشتر اپنے وطن واپس چلے گئے۔[50]

گرم چشمہ میں ایک پرائم منسٹر ہاؤس موجود تھا جو کسی وزیر اعظم کی آمد پر ایک ریسٹ ہاؤس کو خصوصی طور پر ان کے شایان شان تبدیل کر کے وجود میں آیا۔ اس کے کمروں کے درمیان خالی سوئمنگ پول تھا جہاں گرم چشموں کے پانی کے پائپ آتے تھے۔ یہ عمارت اب جدید تہذیب کا ایک کھنڈر تھی۔ قالین پھٹ چکے تھے ٹائلیں اکھڑ گئی تھیں۔ چترال کے مقامی لوگوں کے دل میں اب تک متروک شدہ رائلٹی کا احترام موجود تھا۔ وہاں ضیافت پر بدخشانی اثرات واضح تھے۔ بدخشانی ٹراؤٹ، پنیر اور قیمے کی روٹیاں، مرغ اور مچھلی کے کباب، بدخشانی پلاؤ، روسٹ، خوبانیوں کا سالن اور شہتوتوں کا کیک تھا۔ دعوت کے بعد فنجان میں قہوہ پیش کیا گیا۔ وہاں بازار میں زیادہ کاروبار مجاہدین کے لیے بھیجے گئے بوٹوں اور جیکٹوں کا ہو رہا تھا۔ وہاں مختلف کرنسیوں کا لین دین بھی عام تھا۔ بدخشانی باقی افغانیوں سے یکسر مختلف اپنے جھونپڑوں کی دیواروں پر رنگا رنگ کپڑے چسپاں کر کے انھیں خوبصورت بناتے ہیں۔ مٹی کے فرش پر بدخشانی قالین بچھاتے ہیں۔ گھروں کو چھوڑتے وقت قالین لازمی ساتھ لے جاتے ہیں۔ کھانے کا بھی نفیس اہتمام کرتے ہیں۔ مقامی آبادی سے کم میل جول رکھتے ہیں۔ کسی لڑکی کا مقامی رشتہ آنے پر مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں۔[51]

چترال محل میں شکار شدہ جانوروں کے بھس بھرے سر اور سینگ آویزاں تھے۔ دیواروں پر پرانی تلواریں، ڈھالیں اور زرہ بکتر تھیں۔ قدیم تصویریں تھیں۔ مہتران چترال کا شجرہ نسب پیچیدہ تھا۔ اہل چترال کے نزدیک چترال کی اہم کشش کالاش کا ہونا بدقسمتی ہے کیونکہ اس طرح چترال کی قدیم تاریخ، زبان و ثقافت نظر انداز ہوتی ہے۔ اپنی تہذیب کے پس منظر میں جانے کے باعث چترالی کالاشیوں سے خار کھاتے ہیں۔ چترالی ادیب کے ہاں دعوت میں ان کی تواضع گھی میں چپڑی پنیر کی روٹیوں اور دیگر پکوانوں سے کی گئی۔ انھیں چترالی ٹوپیاں بھی تحفتاً دی گئیں۔

کافرستان کے سٹیج پر متروک خدا تھے۔ محمود ایرانی سیاح کی کتاب کو مصنف نے نصف حقیقت نصف فینٹسی قرار دیا ہے۔ آئیون کے خشک قصبے سے کافرستان کی وادیوں کو راستہ جاتا ہے۔ ان وادیوں میں ہر قسم کی مذہبی تبلیغ پر پابندی کے باوجود عیسائی اور مسلمان تبلیغ کرتے ہیں۔ یہاں لوگ قدرتی مظاہر کی پرستش کرتے ہیں، اپنے موسمی تہوار مناتے ہیں، سچ بولتے ہیں اور صوفیانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں سچ بولنے کی مستحکم روایت ہے۔ اگر کوئی کالاش مسلمان ہو جائے تو اسے کفر کے زمانے کے قرضہ جات سے بری الذمہ قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کالاش کو بیوی سے علیحدگی پر جو تاوان ادا کرنا پڑتا ہے مسلمان ہو جانے سے خود بخود کافر بیوی الگ ہو جاتی ہے تاوان ادا نہیں کرنا پڑتا۔ اسی طرح پادری بھی کالاشیوں کو شہروں میں اعلیٰ ملازمتوں کا لالچ دے کر مذہب تبدیل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

بمبوریت میں ندی کنارے سیاہ لکڑی اور پتھروں سے بنا ایک قدیم واچ ٹاور تھا۔ یہاں مٹتی ہوئی قدیم کافر تہذیب تھی۔ کالاش لڑکی اپنے روایتی ملبوس میں کھیتوں میں کام کرنے میں مگن تھی۔[52] چند بچے ایک دکان سے لالی پاپ اور چیونگم خرید رہے تھے۔ گاؤں میں گلیوں میں اخروٹ کے گھنے درخت بکثرت تھے۔ کافر لڑکی اپنے سنگھار کے لیے کنگھی اور آئینہ ندی کنارے کسی پتھر کے نیچے چھپا کر رکھتی ہے۔

یہاں بچوں کے نام رکھنے کے حوالے سے مصنف اپنا مشاہدہ بتاتے ہیں:

> "ان کفار میں ریت ہے کہ وہ اپنے بچوں کے نام قدرت کے مظاہر پر رکھتے ہیں۔ وہ کالاشی زبان میں "نرم گھاس" بھی ہو سکتے ہیں۔ "ندی کا پانی" بھی ہو سکتے ہیں اور اس میں تیرنے والی مچھلی بھی ہو سکتے ہیں۔ مینڈک اور سردہوا بھی مناسب ہے اور ان زمانوں میں جو بھی معروف شخصیت ہے اس کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔"[53]

شیخان دہ نامی گاؤں میں سرخ کافر تھے۔ وہاں ایک مقامی شخص نے بتایا کہ ان کے گھروں میں کفر کے ایام سے وابستہ قدیم پوشاکیں ہیں۔ وہ اب بھی کافر تہواروں کی آمد پر انھیں پہن کر رقص کرتے ہیں۔ بمبوریت تقریباً دس کلومیٹر طویل وادی ہے۔ اس کے گاؤں واوس، پہلوانده، شیخانده اور کندی مار مسلمان آبادی پر مشتمل ہیں۔ بتریک میں مسلمان اور کافر دونوں ہیں۔ ابنیش، برون، کراکال کفار کے گاؤں ہیں۔ لڑکیوں کی ہار سنگھار والی ندی کے پار کالاش کا

قدیم اور متروک شدہ قبرستان ہے۔ بمبوریت بازار سے آگے بہت سے شاندار ہوٹلوں کے ڈھانچے تھے۔ غیر ملکی سیاح یہاں سستے ہوٹلوں میں مہینوں رہتے کہ انھیں چترال کی مشہور چرس وہیں فراہم ہو جاتی تھی۔[54]

کالاشیوں کے شادی کرنے اور شادی ترک کرنے کے رواج بیان کرنے کے بعد مرنے کی رسوم بیان کی ہیں۔ بمبوریت کے مقامی مسلمانوں کا روزگار مکمل طور پر کالاش کافروں کا مرہون منت ہے۔ اس لیے ان سے محبت اور نفرت کا رشتہ قائم ہے۔ کالاش عورتیں کمر توڑ مشقت کرتی ہیں۔ کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ چارہ کاٹتی ہیں، کمر پر لاد کر گھروں تک لے جاتی ہیں۔ کھدائی اور گوڈی کرتی ہیں۔ کالاش لڑکیوں کی بکثرت تصویریں اترتی ہیں لیکن مفت نہیں بلکہ طے شدہ معاوضے کی ادائیگی پر کہ یہ ان کا روزگار ہے۔ برن گاؤں میں ڈربہ نما چوبی گھر تھے۔ کچھ مرد ٹوپیوں میں رنگ دار پر لگائے شہتیر کو آرے سے چیر رہے تھے۔ کالاش سیاہ لباس پہنتے ہیں۔ ان کے گھروندے سیاہ ہیں۔ سامان مختصر ہے۔ تخت پوش، پرانے پیڑھے، چوکیاں، لالٹین، کمبل نما بستر اور لکڑی کے برتن۔ کالاش لڑکیوں کے چوغے دیدہ زیب کڑھائی سے مزین تھے۔ گلے میں موتیوں کی مالائیں، بال مینڈھیوں میں گندھے اور گھنگھرو ٹانگے ہوئے۔ رخساروں پر زیبائشی تل تھے۔ کالاشی خواتین زیبائش کے لیے چولہے کی کالک، پرندوں کے پر سیپیاں وغیرہ استعمال کرتی ہیں۔ انھوں نے ہار سنگھار کے قدیم طریقے نہیں بدلے۔ جیسے پسو میں ایک مقامی عورت نے جڑی بوٹی کو بطور لپسٹک ہونٹ رنگنے کے لیے استعمال کیا تھا۔[55]

کافر عبادت گاہ کے باہر ہری شاخیں لٹکتی تھیں اور اوپر چوبی گھوڑوں کے سر۔ عمارت کے اندر کچا فرش تھا۔ شہتیروں پر کچھ نقش اور عبارتیں تھیں۔ قربان گاہ کی ریلنگ کے جنگلے پر شکار کے مناظر کی قدیم شکلیں کھدی تھیں۔ کالاشیوں میں مذہب کا اہم جز قربانی ہے۔ بمبوریت میں اب جدید تہذیب کے تماشے عام تھے۔ بشالی میں خواتین فرصت سے وقت اور فراغت سے لطف اندوز ہوتی ہیں کہ کھانا بھی پکا پکایا گھر سے آتا ہے۔ وہاں آگے ایک کالاش لڑکی بھیڑ بکریوں کی رکھوالی کر رہی تھی۔ کالاش رقص کا اہتمام روزانہ کسی نہ کسی گاؤں میں کیا جاتا ہے۔

مصنف نے کچھ عرصہ بعد اپنے ڈرامے کی شوٹنگ کے لیے پھر کالاش کا سفر کیا۔ تب درہ لواری کو صرف دن کی روشنی میں عبور کرنے کی اجازت تھی کیونکہ وہاں ڈاکو راج ہوتا تھا۔[56] موسم بہار کے میلے چلم جوشی کا آغاز کافرستان میں مئی میں ہوتا ہے۔ اس کا آغاز ڈھول کی تھاپ سے ہوتا ہے۔ ہر گھر کے دروازے کے باہر زرد پھولوں اور ہری بھری شاخوں کی سجاوٹ کی جاتی ہے۔ خواتین، مرد ڈھول والے ہر وادی میں جاتے۔ یہ تہوار تب تین دن تک جاری رہا تھا۔ کالاش قبرستان اب متروک ہو چکا ہے۔ پہلے لوگ تابوتوں کے سرہانے مردوں کے لکڑی کے مجسمے ایستادہ کرتے تھے۔ کچھ لوگوں نے جب انھیں چوری کرنا شروع کیا تو پھر یہ رواج ترک کر دیا گیا۔ کالاشیوں کے ہاں ایک دن مخصوص ہے جب وہ ایک دوسرے کی خوب بے عزتی کرتے ہیں، طعنے دیتے ہیں تاکہ دل کا میل صاف ہو جائے۔ یہاں بزرگوں کی

قبروں پر ایستادہ کرنے والے مجسموں کو شلوک کہتے ہیں۔ وہاں چھوٹے مارخور کا دن کو تامرو کہلاتا ہے۔ اس دن وہ لنگڑی بکری بناکر تخلیق کی نقل کرتے ہیں مگر خامیوں کا اعتراف بھی۔ وہاں سفید کوے کا دن بھی ہوتا ہے۔ ان کا ہر دن کائنات کی کوئی الجھی گتھی سلجھانے کا دن ہوتا ہے۔[57] کالاش ورزش کی طرح رقص کرتے ہیں۔ در حقیقت وہ تھکاوٹ دور کرنے کے لیے رقص کرتے ہیں۔ کالاش نکتہ نظر سے انگور کھانے کی نہیں پینے کی چیز ہوتے ہیں۔ ان سے رس کشید کرنے کے لیے انھیں لکڑی کے ٹب میں انڈیلتے ہیں۔ پھر پاؤں سے مسل کر رس چھلکتا ہے جسے مشکیزے میں بھرا جاتا ہے۔

نانگا پربت بلتستان داستان (1990ء)، مستنصر حسین تارڑ

"نانگا پربت بلتستان داستان" مستنصر حسین تارڑ کے بلتستان کے تین سفروں پر مشتمل ہے 1985ء میں فیری میڈوز، 1989ء میں لاتوبو ٹاپ میدان اور 1992ء میں ہوشے، شگر اور دیوسائی تک کے سفر کا احوال اس کتاب میں شامل ہے۔

مستنصر کا کہنا ہے کہ دیامیر پریوں کی سرزمین بھی کہلاتی ہے۔ مقامی آبادی کا عقیدہ ہے کہ نانگا پربت کی چوٹی پر پریوں کی ملکہ رہتی ہے۔ مقامی داستانوں کے مطابق وہ برف کے قلعے میں رہتی ہے۔ لمبے لمبے برفانی سانپ اور مینڈک اس کی حفاظت پر مامور ہیں۔ ان علاقوں کی خواتین رنگ دار کپڑوں اور شوخ زیورات سے پرہیز کرتی ہیں کہ پریاں حسد میں آکر ان پر جادو کر سکتی ہیں۔[58] دیوسائی میدان کی برفیں پگھلنے کے بارے میں مصنف نے سفر نامے میں روایت بیان کی ہے کہ صدیوں سے بکروال اس میدان کی ہریاول کے لیے اپنے جانوروں کے ساتھ ادھر آتے ہیں، برف کی حد پر قیام کرتے ہیں اور اس کے پگھلنے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہیں جب وہ صدپارہ جھیل کے قریب اتر کر سکردو پہنچتے ہیں تو لوگ جان جاتے ہیں کہ دیوسائی کی برفیں پگھل گئی ہیں۔ بلتی اتنے دھیمے اور شریف الطبع ہیں کہ اپنے علاقے کی تعریف کرتے جھجکتے ہیں۔ اس لیے اس کے بارے میں کتابیں کم ہیں ہر کوئی شمال میں گلگت اور ہنزہ کا تذکرہ کرتا ہے۔ مقامی لوگوں کے بقول انھیں اشتہار بازی کا فن نہیں آتا۔ بلتستان کے بے توجہگی کا شکار ہونے ہونے کی وجہ شاہراہ قراقرم کا گلگت ہنزہ کی طرف ہونا ہے یہاں مشہور ہے بلتستان تین چیزوں کا نام ہے کے ٹو، سیاچن اور دریائے سندھ کا راستہ۔ کچھ اوروں کا کہنا ہے پریاں اور نمک والی چائے بلتستان ہے۔[59]

سکردو کی وادی میں بہت وسعت تھی گلگت تنگ تھی۔ سکردو شہر ایئر پورٹ سے کچھ فاصلے پر ہے۔ بیشتر عمارتیں یک منزلہ زمین کے ساتھ لگی تھیں۔ سکردو کے کالج میں میوزیم تھا جس میں بلتستانی ہتھیار، ظروف، زیورات اور ملبوسات سجے تھے۔ دور دراز کے مقامی طالب علموں کے تعاون سے اس میوزیم کا قیام عمل میں آیا تھا۔[60] سکردو

بازار خاصا طویل تھا۔ کے ٹو موٹل آوارہ گرد کوہ پیماؤں کے ملنے کی جگہ ہے۔ مقامی لوگوں کو سخت موسم سرما کا مقابلہ کرنے کے لیے پہلے اس کی تیاری کرنا پڑتی ہے جیسے لکڑیاں جمع کرنا، خوراک ذخیرہ کرنا وغیرہ۔ برف پگھلنے پر جب راستے کھلتے ہیں سیاح آتے ہیں تو تب اکثریت بلتی گائیڈ، پورٹر اور باورچی کا کام کرتے ہیں۔ اکثر بلتی ان تینوں کاموں میں ماہر ہوتے ہیں۔[61]

مصنف نے کچورا جھیل کو شنگریلا کے گاہکوں کے لیے مخصوص کیے جانے کو جھیل کو قید کرنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ بلتستان کی معروف شخصیت، ماہر تعلیم اور دانشور یوسف حسین آبادی کا ذکر کیا ہے۔ بلتستان کاز کے پرانے مبلغ عباس کاظمی کا ذکر ہے ان کے بلتی لوک گیتوں کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ وہ اپنے خطے کی تاریخ اور ثقافت دوسروں تک پہنچانا مقصد حیات سمجھتے ہیں۔ کچورا گاؤں میں دو مقامی بوڑھے رسے بٹ رہے تھے۔ مصنف نے قدیم بلتی خانقاہوں کو محفوظ نہ کرنے کا شکوہ کیا ہے۔ ایسی بے شمار یادگاریں جو بلتی طرز تعمیر اور ثقافت کی نمائندہ ہیں خاتمے کے قریب ہیں۔ ان منقش عبادت گاہوں میں لکڑی کا مثالی کام تھا۔ صدپارہ کے نالے کے پانیوں کو خاص زاویے سے دیکھنے پر ریت مکیش کی طرح چمکتی تھی۔ اسے صدپارہ گولڈ کہا جاتا تھا۔

صدپارہ کی حفاظتی دیوار اور قدیم ڈیم کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے:

"صدپارہ کے اوپر دیوسائی کو چڑھتے راستے کے ساتھ پتھروں کے کچھ ڈھیر اور ایک دیوار نظر آئی تھی۔ صدپارہ سے مراد فصیل یا حفاظتی دیوار ہے اور یہاں قدیم راجے اپنی ریاست کی سرحد کی نشاندہی کے لیے دیوار یا فصیل بنواتے تھے۔ 1876ء میں راجاؤں نے آب پاشی کے لیے ایک چھوٹا سا بند تعمیر کروایا تھا جو ایک کہاوت کے مطابق انڈے کی سفیدی اور خاص قسم کی چکنی مٹی کو گوندھ کر بنایا گیا تھا اور اب تک قائم ہے۔"[62]

خپلو جانے والی ویگن میں مقامی مسافروں میں ایک بوڑھی خاتون اپنے روایتی چوغے میں ملبوس تھی۔ لداخی نقوش کی حامل خاتون کی درجنوں مینڈھیاں کندھوں پر لٹکتی تھیں۔ وہ چاندی کا زیورر اور بھاری جھمکے پہنے ہوئے تھی۔[63] نارتھاں کے علاقے میں مقامی ڈرائیور کے مطابق لوگوں نے کچھ دن پہلے سنو ٹائیگر پکڑا تھا۔ ایک بڑی چٹان پر قدیم شبیہیں کندہ تھیں۔ زمانہ قبل از تاریخ کے انسان کی خواہشات کا اظہار تھا۔ بارہ سنگھے، تیر کمان، درخت، شکاری، بدھ پجاریوں کے پگوڈے اور بدھ شکلیں۔ بلتستان میں پریوں کا تصور حقیقت کے آس پاس سمجھا جاتا ہے۔ ان میں بچھل پیریوں یعنی چڑیلوں کا تصور بھی ہے۔[63] مقامی مسافروں کے مطابق بلتستان میں کئی لوگوں کی بیویاں پریاں ہیں ان کے بچے بھی موجود ہیں۔ راستے میں موجود کھیتوں میں کٹائیاں شروع تھیں اور مرد و خواتین برابر کام میں شریک تھے۔ زوہ جانور عام کھیتوں میں چل رہے تھے۔ کھیتوں میں کام کرتے بلتیوں کے کانوں میں یا ٹوپیوں پر اکثر پھول سجے تھے کیونکہ بلتی پھولوں کے بہت شائق ہیں۔ خپلو بازار اور ریسٹ ہاؤس کے درمیان سڑک رات کے وقت نالے کے بہاؤ کی وجہ سے بند ہو جاتی تھی۔ چقچن مسجد اپنے مخصوص طرز تعمیر کی بدولت ایشیا کی خوبصورت ترین خانقاہ ہے جس کی بنیاد

سید علی ہمدانی نے رکھی۔ ان علاقوں میں ہنزہ کی طرز پر ہی آبپاشی کا نظام رائج ہے۔ گلیشیر کے پانیوں کو چھوٹی نہروں میں تقسیم کر کے گھریلو اور زرعی ضروریات کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔[64]

چقچن خانقاہ کے بارے میں مصنف نے بتایا ہے کہ پہلی منزل پر اعتکاف کے لیے نیچی چھت والی کوٹھڑیاں تھیں جن کے فرش گھاس کے تھے۔ یہ پوری خانقاہ لکڑی سے بنی تھی۔ چقچن نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کا مطلب ہے لوہے کی چیز۔ روایت کے مطابق یہاں لوہے کی زنجیر ہوتی تھی مقامی آبادی میں جس کے ساتھ زیادتی ہوتی اسے ہلا دیتا۔ اس مسجد کو شیاخ چن بھی کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہے انصاف کی مسجد۔ کہا جاتا ہے کہ اس مسجد میں بیٹھ کر کوئی جھوٹی قسم کھائے تو وہ مر جاتا ہے۔[65] مصنف نے خانقاہ چقچن پر سبز پینٹ تھوپنے پر گلہ کیا ہے۔ اہل خپلو کی مہمانوں کو پیش کردہ خصوصی خوراک میں ابلے چاول، گوشت اور مقامی ساگ شامل ہے۔ دریائے شیوک میں پھولے مشکیزوں سے بنی کشتی پر لوگ سفر کر رہے تھے۔ ازمنہ قدیم سے ان علاقوں میں دریا عبور کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے اسے انڈس رافٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دور دراز کی بستیوں کے لوگ سکردو کو تہذیب کی آخری چوکی سمجھتے ہیں۔ سورمو گاؤں میں ایک چھوٹا سا سرائے نما ہوٹل تھا۔ جس میں ایک کچے کمرے میں خوراک تیار ہوتی۔ اس میں چند بستر اور تھوڑا باہر انگوروں کی بیلوں کے سائے میں چارپائیوں پر مسافر چائے پی سکتے تھے۔ یہاں پیدل چلنے والے مقامی لوگ بھی قیام کرتے ہیں۔

سورمو گاؤں میں مقامی شاعر تہور علی خان سے ملاقات کا ذکر ہے۔ پہلے ان کی تواضع رسیلے شہتوتوں سے کی گئی۔ پھر میٹھے کیک اور کیسر روٹی کے ساتھ چائے پیش کی گئی۔ خپلو بازار خاصا بارونق تھا۔ خپلو کے راجا کے محل میں داخل ہونے کا راستہ اصطبل سے گزرتا تھا۔ قدیم محل کو اس کی اصل حالت پر برقرار رکھا گیا ہے۔ راجا کی رہائش کے لیے محل کے پہلو میں نیا مکان تعمیر کیا گیا تھا جس کے دروازے پر مارخور کے سینگ آویزاں تھے۔ وہاں سری نگر سے لائے ہوئے چیری کے تین پودے تھے جن کی چیری مہمانوں کو پیش کی گئی۔ اس کے بعد چائے اور مقامی خوراک عنزوق سے تواضع کی گئی۔ محل میں مخدوش سیڑھیاں، بے شمار کمرے اور کچی چھتیں تھیں۔ درمیان میں گندم ذخیرہ کرنے کی جگہ تھی۔ مختلف کمروں کی کھڑکیاں وادی خپلو اور محل کے باغ میں کھلتی تھیں۔[66] محل کے باغ میں بڑا گلاب بکثرت تھا۔ بلتستان میں مذہبی مبلغین کا تذکرہ کرنے کے بعد مقامی علما اور مقامی شاعر میر مختار کا ذکر کیا ہے۔ کیرس کی خانقاہ میں خواتین کے اعتکاف کے لیے کوٹھڑیاں تھیں۔ وہاں دو منبر تھے۔ اس مسجد میں شیعہ اور سنی مسلک کے لوگ اکٹھے نماز پڑھتے ہیں۔ اہل بلتستان میں مذہبی رواداری اخلاقیات کا حصہ ہے۔ مصنف نے بلتستان کے خصوصی سوپ بالے اور خصوصی کھانے پراپو کا ذکر کیا ہے جو اخروٹ سے بنتا ہے۔[67]

کھرپوچے قلعے کے بارے میں آگاہ کیا ہے کہ مقپون بوخا نے تیرھویں صدی میں تعمیر کرایا تھا۔ قلعے تک کا راستہ انچن کی مغل ملکہ گل خاتون نے بنوایا تھا۔ اس کا ایک محل مینڈوق کھر بھی تھا۔ سکردو میونسپل لائبریری میں

منعقدہ ایک ادبی تقریب میں مقامی ادیبوں شاعروں دانشوروں کا تذکرہ ہے۔ بلتی زبان و ادب کے بارے میں مصنف کہتے ہیں:

"۔۔۔بلتی ادب کی ایک قدیم اور توانا روایت ہے۔ بلتی زبان پہلے تبتی سکرپٹ میں لکھی جاتی تھی لیکن مذہبی تنگ نظری نے اسے کاغذ سے سینوں میں منتقل کر دیا۔ قدیم لوک ادب کی بنیاد تاریخی اور رومانوی داستانیں ہیں۔"[68]

بلتستان میں جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر ہے۔ سکر دو وادی جتنی وسیع ہے اس سے باہر جانے کا راستہ اتنا ہی تنگ ہے۔ مستنصر کو دو برس پہلے والا کریم آباد ہنزہ اب بدلا ہوا لگا۔ سڑک پختہ تھی اور غیر ملکی سیاح بکثرت گھوم رہے تھے۔ آغا خان کی تاجپوشی کی سالگرہ کے سلسلے میں وہاں چراغاں کا اہتمام تھا۔ مقامی لوگ نئے کپڑوں میں چہک رہے تھے۔ چلاس جانے کے لیے ویگن میں بکنگ کے باوجود اور مسافروں کو بٹھانے پر تکرار ہوئی۔ جگلوٹ کو مصنف نے گرم موسموں اور بنجر ویرانوں کا علاقہ کہا ہے۔ رائے کوٹ پل پر پولیس کیبن میں ایک نوجوان نے انھیں روٹیاں اور چائے پیش کی۔ وہاں تاتو گاؤں کا قدم خان اپنے بیمار بیٹے کو چلاس لے گیا تھا اب پیدل اٹھا کر گھر لے جا رہا تھا۔[69] وہاں آسٹرین ٹیم کو فیری میڈو لے جانے کے لیے مقامی پورٹر گدھوں کے ساتھ اترے تھے انھوں نے پل کے فٹ پاتھ پر کھلے آسمان تلے رات گزاری۔

فیری میڈو کے لیے رائے کوٹ پل سے بہت سویرے روانہ ہونا ضروری ہے کیونکہ پتھریلا راستہ جو بولڈر رج کہلاتا ہے گرم ہو کر تپنے لگتا ہے دوپہر کو اس پر چلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ فیری میڈو کے راستے میں کوئی درخت یا جھاڑی نہیں۔ وہاں ایک سڑک بھی زیر تعمیر تھی۔ پیدل راستہ ویران تھا۔ ایک پورٹر رحمٰن جو مسجد میں امامت بھی کرتا تھا کا تکیہ کلام تھا "ہم مسلمان تم مسلمان تم ہمارا بھائی"۔ تاتو گاؤں میں گندھک کی بو بہت تھی کیونکہ وہاں گندھک کے چشمے کا ابلتا پانی بہتا تھا۔ وہاں مقامی بچے بہت غلیظ تھے۔ وہاں مصنف کو لسی پیش کی گئی جو دراصل گاڑھا دہی تھا ان علاقوں میں دہی کو لسی کہا جاتا ہے جو بلندی کی بیماری کے لیے اکسیر ہے۔ ایک ڈالڈے کے ٹین میں دہی دیا گیا جس میں مکھیاں تیر رہی تھیں۔ پھر ابلا ساگ اور باجرے کی روٹی پیش کی گئی۔ وہاں ایک گاؤں کا نام جیل تھا جسے بیل کہا جاتا ہے۔ وہاں کے مقامی شخص خوشحال نے مصنف کو اہل تاتو کی مشکلات اور اس علاقے کے محل وقوع، تہذیب و ثقافت سے آگاہ کیا جنھیں مصنف نے اپنی کتاب میں شامل کیا۔ اس کے مطابق گاؤں کا نام تاتو کی بجائے تتوہ تھا۔ گرم پانی جوڑوں کے درد کے لیے مفید ہے۔ تعلیمی معیار صفر ہے۔ علاج کی سہولتیں ناپید ہیں۔ شین اور یشکن دو بڑی قومیں ہیں۔ عام پیشے کھیتی باڑی اور مویشی پالنا ہے۔ شادی بیاہ کی رسومات سادہ ہیں جس میں خالصتاً والدین کی پسند کا عمل دخل ہوتا ہے۔ منگنی کے لیے لڑکی والے لڑکے والوں سے کثیر رقم طلب کرتے ہیں جسے مقامی زبان میں ژپ کہا جاتا ہے۔ نکاح زبانی ہوتا ہے۔ بعض اوقات پچاس فٹ اونچے ڈنڈے پر نشانہ باندھنے کی شرط رکھی جاتی ہے۔ زیورات چاندی کے ہوتے ہیں جو عورت

کی ٹوپی پر استعمال ہوتے ہیں۔ ان زیورات میں تومر، غرے شامل ہیں۔ بچے کی پیدائش پر سب مرد آکر فائرنگ کرتے ہیں۔ پسندیدہ مشغلہ شکار کھیلنا ہے۔[70]

تاتو گاؤں سے آگے جنگلی گلاب سیا کی بے شمار جھاڑیاں تھیں۔ جرمن کوہ پیما ہرلک کو فرنے فیری میڈو کو یہ نام دیا تھا۔ پہاڑوں میں دستور ہے کہ پورٹر سیاح کو اکیلا نہیں چھوڑتا ساتھ لے کر چلتا ہے مدد کی ضرورت ہو تو فراہم کرتا ہے۔ سارے علاقے کا نام فنتوری تھا۔ فیری میڈو اس کا ایک حصہ ہے جسے مقامی طور پر جت کہتے ہیں۔ رائے کوٹ گلیشیر کے آغاز کے علاقے میں چند پتھروں کے بارے میں مقامی آبادی کا خیال ہے کہ وہاں کافروں کا قلعہ تھا۔ کھیتوں میں کام کرنے والی خواتین کے لباس اور زیورات کو مصنف نے ثقافتی عجائب گھر کی طرح قرار دیا ہے۔ مقامی بچے سیاحوں کو دیکھ کر چاکلیٹ چاکلیٹ کا شور مچاتے رہے۔

فیری میڈو کی پہلی جھلک نے مصنف کو مایوس کیا کہ وہاں پریوں کی بجائے کوہستانی حضرات کلاشنکوفیں لے کر گھوم رہے تھے اور بکریاں بول رہی تھیں۔ فیری میڈو تاتو کے لوگوں کی چراگاہ ہے وہ گرمیوں میں اپنے مال مویشی لے کر یہاں آتے ہیں مقامی کوہستانی اتنے خطرناک نہیں جتنے دکھائی دیتے ہیں۔ مصنف نے وہاں بیٹھے ایک کوہستانی سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی مگر اس نے غصیلا رویہ اپنائے رکھا۔ مولوی رحمٰن کا بچہ دہی لایا تو مصنف نے اسے رقم دینی چاہی اس کے باپ نے منع کر دیا کہ ابھی یہ مہمان سمجھ کر لایا ہے پیسہ دیں گے تو پھر گاہک سمجھ کر لالچ میں لائے گا۔ بچے کو چیونگم دی گئی تو وہ بولا یہ دیسی ہے میں جرمن چیونگم کھاتا ہوں۔[71]

نانگا پربت کو مقامی طور پر دیامیر اور دیاموری بھی کہتے ہیں۔ بیس کیمپ کے راستے میں ایک قدرتی جنگل تھا جہاں درخت اپنی طبعی عمر پوری کرتے پھر گر جاتے تھے۔ ان گرے ہوئے درختوں سے نئے تنے پھوٹ رہے تھے۔ قدیم جنگل کے بعد بیال کیمپ کا علاقہ شروع ہوا۔ ان خطوں میں رام چکور، مرغ زریں اور مارخور پایا جاتا ہے۔ بیال کیمپ تاتو اور مٹھاٹھ کے لوگوں کی گرمائی چراگاہ ہے۔ برچ کے سفید درخت جو بہت بلندی پر ہوتے ہیں بیال کیمپ میں وہ تھے۔ رحمت نبی نے مصنف کی بہت اچھی مہمانداری کی جو تاتو کا رہنے والا تھا اور آسٹرین ٹیم کو فیری میڈو لے کر آیا تھا۔ کوہستانی جو مصنف کے خیمے کے آس پاس پایا جاتا تھا چائے کی دعوت پر اس نے اپنا رویہ تبدیل کر لیا کہ کوہستانی بھی مہمانوں کی طرح مہمان نوازی کے معاملے میں بے حد حساس ہیں۔ اس نے مارخور کا شکار کر کے انھیں کھلانے کا وعدہ کیا۔

آسٹرین ٹیم میں شامل ایک بیالوجسٹ کا کہنا تھا کہ فیری میڈو میں پائے جانے والے پھل، پھول، پودے اور تتلیاں عجوبہ ہیں ان میں ایشیائی، یورپی اور ترکی کی اقسام ہیں جو دنیا میں کہیں اور اکٹھے نہیں دیکھیں۔ رحمت نبی کے

پر دادا گونز فارم کے راستے فیری میڈو آئے اور گھاس میں مارخوروں کے ریوڑ دیکھے تو بہت خوش ہوئے انھوں نے برطانوی حکومت سے اجازت لے کر اس زمین کا مالیہ دے کر اسے اپنی چراگاہ بنالیا۔

1989ء میں دوسرے سفر کے دوران مصنف نے گلگت میں امریکی سیاحوں کو پٹھانوں کے لباس میں گھوڑوں پر سوار درہ خنجراب کی طرف جاتے دیکھا۔ مصنف ایک پاکستانی لڑکی کو کوہ پیا مہم کے ساتھ رابطہ افسر کے طور پر جاتے دیکھ کر حیران ہوئے اس کے بارے میں ایک ساتھی نے بتایا کہ تارڑ صاحب یہ شادمینا پاکستان کی پہلی کوہ پیا خاتون ہے، بالتورو گلیشیر کر کے اب بتورہ جا رہی ہے۔

قراقرم رائٹرز فورم کی جانب سے منعقدہ ایک تقریب میں شریک مقامی ادیبوں صحافیوں اور دانشوروں نے مطالبہ کیا کہ انھیں بھی پاکستانی تہذیب کے دھارے میں شامل کیا جائے۔ بونجی میں فوجی چھاؤنی ہونے کے باعث زیادہ تر عمارتیں فوجی نوعیت کی تھیں۔ استور روڈ پر مصنف کو جابجا کبوتر اور چکور نظر آئے۔ سیاہ تیتر بھی دیکھے۔ گریکوٹ میں ایک مقامی ہوٹل والوں کا کہنا تھا دیوسائی کے بڑے پانی کا پل ہر برس نیا بناتے ہیں سردیوں کے شروع میں اسے توڑ کر آگ تاپتے ہیں۔[72] گریکوٹ سے آگے استور روڈ مہینہ مہینہ خراب رہتی ہے۔ سڑک خراب ہونے پر ایک مقامی شخص نے نانگا پربت کے لیے پورٹر چورت گاؤں سے لینے پر زور دیا۔ ترشنگ کو مصنف نے پاکستان کا خوب صورت ترین گاؤں قرار دیا ہے۔ وہاں مقامی بچوں کے لیے پاکستانی سیاح عجوبہ تھے۔ وہاں ایک زیر تعمیر ہوٹل کو اس کے مالک نے اس علاقے کا پہلا ہوٹل قرار دیا۔ ترشنگ میں ہریاول کے درمیان ایک بنجر پہاڑی ہے جس کے اوپر درختوں کے تنوں اور پتھروں سے سیاہ چوکور ڈھانچہ ہے جو ترشنگ کا چوبی لینڈ مارک ہے لکڑی کا یہ مینار ترشنگ کا حفاظتی مینار ہے۔ پرانے زمانوں میں کوہستانی حملہ آوروں کو روکنے کے لیے ترشنگ کے باسی اس میں جاکر پتھر برساتے اور توپیں چلاتے اس لیے یہ بلند ٹیلے پر واقع ہے۔ پورٹروں کے معاملے پر ترشنگ اور چورت والوں کی چپقلش چلتی رہتی ہے۔ نانگا پربت کی روپل سائیڈ پر مختلف بیس کیمپ ہیں۔ جن میں زیادہ پسندیدہ بے ینگ ہے۔[73]

وادی روپل میں کھیتوں میں لکڑی کے گھر تھے۔ کھیتوں میں پھول بکثرت تھے۔ کھیتوں میں خواتین شوخ رنگوں میں ملبوس کام کر رہی تھیں۔ راستے کے دونوں جانب پتھروں کو جوڑ جوڑ کر چھوٹی چھوٹی دیواریں بنائی گئی تھیں۔ روپل چورت اور ترشنگ والوں کا سمر کیمپ ہے۔ مقامی لوگ ہمیشہ زیادہ برف کی دعا کرتے ہیں چاہے راستے بند ہوں مگر برف پگھلنے سے پانی زیادہ ہونے کا فائدہ ان کے کھیتوں اور ندیوں کو ہوتا ہے۔ اپر روپل میں لکڑی کے ہموار چھتوں والے مکان آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ ان کے متعلق مستنصر لکھتے ہیں:

"یہ بڑا روپل یا اپر روپل تھا جو ان دنوں بالکل ویران پڑا تھا۔ بیشتر جھونپڑے کھلے پڑے تھے۔ کواڑ بند تھے۔ کواڑوں کے اندر اندھیرے کمرے تھے جن میں شلغم اور ساگ سٹور کیے گئے تھے۔ ان مکانوں کے برآمدوں

میں بھی انھیں سبزیوں کو سکھانے کے پیے ہاروں کی طرح گوندھ کر لٹکایا گیا تھا۔ ہم ان ویران مکانوں کی چھتوں پر چلتے تھے لیکن احتیاط کے ساتھ۔ ان کی چھتوں میں چوکور روشندان تھے۔"[74]

نانگا پربت کو شل مکھی بھی کہا جاتا ہے یعنی سو چہروں والا پہاڑ۔ مقامی پورٹروں سے گفتگو میں مصنف نے ان کے روز و شب کی تفصیل پوچھی۔ ان لوگوں کے نزدیک باہر جانے سے مراد اسلام آباد یا پنجاب تک جانا ہے۔ پورٹر سلطان کھیتی باڑی کرتا تھا اور گرمیوں میں سیاحوں کا بوجھ اٹھاتا تھا۔ پورٹروں کی غیر موجودگی میں مویشیوں اور زمینوں کی دیکھ بھال مقامی آبادی کے دیگر افراد رضاکارانہ طور پر کرتے ہیں کہ آپس میں سب بھائی سمجھے جاتے۔ مقامی پورٹر کے بقول ٹاپ میدان میں ہرن بھی ہوتے ہیں۔ پورٹر رات گزارنے کے لیے آگ جلا کر پتھر گرم کر کے ان کے نزدیک سونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کسی پورٹر کے رشتہ دار قریبی بہک میں ہوتے تو وہ وہاں رات گزارتے۔ بہک میں مقامی لوگ اپنے مویشیوں سمیت مقیم ہوتے ہیں۔ ٹاپ میدان میں چرواہوں کے بچے سیاحوں کو دیکھ کر میٹھی میٹھی کا شور مچانے لگے۔ ٹاپ میدان کے درمیان بہنے والا دریائے روپل مقامی طور پر تاپ نی سن کہلاتا ہے۔ یہاں چھلی نما درخت پائے جاتے ہیں جنھیں مقامی چرواہے جلا کر سردیوں کے لیے کوئلہ بناتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہاں عقاب کی طرح کا مقامی پرندہ گریجال مورس پایا جاتا تھا۔[75]

دیامیر پہاڑ مقامی لوگوں کے لیے بڑے بوڑھے کی طرح ہے جس کے دامن میں وسیع چراگاہیں ہیں۔ جہاں پانی کی کمی نہیں، شادی کے موقع پر ماں دلھن کی تعریف کرتے وقت اسے "میری دیامیر چھیس" کہتی ہے جس کا مطلب ہے مری نانگا پربت کی طرح اونچی لمبی بیٹی۔ نانگا پربت کے پہلو میں کھل نامی پہاڑ میں سسر بوٹی بکثرت ہے جسے خوشبو کے لیے جیب میں رکھتے ہیں اور کیڑوں سے بچاؤ کے لیے کپڑوں میں رکھتے ہیں۔ نانگا پربت کے روپل چہرے کی اصل وجہ شہرت چوٹی سے لے کر نیچے بیس کیمپ تک ساڑھے چار ہزار میٹر بلند چٹانی چہرہ ہے۔

چھلی سے کوئلہ بنانے کی خاطر مقامی لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ الاؤ جلد ٹھنڈا ہو جائے ورنہ ہوا تیز ہو تو لکڑی تیزی سے جل کر راکھ میں بدل جاتی ہے۔ چھلی کا درخت لوگ صرف کاٹتے نہیں بلکہ لگاتے بھی ہیں یہ تیزی سے بڑھتا ہے۔ لاتوبو کا مطلب ہے ایسا نشیب جو چٹانوں میں گھرا ہو۔ وہاں مصنف کی ملاقات شکاری یار محمد سے ہوئی جو فخریہ اپنا کارنامہ بتا رہا تھا کہ اس نے پچھلی رات لاتوبو کا آخری ہرن بھی مار دیا۔ اس کے خیال میں اس نے ضائع نہیں کیا بلکہ مشک نافہ نکالا اور گوشت سب کو کھلایا۔ تھوڑی سی مشک گھر میں رکھ کر باقی چار پانچ سو میں بیچ دینے کا خیال تھا۔[76] مشک نافہ والے ہرن کی نشانی اس کے دو سفید دانت منہ سے باہر نکلے ہوتے ہیں اس لیے شکاری اسے دور سے پہچان جاتے ہیں۔ لاتوبو میں شام کو چرواہوں کے جھونپڑوں کے درمیان باڑے میں خواتین مویشیوں کو ہانک کر اندر لے جا رہی تھیں۔ نانگا پربت کی مقامی جھیل کا نام سروت ہے۔ سارے ٹاپ میدان میں کوئی چارپائی نہیں تھی۔ جاپانی سیاح لڑکی کی

ٹانگ ٹوٹ گئی تو اسے نیچے تک چھوڑنے کے لیے چارپائی کی ضرورت پڑی مگر یہاں گھروں میں لوگ نہیں رہتے بلکہ بہک میں رہتے ہیں جہاں صرف زمین پر سونے کی جگہ ہوتی ہے۔[77]

مقامی پورٹروں نے اس علاقے کے ایک پرانے شکاری اور چڑیل یعنی روئی کی کہانی سنائی۔ ایک مقامی پھول چر کی لوگ سر درد کے علاج کے لیے سونگھتے ہیں۔ لوئر روپل میں سکول میں دیواروں پر بچوں نے کوئلے سے فقرے لکھے تھے، جیپ اور بس کی تصویر بنائی تھی۔ مقامی پورٹر نے اس علاقے میں پھولوں کی کثرت پر شکوہ کیا کہ ایسے دیکھنے کو زیادہ ملتا ہے مگر کھانے کو کم کہ اس زمین میں فصل کم ہوتی ہے اور پھول زیادہ۔ اپر روپل میں چورت کے لوگ زیادہ ہوتے ہیں اور لوئر روپل میں ترشنگ والے۔ پورٹر سلطان نے ایک بوڑھے کے تحفتاً دیے شلجموں کا چھلکا بہت مہارت سے ستارہ نما اتارا۔ وہاں ایک لڑکے کے کندھے پر چمڑے کے مشکیزے میں دہی تھا جو پانی کے بغیر پنیر کی شکل کا تھا۔ گھر پہنچنے پر اس کی ماں نے اس میں پانی ڈال کر لسی بنائی تھی۔ پورٹر سلطان کے والد بابا محمود کو جب رقم ادا کی گئی تو اسے پتہ نہیں تھا کہ کس حساب سے اور کتنی۔ اس کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے:

> "۔۔۔ مجھے معلوم تھا کہ بابا یہ رقم جوں کی توں اپنے بیٹے کو دے گا کیونکہ اس کے پاس اس کا کوئی مصرف نہ تھا۔ وہ بوٹوں کے اس جوڑے سے بھی مطمئن تھا جس پر چمڑے کے بڑے بڑے پیوند کسی مقامی موچی نے تھوپ رکھے تھے اور دونوں بوٹ بھی الگ الگ تھے۔ ان میں تسمے نہ تھے بلکہ انھیں رسیوں اور چیتھڑوں سے کسا گیا تھا۔"[78]

پورٹر سلطان نے بہت اصرار سے مصنف کو اپنے گھر مدعو کیا۔ صاف ستھرا پتھروں اور لکڑی سے بنا گھر تھا۔ نیچے لکڑی کا سٹور اس کے ساتھ مویشیوں کا باڑہ۔ اس کی آخری کوٹھڑی بے حد تنگ اور بغیر ہوا کے تھی۔ شدید سردی میں مویشیوں کو وہاں رکھا جاتا۔ ایک کمرے میں فرش پر اونی دری بچھی تھی۔ دیواروں کے ساتھ تکیے اور ایک طرف رضائیاں ترتیب سے رکھی تھیں۔ سلطان کے چاچا نے مقامی فصلوں کے بارے میں بتایا کہ کہ زیادہ تر آلو، مٹر، پھلیاں اور دال کاشت کی جاتی ہے۔ سردیاں لمبی ہوں تو گندم کی فصل نہیں پکتی۔ پہلے شادی بیاہ پر ڈھول بجایا جاتا تھا جو اب منع ہے۔ کھانے میں دیسی انڈوں اور مکھن کا آملیٹ ، خمیرے پراٹھے، گول کیک نما روٹی اور گاڑھی میٹھی لسی تھی۔[79] آزادی سے قبل گلگت اور شمالی علاقوں کو سری نگر سے ملانے والی سڑک استور سے گزرتی تھی۔ گلگت میں پہلی جیپ 1937ء میں اسی راستے سے پہنچی۔

مصنف کا تیسرا سفر اپنے اہل خانہ کے ہمراہ تھا۔ ہوشے کے بارے میں مصنف کہتے ہیں کے یہاں کے لوگ بہت سادہ لوح ہیں۔ کے ٹو موٹل مہمات کا عجائب گھر ہے۔ کچورا گاؤں اور اس کے آس پاس کے علاقوں کے بچے سیاحوں کی کثرت کے باعث بھکاری ہو چکے تھے۔[80] کچورا گاؤں سے ایک راستہ وادی سوکھ کو جاتا ہے۔ پہلے صدپارہ جھیل کے کنارے صرف ایک خیمہ ہوتا تھا جہاں سیاحوں کے لیے چائے اور بسکٹ کا بندوبست ہوتا۔ اب ایک مہنگا ریستوران تھا۔

خپلو کے راستے میں زوہ سے گندم اگانے کا کام لیا جارہا تھا اور ایک جگہ گھوڑوں سے۔ ہوشے تک جیپیں کم جاتی تھیں اس لیے اس راستے پر گھاس اگی تھی کہ ٹائر اسے مسلتے نہیں تھے۔ اہل ہوشے کے ہاتھ اور چہرے دھوئیں کے باعث سیاہ تھے۔ کیونکہ ان کا موسم سرما ناکافی آگ پر جھکے گزرتا ہے۔ وہ قدیم وضع کی اونی بلتی ٹوپیاں پہنے تھے۔ مقامی لوگوں نے مصنف اور اس کے خاندان کو انگریز سمجھا کہ تب پاکستانی سیاحوں کے وہاں جانے کا رواج نہیں تھا۔ انھوں نے اپنے مسلمان ہونے کا یقین دلایا۔[81]

شمال میں مختلف علاقوں میں گندم کی فصل پکنے کا موسم مختلف ہے۔ ہوشے کے مکین بھی دعا کرتے تھے کہ گندم کی فصل جلد پک جائے ورنہ سردیاں شروع ہونے پر ساری فصل ضائع جائے گی۔ گرمیاں مختصر ہونے پر گندم کے خوشے ہرے رہتے ہیں۔ ہوشے کی بین الاقوامی شہرت کا سبب لٹل کریم ہے۔ غیر ملکی کوہ پیما اس کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ بلتستان میں کم عمری میں شادی کا رواج ہے۔ ایک مقامی خاتون نے بتایا وہ کبھی ہوشے سے نیچے نہیں گئی۔ اس نے مصنف کی بیوی سے کہا:

> "میرا رنگ بھی تمھارے جیسا ہے۔ میرے پاس بھی صابن ہوتا تو میں بھی منہ ہاتھ دھوتی۔ نیچے سے آئی ہو؟ سنا ہے سکردو بہت بڑا شہر ہے۔ نہیں میں تو کبھی ہوشے سے نیچے نہیں گئی۔ ہاں اوپر جاتی ہوں گھاس کاٹنے کے لیے۔"[82]

مستنصر نے اہل ہوشے کو پتھر کے زمانے کے لوگوں کی طرح اور خوفزدہ لوگ قرار دیا جن کے لباس میوزیم میں رکھے جانے کے قابل ہیں۔ دریائے شگر کے پتھروں کے رنگ انوکھے حیرت زدہ کرنے والے تھے۔ شگر میں سکھوں کا ایک ویران گوردوارہ بھی تھا۔ شگر کے محمد حسن محقق اور لوک داستانوں پر عبور رکھتے تھے۔ شگر کی خاص چیز زہرہ موہرہ پتھر ہے۔ شگر میں خانقاہ کے صحن میں تقریباً پانچ سو سال قدیم چنار تھے۔ پانچ سو برس بعد چنار کا درخت مر جاتا ہے تنے میں گھن لگنے سے مردہ ہونے کو آگ لگنا کہتے ہیں۔ اس مسمار ہوتی مسجد کو نیا بے جوڑ دروازہ لگایا گیا۔ وہاں ہاتھ سے لکھے ہوئے قرآن پاک کے اوراق تھے۔ شگر محل اونچائی پر تھا وہاں سے رعایا کے اجتماع کے لیے راجا ایک ڈولی پر سوار ہوتا جو بکری کے بالوں سے بنے موٹے رسے پر ہک کے ساتھ لگی ہوتی تھی۔ جھولا برج کی تکنیک پر ڈولی پہاڑ سے اترتی اور چڑھتی تھی۔[83]

شگر کے سب سے قدیم محلے میں جولاہوں کے گھر نچلی چھتوں والے اور تاریک تھے۔ گلتری سے آنے والے خانہ بدوش دیوسائی کا میدان عبور کرتے تھے۔ وہ سکردو میں اپنی بھیڑیں اور مویشی فروخت کر کے ضرورت کی چیزیں لے کر کئی روزہ کوہستانی مسافت کر کے پھر گلتری کی طرف لوٹ جاتے۔ دیوسائی میں ایک پتھریلی چٹان پر 71ء کی جنگ میں فوج کے عارضی مورچے کے آثار تھے۔ دیوسائی غیر دوستانہ رویہ رکھنے والا میدان ہے اس لیے ویران رہتا ہے۔

مصنف نے بلتی پورٹروں کے عجب وصف کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قریب پہروں چپ بیٹھے رہتے ہیں اور پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر بھی باہر سوتے ہیں۔[84]

کے ٹو کہانی (1993ء)، مستنصر حسین تارڑ

کنکورڈیا تک کا سفر مصنف نے 1993ء میں کیا یہ مصنف کا کسی باقاعدہ ٹیم کے ساتھ پہلا سفر تھا۔ سکردو وائیر پورٹ کے بارے میں ان کا کہنا ہے یہاں بلتیوں کی پسند ناپسند کی ہر شے آسمان سے اترتی ہے۔ جہاز سے سیاح اور زندگی کی آسائشوں کے کریٹ بکس نکلتے ہیں، فوجی، افسر، مولوی اور جھگڑے آتے ہیں۔[85] سکردو میں یہ رواج ہے کہ میدانی علاقوں سے آنے والوں کو کہا جاتا ہے نیچے سے آیا ہے کوئی پہاڑوں میں جائے تو کہتے ہیں اوپر گیا ہے۔ شمالی علاقوں کے مخصوص موسم کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے کہ دھوپ میں چھاؤں بھلی لگتی ہے اور چھاؤں میں دھوپ کی خواہش ہوتی ہے۔

محمد علی چنگیزی نے مصنف کی ٹیم کو بتایا کہ ٹیم کے آفیشل کک کو باورچی کہا گیا تو وہ برا منائے گا۔ پورٹروں کے بارے میں یہاں قانون ہے کہ آدھے سکردو اور آدھے شگر سے جائیں گے ورنہ کم زیادہ ہونے پر جھگڑا ہو جاتا ہے۔ اسکولے تک مصنف کے سفر کے سال سے ایک سال پہلے سڑک گئی ورنہ داسو سے کنکورڈیا ٹریکنگ کا آغاز ہوتا تھا۔ کے ٹو موٹل میں سیبوں سے لدا درخت تھا جو کہیں اور ہوتا تو پھلوں سے خالی ہو چکا ہوتا۔ کے ٹو موٹل کے برآمدے میں 1982ء سے آنے والے برسوں تک مہم جوؤں کی مہمات کے پوسٹر آویزاں تھے۔ لٹل کریم نے مصنف کو کنکورڈیا سے واپسی پر گندوگورو کے راستے ہوشے اترنے پر اکسایا۔ پورٹروں کا کھانا بھی ٹیم کے ذمے تھا۔ صدپارہ جھیل کے پاس دیوسائی کی برفیں پگھلنے پر آنے والے خانہ بدوش اگست میں وہاں نہ ہونے پر مصنف نے تشویش کا اظہار کیا ہے کہ کہیں ان پر پابندی تو نہیں لگائی گئی جیسے درہ بابوسر کو جاتے خانہ بدوشوں کو ہر برس اپنے مویشی چرانے کے لیے دگنا تاوان دینا پڑتا ہے۔[86]

مصنف کی ٹیم کے ساتھ جانے والے پورٹروں میں ایک پورٹر صرف اس لیے جا رہا تھا کہ واپسی پر مزدوری کی رقم سے تیسری بیوی خرید سکے۔ سکردو سے روانگی پر بلتی پورٹر لوک گیت گا رہے تھے۔ ایک جگہ مصنف کو وہاں پچھلے سفر کے دوران دیکھے جانے والے اڑیال نظر آئے۔ ڈرائیور نے بتایا انھیں مقامی زبان میں شاپو کہا جاتا ہے وہ سہ پہر کے قریب دریائے شگر میں پانی پینے آتے ہیں۔ شگر اور سکردو میں پورٹروں کے معاملے پر تکرار روزمرہ کا معمول ہے۔ مصنف کو کھیتوں کے قریب ایک نیا بنا مکان دکھائی دیا اس کے برآمدے میں کسی ماہر بلتی کاریگر کی بنائی لکڑی کی دلکش جالی تھی۔[87] خوبانیوں سے بھرے درخت سے ڈرائیور خوبانیاں ویسے ہی توڑ کر دینے لگا تو مصنف نے کہا پہلے کھیت کے مالک سے پوچھ لو تب اس کا کہنا تھا خوبانی تو سب کا ہے۔ حشوپی سے آگے گھوڑے پر سوار ایک ڈاکیا آتا دکھائی دیا۔ جیپ

ڈرائیور نے ایک گاؤں جو پتھر نکالنے والوں کا تھا پر ہونے والے ظلم کے نتیجے میں ویران ہونے کی بابت بتایا۔ وہاں ایک آدمی کو بڑا قیمتی پتھر ملا اس نے گلگت کے خریدار کو دو لاکھ قیمت لگائی اس نے پچاس ہزار دیے اور کہا باقی رقم گلگت پہنچ کر دے گا۔ راستے میں اس نے اسے قتل کر دیا۔ اسی دن وہاں سیلاب آیا اور سارا گاؤں بہہ گیا۔ یونو سے لوگوں نے آگے جا کر حیدر آباد نامی گاؤں بسا لیا۔ اس کا پہلا نام بونگ لاء تھا۔[88] وہاں ایک آدمی نے انھیں وہ عام پتھر دکھا کر قیمتی ہونے کا لالچ دے کر خریدنے پر اکسایا جو ہنزہ نگر میں چھوٹے چھوٹے بچے عام لیے پھرتے ہیں۔ کچھ سیاح ان کے بیش قیمت ہونے کے دھوکے میں آجاتے ہیں۔ غوروچو کے علاقے میں دریائے برالڈو دریائے باشو میں شامل ہو رہا تھا۔ سڑک اسکولے تک پہنچنے سے داسو گاؤں ویران ہو گیا ورنہ پہلے تمام ٹیمیں یہاں خیمہ زن ہوتی تھیں۔ داسو کے راستے میں ہی برالڈو گورج آتا تھا جو کوہ پیاؤں کے لیے مشکل ہوتا تھا۔ اسی راستے پر گیلی برج کا پر خطر مقام تھا۔

تھنگل میں اوپر گاؤں سے لوگ سیاحوں کے خیمے کے نزدیک آکر جمع ہو گئے تھے ان کے نزدیک یہ تفریح تھی۔ پورٹروں کے لیے ہر ٹیم اسکولے سے بکرا خریدتی ہے جسے پائیو میں پہنچ کر پورٹروں کے کھانے کا رواج ہے۔ پائیو میں پورٹروں کا راشن بھی تقسیم کیا جاتا ہے اور وہ آگے کے سفر کے لیے اکٹھی روٹیاں پکاتے ہیں۔ ان کے سونے کے متعلق مصنف بتاتے ہیں:

"انھیں ہماری طرح آرامدہ سلیپنگ بیگز اور خیموں کی ضرورت نہ تھی۔ ان میں سے بیشتر پتھروں کی دیوار سے ٹیک لگائے سو رہے تھے"[89]

تھنگل میں مصنف کی ٹیم میں شامل ڈاکٹر مقامی مریضوں کو دیکھ رہا تھا تو وہاں گلہڑ کا مریض اپنے گلہڑ کے بڑا ہونے پر فخر کر رہا تھا کہ اردگرد کے علاقے میں کسی کی گردن پر اس کے جتنا بڑا گلہڑ نہیں۔ تھنگل سے آگے روانگی سے پہلے پورٹروں نے حسب روایت بغاوت کر دی کہ ہمیں یونیفارم، بوٹ اور بکرے کے پیسے دو ورنہ واپسی کی آدھی مزدوری دو ہم آگے نہیں جائیں گے۔ انھوں نے سامان پھینک دیا۔ ان کی شرائط مانی گئیں تب وہ روانہ ہوئے۔

اسکولے میں گندم کے کھیت گلابی رنگ کے تھے۔ یہ خاص نسل کی صرف بلندی پر اگنے والی گندم ہے جو مقامی زبان میں گیاؤس کہلاتی ہے۔ اس کی روٹی قدرے سیاہی مائل ہوتی ہے۔[90] اسکولے شمال کا آخری گاؤں اور پتھروں اور برف کے ویرانے سے ادھر آخری بستی ہے۔ ہموار چھتوں کا ایک کچا پتھریلا گاؤں تھا۔ چھتوں پر شہتوت کی شاخوں سے بنے چھوٹے مستطیل کمرے تھے۔ یہ برساتی نما چھجے گرمیوں میں چھت پر سونے اور خوراک ذخیرہ کرنے کے کام آتے ہیں۔ اہل سکردو کے لباس عجیب تھے۔ زیورات عجیب تر تھے۔ عورتیں گھروں میں کھڈیوں پر تیار کردہ اونی چوغوں میں ملبوس تھیں جن پر قدیم طرز کی شوخ کڑھائی تھی۔ رنگ دار ٹوپیوں میں عورتوں کے بال منکوں اور سیپیوں میں گندھے مینڈھیوں میں شانوں پر پڑے تھے۔ ان کے چہرے سرمے اور مہندی کے بیل بوٹوں سے سجے تھے۔[91] مصنف کے

بقول جیپ آنے سے یہاں جدت آئے گی یہ قدیم کلچر اب تبدیلی کی زد پر ہے۔ اسکولے کی خوش شکل بچیاں دیدہ زیب کڑھائی والے نمونے لیے سیاحوں کو بیچنے کے لیے کھڑی تھیں۔

> "یہاں کا رواج تھا کہ جب بھی کوئی کوہ پیما یا کوہ نورد اس بستی میں داخل ہوتا ہے تو لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں اور اپنی دستکاریاں اسے دکھانے آتے ہیں۔"[92]

تب وہاں صاف ستھرے کپڑوں اور چترالی ٹوپیاں پہنے چند لوگ آئے اور ناگواری سے مقامی خواتین اور بچیوں کو ہٹایا۔ یہاں بھی کالاش کی طرح پیسے لے کر تصویر اتارنے دی جاتی ہے۔ لیکن تب یہ سہولت صرف غیر ملکیوں کے لیے تھی۔ اسکولے میں تین ہسپانوی خواتین کے پاسپورٹوں والا بیگ گم ہو گیا تھا وہاں تعینات فوجی جوان کا کہنا تھا کہ کسی بچے نے شرارت سے بیگ اٹھا لیا ہو گا مل جائے گا کیونکہ اسکولے میں چوری کا رواج نہیں۔ اسکولے میں پھر پورٹروں نے بکرے کے رواج کا یاد کرایا۔ بلتی پورٹروں کے علیحدگی پسند رویے کو مصنف نے ناپسند کیا۔ ان کا رویہ غیر دوستانہ تھا۔ بلتی پورٹر صبح سویرے سامان اٹھاتا ہے اور منزلیں مارتا وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں اس کے مطابق اس دن منزل ہو گی۔ مصنف نے ان کے اس علیحدگی پسند رویے کی توجیہ بھی دی ہے کہ شاید بلتی پورٹروں کا رویہ بڑی مہمات کے ساتھ جانے سے ایسا ہے جن کی ٹیم میں ارکان بہت زیادہ اور سیکڑوں پورٹر ہوتے ہیں ان کا آپس میں میل جول بہت کم ہوتا ہے۔[93]

ایک جگہ دریا پر خطرناک پل آیا جہاں پل کے تختے فاصلے فاصلے پر جوڑے گئے تھے انھیں پھلانگ کر پل پار کرنا پڑتا تھا آگے ایک جھونپڑے میں پل کا رکھوالا رہائش پذیر تھا جو پل سے گزرنے کی فیس لیتا تھا اس آمدنی سے اسکولے میں سکول تعمیر کرنے کا ارادہ تھا۔ ہر برس برف پگھلنے پر نیا پل تعمیر کیا جاتا۔ کوروفون کے قریب پڑی ون کی فوجی چوکی تھی۔ ہر خیمہ گاہ میں پتھریلی چار دیواری کچن کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ آرمی کیمپوں میں خالی کنستر بہت مفید شے ہوتی ہے۔ تین چار لٹا کر اوپر ٹاٹ بچھا دیں تو صوفہ بن جاتا ہے۔ زیادہ ہوں تو سلیپنگ بیگ بچھا کر سونے کا کام لیا جاتا ہے۔ تفریحاً دف کی طرح بجھانے کے کام بھی آتے ہیں۔ بیافو ہسپر گلیشیر وہ قدیم برفانی راستہ ہے جس پر نگر اور ہنزہ کے لوگ آکر اہل اسکولے کو لوٹتے تھے۔[94] رات کو پورٹر الاؤ کے گرد بیٹھے بلتی لوک گیت گا رہے تھے۔

پڑی ون کا مطلب ہے پتھروں کا علاقہ اور بیافو کا مطلب ہے مرغ جبکہ کوروفون کا مطلب سفید پتھر ہے۔ اگلے پڑاؤ بوردومل کا مطلب تھا مصیبت دریا۔ کنکورڈیا کا ایک اہم سنگ میل جھولا کیمپنگ سائٹ ہے جو جھولا پل کے باعث مشہور ہوئی۔ مصنف کا کہنا ہے کہ کسی گائیڈ کے بغیر بھی کنکورڈیا پہنچا جا سکتا ہے اگر ٹیلی فون تار کو نظر میں رکھیں جو کہیں کھڑے کہیں گرے بانسوں کے ساتھ بندھی کنکورڈیا جاتی ہے۔ اس راستے پر خچروں کے چلنے کے آثار بھی جا بجا نظر آتے ہیں۔

راستے میں مصنف کا سامنا ایک فرانسیسی ٹیم سے ہوا جو صرف اس علاقے میں کوہ نوردوں، فوجیوں کا پھیلایا کچرا اٹھا کر سمیٹنے آئی تھی تا کہ قدرتی حسن داغدار نہ ہو۔ راستے میں کہیں کہیں پالتوزدہ نظر آئے جنھیں اسکولے کے لوگ چرنے چھوڑ جاتے۔ باردومل میں آلودگی بہت تھی۔ خالی ڈبے، پلاسٹک کی بوتلیں، لفافے، جلی لکڑیاں وغیرہ۔ اس ٹریک پر یہ رواج ہے کہ پورٹر پائیو میں ایک دن کا ریسٹ مانگتے ہیں، اپنی روٹیاں پکاتے ہیں اور لکڑی جمع کرتے ہیں ان میں راشن تقسیم ہوتا ہے۔ کنکورڈیا کے راستے میں پائیو اور اردوکس کی کیمپنگ سائٹس بہت مشہور ہیں۔ پائیو میں آخری ہریاول ہے اور اردوکس سے دنیا کی خوب صورت چوٹیوں کے مناظر نظر آتے ہیں۔ پائیو سے آگے بالتورو گلیشیر کا آغاز ہوتا ہے۔ پائیو میں کاٹن ووڈ کے درخت تھے۔ وحید نامی مصنف کے لیے بہت مددگار رہا۔ پائیو تک راشن اٹھانا پورٹروں کی ذمہ داری نہیں ہوتی لیکن یہاں راشن کی تقسیم کے بعد وہ مزدوری کے بوجھ کے ساتھ اپنا راشن خود اٹھاتے ہیں۔ وہ اکٹھی روٹیاں پکا لیتے ہیں اور راستے میں چائے بنا کر کھا لیتے ہیں۔ جلانے کے لیے لکڑیاں بھی یہیں سے جمع کرتے ہیں۔ عرصہ دراز سے یہی رواج ہے پھر بھی پائیو کا سبزہ اور درختوں کا جھنڈ قائم ہے۔[95] پائیو پیک کو پہلی بار ایک پاکستانی نے سر کیا۔ پائیو میں ایک ٹیم کی کامیاب واپسی کی خوشی میں موسیقی کا اہتمام تھا۔ مایو خان جو ایک سیاحتی ادارے کے سٹور کی دیکھ بھال کرتا تھا اس نے بانسری بجائی۔ خالی کنستروں پر سلیپنگ بیگ بچھا کر نشستوں کا انتظام تھا۔ پورٹر پنجابی اردو گانے اور ملی نغمے سب کو اپنے مخصوص ردھم میں گاتے۔ گلیشیر میں سے دریا کے منبع پر بہت شور ہوتا ہے۔ میدانوں کے رہنے والے ہمیشہ پاؤں جما کر چلتے ہیں جبکہ پہاڑوں کے رہنے والوں کے پاؤں قدرتی طور پر لچک کے ساتھ اونچی نیچی سطحوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ گلیشیر پر چلتے برف کم اور ریت پتھر زیادہ نظر آتے ہیں۔ گلیشیر کی دڑاریں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔

ٹرانگو مجموعے کے بارے میں مصنف نے جغرافیائی معلومات دی ہیں۔ للی کیمپنگ سائٹ کو لینڈ سلائیڈ نے تباہ کر دیا تھا۔ کھوبرسے گلیشیر بہت خوش منظر تھا۔ راستے میں دو لوگ ٹیلی فون کی تار کو چیک کرتے جا رہے تھے جو سیاچن تک جاتی تھی۔ شمالی علاقوں میں آلودگی کا اہم ذمہ دار مصنف فوج کو بھی ٹھہراتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا موقف ہے:

> "شمالی علاقوں میں ٹریکرز اور پورٹرز کے علاوہ فوج بھی ان کی بدنمائی اور آلودگی کی ذمہ دار ہے۔ کئی بار بالتورو گلیشیر پر چلتے ہوئے بوٹ کے نیچے کوئی شے پچکی اور کڑ کڑائی یہ ایک خالی ٹین تھا۔"[96]

فوجیوں کا سامان پہنچانے کے لیے یہاں خچروں کا سہارا لیا جاتا ہے ان کی وجہ سے بھی راستہ بدنما تھا۔ مصنف کی تجویز کے مطابق فوج جیسے منظم ادارے میں ہر صورت ٹینوں اور پلاسٹک کے تھیلوں اور کنستروں کو واپس لانے کا حکم ہو تو یہاں صورتحال کافی بہتر ہو سکتی ہے۔ بالتورو میں چند دراڑوں کو عبور کرنے کے لیے ان کے درمیان پتھر پھینک کر

راستہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان علاقوں میں یہ روایت ہے کہ جو اردوکس پہنچ جائے اس کے لیے کنکورڈیا کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ یہ بہت بارونق خیمہ گاہ تھی۔ پورٹروں کی پسندیدہ جگہ یہاں کی مشہور چٹان ہے جس کے اندر سونے کی بھی جگہ ہے وہ یہیں کھانا پکاتے اور دھوپ سینکتے ہیں۔ اردوکس میں جب فالتو پورٹروں کو فارغ کیا جانے لگا تو ایک پورٹر رونا شروع ہو گیا کہ اسے اسکولے واپسی تک ساتھ رکھ کر مزدوری دی جائے تاکہ وہ تیسری شادی کے لیے درکار رقم جمع کر سکے۔ ورنہ اس کی ہونے والی تیسری بیوی کی شادی کہیں اور کر دی جائے گی۔[97]

آگے راستے میں نظر آنے والی بلند ترین چوٹیوں مشابرم، گشابرم، براڈپیک اور مستاگ ٹاور کے بارے میں مصنف نے معلومات دی ہیں۔ مشابرم کی چونچ نما چوٹی ہر دفعہ روپ بدلتی نظر آتی۔ گورے ٹو کنکورڈیا کے راستے میں ایک اہم پڑاؤ تھا جبکہ گورے ون ایک بڑا آرمی کیمپ تھا۔ مصنف کی ٹیم کا باورچی ساری مہم کے دوران ٹیونافش کے ٹن بہت کنجوسی سے استعمال کرتا رہا جس کی وجہ عموماً مہم کے اختتام پر بچ جانے والی خوراک باورچی کو بخشش کے طور پر دیا جاتا تھا۔ مستاگ ٹاور کی تاریخی اہمیت بیان کرنے کے بعد مصنف نے 1930ء میں اس کے قریب ایک قدیم گاؤں کے کھنڈرات کی دریافت کے بارے میں بتایا ہے:

> "1930ء میں مستاگ گلیشیر کے نزدیک شاراگن نامی ایک گاؤں کے کھنڈر دریافت ہوئے۔ یہ ایک حیرت انگیز دریافت تھی۔ دنیا کی سرد ترین چوٹیوں کے دامن میں برفانی آب و ہوا میں ایک آبادی کیسے ہو سکتی تھی۔ گاؤں میں ایک پولو گراؤنڈ کے آثار ہیں جس کی لمبائی آٹھ سو فٹ اور چوڑائی ایک سو ساٹھ فٹ کے قریب ہے۔ بقول عباس کاظمی اس پولو گراؤنڈ سے گھوڑوں کی نعلیں اور چاک بھی ملے ہیں۔ مستاگ گلیشیر پر یہ گاؤں اس لیے آباد تھا کہ زمانہ قدیم میں یارقند اور تبت سے تجارتی قافلے اس دشوار گزار راستے سے بلتستان آتے تھے۔"[98]

منفی چودہ درجے سینٹی گریڈ میں مصنف نے پورٹروں کے ناکافی کپڑوں، پھٹی ٹوپیوں اور پلاسٹک کے جوتوں میں کھلے آسمان تلے رات گزارنے پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ کے ٹو کو لارڈ آف قراقرم بھی کہا جاتا ہے۔ 1954ء میں گم ہونے والے ایک کوہ پیما کی لاش کے ٹو پر 1993ء میں نظر آئی۔ کے ٹو کو چینی کوگیر کہتے ہیں۔ مقامی لوگ اسے شاہ گوری اور ویسے ماؤنٹ گاڈ آسٹن بھی کہا جاتا ہے۔ کے ٹو کے مختلف ناموں کا تذکرہ کرنے کے بعد مصنف نے اسے سر کرنے کی تاریخ بھی بیان کی ہے۔

یاک سرائے (1995ء)، مستنصر حسین تارڑ

مستنصر حسین تارڑ کا یہ سفر نامہ 1995ء کے جھیل کرومبر اور وادی بروغل کے سفر کی روداد ہے۔ "یاک سرائے" میں مصنف نے کرداروں اور مکالموں سے سفر نامے میں ڈرامائی تاثر پیدا کیا ہے۔ خطرناکیوں کا بیان زیادہ ہے۔ مناظر کو فینٹسی کے رنگ میں پیش کرنے کا رجحان ہے۔ بشام میں شاہراہ قراقرم پر لینڈ سلائڈنگ کے دوران لوگ

سمجھوتہ کر چکے تھے کہ جیسے یہیں وقت گزارنا ہے۔ اس لیے کچھ مسافر دریا میں نہار ہے تھے، کچھ پتھروں پر سو رہے تھے۔ انسان پہاڑوں سے ہار نہیں مانتا راستہ بنانے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ اس سفر کے لیے کرومبر جھیل کے بارے میں مصنف کو معروف کوہ پیما نذیر صابر کے ذریعے آگاہی ہوئی۔ اس راستے پر بہت کم کوہ نوردوں کے پاؤں پہنچے تھے۔ بشام سے شانگلا پاس کو اٹھتی تنگ سڑک کا نام عاشق روڈ ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ ایک مقامی کی زبانی مصنف نے بیان کی ہے کہ یہاں ایک فوجی کو چشمے پر پانی بھرتی مقامی لڑکی سے محبت ہوئی۔ کوہستانی لوگ باہر رشتہ کرتے نہیں۔ بڑی مشکلوں سے لڑکی کا باپ اس شرط پر مانا کہ میجر کا عشق اگر سچا ہے تو گاؤں تک سڑک لے آئے۔ شاہراہ قراقرم سے ان کے گاؤں تک بہت لوگ گر کر جاتے تھے۔ میجر نے تین سال لگا کر وہ سڑک بنائی۔ اس لیے اس کا نام عاشق روڈ ہے۔

مصنف نے چلاس کی بدھ عہد کی چٹانوں اور ان پر کندہ قدیم نقوش کا تذکرہ کیا ہے۔

"سندھ کے ریتلے کناروں میں سے وہ چٹانیں ابھری ہوئی تھیں جن پر ہزاروں برس قدیم نقش کھدے ہوئے تھے۔ ان میں جانور اور شکاری تھے۔ مہاتما بدھ کے گیان کے لمحے تھے اور جو بدھ یاتری چین سے ٹکشیلا تک کا زیارتی سفر کرتے تھے ان کے ہاتھوں کی لکیریں تھیں۔"[99]

رائے کوٹ پل کے قریب پہنچ کر مصنف نے اپنے قدیم فیری میڈوز کے سفر کے دوران وہاں سے اوپر جانے والے راستے اور اب سڑک کا موازنہ کیا ہے کہ پہلے سڑک نہ ہونے کی وجہ سے بہت مشکل راستہ تھا۔ رائے کوٹ پل پر گیارہ برس پہلے والے چینی شیروں کے مجسمے اب بھی موجود تھے۔ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ بھی فیری میڈوز تک کے ایک پرانے سفر کی یاد کا تذکرہ کیا ہے۔ اس دوران بھوج پتر نامی درخت کا ذکر بھی کیا ہے جس کی چھال بدھ مت کے دور میں لکھنے کے کام آتی تھی یہ اظہار کی علامت تھا۔ اب بھی مقامی چرواہے اور پورٹر فیری میڈوز جانے والے سیاحوں کو مستنصر کی اپنے بچوں کے ساتھ فیری میڈوز اور نانگا پربت کے بیس کیمپ جانے کی کہانیاں سناتے ہیں۔ وہاں ایک جھیل بھی تارڑ جھیل کہلاتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ فیری میڈوز لیجنڈ کا حصہ بن چکے ہیں۔

1995ء میں گلگت مصنف کو تنہا جزیرے کی مانند نہیں لگا جتنا پہلے سفر کے دوران لگا تھا۔ اب یہاں آبادی اور رونق زیادہ تھی۔ چنار ان گلگت میں حسب روایت مصنف کی تواضع سرخ کٹے آڑوؤں سے کی گئی۔ سویت یونین کا شیرازہ بکھرنے سے پہلے واخان پامیر ٹریک حساس علاقہ تھا اور وہاں جانا ممنوع تھا۔ اشرف امان پہلا شخص تھا جس نے اس ٹریک کو کوہ نوردوں سے آباد کیا۔ راستے درست کیے، ندی نالوں پر جھولا پل تعمیر کرائے۔[100] اہل ہنزہ کی خصوصیات کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں زندگی چار دن کی ہے اس لیے اسے بحث مباحثوں اور خوف میں گزارنے کی بجائے زندگی کی طرح گزارتے ہیں۔ کریم جان کے گھر میں مصنف کو کیک نما شے مقامی خوراک کے طور پر پیش کی گئی جو ذائقہ دار تھی۔ وہاں ایک مقامی گائیڈ عبدالاحد سے بھی ملاقات ہوئی جو ازبک پس منظر رکھتا تھا۔

اس کے آباؤ اجداد نے 1926ء میں سوختر آباد میں سکونت اختیار کی۔ سوویت یونین کے خاتمے پر ازبکستان کی آزادی کے بعد اس کے خاندان کے کچھ نوجوان جا کر ازبک شناختی کارڈ بنوا کر واپس آ گئے کیونکہ روزگار کے مواقع پاکستان میں زیادہ تھے۔ اس گائیڈ کے بقول امت میں آباد کوہستانی بہترین پورٹروں میں شمار ہوتے ہیں۔[101]

اشکومن کے راستے پر سڑک پر حادثے کی یاد میں ایک سرخ جھنڈی پھڑپھڑا رہی تھی۔ جھیل کرومبر کے ٹریک پر یہ پاکستانی کوہ نوردوں کی پہلی مہم تھی۔ دریائے غذر پر ایک نیا جاپانی پل بنا تھا۔ جس کے پار وادئ اشکومن تھی۔ وادئ اشکومن، نلتر اور یاسین کے بارے میں جغرافیائی معلومات دیتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے کہ اشکومن کے پانچ گاؤں چتور کھنڈ، پکوڑہ، دائین، امت اور اشکومن ہیں۔ گلوکاہ اور ہیگل اسکی بلند چوٹیاں ہیں۔ یہاں مقامی آبادی ازبکستان روڈ بننے کی بہت خواہشمند ہے ان کی اس خواہش کے بارے میں مصنف بتاتے ہیں:

> "مقامی آبادی ان دنوں متوقع ازبکستان روڈ کے خواب میں مبتلا ہے۔ کہا جا رہا کہ وسط ایشیا تک زمینی راستے کے لیے وادئ اشکومن بھی زیر غور ہے۔ ہم جہاں بھی گئے کسانوں نے، پورٹروں نے، چرواہوں نے ہم سے یہی درخواست کی کہ صاحب اوپر جا کر کسی کو بولو کہ ازبکستان روڈ ادھر سے لے جاؤ ہمارا بہت بھلا ہو گا۔ ہم خوشحال ہو جائے گا۔"[102]

اشکومن کے مقامی نوجوان کے مطابق اس وادئ کے پانچ بڑے تہوار ہیں۔ جن میں بی تہوار، نیسنو گوٹ، نیلٹ یو جوک، نیلو وایوگ، اور نسالو ہیں۔ مصنف نے ان تہواروں کی تفصیل اپنے سفر نامے میں شامل کی ہے۔ یکم مارچ کو منایا جانے والا بی تہوار بیج بونے سے متعلق ہے اور اس زمانے کی یادگار ہے جب انسان فطرت کے قریب تھا۔ نیسنو گوٹ یکم جولائی کو مناتے ہیں جس میں کھیتوں سے گندم کی بالیاں کاٹ کر لا کر گھروں کے باہر لٹکاتے ہیں۔ 20 جون کو نیلٹ جوٹ یعنی نالے کی طرف جانے کا تہوار مناتے ہیں۔ جس میں مال مویشیوں کے ساتھ بلند چراگاہوں کی طرف جاتے ہیں۔ موسم سرما سے قبل وہاں سے واپس آنے کا تہوار نیلو وایوگ ہے۔ گوشت محفوظ کرنے کا تہوار نسالو ہے۔ امت وادئ اشکومن کا پرانا صدر مقام تھا۔ وہاں مصنف کو خوبانی کے پتوں اور شاخوں سے سجا خوبانی کا تھال پیش کیا گیا۔[103] مترن داس میں الاؤ کے گرد پورٹروں نے رقص کیا اور مقامی گیت گائے ایسے ایک گیت کا ترجمہ مصنف نے اپنے سفر نامے کا حصہ بنایا ہے جس میں مقامی علامتوں ندی، آبشار، گلیشیر اور مارخور کا تذکرہ ہے۔[104]

راستے میں ایک تیز نالہ مصنف نے پورٹر نگیر کے کندھوں پر سوار ہو کر پار کیا۔ ہر ٹریک کے دوران کچھ پورٹر مہربان خصلت کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے چند کوہستانی باشندے ہونے کے باوجود وادئ اشکومن میں مقیم ہونے کے باعث مہمان نوازی اور ہمدردی کے جذبات سے بھرپور تھے۔ اکثر پورٹر پھٹی پرانی جوتیوں میں سفر کرتے تھے۔ جبکہ جس شخص نے اپنے آپ کو گائیڈ اور ماہر باورچی بتایا تھا وہ فراڈ ثابت ہوا۔ وہ جھوٹ بول کر ٹیم میں شامل ہوا تھا۔ بکین کے گاؤں کے پاس شکاری کینجابائی سے مصنف اور ان کی ٹیم کی ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے ساتھ مارخور کا شکار لایا تھا۔ جسے

اس نے رات تک کے انتظار کے بعد شکار کیا تھا اور اندھیرے میں اس چٹان تک گیا جہاں اس نے دور سے صبح مارخور دیکھے تھے۔ مقامی لوگ مارخور کے شکار میں احتیاط کرتے ہیں کہ بلا وجہ نہ کریں۔ بعض اوقات انھیں اپنے ماحول کی مجبوری کی وجہ سے ایسا کرنا پڑتا ہے۔

ورگوتھ کے جنگل کے راستے میں اشور بیگ برین نامی پہاڑی سلسلہ تھا جس کا مطلب پہاڑ سے گرا آدمی بتایا گیا۔ ورگوتھ گلیشیر کے قریب تین خطرناک نالے مصنف کی ٹیم نے پورٹروں کی مدد سے پار کیے۔ اس دن کی طویل پر مشقت ٹریکنگ کے بعد پورٹر نگیر نے مصنف کو دبایا اور اپنی کوہستانی روایت سے آگاہ کیا کہ وہاں مہمان کو کھانا کھلانے سے پہلے دبانے کا رواج ہے تاکہ اس کی تھکاوٹ ختم ہو۔[105]

سوختر آباد کی چراگاہوں میں گوجر قبیلے کی قیام گاہیں تھیں۔ جن کے لیے ایک ہی جسامت کے پتھروں کو جوڑ کر دیواریں کھڑی کر کے ان پر برچ کے تنے ڈال کر مٹی پھیلا کر لیپ کر دیا گیا تھا۔ ان میں کوئی روشندان یا کھڑکی نہ تھی۔[106] گوجر حضرات بہت مہمان نواز تھے۔ پہلے تازہ دہی اور گاڑھی لسی سے ان کی تواضع کی گئی۔ سوختر آباد میں مقامی لوگوں نے ازبک پلاؤ کے ساتھ ان کی دعوت کی۔ سوختر آباد میں احد کے چچا محمد لطیف جنھوں نے دعوت کی وہ اپنی ہی بھیڑوں کی اون کی بنائی ہوئی پٹی کے کوٹ پتلون اور چترالی ٹوپی میں ملبوس تھے۔ اسی برس سے زائد ہونے کے باوجود ان کی داڑھی کے بیشتر بال سیاہ تھے۔ یہاں انھیں یاک کا دہی بھی بھیجا گیا۔ محمد لطیف کینجا بائی کے والد تھے اور خود بھی شکاری تھے۔ انھوں نے پچاس برس قبل تلوار سے ریچھ کے شکار کا قصہ سنایا۔ مقامی زبان میں ریچھ کو آیوک اور بھیڑیے کو گرک کہتے ہیں۔ سیاہ رنگ کا چیتا خرپلنگ، سفید چیتا پانی پلنگ اور زرد کھال والا چیتا آزادہ پلنگ کہلاتا ہے۔ ان کے بقول وہ تو مجبور ہو کر یا خوراک کے لیے شکار کرتے ہیں لیکن افسران ہیلی کاپٹروں میں سوار آتے ہیں اور اپنی بہادری جتانے کے لیے اور اپنے گھروں کو سجانے کے لیے بے دریغ شکار کرتے ہیں۔ کچھ لوگ سنو ٹائیگر کو پکڑنے کے لیے پھندہ لگاتے ہیں۔ لوہے کے شکنجوں میں وہ اسے زخمی کر کے پکڑتے ہیں اور کھال گلگت جا کر سیاحوں کو فروخت کرتے ہیں۔[107] ازبکستان میں مقامی پلاؤ صرف خوراک نہیں بلکہ مقدس شے مانا جاتا ہے۔ پلاؤ کی دعوت کے بعد الاؤ کے گرد رقص کا مظاہرہ ہوا۔ وہاں گائے جانے والے ایک مقامی گیت کا ترجمہ بھی مصنف نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ سوختر آباد سے تھوڑا ہی دور ایک واخی گاؤں تھا جہاں کے لوگوں نے مصنف کو بکری کا دودھ پیش کیا۔ چٹی بوئی گلیشیر کا مطلب ہے بڑے سوراخوں یا دراڑوں والا گلیشیر۔ یہ کوہ ہندوکش اور پامیر کا سنگم ہے۔ یہ ایک نوزائیدہ گلیشیر ہے جو 1905ء کے سیلاب کے بعد وجود میں آیا۔ اس گلیشیر کو کامیابی سے عبور کرنے کے لیے ایک پورٹر نے بکرا قربان کرنے کی منت مانی تھی۔ اس کی دراڑوں پر بعض جگہ پار کرنے کے لیے برف کے تودے کاٹ کر رکھ کر عارضی پل بنائے گئے تھے۔ ایک دراڑ میں کینجا بائی شکاری کی کلہاڑی گر گئی وہ اسے نکالنے کے لیے اس کے اندر تک اتر گیا۔ چٹی بوئی گلیشیر

سے نکلنے والی ندی شین، کرومبر اور اشکومن کے دریاؤں سے جانی جاتی تھی۔ دریائے غذر میں داخل ہونے کے بعد اس کا نام دریائے گلگت ہو جاتا ہے۔ چٹی بوئی گلیشیر کے بعد وادئ سوئنج کے اختتام پر جھیل کرومبر تھی۔ وادئ سوئنج میں رات کو پورٹر جنوں کو بھگانے کے لیے ڈرم اور برتن بجارہے تھے۔[108]

پورٹر نگیر نے بتایا کہ سوئنج میں اس کے بھائی کے جھونپڑے ہیں وہ ہمت کرتا ہے اور اشکومن سے مال مویشی اور بیوی بچوں کے ساتھ سوختر آباد اور چٹی بوئی کے راستے ادھر آتا ہے۔ اس لیے وہ ہمت کرتا ہے تو یہ چراگاہ اس کی ہے۔ وہاں مصنف کے لیے نگیر نے ایک گھوڑا پیش کیا جس پر سواری کر کے جھیل تک کا سفر طے کر سکیں۔ وہ گھوڑا نگیر کا بھائی واخان پار کر کے ازبکستان سے لایا کہ وہاں خوش گاؤ اور گھوڑا سستا ہوتا ہے۔ ان علاقوں میں جنگلی پیاز کی بہتات تھی۔ وہاں گانی بوٹی بھی بکثرت تھی جو پورٹرز کی پسندیدہ چیونگم تھی۔ یہ تھکاوٹ دور کرنے کے لیے زود اثر تھی۔ جھیل کرومبر کی گہرائی نامعلوم ہے۔ پامیر میں مصنف کی ٹیم کے پورٹروں نے وادئ سوئنج اور کرومبر کی چراگاہوں میں عارضی قیام شدہ اپنے رشتہ دار چرواہوں کی مدد سے پولو میچ کا اہتمام کر رکھا تھا۔ جو پامیر اور ہندوکش کے درمیان پھیلا دنیا کا بلند ترین پولو گراؤنڈ تھا۔ یہ گھوڑے پامیر سے ادھر لائے جاتے تھے یہاں سے تاجکستان پہنچنا آسان اور پامیر پہنچنا مشکل تھا۔[109] پورٹروں کا ناشتہ موٹی خمیری روٹی اور دھواں لگی کڑوی چائے پر مشتمل ہوتا تھا۔ ان علاقوں میں کسی بھی شخص کے لیے سب سے بڑی خوش بختی ایک گھوڑا ہے۔ اس کے حصول کے لیے وہ ساری زندگی مشقت کرتا ہے۔ شمال میں پولو گڈریوں کا کھیل ہے۔ پولو میچ کے بعد مقامی آبادی کی جانب سے مصنف اور ان کی ٹیم کو موٹی خمیری روٹی اور دہی پیش کیا گیا۔ بعد میں چائے دی گئی۔

پورٹروں کے بقول پامیر چھوٹا پہاڑ ہونے کے باوجود اچھا پہاڑ ہے۔ کیونکہ باقی علاقوں میں برف کے باوجود لوگ اس کو پار کر کے بڑے پامیر تک جاتے ہیں۔ جہاں بہت چراگاہیں اور مویشی ہیں جو بہت سستے ہیں۔ یہاں کے لوگ ملکوں کی حدبندیاں نہیں جانتے کہ پہلے روس تھا اب تاجکستان ہے، یہ ہمیشہ سے ادھر جاتے رہتے ہیں۔ وہاں گھوڑے چھوٹے قد کے ہیں اور خوش گاؤ بکثرت ہیں۔ وہاں پاکستانی کرنسی کی بجائے لین دین سے چیزیں لیتے ہیں۔ دس کلو چائے کے بدلے ایک خوش گاؤ ملتا ہے۔ پاکستانی کپڑے، ٹافیوں، بسکٹ، سگریٹ کی ادھر بہت مانگ ہے۔[110]

وادئ کرومبر کے بعد وادئ بروغل بہت وسعت کی حامل تھی۔ وہاں دریائے یارخون تھا جو ایک مقام پر دریائے ابات کہلاتا تھا۔ بروغل چترال کی بلند ترین اور دور افتادہ وادی ہے۔ یہاں گھاس اور پانی بہ افراط ہے۔ یاکوں کی پسند کا برفیلا موسم بھی اس لیے یہ یاک سرائے کہلاتا ہے۔ ایک جگہ انھیں تین خستہ حال واخی نقوش کے چرواہے نظر آئے۔ ان چرواہوں کے معمولات کے بارے میں مصنف نے بتایا:

"یہ واخی نسل چرواہے ایسے تھے کہ ازبکستان، تاجکستان اور افغانستان آنا جانا ان کے معمول میں شامل تھا بلکہ وہ بہت زیادہ آگاہ نہیں تھے کہ یہ غیر ممالک ہیں۔ ان کے لیے چراگاہیں چاہیے تاجکستان میں ہوں، افغانستان کی واخان پٹی میں ہوں یا پاکستان کی وادی بروغل میں ہوں چراگاہیں تھیں جن میں وہ اپنی بھیڑیں اور یاک چرا سکتے تھے۔"[111]

وادیٔ بروغل میں پامیری نالے کے دونوں طرف پتھروں کے گھر تھے جن کی چھتوں پر میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس بچے تھے۔ نالے کے گدلے کناروں پر متعدد خواتین پتھروں پر کپڑے پٹخ پٹخ کر دھو رہی تھیں۔ انھوں نے سیاحوں کو دیکھ کر تعجب کا اظہار نہ کیا۔ وہاں خیمہ بستی میں جاپانی گروپ موجود تھا جو اس وادی کی ثقافت پر تحقیق کرنے آئے تھے۔ یہاں مقامی شخص مرزا رفیع کا بہت حوالہ دیا جاتا تھا جو کوہ نوردوں کو اپنے قدیم واخی گھر میں مدعو کر کے ضیافتیں کرتا ہے۔ ان علاقوں میں بہت عرصہ اجنبی نہیں جاتے تھے۔ وہاں موجود عورتیں ویرانی کی وجہ سے حجاب میں نہیں رہتی تھیں۔ اگر بہت عرصے بعد کوئی اجنبی جاتا تو مقامی آبادی سے دور کسی پتھر پر بیٹھ کر انتظار کرتا کہ کوئی مقامی فرد آئے اور ان سے آنے کی وجہ پوچھے۔[112] وہاں واخان کی جانب سے ایک یاک کارواں آرہا تھا۔ آگے اونی فرغل اور ڈھیلی پگڑی والا سفید ریش بزرگ تھا۔ جس کے پاؤں میں بوٹوں کی بجائے اونی پٹیاں لپٹی تھیں کچھ یاکوں پر گھریلو سامان لدا تھا۔

تاریخی حیثیت کا حامل درہ درکوت چترال کو گلگت سے ملاتا ہے۔ وادیٔ گرہل میں دریائے یارخون کی کنارے دو گھر تھے جن کی دیواریں قلعی شدہ تھیں۔ وہاں ایک تنگ راستہ سینکڑوں برس تک وسط ایشیا اور برصغیر کے درمیان سب سے مختصر راستہ تھا۔ اس راستے کے ذریعے حملہ آوروں، سیاحوں اور تاجروں کے آنے کی تاریخ مصنف نے بیان کی ہے۔ چکار ایک یخ بستہ وادی ہے۔ وہاں ایک مقامی شخص کا نام تھا چار سکھ۔ وہاں مقامی لوگوں نے پورٹروں کو درہ درکوت کی خطرناکی سے ڈرایا تو انھوں نے بغاوت کر دی۔ مقامی لوگوں کا مقصد تھا کہ وہ منہ مانگے معاوضے پر انھیں درپار کرائیں۔ طے شدہ معاوضے کے علاوہ زائد انعام کی شرط پر پورٹر مانے۔ وہاں بدخشاں سے آئے دو لوگوں سے ملاقات ہوئی جو پاکستانی علاقوں کو گندم، گھی اور چائے کی فراوانی کے باعث جنت گردانتے تھے۔ وہ یہاں سے ضروریات زندگی حاصل کر کے واپس اپنے وطن جانا چاہتے تھے۔[113] مصنف کے مطابق درکوت اور وادی یاسین کے حوالے سے جارج ہیورڈ کے قتل ہونے پر تاریخ میں غلط معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

سنولیک (1996ء)، مستنصر حسین تارڑ

"سنولیک" مستنصر حسین تارڑ کے 1996ء میں دنیا کے طویل ترین برفانی راستے بیافو ہسپر پر سفر کی روداد ہے۔ شروع میں مصنف نے نگر کے لوگوں کی اسکولے والوں کو لوٹنے کے لیے اس قدیم گزر گاہ پر طویل سفر کرنے کی روایت کو افسانوی رنگ میں بیان کیا ہے کہ وہ شہد، پنیر، مارخور کی کھالوں، مکھن اور جو کے حصول کے لیے اتنا لمبا سفر کرتے ہیں اور لوٹ مار کر کے اسی راستے سے واپس اپنے علاقے نگر میں پہنچ جاتے۔[114] اسی سفر کے دوران ان کے بدنوں پر بھیڑوں کی گرم اور دبیز کھالیں اور پشت پر بندھی پوٹلیوں میں مارخور کا سوکھا گوشت اور گھی ہوتا جسے ساتھ لائی خشک لکڑیوں کو جلا کر گرم کرتے۔ ہسپر گاؤں پہلا پڑاؤ ہوتا ہے۔ ہسپر گلیشیئر کی دراڑوں کو پار کرنے کے لیے شہتوت کی ٹہنیوں سے بنی سیڑھیاں تھیں۔ بلتیوں کے بارے میں اہل نگر کے تعجب کا اظہار کیا ہے کہ یہ دوسروں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے، ان بستیوں میں کوئی خون نہیں ہوتا شاید بدھ تعلیمات کے آثار باقی ہیں۔ بلتی پھولوں کے بے حد گرویدہ ہیں۔[115]

بیافو اور ہسپر مشترکہ طور پر دنیا کی طویل ترین 122 کلو میٹر طویل گلیشیائی زنجیر بناتے ہیں۔ یہ ٹریک دنیا کا سب سے خطرناک اور مشقت طلب ٹریک گردانا جاتا تھا۔ سکردو کی جھیل صدپارہ کے ٹھہرے پانیوں میں مچھلیاں اچھلتی تھیں لیکن پچھلی بار والا سونے کے ذرات والا چشمہ مصنف کو شام ہونے کی وجہ سے نہ ملا۔ پچھلے سفروں کے دوران صدپارہ کے ایک پورٹر نے اب ٹریکنگ کے سامان کی دکان بنالی تھی۔ یوسف نامی گائیڈ نے مہم کے دوران ہر اگلی منزل کے بارے میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ صاحب بہت خطرناک ہے پچھلے برس وہاں فلاں حادثہ ہوا۔ اسکولے روڈ پر پل ٹوٹنے کی خبر نیچے تب پہنچی جب شگر کے قریب پانیوں میں لوگوں کے بہتے ہوئے رک سیک دیکھے گئے۔ شمالی علاقوں کی روڈ بلاک کے باوجود ٹرانسپورٹ حکمت عملی یہ تھی کہ جہاں روڈ بلاک ہوتا آگے جیپوں تک پیغام بھیجا جاتا ہے کہ ان سواریوں کو وہاں تک پہنچاؤ جہاں تک سڑک کھلی ہے کرایہ وہ خود ادا کریں گے جن سے پہلے بات ہوتی ہے۔ بیافو ہسپر کو دنیا کی پرکشش ترین برفانی لینڈ سکیپ کہا جاتا ہے۔ مصنف کی ٹیم کے گائیڈ کے بقول حشوپی میں ایک خوبانی کا خاص درخت ہے اس جیسا پورے بلتستان میں کہیں نہیں ہے۔ داسو کے قریب حیدر آباد نامی گاؤں میں ایک نوجوان نے کوہ پیمائی کے سامان کی دکان کھولی تھی۔ وہاں عام سی فٹ پاتھ پر تیس تیس روپے میں بکنے والی عینک کی قیمت 500 روپے بتائی گئی۔[116]

پہاڑی علاقوں میں جب دور سے بے تحاشا ہاتھ ہلا کر کسی کو اشاہ کیا جائے تو گویا کسی خطرے سے خبردار کیا جاتا ہے کہ پناہ لے لیں۔ اسکولے روڈ بننے سے پہلے اپالی گان میں کوہ پیما پڑاؤ کرتے تھے۔ اب سڑک بلاک ہونے کے باعث

وہ دوبارہ آباد ہو گیا تھا۔ بلتی پورٹروں کے لیے خیمہ نصب کرنا ایک چیلنج ہوتا ہے۔ راستے میں ایک پر خطر مقام پر پورٹر رستم نیچے گرا تو اس کی ہمت کے بارے میں مصنف بیان کرتے ہیں:

> "پورٹر رستم کو اس کے ساتھی مالش کرنے لگے۔ اسے تسلی دینے لگے اور اسکی ہڈیاں ٹٹولنے لگے۔ اسے تھوڑا سا گھی پلایا گیا۔ پھر قرآن پاک کی کوئی آیت پڑھ کر پھونکی گئی۔ پھر کوئی بلتی گیت سنایا گیا۔ اور وہ اٹھ کھڑا ہوا، "پرواہ نہیں صاحب"۔۔۔"[117]

اسکولے میں تھانیدار کا کہنا تھا کہ ادھر ڈیوٹی پر آنا انھیں قید پر آنا لگتا ہے کیوں کہ یہاں لوگ جرائم ہی نہیں کرتے زیادہ سے زیادہ کسی کی مرغی چرا لی بس۔ نومبر میں سیزن ختم ہونے پر وہ نیچے واپس جانے پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔[118] اسکولے ایک گزرے ہوئے گاؤں کی مانند تھا۔ اسکولے میں ہر کھڑکی، روشندان، پتھر اور دروازے کی اوٹ سے خواتین کے دودھیا ہاتھ بلند ہوتے تھے جن میں اسکولے کی دستکاریوں کے نمونے برائے فروخت تھے۔ یہ ایک معدوم ہوتی ہوئی تہذیب کی ہنر مندی تھی۔ مستنصر نے جدید زمانے کے اسکولے کی قدیم بستی پر اثرات کے خدشے کا بھی اظہار کیا ہے۔ ایک اونی واسکٹ پر اسکولے کی قدیم کڑھائی کے ڈیزائن کے طور پر مارخور بنائے گئے تھے جو چلاس کی قدیم چٹانوں پر کھدے تھے۔[119]

کوہ پیمائی کی تمام کتابوں میں اسکولے کے حاجی مہدی کا بہت تذکرہ ہے جو اب بہت بیمار تھا۔ اب راستے میں جگہ جگہ سڑک بلاک ہونے سے بنیادی ضروریات زندگی چینی اور گھی وغیرہ اسکولے تک نہیں پہنچی تھیں تو حاجی مہدی کے بقول لوگوں کو مشکلات کا سامنا ہے۔ اب عادت ہو گئی ہے اس لیے ان کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔ اسکولے پہنچ کر پورٹر بکرے کا مطالبہ لازمی کرتے ہیں۔ حاجی مہدی کے مطابق قوانین کی رو سے بیس سے کم پورٹر بکرے کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔ اسکولے کی تبدیلی کے بارے میں حاجی مہدی کا کہنا تھا:

> "میری نظروں کے سامنے بدل رہا ہے۔ آپ ادھر تیس برس پہلے آتے تو دیکھتے کہ اسکولے کیا ہے۔ آپ جانتے ہو کہ ادھر گاؤں میں چھ کنال کا رقبہ ایسا تھا جو صرف اس ہرکارے کے لیے مخصوص تھا جو سکردو کے راجہ کا پیغام لے کر چین جاتا تھا۔ مستاگ ٹاور کے درے کو عبور کر کے۔ اور یہ رقبہ اب بھی اس ہرکارے کی اولاد کی ملکیت ہے۔ ہمارا قدرتی رابطہ ادھر تھا۔ چین اور تبت کے ساتھ۔ پاکستان بننے کے بعد ادھر ہو گیا ہے پنجاب کے ساتھ۔"[120]

اسکولے کے چوک میں گاؤں کے چوپال کی طرح عمر رسیدہ لوگ جمع ہوتے تھے ان میں سے چند ایک سکردو سے آگے گئے تھے۔ قیصر گراؤنڈ میں پورٹر اپنے لیے لکڑی جمع کرتے ہیں۔ گائیڈ نے بکرے اور اس کے حصے کے روپے فی پورٹر لینے میں فرق بتاتے ہوئے کہا کہ بکرے اور روپے میں فرق ہوتا ہے۔ روپیہ بیوی کھائے گا جبکہ بکرا تو پورٹر خود کھاتا ہے۔ پہلے راستے میں اسکولے سے آگے کوئی دیوار نہیں ہوتی تھی مگر اب زمین کی قیمت بڑھنے سے کسی کسان نے

اپنی ملکیت مستحکم کرنے کے لیے پتھروں کی چار دیواری بنادی تھی۔ راستے میں کنکورڈیا ٹریک کے دوران ایک مہربان رہنے والے پورٹر وحید سے مصنف کا اب سامنا ہو گیا۔ چند ہی برسوں میں پہاڑوں کی سختی اور مشقت سے وہ بہت جلدی بوڑھا ہو گیا تھا۔

مصنف نے عام بلتی پورٹر کی خصوصیات بیان کی ہیں کہ وہ محبت کرنے والے اور مہربان مددگار ہوتے ہیں۔ لیکن اس سفر کے دوران پورٹر یوسف گائیڈ کی پسند کے تھے وہ ٹیم سے لاتعلق رہے۔ ہر کیمپنگ سائٹ کی طرح نملا میں بھی پورٹروں کے لیے پتھریلی چار دیواری تھی۔ راستے میں ایک جگہ کسی اور ٹیم کے پورٹر واپس آرہے تھے، انھوں نے انھیں تیز نمک والی چائے پیش کی جو بلندی پر سانس بحال کرتی ہے۔[121] پورٹروں یا گائیڈ سے کسی خوشنما منظر تک جانے کی بات کی جاتی تو وہ کہتے بیکار پتھر ہے، بیکار پھول ہے انھیں دیکھ کر کیا کریں گے۔ ایک جگہ آبشار کے قریب اونچی چٹان میں شکاری کا غار تھا جہاں وہ مارخور کے شکار کے لیے بیٹھتا تھا اور لکڑی جمع رکھتا تھا۔ پورٹر اس کی جمع شدہ لکڑی چوری جمع کرنے کے لیے جاتے تھے۔ بعد میں شکاری کو بتادیتے تھے وہاں یہ رواج تھا۔ لاٹوک کی چوٹیوں کے بارے میں مصنف نے جغرافیائی معلومات فراہم کی ہیں۔ مانگو میں موجود یاک اوپر پانامہ گلیشیئر کی طرف کوچ کر چکے تھے۔ اس سفر کے دوران صرف پورٹر عباس اور نثار مددگار رہے۔ اگلی کیمپنگ سائٹ میں بھی پورٹر اپنی پتھریلی آماجگاہوں میں براجمان مزے سے گھی ملی نمک والی چائے پیتے تھے اور ٹیم کے خیمے وغیرہ لگانے کے لیے کوئی آمادہ نہیں تھا۔ مصنف کے مشاہدے کے مطابق پورٹرز کے پاس چونکہ رات گزارنے کے لیے کوئی خیمہ نہیں ہوتا اس لیے ان کی پسندیدہ پڑاؤ کی جگہ وہ ہوتی ہے جہاں شدید موسم سے بچاؤ ممکن ہو۔ پورٹر کبھی کچن ٹینٹ میں پناہ لیتا ہے کبھی برف پر لکڑیاں جلا کر رات گزارتا ہے۔ کبھی دریا کی ریت پر لیٹ کر اور کبھی کسی چٹانی کھوہ میں۔[122] گلیشیر پر راستے میں کہیں دراڑ کا خدشہ ہوتا تو پورٹر یامبو یامبو کا نعرہ لگاتے۔ گائیڈ یوسف نے جھوٹ بولا کہ وہ سنولیک تک جاچکا ہے۔ بعد میں اس نے اعتراف کیا کہ روزی کمانے کے لیے اسے جھوٹ بولنا پڑا۔ بیانتھا میں جھاڑیوں کی شباہت اور باریک پتے چائے کے باغات سے مشابہ تھے۔ بیانتھا میں ریچھ کے ڈر سے کھانے پینے کا سامان باہر کھلا نہیں چھوڑا جاتا۔ بیانتھا میں ریچھ کے ڈر سے پورٹروں نے بھی جاگ کر رات گزاری۔

مصنف نے لاٹوک چوٹی سر کرنے کی تاریخ بھی بیان کی ہے۔ کوہ نوردوں کی عارضی بستیاں کیمپنگ سائٹس آباد اور برباد ہوتی رہتی ہیں۔ مارخو غورو اور للی گو کی کیمپنگ سائٹس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ گلیشیر کے کناروں پر دراڑیں زیادہ ہوتی ہیں جبکہ گلیشیر کے درمیان میں کم۔ سنولیک کے برابر میں سم گانگ گلیشیر کے پار وادی شمشال ہے۔ دوسری طرف خورد پن پاس کا راستہ ہے۔ سنولیک کو یہ نام 1892ء میں مارٹن کونوے نے دیا تھا۔ اسے مقامی طور پر لپ کے لا بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں برف کی تہہ ڈیڑھ کلومیٹر دبیز ہے۔ مصنف کے نزدیک سنولیک کا بہترین منظر درہ ہسپر کے بیس

کیمپ سے دکھائی دیتا ہے۔ ہر بڑا گلیشیر موسم گرما میں برف پگھلنے کے بعد اپنی حالت بدلتا ہے۔ اس میں نئی کھائیاں وجود میں آتی ہیں۔ ایسے ہی ایک جگہ ہسپر گلیشیر میں کسی کھائی پر دو فٹ چوڑی برف کی پٹی موجود تھی جس کے ساتھ دو پورٹروں نے دونوں طرف رسے کا سہارا بنایا جسے تھام کر ساری ٹیم پار گئی۔ ایک پورٹر ایک دراڑ میں گر گیا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے نکال کر اسکی مالش کی تو وہ زندہ ہوا ورنہ سردی سے نیلا پڑ گیا تھا۔[123] کھائی باسا کا پڑاؤ اردگرد پھیلی برف میں خشکی کا مختصر حصہ تھا۔ اسکے اطراف میں ونج پیک، شوگر لوف اور بال چش کی چوٹیاں تھیں۔ ہسپر گلیشیر میں کھائی باسا، بت مارو، پمار چنیش اور کنیانگ چنیش نامی گلیشیر بھی اترتے تھے۔ سفرنامے میں مصنف نے جابجا خارج کے ساتھ ساتھ داخلی واردات کا بھی اظہار کیا ہے۔ کنجوت سر دنیا کی انتسویں بلند ترین چوٹی بھی کھائی باسا گلیشیر کے قریب تھی۔ یہاں سے راستہ شمشال کو جاتا ہے۔ اسی کے قریب کنیانگ چش نامی چوٹی دنیا کی بائیسویں بلند ترین چوٹی ہے۔ ٹریک کے دوران ہر خطرناک نالہ پار کرنے کے لیے پورٹرز کی اپنی تکنیک ہوتی ہے۔ گائیڈ کوئی مختلف راستہ تجویز کرتا ہے۔ کسی مشکل مقام پر گائیڈ مصنف کو کہتا آجائیں صاحب مولا علی مدد کریں گے۔[124] یت مارو گلیشیر کے کنارے پڑاؤ میں ندی سوکھنے سے پانی نہیں تھا وہاں ایک پورٹر عباس نے زمین کے ساتھ کان لگا کر پانی بہنے کی آواز سنی اور اپنی انگلیوں سے زمین کو کھودا تو پانی نکل آیا۔[125]

پورٹروں کو سارے ٹریک کا راشن مہم شروع ہونے پر تقسیم کیا گیا تھا مگر انھوں نے جلدی ختم کر لیا، ان کے پاس صرف چائے بچی تو وہ فریاد لے کر ٹیم لیڈر کے پاس آئے۔ استفسار پر اس کا کہنا تھا: "ختم ہو گیا صاحب۔ زیادہ کھا لیا تو ختم ہو گیا۔ غریب لوگ کو کیا پتہ کتنا کھانا ہے وہ تو کھاتا جاتا ہے تو ختم ہو گیا"[126]

مقامی پورٹروں کے بقول ہسپر گاؤں میں مارخور کا گوشت عام ملتا ہے۔ ریڈ سٹار کیمپ میں رات کے وقت سب خشک ندیاں رواں ہو گئیں۔ اوپر پڑنے والی کچھ برف شام تک پگھلتی ہے اسکا پانی رات تک یہاں پہنچتا ہے۔ اگلے دن دوپہر تک خشک ہو جاتا ہے۔ مر قوم چش کی چوٹی کے دامن میں ہرن موجود تھے۔ بتیان مل نامی جگہ کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر مصنف نے بتیان جو شمال میں مستقبل کا حال بتانے والے شخص کو کہتے ہیں سے منسوب واقعات کو اپنے سفرنامے میں شامل کیا ہے۔[127] ہسپر میں مقامی لوگ جو گلگت میں مزدوری کرتے تھے مصنف کی ٹیم کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ ہسپر گاؤں کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

> "ہسپر ایک اسکولے طرز کا گاؤں تھا۔ لیکن اسکولے نہ تھا۔ بالکل نہ تھا۔ اس میں پوشیدگی اور اداسی بہت تھی۔ یہاں حسن کا اگر کوئی رنگ تھا تو دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس میں شوخی اور موسم کی مسرت نہ تھی۔ خاموشی تھی۔ پتھریلی دیواروں کے بیچوں بیچ چلتے ہوئے خاردار باڑوں کے عقب میں گھر تھے۔۔۔ فصل کٹ چکی تھی۔ کھیتوں میں جو کی فصل کے گٹھے پڑے ہوئے تھے۔ زرد رنگ کے نہایت سلیقے سے بندھے ہوئے۔"[128]

ہسپر کا ریسٹ ہاؤس صرف ٹوٹے پھاٹک پر مبنی تھا۔ اس میں موجود کمرے زمین بوس ہو چکے تھے۔ وہاں راستے پر شام کو خواتین اپنے مویشی چرا کر واپس آرہی تھیں۔ ہسپر میں واحد دکان اور واحد جیپ کے مالک شیخ صاحب تھے۔ اس کی جیپ بستی سے باہر تھی۔ مقامی آدمی اسے لانے کے لیے رات کے وقت ہی روانہ ہو گیا۔ صبح کے وقت ریسٹ ہاؤس کے باہر ہسپر کے بچے بھی موجود تھے جن کے لیے ٹیم کے افراد تماشا تھے۔ باقی سیاحوں کے تجربے کے برعکس مصنف نے ہسپر کے مقامی لوگوں کو بھلے پایا۔ ان کے لیے یہاں آنے والے کوہ نورد افراد کو دیکھنا تفریح تھا۔ اور صرف چار ماہ سیاحوں کے آنے کی وجہ سے یہاں کے پورٹر زیادہ مزدوری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ دوپہر کو مقامی خوراک چھپ شورو کھائی گئی جو پائی کی طرح تھی۔ میدے کے اندر مرغی کو دم پخت کیا گیا تھا۔ ہسپر گاؤں کی قدیم ترین چوبی مسجد نے سادہ اور گمنام ہونے کے باوجود مصنف کو بہت متاثر کیا۔ اس میں قدیم نسخوں والے کتابت شدہ قرآن پاک، خطاطی کے نمونے، کربلا کی خاک کی ٹھیکریاں اور مارخور کی کھالیں تھیں۔[129]

ہورو میں مقامی چرواہا خوش تھا کہ گوروں کے علاوہ پاکستانی بھائی بھی ادھر آئے ہیں۔ ایک جگہ چرواہے لکڑی کے سانچے میں دودھ بلوتے تھے۔ شاہراہ ریشم نگر سے نہیں گزرتی اس لیے دنیا بھر کے سیاحوں نے اس خوبصورت وادی کو فراموش کر دیا ہے۔ ہنزہ سے گزرتے ہوئے مصنف نے ہنزہ کے پرانے سفر کی یاد تازہ کی ہے۔ لیکن اب قدیم ہنزہ میں کچے راستوں کی جگہ ہوٹل اور جدید عمارتیں زیادہ تھیں۔ بارہ برس میں ہنزہ میں بہت تبدیلیاں آئی تھیں۔ اب ہنزہ بازار میں رونقیں تھیں، سیاحوں کا ہجوم تھا، روشنیاں تھیں، سپر سٹور تھے، ریستوران، موسیقی، کاروں، موٹر سائیکلوں کا بے ہنگم شور تھا۔[130]

دیوسائی(1997ء)، مستنصر حسین تارڑ

مستنصر حسین تارڑ نے دیوسائی اور برجی لاء کا یہ سفر اپنے ساتھیوں کے ساتھ 1997ء میں کیا۔ دیوسائی کے راستوں کے بارے میں جغرافیائی، معلومات دیتے ہوئے مصنف بتاتے ہیں کہ اس کے تین اطراف سکردو، استور اور گلتری سے راستے ہیں۔ چاروں طرف 18 ہزار فٹ بلند تک چوٹیاں ہیں۔ برجی لا درہ ہے۔ دیوسائی کی لمبائی چھتیس کلومیٹر اور چوڑائی چوبیس کلومیٹر ہے۔[131] قراقرم کا ترکی میں مطلب ہے سیاہ بھربھری چٹانیں۔ تیز بارش ان میں سرایت کر کے ان کی مٹی اپنی جگہ سے کھسکاتی ہے۔ مصنف کے گزرنے کے فوراً بعد چٹانوں کے گرنے سے سکردو روڈ ایک ہفتے کے لیے بلاک ہو گئی۔ سکردو میں کے ٹو موٹل بالکل فل تھا۔ وہاں مصنف اور ان کی ٹیم کے لیے گنجائش نہ تھی۔ چھ جاپانی جو کے ٹو کے قریب برفانی طوفان کی زد میں آکر ہلاک ہو گئے تھے ان کے رشتہ دار وہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مصف کو ہنزہ ٹورسٹ ہاؤس میں قیام کرنا پڑا۔ اگلی صبح سکردو برفباری سے سفید تھا۔ نذیر صابر معروف کوہ پیما نے مصنف کو

جاپانیوں کے حادثے کی تفصیل بتائی۔ بلتی پورٹر خون دیکھ کر بہت خوفزدہ ہوتے ہیں۔ حادثے کے زخمیوں کی مدد وہاں خیمہ زن ایک غیر ملکی ٹیم نے کی۔[132] نذیر صابر ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے والے والے بھی پہلے پاکستانی ہیں۔ سکردو بازار میں ملنے والی مقامی خوراک زوہ کا گوشت اور منتو کا ذکر کیا ہے۔ ہر طرف لینڈ سلائڈ سے سکردو کے اطراف کے راستے بند تھے۔ سکردو بازار میں مصنف کی ملاقات اس پورٹر سے ہوئی جو پچھلے سفر میں ان کے ساتھ دیوسائی ٹاپ تک گیا تھا۔ وہ پہلے قصائی تھا پھر پورٹر ہو گیا۔ ہر بلتی عمر کے کسی نہ کسی حصے میں پورٹر ہوتا ہے۔ اب وہ ایک معزز دکاندار تھا۔[133] اس کی دکان کی چیزیں سیکنڈ ہینڈ ہونے کے باوجود بہت مہنگی تھیں۔ سنولیک ٹریک کے گائیڈ یوسف اور عباس پورٹر سے بھی مصنف کی ملاقات ہوئی۔ شگر یلا میں ہوا سے درختوں سے گرنے والے سیب گھوڑوں کو کھلانے کے کام آتے ہیں۔ کچورا کے سیب رسیلے، آڑو اور سٹرابری رس بھری تھی۔

صدپارہ نالے کے کنارے رات کو بہت جگنو ٹمٹماتے تھے۔ وادیٔ صدپارہ میں مل پن، پلولو، بڑا گاؤں، میر کو، ڈاری جیسے گاؤں تھے۔ دیوسائی ٹاپ کی طرف جنگلی حیات کے تحفظ کے ادارے کی جیپ میں جاتے انھیں دیوسائی کا نایاب سنہری عقاب نظر آیا۔ دیوسائی کے پچھلے سفر میں مصنف کو جابجا ہریاول اور انوکھے رنگ و خوش بو والے پھول بکثرت نظر آئے تھے مگر اب دیوسائی بھوری بے پناہ وسعت کا حامل تھا۔ مصنف کی ٹیم کے ساتھ شامل ایک پورٹر علی مددنے دیوسائی ٹاپ تک سامان پہنچا کر یہاں ہوٹل کھولا۔ دس روپے فی انڈہ اور دس روپے فی کپ چائے کے طلب کیے کیونکہ وہاں تک چیزیں پہنچانا بہت مشکل تھا۔ وہاں خیمہ ہوٹل میں تہہ در تہہ رضائیاں سٹور تھیں اور فرش پر گدے بچھے تھے۔ یہاں سرد تنہائی کا دور افتادہ احساس تھا۔ پورٹروں میں عباس کی کمر پر سب سے زیادہ بوجھ سزا کے طور پر لادا گیا تھا۔ کیونکہ وہ واحد پورٹر تھا جو صدپارہ کا نہ تھا اور مصنف کی پسند کا تھا۔ دیوسائی کی چوٹیاں پستہ قد اور ٹھگنی ہونے کی وجہ ان کا چودہ ہزار فٹ کی بلندی سے شروع ہونا ہے۔ ٹریک کی پہلی شام ہی پورٹروں نے حسب روایت بغاوت کر دی کہ اگر اور پورٹر ہائر نہ کیے گئے (جنھیں دکاندار گائیڈ علی نے اس وقت بلا لیا تھا) تو وہ سب سامان چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اور وہ گائیڈ بر جی لا تک نہیں گیا تھا جھوٹ بول کر آیا تھا کہ دیوسائی کا چپہ چپہ جانتا ہے۔[134] دیوسائی میں ستارے زیادہ قریب دکھتے تھے۔

دیوسائی کی ایک ایک پگڈنڈی کی، گھاس کی، مرجھائے پھولوں کی، برف کے آثار کی، بادلوں کی مصنف اتنی جزئیات کے ساتھ منظر کشی کرتے ہیں کہ کوئی بھی تفصیل اوجھل نہیں ہونے پاتی۔ اہل سکردو دیوسائی کے بر جی لا والے حصے کو من پسند قرار دیتے ہیں اور چمن کا نام دیتے ہیں۔ ملک لا کی وادی سے آگے مصنف کی ٹیم راستہ بھول گئی۔ برفباری میں بھی شدت آگئی۔ علی نامی تین پورٹروں میں ایک ہمدرد پورٹر تھا۔ غیر متوقع برف باری کے بارے میں اس کا کہنا تھا:

"نہیں گرتا صاحب۔ لیکن یہ دیوسائی ہے۔ ادھر دیو لوگ کا گھر ہے۔ کیا پتہ کب برف گرا دے، کب اولے گرائے اور کب بارش لائے۔ یا کب اتنا دھوپ ہو جائے کہ ادھر کربلا ہو جائے اور لوگ پیاس سے مر جائے۔ یہ دیوسائی تو ایسا ہے صاحب۔"[135]

برجی لاء کے دامن سے ٹاپ تک ایک خچر راستہ جا کر دوسری طرف سکردو میں اترتا ہے۔ وہاں لچھن جھیل بھی تھی جسے مقامی لوگ کھانا گوش کہتے تھے۔ برجی لا ٹاپ سے بائیں جانب لیلیٰ پیک اور گولڈن پیک تھیں۔ دائیں طرف کنکورڈیا کا منظر نامہ تھا۔ ان میں کے ٹو، براڈ پیک، گشابرم، مشابرم، چوغولیزا تھیں۔ اس دن وہاں موسم بہت صاف تھا۔ برجی لاء سے اوپر ایک چھوٹی سی چوٹی سے پچھلی جانب نانگا پربت بھی نظر آتا ہے۔ وہاں سے نیچے دو جھیلیں دریلا جھیلیں کہلاتی تھیں۔ ایک بلتی پورٹر کے بقول گلتری اور دور دراز کی وادیوں سے آنے والے لوگ روزگار کی تلاش میں سکردو آنے کے لیے دیوسائی کو عبور کرتے ہیں۔ بعض اوقات رات کے وقت وہ بھی دیوسائی میں بھٹک جاتے ہیں اور ایک ہی مقام پر چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ مصنف بھی برجی لا سے اترتے ہوئے دوبارہ دیوسائی روڈ کا راستہ بھول چکے تھے۔ رات گزارنے کے لیے ان کے پاس خیمہ بھی نہیں تھا۔ مقامی لوگوں کے مطابق پہلے دیوسائی پر آبادیاں تھیں۔ کھیت کھلیان تھے۔ پھر کسی بزرگ کی بددعا سے موسم بدلے تو بستیاں ملیامیلٹ ہو گئیں۔[136]

شدید تھکاوٹ میں مصنف نے ایک پورٹر اور کھانے کا سامان چھوڑ کر باقیوں کو آگے شتونگ پہنچنے کا کہا کہ وہ صبح پہنچ جائیں گے۔ مگر علی مدد دوسرے پورٹر علی کو ساتھ رکھنے کے حسد میں خیمہ یا سلیپنگ بیگ ان کے لیے نہیں چھوڑ کر گیا۔ جبکہ پورٹر آگے چلے گئے اور مصنف کی ٹیم کے تین لوگ بھی وہیں تھے۔ تب غیر متوقع طور پر بھٹکتے بھٹکتے اندھیرے میں وہ ایک سڑک پر آنکلے اور چلتے چلتے بلوم ڈدے پہنچے۔ جس مقام سے پورٹر رخصت ہوئے تھے وہ واٹو پائی کہلاتا تھا۔ شتونگ کا لفظی مطلب ہے گوشت ملنے کی جگہ۔[137]

شتونگ میں دیوسائی کا تیج ہوٹل تھا۔ جو دو خیموں پر مشتمل تھا ایک ریستوران اور دوسرا رہائش کے لیے۔ وہاں مچھلی کے شکار پر پابندی ہے۔ ایک پورٹر نے کپڑے سے نالے میں نو مچھلیاں پکڑیں۔ پابندی کے باعث وہ چھپ کر کسی تنگ جگہ کپڑا ڈالتے ہیں تو اس میں مچھلیاں آجاتی ہیں۔[138] ان علاقوں میں امداد باہمی کا اصول رائج ہے۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ مصیبت میں کون گرفتار ہے۔ جانے بغیر مدد کے لیے تیار رہتے ہیں۔ جیسے شتونگ میں ایک ندی کے پانیوں میں پھنسنے والی جیپ کو نکالنے کے لیے کاٹیج کا عملہ اور پورٹر سب روانہ ہو گئے۔ آگے ایک جگہ راستے میں لمبے بالوں والی بکریاں اور ان کے رکھوالے بکروال تھے۔ وہی بکروال جو موسم کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں اور برف پگھلنے کے ساتھ سکردو میں اترتے ہیں تو سکردو کے لوگ واقف ہوتے ہیں کہ دیوسائی کا راستہ کھل چکا ہے۔ یہ بکروال سیکڑوں سال سے اس راستے پر نسل در نسل سفر کرتے ہیں۔ یہ پنجابی بکروال تھے جن کے بقول ان کا سفر جہلم سے شروع ہو کر مظفر

آباد، کیل، منی مرگ، دیوسائی اور سکردو تک ہے۔ بکروال کے مطابق یہاں ریچھ کا خطرہ اتنا نہیں ہوتا جتنا لوگ شور کرتے ہیں۔ سیزن میں دو چار بکریاں لے جاتا ہے مگر انسانوں کے قریب نہیں آتا۔[139] مارموٹ کو بلتی میں پھیا اور شنا میں تروشن کہتے ہیں۔

بڑا پانی کے پل کی لکڑی سردیوں میں چلم چوکی اور صدپارہ کے گھروں میں جلتی ہے۔ موسم کھلنے پر ہر سال نیا پل تعمیر ہوتا ہے۔ بڑے پانی کے کناروں پر سنہری گھاس تھی۔ شمس کٹ سے آگے کا علاقہ کالا پانی کہلاتا تھا۔ دیوسائی کے تمام نالے شتونگ، کالا پانی، سار سنگری، مرتضی چوکی، لمالنگ، پھیالنگ، وٹو گیر اور بڑا دریا شنگو سب بڑا پانی میں شامل ہوتے ہیں جو گلتری میں پہنچ کر اپنا نام بدل کر شنگو شگر رکھ لیتا ہے۔ علی نے ڈوری میں چارہ لگانے کے لیے ندی کنارے پتھر کے نیچے سے گیلی لکڑی اٹھا کر توڑی جس میں کیڑے تھے۔ اس کو ڈوری پر لگا کر مچھلی پکڑی۔ بڑے پانی کے مخدوش پل پر سے جیپیں گزارنے کے لیے انھیں سواریوں سے خالی کرایا جاتا تھا۔ دیوسائی میں قدیم بستیاں اجڑنے کی صرف روایتیں تھیں کوئی باقاعدہ آثار نہ تھے۔ جنگلی حیات والے دیوسائی میں ریچھوں کی حفاظت کے بارے میں جو اقدامات کر رہے تھے ان کی تفصیل مصنف نے کتاب میں شامل کی ہے۔ ریچھوں کی مانیٹرنگ کا مناسب بندوبست ہے۔ سرمائی نیند پوری کرنے کے بعد جب ریچھ غاروں سے باہر آتے ہیں تو انھیں دیکھ بھال کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ وائلڈ لائف کا انچارج حلیم استور کا رہنے والا تھا۔ اس نے کہیں اور ملازمت کی بجائے اپنے علاقے کی خدمت کو ترجیح دی۔ بڑا پانی دیوسائی کے سکردو اور استور کے علاقوں کی حد بندی کا کام کرتا ہے۔ اس وقت تک دیوسائی میں 26 ریچھ باقی بچے تھے ریچھوں کے بارے میں محکمہ تحفظ جنگلی حیات کے محمد حلیم اور رفیق راجپوت کی فراہم کردہ تفصیلی معلومات کو مصنف نے کتاب کی زینت بنایا ہے۔ ریچھوں کے مختلف نام رکھے گئے ہیں جیسے بگ بوائے آف کالا پانی، بگ بوائے آف بڑا پانی، سٹیمپ بوائے آف کالا پانی، شیطان نمبر ایک، شیطان نمبر دو، چالاک ریچھ وغیرہ۔ ریچھ کے لیے 28 سال کی عمر بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ریچھ مچھلیاں اور مارموٹ کھاتا ہے۔ دیوسائی کے پرندوں میں عقاب، گل، لارک، ممولا، ویگ ٹیل، پدیاں اور چڑیاں شامل ہیں۔ لوگ سنہری عقاب کا غیر قانونی شکار کر کے باہر کے ملکوں میں سمگل کرتے ہیں۔ بڑا پانی سے منی مرگ جانے کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ دیوسائی روڈ پر سفر کر کے چلم چوکی پھر برغل پاس کے پار۔ دوسرا کالے پانی کے پار گلتری روڈ کی طرف مرتضی چوکی سے اترکر ہے۔[140]

دیوسائی پر ماچس کی لکڑی بنانے کے لیے بھی لکڑی میسر نہیں، نیچے سے لانی پڑتی ہے۔ اگلی صبح ریچھ ان کے قدرتی علاقوں میں دیکھنے کی خواہش میں مصنف گھاس کے میدانوں تک گئے مگر کوئی ریچھ نظر نہ آیا۔ راستے میں بیار پنگ نامی ایک پرندہ نظر آیا۔ ان علاقوں میں قدیم کہاوت ہے کہ جس کا قسمت برا ہو وہ دیوسائی پر جاتا ہے۔[141] پہلے استور کو مرکزیت حاصل تھی۔ اہل استور اور اہل سکردو کا آپس میں ہمیشہ سے جھگڑا رہتا ہے۔ سرینگر کشمیر سے لوگ

پہلے استور میں اترتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد جہاز سکردو میں اترنے سے اس کی اہمیت بڑھ گئی۔ گلتری کی طرف سے منی مرگ جاتے راستے میں ایک جگہ برف کی دلدل میں دھنس جانے سے جیپ آگے جانے سے انکاری ہو گئی۔ مرتضی چوکی کے قریب جیپ کے بریک فیل ہو گئے۔ مرتضی چوکی میں محمد حسین نے انھیں چائے اور بسکٹ پیش کیے۔ بعد میں اپنے کمروں میں رات بھی ٹھہرایا لیکن ایک لیفٹنٹ نے آکر جواب طلبی کی۔ مستنصر کو فوج کی طرف سے پہلی بار مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے خالی فوجی ٹرک میں مصنف کی ٹیم کو آگے تک لے جانے سے بھی انکار کر دیا۔ چھوٹے دیوسائی کے نالے میں مقامی لوگ خالی ہاتھ ڈال کر مچھلی پکڑ لیتے ہیں۔ دفاع کے حوالے سے برزل درے کی بہت اہمیت ہے۔ یہیں سے کشمیر کی کنٹرول لائن تک فوجی ساز و سامان جاتا ہے۔ چلم چوکی نے مصنف کو مایوس کیا۔ وہاں مانسہرہ سے آکے ایک آدمی ہوٹل چلاتا تھا۔[142]

شمشال بے مثال (1999ء)، مستنصر حسین تارڑ

چین کی سرحد کے قریب واقع شمشال کا یہ سفر نامہ مستنصر حسین تارڑ نے 1999ء میں کیا۔ شمشال کی قدامت اور تاریخ میں تذکرے کے حوالے سے مصنف کا کہنا ہے کہ پچھلے زمانوں میں ہنزہ کے میر اپنے مجرموں اور مخالفین کو سزا دینے کے لیے شمشال بھیجتے تھے۔ یہ ان کا کالا پانی تھا۔[143] دریائے شمشال کے کنارے سونے وال کے جھونپڑے تھے جو دریائے شمشال سے سونا نکالتے ہیں۔ بائیں جانب کے پہاڑ کا نام کوہ قارون تھا۔ شمشال میں قدیم آباد کاری کے حوالے سے روایت ہے کہ ان کا دادا (پہلے شمشالی کو وہ دادا بولتے ہیں) پندرہ نسلیں پہلے مارخون کے قصبے سے کوہ قارون عبور کر کے آیا اور وہاں آباد ہوا۔ ایک رات لٹیروں کے حملے سے جان بچا کر شمشال میں اترا۔ وہاں کسی آبادی کے آثار تھے مگر کوئی موجود نہیں تھا۔ جھونپڑے، کھنڈر، کاشتکاری کے اوزار، پتھر کے برتن، کپڑا بننے کی کھڈیاں، یاک کے جوتے، آتش دان تھے۔ یہ دراصل پامیر سے ترکستان جانے والے مسافروں کے ٹھکانے تھے۔ دادا نے بڑا پتھر ہٹایا تو اس کے نیچے مٹی کے نیچے نہر تھی۔ دادا نے وہاں رک کر کاشتکاری شروع کی۔ ایک بزرگ نے اس کی بیوی خدیجہ سے کہا بھیڑ کی قربانی کرو تمھارے ہاں اولاد ہوگی۔ بزرگ غائب ہو گیا بھیڑ رہی۔ اس کی قربانی کی برکت سے اس کی بہت اولاد ہوئی۔ تمام شمشالی اس کی اولاد ہیں۔ مامون سنگھ کے بیٹے شیر نے یاک پر بیٹھ کر چینیوں کے ساتھ پولو کھیلا۔[144]

سترہ برس قبل جب مصنف پہلی بار گلگت گئے وہ ایک ویران جزیرے کی مانند تھا، اب وہاں ہجوم تھا رونق تھی اور بڑا شہر بن چکا تھا۔ مصنف کے گلگت میں ہونے کا سن کر روپل ہوٹل میں ان کے اعزاز میں محفل سجی تھی۔ مقامی موسیقار لوک گیت پیش کر رہے تھے۔ مصنف سے محبت کرنے والے شمال کے لوگ وہاں جمع تھے۔ فیری میڈو کے رحمت نبی نے کھڑکی کھولی تو گلگت کی ہوا کو زہریلی ہوا کہا۔ دیگر لوگوں کی بات چیت میں گلگتی موسیقار عدم توجہی

برداشت نہ کر سکے اور احتجاج کیا کہ آپ سمجھتے ہیں صرف ہنزہ اور بلتستان کا کلچر ہے جبکہ گلگت کی ثقافت سب سے جدا ہے۔ گلگت میں سیاحت کی ترویج کے لیے ہونے والی عالمی کانفرنس میں آغاخان رورل سپورٹ پروگرام کے بانی شعیب سلطان کا تذکرہ کیا ہے کہ انھوں نے شمالی علاقوں میں حیرت انگیز زرعی اور سماجی انقلاب کی بنیاد رکھی۔[145]

رجب شاہ ہائی پورٹر کو مصنف نے پاکستان کا سب سے بڑا کوہ پیما قرار دیا ہے۔ وہ نانگا پربت سر کرنے والوں میں شامل تھا پر اس کی کوئی تصویر یا انٹرویو رپورٹ میں شامل نہ تھا۔ اس کانفرنس میں رجب شاہ بھی تھا جو مصنف کو شمشال لے کر گیا۔ قدیم سلک روٹ پر تحقیق کرنے والی پروفیسر ہاروکا بھی تھیں۔ شمشال کا سفر آسان ہونے کی خبریں تھیں مگر وہ صرف شمشالیوں کے لیے آسان ہوا تھا۔ گلگت میں ایک گھر کے اندر ایک ٹورسٹ ہوٹل ایسا بھی تھا جس کا مالک شہرت کا شوقین نہ تھا۔ اس کی خواہش تھی اس کے ہوٹل کا نام یا اس کا کام کسی کتاب میں نہ دیا جائے ورنہ لوگ زیادہ آئیں گے اس کے پاس گنجائش کم تھی۔ اس نے کھانے کے بعد چوموروچائے پلائی۔ روپل ہوٹل کے کمرے میں چلاسی رقص اور ہنزہ کے بھی روایتی رقص کا مظاہرہ کیا گیا۔ شمال میں داد دینے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ نوٹ لہراتے ہوئے اٹھیں اور رقاص کے گرد چکر کاٹ کر اس کی ٹوپی میں اڑس دیں۔ بعد میں بگروٹیوں کے بارے میں لطائف سنائے گئے جن سے جملہ حاضرین محظوظ ہوئے۔ جیسے گائے کو حلال کرنے کے لیے بگروٹیوں کو چھری نہیں مل رہی تھی۔ ایک بگروٹی مکان کی چھت پر گیا وہاں چھری دیکھ کر بولا چھری تو یہاں ہے گائے کو اوپر لے آؤ۔[146]

سلطان آباد میں فضل احمد کے ماموں رحیم بیگ نے مصنف کو اپنے گھر مدعو کیا۔ ماموں فضل کے ہم عمر تھے۔ ماموں کے دادا نے وہ پوری پہاڑی پانچ سو روپے میں خریدی تھی جس پر ان کا گھر تھا۔ خریدتے وقت برادری والے مذاق اڑاتے تھے کہ پتھروں کو پانچ سو روپے میں خریدنا بے وقوفی ہے۔ پر شاہراہ ریشم کے بعد گلگت شہر پھیلتا ہوا یہاں تک آگیا۔ ماموں کا شمار ہنزہ کے بہترین رقاصوں میں ہوتا تھا۔ اس شام میں مصنف کو مسرت کو گناہ نہ سمجھنے کے خوف سے آزادی کی کیفیت محسوس ہوئی۔[147]

غل مت کی نان نما خوراک چھپ شورو مقامی ڈش ہے۔ جس میں آٹے کے اندر گوشت کو دم پخت کیا جاتا ہے۔ یہ نگر کی خاص سوغات ہے۔ شاہراہ قراقرم سے جس جگہ راکاپوشی کا نظارہ نظر آتا تھا مصنف کے پچھلے سفر کے دوران وہاں صرف ایک پل اور پر شور نالہ تھا اور خاموشی تھی۔ اب اس راکاپوشی ویو پوائنٹ پر ہوٹل، ریستوران، بازار تھے۔ سیاحوں کا ہجوم تھا۔ قدیم و جدید زمانے کے تقابل کے ساتھ مصنف نے یہاں شغل میلے کے لیے آنے والے گاہکوں کو تماشا دیکھنے والے اور خود کو اس کی پرستش کرنے والا قرار دیا ہے۔[148]

ہنزہ کے آغاز میں شاہراہ ریشم کے کنارے شہتوت اور خوبانی کے باغ میں ایک قدیم کنویں سے طرح طرح کی روایات وابستہ تھیں۔ جب لوگ پرانے راستے پر دریا کے اوپر پیدل سفر کرتے تھے۔ گلگت سے ہنزہ کے راستے میں

کہیں پینے کے پانی کا قطرہ تک نہ تھا۔ تب یہ کنواں موجود تھا۔ مسافر اس کی آس میں چلتے تھے کہ پانی آئے۔ یہاں ایک کہاوت تھی کہ اس کنویں کی حفاظت پر پریاں مامور ہیں۔[149]

ہنزہ کے ذکر کی ذیل میں مصنف نے قدیم ہنزہ کی جھلک دکھائی ہے۔ جب یہ بہت حد تک گمنام تھا۔ ہنزہ کے دربار ہوٹل میں وادئ ہنزہ کا مزاج رچا بسا تھا۔ اس میں پتھر کے برتن شمشال سے لائے گئے تھے۔ بلتت قلعے کو روایت اور قدامت کی پاسداری کرتے ہوئے از سر نو تعمیر کیا گیا تھا۔ ہل ٹاپ ہوٹل میں شمال کی جنگ آزادی کے ہیروز میں سے ایک گروپ کیپٹن شاہ خان تھے۔ شمالی علاقوں کی عوام کو مسلح جدوجہد کے بعد پاکستان میں شمولیت کے باوجود آئینی حقوق سے محرومی پر بہت دکھ ہے۔[150] جنگ آزادی کے ہیروز کو مختلف ٹائٹل دیے گئے۔ کرنل حسن خان کو ہیرو آف ٹائیگر فورس، بریگیڈیر اسلم کو پاشا، کرنل احسان علی کو ہیرو آف ائی بیکس اور گروپ کیپٹن شاہ خان کو ہیرو آف سکیمو فورس کا خطاب دیا گیا۔ شاہ خان کو زوجی لا درے پر پاکستانی پرچم لہرانے کے کارنامے پر ستارہ جرات و امتیاز عطا کیا گیا۔ کارگل معرکے کے اہم کارناموں کو مصنف نے سفر نامے میں بیان کیا ہے۔

ہنزہ بھی گلگت کی طرح تبدیلی کی زد میں ہے مگر اہل ہنزہ کی زندہ دلی جوں کی توں ہے۔ ہندی کے قصبے میں مقیم ایک بڑھیا سے ملنے مصنف اس کے گھر گئے۔ جو بہت ضعیف تھی۔ میل کچیلی ٹوپی اوڑھے مینڈھیاں سر پر بکھری تھیں۔ وہ بڑھیا اس وادی میں سب سے بہترین عرق کشید کرتی تھی اور ایمانداری کے باعث اس کے کام میں بہت برکت تھی۔ ستر برس سے وہ شہتوت کا عرق تیار کر رہی تھی۔ اس کے گھر کے راستے میں ایک جگہ میر آف ہنزہ کا پرانا اجڑ چکا مہمان خانہ تھا۔ کسی زمانے میں وہ یہاں اپنے مہمانوں کو چاندنی راتوں میں راکاپوشی کا دیدار کرانے لاتے۔ ایک سکول میں آدھی چھٹی کے وقت بچے درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھے پھل کھا رہے تھے۔ اس ضعیف بڑھیا کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں:

> "یہ بڑھیا ہمارے رہن سہن کے کڑے اصولوں سے الگ تھلگ، ان قراقرمی بلندیوں پر ان سے بے خبر ایک ہی، ہمارے لیے ایک گنہگار، ایک بنی قدیم روایت کی پیروی کرتی تھی۔ ایک قدرتی عمل کی نگہبانی کرتی تھی۔ اور اسے اسی طرح سرانجام دیتی تھی۔ کسی بھی احساس جرم کے بغیر، جیسے ہم سب سکنجبین بناتے ہیں۔ جیسے ہم عرق گلاب یا عرق گاؤزبان بناتے ہیں۔ ویسے وہ شہتوت کا عرق بناتی تھی۔"[151]

شمشال پسو کونز کے پیچھے واقع تھا۔ مارکوپولو ان گل مت کا اولین ہوٹل ہے۔ پسو گاؤں میں مصنف نے واخی زبان کے موجد ماسٹر محمد حقیقت کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ شمشال کی مہم کے لیے سامان میں مٹی کا تیل نہیں تھا جو چینی سرحدی قصبے سوست سے پہلے کہیں سے بھی میسر نہیں تھا۔ دریائے شمشال کے پار ایک موڑ پر ویران کوٹھریاں بنی تھیں۔ اس جگہ کا نام ڈوٹ تھا۔ پہلے سڑک صرف وہاں تک تھی اب آگے کیمپ کے علاقے تک چلی گئی۔ وہ کوٹھریاں شمشالیوں کے کمرے تھے۔ وہ یہاں سے گزرتے ہوئے ان میں رات کر کے آگے چلتے ہیں۔ آگے لپ غرچوٹی سے

آنے والا لپ غر نالہ تھا۔ ڈوٹ سے ایک راستہ لپ غر پیک کے دامن تک جاتا ہے جو اہل شمشال کی چراگاہ ہے۔ روڈ کیمپ کے علاقے میں چٹانوں سے سڑک نکالنے کا کام ہو رہا تھا۔ وہاں اوپر شمشالی دکان تھی۔ جس میں درجنوں نیلے ڈرم تھے۔ یہ شمشالیوں کے سٹور اور ڈریسنگ روم تھے۔ وہ اپنی وادی سے سفر کرتے یہاں تک آتے، اپنے ڈرموں کے تالے کھول کر مناسب لباس پہنتے، فالتو سامان سٹور کر کے گلگت چلے جاتے۔ واپسی پر جتنا سامان اٹھا سکتے وادی لے جاتے۔ باقی ان ڈرموں میں محفوظ کر دیتے۔ کوئی عزیز رشتے دار خالی ہاتھ جاتا ہوا لے جاتا۔ اس پتھریلی عارضی آماجگاہ میں کچھ بستر تھے، لالٹین تھی۔ آٹا، چینی، ایک چولھا تھا۔ وہاں ہر مسافر کو مفت چائے پلائی جاتی تھی۔ چائے شمشالیوں کے مشترکہ فنڈ سے چلتی ہے۔[152]

ایک ہموار جگہ پتھروں کے نیچے رجب نے واکنگ سٹک سٹور کی ہوئی تھی کیونکہ وہ ڈرم میں نہیں آسکتی تھی۔ کے ٹو سر کرنے والے مہربان کا خوش مزاج پھرتیلا بیٹا رہبر بھی پورٹر کے طور پر بوجھ اٹھا رہا تھا۔ زیارت کے راستے میں ایک جگہ فصیل نما بلندیوں کا علاقہ شیطان کے ڈیرے کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں سے ہمیشہ سے پتھر برستے ہیں۔ لوگ ایک گھنٹے میں شاہ شمس کو یاد کرتے بھاگ کر اسے پار کرتے تھے۔ اب وہ راستہ ایک پل بنا کر ختم کر دیا گیا ہے۔ شمشال کے راستے کا پہلا پل ووین پل تھا۔ جس کے دونوں طرف تاروں سے بنے لوہے کے رسے تھے اور درمیان میں کہیں لکڑی کے تختے تھے۔ اس پل کے پار اہل شمشال کا پتھروں سے ترتیب دیا گیا باقاعدہ چوڑا راستہ تھا۔ یہ ان کی مشقت تھی کہ جب سڑک یہاں پہنچے گی تو یہ راستہ بنا ہو۔ زیارت میں پتھریلی آماجگاہوں کی چابی ایک پتھر کے نیچے سے رجب نے نکالی۔ یہ بھی شمشالیوں کے سٹور روم تھے۔ جو بھی ادھر پہنچتا ہے کہ جانتا ہے کہ ان کی چابی کہاں ہے۔ وہ انھیں کھول کر حسب ضرورت خوراک استعمال میں لاتا ہے اور رات بسر کر کے آگے چلا جاتا ہے۔ پہلے اہل شمشال گرمیوں میں نیچے نہیں آتے تھے۔ البتہ سردیوں میں دریا میں پانی کم ہونے کے باعث آسانی سے پار کر لیتے تھے۔ سردیوں میں شمشال میں کوئی فصل نہیں ہوتی اس لیے ضروریات زندگی کے لیے لوگ نیچے آتے ہیں۔ شاہ شمس کے عرس کے موقع پر ہر سال شمشالی خواتین آتی ہیں۔ اس لیے وادی کے راستے میں آنے والے پڑاؤ ڈوٹ، زیارت، گرم چشمہ وغیرہ ان کی سرائے ہیں۔ خواتین آتی ہیں تو کمروں کی صفائی ستھرا کرتی ہیں۔ وہاں صرف زیارت کے کمرے تھے۔ شاہ شمس کی زیارت دریا کے پار چٹانوں کے اوپر ہے۔ وہ شمشالیوں کے بزرگ ہیں۔ جن کی مرادیں پوری ہوں وہ جان جوکھوں میں ڈال کر وہاں پہنچ کر جھنڈے نصب کرتے ہیں۔ زیارت میں تبت نما ماحول تھا۔[153] وہاں سوپ نوش کرنے کے لیے قدرت نے چاقو سے تراش کر چمچہ بنا لیا۔ شمشال میں شاہ طالب اور بابا غنڈی کی زیارتیں مشہور ہیں۔ ان علاقوں میں کہاوت ہے:

"زیارت کا شمس اگر کچھ نہیں کرے گا تو پھر دیکھنا قارون کرے گا۔ یعنی شاہ شمس مہربان ہے اور کوہ قارون کے راستے سفر کرنے والے ہلاک ہوتے ہیں۔"[154]

پہلے وقتوں میں لوگ کوہ قارون کے راستے مارخون سے سفر شروع کرتے تھے اب پسو کے راستے آنے لگے۔ 1966ء تک وہیں سے آتے تھے لیکن بہت لوگ مر جاتے تھے۔ خوردپن اور مستاگ درے سے آتے بارہ دن لگتے تھے۔ تب تک شمشالی میروں کے غلام تھے، ان کے لیے نمک ڈھوتے اور بیگار کرتے تھے۔ پرانے زمانے میں میروں کی وجہ سے بہت ظلم ہوا۔ بھٹو کے بعد بیگار سے آزادی مل گئی۔ اب لوگ اپنے لیے مشقت کرتے ہیں۔ شمشال میں چکور بہت پائے جاتے ہیں۔ اگلا پڑاؤ شکر جوئی تھا جس کا مطلب میٹھے پانی کا تالاب ہے۔

شمالی پورٹر خیمہ ایستادہ کرنے کو چیلنج کے طور پر لیتے ہیں۔ رام چکور ان علاقوں میں اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ شمشالی لوگوں کے نوجوانی کے قصوں میں عشق کی بجائے جنگلی جانوروں کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ رجب نے سرخ بھیڑیا پکڑنے کا قصہ سنایا۔ اس نے ایک بار سنو ٹائیگر بھی دیکھا تھا۔ ایک بڑے سبز رنگ کے جانور کا سون کو مارنے کا قصہ بھی سنایا۔ کچھ بوڑھے لوگوں کے بقول پانی و خشکی کا یہ جانور بنگالی تھا۔ اس کی کھال ہنزہ کے میر کو تحفتاً دے دی۔[155]

رات گزارنے کے لیے زیارت سے لائے سامان کو پورٹروں نے شکر جوئی میں بڑے پتھروں کے نیچے سٹور کر دیا کہ دوسرے مسافر گزرتے ہوئے اسے وہاں پہنچا دیں گے۔ ان راستوں پر شمشالیوں کے علاوہ کوئی نہیں چلتا اس لیے بالکل محفوظ رہتے ہیں۔ اور یہ رواج ہے کہ نیچے آتے ہوئے راستے کا سامان بوجھ کر کے اگلی منزل پہ پہنچایا جاتا ہے۔ آگے یرک جریخت نامی بڑا نالہ تھا جس کا مطلب ہے جہاں چوہا بھی پھنس جائے۔ اس کے آگے وہ دیوار تھی جو پوری وادی کو دو حصوں میں بانٹتی تھی۔ اس فصیل سے بھی ایک راستہ شمشال جاتا تھا جو ملنگو دی سر گلیشیر سے ہو کر جاتا تھا۔ رچھ دشت جس کا مطلب تھا گھاس کا صحرا اس کے اختتام پر اس راستے کا سب سے پر کشش دیومالائی پل تھا جس کا نام عبدل محمد پل تھا۔ پل پار کر کے چٹانوں کے اندر چند غاریں تھیں جو رات گزارنے والے مسافروں کی آماجگاہیں تھیں۔ گرم پانی کا چشمہ ایک چٹان کے اندر سے جھاگ اڑاتا برآمد ہو رہا تھا۔ وہاں ایک پن چکی بھی تھی۔ گرم چشمہ کا مقامی نام تھین کک تھا۔ گلیشیر کے پار دستگیر سر اور کنیانگ چش کی چوٹیاں تھیں۔ بیافو ہسپر ٹریک پر کنیانگ چن گلیشیر سے راستہ شمال کو جاتا ہے۔ وہاں پودینے کے خوش بودار پتے بکثرت تھے۔ گرم چشمہ کے قریب بنے ایک کمرے میں مصنف نے کچھ دیر آرام کیا اس میں یاک کے بالوں کے نمدے بچھے تھے۔ رجب کا کہنا تھا کہ جب ادھر تک سڑک آئے گی تو وہ یہاں ہوٹل بنائے گا۔[156] شمشال سے پہلے آخری پل کٹ دور بین اور چڑھائی کو کٹ دوئیں کہتے تھے۔ مقامی لوگ اس قسم کی چڑھائی کے لیے یاک کی دم پکڑ کر اس کے سہارے چلتے ہیں۔

شمشال کے شروع میں غشت اور رحیم آباد کے گاؤں تھے۔ فرمان آباد میں رجب شاہ کا گھر تھا۔ باہر سے پتھریلا لگنے والا گھر اندر سے بہت متاثر کن تھا۔ وسیع ہال نما کمرہ شمشالی مزاج کا عکاس تھا۔ اس میں تازہ چھلی لکڑی کی مہک تھی۔ طرز تعمیر زیارت گرم چشمہ کے کمروں والا تھا۔ درمیان میں نمدے اور قالین بچھے تھے۔ دیوار کے ساتھ گاؤ تکیے، کوہ پیمائی کا سامان، صاف بستر تھے۔ کوہ پیمائی کی کتابیں جن کے ہر دوسرے صفحے پر رجب کی تصویر اور تذکرہ تھا۔ اس کی کچی دیواروں پر قلعی کر کے پہاڑوں کی تصویریں پینٹ کی گئی تھیں۔ ان کی تواضع یاک کے پنیر اور گھی میں گندھی روٹیوں کی روایتی شمشالی خوراک اور گرم چائے سے کی گئی۔[157] تب تک رجب پاکستان میں آٹھ ہزار فٹ سے بلند تمام پانچ چوٹیاں سر کر چکا تھا۔ شمشال میں ہیلی کاپٹر کے ذریعے ٹریکٹر کے حصے لائے گئے پھر ان کو جوڑا گیا۔ شمشال میں سائیکلوں کی تعداد تین چار تھی جو لوگ سر پر اٹھا کر لائے تھے۔1962ء کے سیلاب کے بعد شمشال کی وادی مزید مختصر ہو گئی۔ شمشالی بچوں نے سیاحوں کو دیکھ کر پکچر پکچر کا شور مچانا شروع کر دیا۔ سرسوں کے کھیتوں میں شمشالی لڑکیاں کام کر رہی تھیں۔ خواتین خوش شکل اور خوش لباس تھیں۔ قدیم طرز کی ٹوپیاں پہنے کام میں مصروف تھیں۔ مصنف کا استقبال وہاں پیدل چل کر آنے کی خوشی میں گلے میں ہار ڈال کر کیا گیا۔ انھوں نے مقامی سکول ٹیچر کے گیسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔ اسکا کہنا تھا پیدل وادی تک پہنچنے کے باعث آپ ہمارے مہمان ہیں۔ آرام دہ کمروں کا کرایہ بہت مناسب تھا۔ شمشال میں کسی حد تک بجلی تھی۔ امین آباد گلیشیر کے دہانے پر ایک چھوٹا سا بجلی گھر۔ گرمیوں میں گلیشیر پھلنے سے نالہ رواں ہوتا تو بجلی کی فراہمی شروع ہوتی۔ سردیوں میں اہل شمشال مکمل تاریکی میں چلے جاتے۔[158]

شمشال پاس میں شمشالیوں کی چراگاہیں ہیں جو ان کے لیے زندگی جتنی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس وقت زیادہ تر شمشالی اپنے مویشیوں کے ساتھ اوپر تھے۔ مئی میں میلے کا سماں ہوتا ہے جب قافلے اوپر جاتے ہیں۔ اکتوبر میں ان کی واپسی پر بھی جشن ہوتا ہے۔ درہ شمشال تک کا راستہ بہت مشکل ہے۔ وہاں شورت پوئی نام کی چراگاہ ہے۔ کچھ فیصل آباد کے نوجوان مصنف سے ملنے آئے جو شمشال پاس جا کر مینگلک سر کی چوٹی سر کرنا چاہتے تھے۔ ان نوجوانوں کے ناموں کا تذکرہ شمال کے دیگر سفر ناموں میں بھی ملتا ہے۔ شمشال میں صبح سویرے قطار بنائے بچیاں لب پہ آتی ہے دعا الاپ رہی تھیں۔ جب ترانے کا آغاز ہوا تو کھیتوں کے اندر بھاگتی بچی جو تھوڑا لیٹ ہو گئی تھی یہ آواز سن کر قومی ترانے کے احترام میں وہیں مودب کھڑی ہو گئی۔ کسان بھی اپنا بیلچہ اپنی کمر کے ساتھ ٹکائے قومی ترانے کے احترام میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔[159]

شمشالی کوے مصنف کو تھوڑے مختلف لگے۔ خواتین اپنے بچوں کو پشت پر پوٹلیوں میں باندھے لکڑیاں اٹھائے گزریں۔ وہ اسی طرح اپنے بچوں کو اٹھا کر اپنے کاموں میں مصروف رہتیں۔ دولت امین پہلا شمشالی تھا جو تعلیم یافتہ ہوا پھر اپنی وادی میں آکر سکول کھولا۔ اس کے سکول میں دیواروں پر نقشے اور چارٹ تھے۔ وہاں بچوں نے تحقیقاتی

کمیٹیاں بنا رکھی تھیں جو شمشال کے موسم، زراعت، جنگلات، معیشیت، معاشرت، لوک میلے، سیاحت وغیرہ پر تحقیق کرتی تھیں۔[160] خوردپن گلیشیر کی طرف تین روزہ مسافت پر آگے جو چراگاہ ہے، وہاں شمشالی گرمیوں میں اپنے مویشیوں کے ساتھ موجود تھے کہ ایک فوتگی ہو گئی۔ اب اس میت کو قافلہ وادی میں واپس لا رہا تھا۔ وادی میں قافلے کے پہلے قدم کے ساتھ عورتیں چادروں سے اپنے چہرے ڈھانپ کر بین کرنے لگتی ہیں۔ پروین کو دمہ تھا وہ چراگاہ کی کی زیادہ بلندی برداشت نہ کر سکی۔

"آپس میں جڑی ہوئی مختصر بستیوں اور وادیوں میں یہ ایک اجتماعی سانحہ ہوتا ہے، اور وہاں کے درخت، کھیت اور ہوائیں بھی مرگ سے متاثر ہوتی ہیں۔"[161]

ششمالی تین دن تک مرنے والے کا سوگ مناتے ہیں۔ چوتھے روز کھیتوں میں کام پر چلے جاتے ہیں۔ جماعت خانہ میں جمع ہو کر چراغ نامہ پڑھتے ہیں۔ پتھر کا چراغ جلا کر مرنے والے کے ایصال ثواب کے لیے چراغ نامہ سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ واخی ادب میں ایک معروف صنف بلیک ہے جو صرف خواتین گاتی ہیں۔ اس صنف ادب میں بلند چراگاہوں میں موسم گرما کے دوران جنم لینے والے جذبات و تجربات کا ظہار کیا جاتا ہے۔[162] مصنف نے ایک واخی بلیک کا ترجمہ بھی کتاب میں شامل کیا ہے۔

شمشال نیچر ٹرسٹ کے معلوماتی کتابچے کے مطابق شمشال زرعی اور مویشی پالنے والوں کی آبادی ہے۔ اس کی آبادی گیارہ سو کے قریب ہے۔ رقبہ 2700 مربع کلو میٹر ہے۔ اس کی نوچوٹیاں سات ہزار میٹر سے بلند ہیں۔ مویشیوں میں آئی بیکس، نیلی بھیڑ، جنگلی گدھے، برفانی کوے، خرگوش، مرغابیاں، بھیڑیے اور برفانی چیتے پائے جاتے ہیں۔ فصلوں میں گندم، آلو، جو، مٹر، پھلیاں، سیب اور خوبانی کا گوشت ہوتے ہیں۔ ہر گھرانے میں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ ہیں۔ جن کے گھی، دودھ، پنیر کی فروخت سے آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ یاکوں کے بالوں سے بنے نمدے بھی بیچے جاتے ہیں۔ مویشیوں کی دیکھ بھال خواتین کرتی ہیں۔ شمشالی ہنزہ سے الگ واخی زبان بولتے ہیں جو یہاں اپنی اصلی تاریخی حالت میں محفوظ ہے۔ 1995ء کے سروے کے مطابق جانوروں کی تعداد بھی بتائی ہے۔ یہاں لوک گیتوں کہانیوں کی صورت میں تاریخی واقعات سینہ بہ سینہ چلتے ہیں جو ڈراموں کی صورت میں میلوں ٹھیلوں پر پیش کیے جاتے ہیں۔ بے دریغ شکار سے گریز کرتے ہیں۔ ہمیشہ اجتماعی طور پر شکار کر کے سارے گھرانوں کے ساتھ بانٹتے ہیں۔ صرف عمر رسیدہ جانوروں کو مارا جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے تمام جانور پریوں کی ملکیت ہوتے ہیں۔ چینیوں نے شمشالیوں کی چراگاہوں پر ان کا حق تسلیم کر لیا۔ یہاں اسماعیلی عقیدے کی پیروی کی جاتی ہے۔[163]

شمشال میں افسوس کے لیے آنے والے برادری کے لیے دودھ اور کھانا ساتھ لاتے ہیں۔ کبھی وادی میں سردیوں میں برفباری بہت ہوتی ہے۔ اور کبھی سردیاں بالکل خشک گزرتی ہیں۔ شمشالی خوراک کے معاملے میں خود

کفیل ہیں۔ وہاں ایک بھی دکان نہیں۔ نامساعد حالات سے نمٹنے کے لیے اجتماعی کاوش سے شمشالیوں نے عوامی خزانہ بنا رکھا ہے جس میں خوراک کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ کسی کے پاس خوراک کم ہو تو خزانے سے مہیا کی جاتی ہے۔ اگلی فصل پر وہ اتنی واپس کر دیتا ہے۔ کوئی مجبور ہو تو اس سے قیمت وصول نہیں کی جاتی۔ شمشالی سب خود ہی ایک دوسرے کی حجامت بناتے ہیں۔ موچی، درزی، ترکھان کا کام سب خود ہی کرتے ہیں۔ بجلی کی آمد سے پہلے شمشالی سات بجے سو جاتے تھے اب بلب جلا کر رات کو بھی کٹائی کرتے ہیں۔ دن میں گرمی میں کام مشکل ہوتا ہے۔ شمشالی زیادہ مرغیاں نہیں رکھتے کیونکہ وہ فصلوں کا ستیاناس کرتی ہیں۔ وہاں کوئی سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ قدیم شمشالی قبرستان میں بارش کے باعث قبریں دھنسی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ کھوپڑی اور ہڈیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ مقامی بچے اور خواتین سامان اٹھائے بھی وہ پل با آسانی پار کر رہی تھیں جو باقی سیاحوں کے لیے بہت مشکل ہوتا۔ وہاں لوگوں نے مصنف سے اپیل کی کہ گلگت میں ایک مویشی بھی مرتا ہے تو حکومت مدد کو آتی ہے۔ پامیر میں زیادہ برف گرنے سے بہت سیلاب آیا ان کا بہت نقصان ہوا مگر حکومت نے مدد نہیں کی۔[164]

شمشال میں ایک صدیوں پرانا گھر تھا جسے عجائب گھر کہا جاتا ہے۔ اس میں شمشالیوں نے صدیوں پرانی ثقافت کو سنبھال کر رکھا ہے۔ اسکی چھتوں، چوکھٹوں، کھڑکیوں پر سیاہ رنگ کی کالک کی تہیں تھیں۔ دودھ بلونے والے چوبی سلنڈر، یاک کی پرانی اکڑی کھال، آہنی تسلے، رحل، اناج ذخیرہ کرنے کے تنور نما سٹور، لکڑی کے زرعی اوزار، کاشغر کی شباہت لیے گھریلو پتھر کے برتن، بوسیدہ بندوقیں، کپڑا بننے کی قدیمی کھڈی، ہاتھ کی بنی اونی جرابیں، ٹوٹا ہوا رباب وغیرہ تھے۔ یہاں قدیم اشیا کی موجودگی نے ثابت کر دیا تھا کہ یہاں انسانی تہذیب اپنے محدود دائرے میں مکمل تھی۔ اتنے الگ تھلگ دور افتادہ ہونے کے باوجود شمشالی اعلیٰ تمدن کے امین تھے۔[165] مصنف نے ان چیزوں کی باقاعدہ نگہداشت کر کے محفوظ کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ تو رجب کا کہنا تھا اس سے بہتر چیزیں لوگوں نے گھروں میں سنبھال رکھی ہیں۔ ہنزہ کے دربار ہوٹل میں بیشتر اشیا شمشال سے ہی گئی ہیں۔ شمشال میں واخی زبان کا کوئی رسم الخط رائج نہیں۔ بنیادی تاریخ مامون سنگھ والی روایت نسل در نسل بیان ہوتی آئی ہے۔

شمشال کی تصویر یاک کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ پہلے شمشال کے پل پر تھامنے کے لیے رسے یاک کے بالوں سے بنائے جاتے تھے۔ جو الجھ کر ٹوٹ جاتے تھے۔ بعد میں کسی جرمن کے پانچ ہزار ڈالر عنایت کرنے سے پل کو محفوظ کیا گیا۔[166]

برفیلی بلندیاں (2001ء)، مستنصر حسین تارڑ

"برفیلی بلندیاں" میں مستنصر حسین تارڑ کے دو سفر نامے شامل ہیں۔ ایک فیری میڈو اور نلتر پکھورا ٹریک، دوسرا ہوشے سے درہ گوندو گورو کے بیس کیمپ اور لیلی پیک تک۔ پہلا سفر 2000ء میں ہوا جبکہ دوسرا اس سے اگلے برس۔ گلگت میں فضل کے ماموں کے گھر شاہانہ شمشالی دعوت میں پہلے اکرام بیگ نے ننگی تلوار لہراتے ہوئے ماہرانہ انداز میں رقص کیا پھر ماموں نے رقص کیا جو ہنزہ کے نمبرون رقاص کے طور پر مشہور ہیں۔ ان کے ہاں اہل ہنزہ کے ڈکیت ہونے کے زمانوں کی نایاب تلوار تھی۔ ان کے بزرگوں کا کہنا تھا کہ اجنبی اس تلوار کو دیکھیں تو برا شگون ہوتا ہے۔[167]

داسو کے پل پر چینی شیروں کے مجسموں کو لوگوں نے بت سمجھ کر توڑ دیا ان کے بس دھڑ باقی رہ گئے تھے۔ پہلے رائے کوٹ پل ویران ہوتا تھا، اب میلہ لگا تھا۔ چائے خانے تھے، بہت جیپیں تھیں۔ یہاں مصنف پہلے کی ویرانی کو یاد کرتے ہیں جب وہ پہلی بار فیری میڈوز گئے تھے۔ ٹیم کے سامان کو اوپر پہنچانے کے لیے حسب معمول ہنگامہ ہوا۔ قرعہ اندازی کے ذریعے پورٹروں کے ناموں کا اعلان ہوا۔ وہ شمال کے مہنگے ترین پورٹر تھے۔ دو تین گھنٹوں میں اوپر پہنچنے کے چار سو روپے فی کس وصول کیے گئے۔ فنتوری میں اب دھول اڑتی تھی۔ چشمے خشک تھے کوئی پھول نہ تھا۔ جبکہ پچھلی بار یہ جگہ اتنی بے روح نہ تھی۔ مصنف کے پچھلے سفر کے دوران فیری میڈو میں کوئی اور سیاح نہیں گیا تھا صرف وہ تھے جو ان کے ساتھ تھے۔ اب بدلے زمانے میں یہاں کی ایک جھلک دکھاتے ہوئے مصنف کہتے ہیں:

"کہاں وہ دن تھے اور کہاں یہ دن تھے کہ فیری میڈو کی جادوئی چراگاہ کا نصف حصہ چوبی مکانوں سے ڈھک چکا تھا۔ بھیڑوں سے زیادہ تعداد میں مقامی اور غیر ملکی سیاح تھے جو منہ اٹھائے گھومتے تھے۔ میلہ لگا ہوا تھا۔"[168]

رحمت نبی اور عزیز کی کیمپنگ سائٹ کسی حد تک یہاں کے قدرتی ماحول میں رچی بسی تھی۔ باقیوں نے اس کے زوال پذیر حسن کو اور مجروح کر دیا تھا۔ رحمت نبی نے رائے کوٹ گلیشیر کے سامنے والے گھاس کے میدان میں فیری میڈوز کی مردہ لکڑی سے تعمیر شدہ دیدہ زیب کیبن مصنف کے لیے سنبھال کر رکھا تھا کہ وہ وہاں قیام کریں گے۔ اس پر تارڑ کیبن کی تختی آویزاں کر دی گئی۔ رحمت نبی نے فیری میڈو میں وہ پتھر جسے مصنف کی بیٹی نے ایک پچھلے سفر کے دوران پینٹ کر کے تارڑ 92ء لکھا تھا اسے بطور یادگار محفوظ کر رکھا تھا۔ جنگل کے اندر پوشیدہ چھوٹے فیری میڈو میں اب ہوٹل تھا جس میں کارکن ویٹر سب کے سب باریش تھے۔

بیال کیمپ بھی تبدیلی کی زد میں تھا۔ پہلے اس کا منظر کھلا کھلا تھا۔ اب کمرشلزم کے باعث ہوٹلوں اور چار دیواریوں میں بند ہو چکا تھا۔ اب نانگا پربت کا کھلا کھلا دیدار ممکن نہیں تھا۔ پہلے جہاں وہ بے دریغ چلتے تھے وہاں اب ذاتی جائیداد کی حد بندیاں تھیں۔[169] پہلے فیری میڈو پر ستارے چمکتے تھے اب وہاں درجنوں خیمے تھے۔ انکا نصف حصہ چرواہوں کے مکانوں سے ڈھک چکا تھا اس لیے اب ستارے پہلے کی طرح چمکتے نظر نہیں آتے تھے۔ نلتر جاتے ہوئے

پرانے سفر والی نومل روڈ اب کشادہ اور پختہ ہو چکی تھی۔ نومل میں جیپ ڈرائیور نے اپنی خالہ کے گھر سے تازہ انگور لا کر دیے۔ وہاں پورٹروں نے سرکاری ریٹ کے مطابق معاوضہ لینے سے انکار کرتے ہوئے کسی کے ورغلانے سے عین وقت پر جانے سے انکار کر دیا۔ ان کے لیڈر نے صاف صاف کہا وہ اپنے ریٹ مانگتے ہیں نہیں دیتے تو ان کے علاقے سے چلے جائیں۔[170] بعد میں اس نے شکایت کی کہ ٹور کمپنیاں سیاحوں سے پورٹروں کے پیسے زیادہ لیتی ہیں مگر پورٹروں کو ادائیگی بہت کم کرتی ہیں اور وہ سارا سال صرف گرمیوں کے دو تین ماہ روزی کمانے کی آس میں گزار دیتے ہیں۔ شمال کے لوگوں کے اس جذباتی رویے کی وضاحت مصنف اس طرح کرتے ہیں:

"شمال کے بیشتر باسی دل کے کھرے ہیں وقتی ابال آتا ہے اور پھر پرسکون ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ابال بھی کسی حد تک جائز ہے کہ ان کی محرومیاں اور مایوسیاں بہت ہیں۔ زندگی کٹھن اور پتھروں سے بھری ہوئی ہے۔ نامہربان موسموں اور دشوار زندگی کے ستائے ہوئے یہ لوگ پورا سال ان مہینوں کے منتظر رہتے ہیں جب سیاح اور کوہ نورد اترتے ہیں اور ان کو روزی روزگار کی صورت نظر آتی ہے تو وہ بے چین ہو کر ذرا جوشیلے اور بے احتیاط ہو جاتے ہیں۔[171]

نلتر میں مصنف کو راستے کے دونوں جانب پتھریلی دیواروں سے الجھن ہوتی تھی۔ ذاتی جائیداد کے لالچ نے وادی اور اس کے منظر کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ مصنف کے نلتر کے پچھلے سفر میں نلتر مکمل سناٹے اور تنہائی کا شکار تھا۔ اب یہاں بھی وہی کچھ ہو رہا تھا جو باقی جگہوں پر ہو چکا تھا۔ نلتر جھیلوں کے بارے میں پوچھنے پر ایک کسان نے جب بتایا کہ پاس ہی ہیں تو مصنف چونک گئے کیونکہ جب شمال میں کوئی شخص کہے کہ فلاں مقام پاس ہی ہے تو یقیناً وہ بہت دور ہوتا ہے۔ بنگلہ نامی جگہ گوجروں کے کچھ جھونپڑے تھے۔ اس کے بعد جھیلیں آئیں جو رات کے اندھیرے میں مصنف کو جوہڑ کی مانند لگیں۔ شمالی بات بات میں گوروں کے حوالے دیتے ہیں کہ وہ بوٹ دیتا ہے، ابلی سبزی کھاتا ہے آپ پراٹھا مانگتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔[172] صبح روشنی میں مصنف کو تاریکی میں جھیلوں کو جوہڑ سمجھنے پر شرمندگی ہوئی ان کے پانی اتنے شفاف تھے کہ دھوپ میں دکھائی نہیں دیتے۔ تھے۔ مقامی پورٹر نے بتایا کہ جھیل کے اندر دلدل ہے۔ بلند جھیل کے قریب دو اور جھیلیں تھیں۔ آگے کے سفر میں دریا کے پار گوجر بستی کے آثار تھے۔ وہاں غلیظ گوجر بچے بھاگتے ہوئے سیاحوں کے گرد جمع ہو گئے۔ یہ گوجروں کا عارضی پڑاؤ تھا، گرمیاں گزار کر وہ نیچے وادیوں میں چلے جاتے تھے۔ مصنف کے بقول گوجر قابل بھروسہ لوگ تھے وہ نہایت ہمدرد اور وضع دار ہوتے ہیں۔ کوہ نوردوں سے پیسے بٹورنے کے لالچ میں مبتلا نہیں ہوتے۔[173]

لوئر شاہنی کے قریب ایک جگہ یاکوں کا ریوڑ اوپر سے نیچے آ رہا تھا۔ ان کے سموں کی دھمک سے بہت شور تھا۔ ان کا دھول اڑائے لڑھکتے آنا حیرت ناک منظر تھا۔ لوئر شاہنی میں پورٹر ابراہیم نے مصنف کو دبایا۔ ان علاقوں میں اب تک دستور ہے کہ مہمان پہاڑوں میں سفر کر کے آئے تو پہلے اسے دبائیں۔ شاہنی چوٹی تین سروں والی تھی۔ اس کے

برابر میں دو جڑواں چوٹیاں اور تھیں جن کا نام ہی جڑواں تھا۔ پورٹر اور گائیڈ راستوں کی خوب صورتی پر توجہ نہیں دیتے وہ ان کے لیے محض مسافت ہوتی ہے۔ پکھوراوادی اور پکھوراگلیشیر کے بارے میں بھی اس کا یہی کہنا تھا۔ بہت بار ادھر آیا تھا پر کبھی غور نہیں کیا صرف مسافت ہے۔[174] اس ٹریک کے دوران پورٹر فرقہ واریت کا شکار رہے۔ سنی مسلک اور شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والے پورٹر الگ الگ رات بسر کرتے۔ یاک نمک کے اتنے شوقین ہوتے ہیں کہ ایک ڈھیلے کے لیے آپس میں لڑتے ہیں۔ ایک جگہ خشک نالے کو پار کرتے وقت بکریوں کا ریوڑ وہاں سے گزرا تو ٹیم کے افراد نے بکریوں کی مدد سے انھیں پکڑ کر پار کیا۔ سرخ پتھر کے علاقے میں پہنچ کر رات کو ایک بکرا خرید کر الاؤ میں بھونا گیا۔ جس کی کچی بوٹیاں پورٹر رغبت سے کھاتے ہوئے کھوار گیت گا رہے تھے۔ اشکومن سے اوپر ایک بلند علاقہ اتزیا چشمہ تھا۔ جہاں لوگ چارہ کاشت کر کے نیچے اشکومن چلے جاتے تھے۔ قیام نہیں کرتے تھے۔ پکھورا میں انسانی ہاتھوں کی بنی برفانی پانی کی قل تھی۔ اس میں سے چند مقامی افراد ریت نکال کر صاف کر رہے تھے۔[175]

دوسرا سفر ہوشے سے درہ گوندوگورو کے بیس کیمپ تک کے سفر کی روداد ہے۔ ہوشے کے راستے میں کیند اس تھنگ نامی مقام پر کاندے کے سیلاب میں بے گھر ہونے والوں نے اپنے لیے کوٹھری نما مکانات بنائے تھے۔ وہاں پانی بالکل نہیں تھا۔ اس لیے جیپ ڈرائیور پیچھے سے پانی کے کین بھر کر گزرتے ہوئے یہاں چھوڑ جاتے تھے۔

قراقرم پر سفر کرتے ہوئے چلاس میں لوگوں کے کم رکنے کی وجہ بتاتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے:

> "چلاس میں بہت کم لوگ رکتے ہیں۔ رکتے ہیں تو مجبوراً رکتے ہیں۔ اس میں جہاں اس کے گرم ویران اور چٹیل ہونے کا عمل دخل ہے۔ وہاں اس کے باشندوں کے کھردرے پن اور باہر سے آنے والوں کے لیے ایک ناپسندیدگی کا عنصر بھی شامل ہے۔ یوں بھی چلاس شہر شاہراہ سے اوپر کہیں واقع ہے اور اس بستی کی کوئی ایک عمارت بھی شاہراہ سے نظر نہیں آتی۔"[176]

چلاس میں پٹرول بھروانے کے لیے رکے تو پٹرول بھرنے والے نے پٹرول کم ڈال کر پیسے زیادہ وصول کیے۔ بحث اور لڑائی سے بچنے کے لیے انھوں نے زیادہ ادائیگی کر دی۔ انچارج پٹرول پمپ نے کہا ہمیں بے ایمان کہتے ہو جاؤ تھانے میں رپورٹ کرو۔ انھوں نے پولیس میں جا کر رپورٹ کر دی۔ پولیس والے نے کہا ہم کارروائی کر کے اطلاع کر دیں گے۔ تب تو انھیں یقین نہ آیا مگر بعد میں لاہور کے پتے پر تین سو روپے کا منی آرڈر وصول ہوا جس کے ساتھ بتایا گیا تھا کہ شکایت پر انھیں عدالت میں پیش کیا گیا، جہاں انھیں ہزار روپیہ جرمانہ بھی ہوا۔ مصنف کو وہاں کی پولیس سے اس فوری انصاف کی امید نہیں تھی۔[177]

گلگت میں انھوں نے حسب روایت چنار ان میں اور اسی کمرے میں قیام کیا جہاں گئے زمانوں میں پہلی بار آنے پر کیا تھا۔ سکردو روڈ پر پہلی ہریاول سسی اور اس پر جھانکتے کوہ حراموش کے علاوہ باغیچہ نامی وادی کا بھی مصنف نے ذکر کیا ہے۔ مصنف نے ہوشے سے مشابرم بیس کیمپ جانے کا ارادہ کیا تھا مگر پھر سکردو میں ٹریکنگ میں گائیڈ کرنے والوں

کے کہنے پر نئے راستے کا ارادہ کیا۔ 1993ء تک کنکورڈیا جانے والے اسی راستے سے واپس جاتے تھے مگر بعد میں نیا راستہ دریافت ہونے سے واپسی پر مشابرم گلیشیر عبور کر کے درہ گندوگورو پار کر کے ہوشے میں آتے ہیں۔ ٹور آپریٹرز کے مطابق گندوگورو کی چوٹی سر کرنا بہت آسان ہے وہاں کچھ ہائی پورٹرز نے مستقل رسے لگائے ہوئے ہیں۔ ریسکیو والے تین سو روپے فی کس چارج کرتے ہیں اور رسوں سے لٹک کر چوٹی پر پہنچ جاتے ہیں۔ سکردو کا کے ٹو موٹل بالکل فل تھا برآمدوں میں کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ خپلو روڈ بھی اب پہلے سے وسیع ہو چکا تھا۔ کیونکہ سیاچن کے راستے کے باعث اس پر فوجی آمدورفت بھی بہت تھی۔ پہلے خپلو میں صرف ایک ریسٹ ہاؤس تھا وہاں اب جدید فن تعمیر کے نمونے تھے۔ ہوشے کے راستے میں کاندے کا پل سیلاب سے بہہ گیا تھا۔ خپلو بازار بھی بدل چکا تھا۔ مصنف پرانے خپلو کی جھلک دکھاتے ہیں جب رات کو نالے کا پانی سڑک پر آنے سے خپلو بازار اور ریسٹ ہاؤس کا راستہ منقطع ہو جاتا تھا۔ اب دکانوں کی کثرت تھی، ہجوم تھا، ٹریفک بھی بہت تھا۔ وہاں اکلوتے ڈاک خانے میں ڈاکیا اندر باہر کے سارے کام نمٹاتا تھا۔ پرانے ڈاکخانے کے بارے میں پوچھنے پر خپلو کے مقامی آدمی نے کہا:

> "وہ تو پرانا ڈاکخانہ ہوا کرتا تھا صاحب! اب تو ترقی ہو گیا ہے۔ سیاچن کی وجہ سے۔ اس کی جگہ تو نیا مارکیٹ بن گیا ہے اور ورکشاپ بن گیا ہے۔ اوپر نیا ڈاکخانہ بنا ہے۔ بالکل سکردو کے موافق۔ اس میں پی سی او بھی کھلا ہے۔ بے شک امریکہ فون کرو۔"[178]

مصنف کے پچھلے سفر کے دوران دریائے شیوک کے پار جانے کے لیے انڈس رافٹ کا استعمال ہوتا تھا۔ ایسی کشتی جو ہزاروں برس سے زوہ کی کھالوں کو مشکیزے کی طرح پانی سے بھر کر پھلا کر باندھ کر تیار کی جاتی تھی۔ اب مشکیزوں والی کشتی کی ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ سیاچن کی ٹریفک کی وجہ سے پل بن گیا۔ مچلو گندم سے بھرا گاؤں تھا۔ جس کی خانقاہ میں تبتی مینار تھا۔ وہاں پرانی خانقاہ کے ساتھ نئی خانقاہ اسی طرز پر تعمیر کی گئی تھی۔ جیپ کے ڈرائیور نے شیعہ اور نوربخشی مسلک کا فرق بتایا کہ نوربخشی سفر میں بھی روزے رکھتے ہیں۔ نمازیں ملا ملا کر نہیں پڑھتے اور بہت عبادت کرتے ہیں۔ ایک ضعیف بلتی اپنی کمر پر گندم کا آدھا کھیت اٹھائے مسکراتے ہوئے گزرا۔ مصنف کو خپلو کے مسلمانوں کی بے حد مسرت کی وجہ سمجھ نہیں آتی تھی۔[179]

مشہور چوٹیوں کے قریبی علاقوں کی دھوم ہوتی ہے ورنہ باقی علاقوں راستوں سے لوگ سرسری گزر جاتے ہیں۔ وہاں ایک دوشیزہ سے خوبانیاں خریدنے کے ایک ٹیم رکن نے دس روپے دیے تو اس نے اور اس علاقے کے لوگوں نے پیسے لینے سے انکار کر دیا کہ وہاں اس طرح بیچنے کا رواج نہیں ہے۔ ایک اور جیپ میں ہنزہ کے فیشنی گائیڈ تھے جو اپنے زعم میں دیگر وادیوں کو چشم حقارت سے دیکھتے تھے۔ تلس مچلو سے زیادہ خوب صورت وادی ہے مگر پانی کی کمی سے زرخیزی کم ہے۔ وہاں ہر طرف پھول تھے۔ گھروں کی دیواروں پر گملے، گھی کے خالی ٹین، بالکونیوں میں،

کیاریوں میں ہر طرف پھول تھے۔ بلتیوں کو پھولوں سے بہت لگاؤ ہے۔ اگر کسی خطرناک ڈھلوان کے نیچے کسی کو کوئی خوش رنگ پھول نظر آجائے تو اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس تک پہنچتے ہیں اور اپنی ٹوپی کی زینت بناتے ہیں۔[180] بلتی شمالی تہذیب اور بقیہ تہذیب کا یہی فرق ہے کہ وہ اصل پھولوں اور ان کی خوشبو کے دیوانے ہیں جبکہ بقیہ پاکستانی مصنوعی پھولوں اور مصنوعی خوشبوؤں کے دلدادہ ہیں۔

کاندے میں ایک سکول ٹیچر اور گائیڈ نے مصنف کی ٹیم کو پانامہ اور ننگ ماوادیوں میں لے جانے کی ترغیب دی اس کے کارڈ پر لکھا تھا:

"اقبال قادری۔ ماؤنٹین گائیڈ اور باورچی۔ وائس چیر مین یونین کونسل مچلو گاؤں کاندے۔ ڈاکخانہ۔ تھاگس۔ تحصیل مشابرم۔ ضلع گھانچے۔ سکردو بلتستان۔ پاکستان۔"[181]

اس گائیڈ اور ٹیچر کے بقول ہوشے سے پورٹر نہ لیے جائیں کیونکہ وہاں سب گندم اور جو کی کٹائی میں مصروف ہیں اور اچھے لوگ نہیں۔ سیاحوں کو تنگ کرتے ہیں۔ جبکہ کاندے کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ کاندے کے لوگوں نے زبردستی مصنف کو اپنے شناختی کارڈوں کی کاپیاں تھمانا شروع کر دیں۔ وہاں شمال میں شناختی کارڈ کی کاپی ایک گارنٹی ہے کہ یہ شخص مقامی اور اصلی ہے۔ کاندے 130 گھرانوں اور 830 افراد پر مشتمل گاؤں تھا۔ 1997ء اور 2009ء میں سیلابوں نے اسے تباہ کر دیا۔ تب یہاں کے لوگوں نے کیند اس تھنگ میں بستی آباد کر لی۔ مگر وہاں سے گدلا پانی بھی حاصل کرنے کے لیے ایک گھنٹہ سفر کرنا پڑتا ہے۔ اب وہ لوگ اپنے گھر بنانے میں مصروف تھے اس لیے سیاحوں کے ہمراہ پہاڑوں میں نہیں جاسکتے تھے۔ ورنہ وہ ان کی آمدنی کا ذریعہ تھے۔[182]

شمالی جیپ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے کہ اگر ڈرائیور کی مرضی ہو تو جیپ میں ایک چھوٹے موٹے گاؤں کا کل سامان اور باشندے بآسانی سما جاتے ہیں۔ وہاں حوالدار کاندے اور ہوشے کے درمیان جیپ چلاتا تھا۔ ایک پھیرے کے بارہ سو لیتا تھا اور دن میں کئی پھیرے لگاتا تھا۔ اس کی جیپ میں کاندے کے سیلاب سے متاثرہ افراد کے لیے پانی کے کنستر موجود تھے۔ وہ علاقے امداد باہمی کی عمدہ مثال ہیں۔ کھیتوں میں کام کرتے لوگ ڈرائیور کو اپنی بوتلیں دیتے۔ وہ آگے ان کے گھروں میں سے چائے بنوا کر ان میں ڈال کر واپسی پر کھیتوں میں پکڑا دیتا۔ یہاں نئے تعمیر شدہ پتھر کے گھر تھے۔ ایک نیا سکول بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ انھوں نے بالکل ویران جگہ گھر بنائے۔ کہیں اور بناتے تو وہاں کھیت تھے پھر ان کے کھانے پینے کے لیے اناج کم ہو جاتا۔ دس سال پرانے سفر کے دوران مصنف نے قدیم ہوشے کی یاد تازہ کی ہے کہ اس میں خواتین کے چہرے دھویں سے سیاہ ہو چکے تھے۔ ان کی مینڈھیاں ایسے لگتا تھا کبھی کھولی نہیں گئیں۔ بچوں کے سر استرے سے مونڈ کر درمیان میں صرف ایک لٹ لٹکتی تھی۔ بوڑھے اپنے چرخوں میں اون لپیٹتے تھے۔ اہل ہوشے اپنے علاقے میں مصنف کے خاندان کو دیکھ کر انگریز انگریز کا راگ الاپتے تھے۔

حوالدار نے کہا اب ہوشے بہت بدل گیا ہے کہ وہاں دنیا جہاں کے سیاح کے ٹو کی جانب سے اترتے ہیں مگر وہ لوگ پانی کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور اب بھی نہاتے نہیں۔ لیکن مصنف نے ان کی طرف داری کی کہ بھوک اور موسموں کی شدت سہنے کے باوجود وہ اپنے گھر نہیں چھوڑتے یہ قابل تعریف امر ہے۔[183]

اب ہوشے باقاعدہ آباد گاؤں تھا اور وہاں تین خیمہ گاہیں تھیں۔ اشرف کیمپ میں کاندے کے پورٹر خیموں کی تنصیب اور خوراک کے بندوبست میں بہت پھرتیلے ہو رہے تھے تاکہ اگلی صبح چناؤ میں کامیاب ہو سکیں۔ اس برس مصنف کو شمال میں ہسپانوی کوہ نوردوں کی کثرت نظر آئی۔ ہوشے میں ہر گلی کے بعد اترائی اور کھیت آئے پہلے ہوشے والے بھی درہ گوندو گورو کو ناقابل عبور سمجھتے تھے۔ اس راستے کی دریافت سے ہوشے والوں کی قسمت بدل گئی۔ وہاں کچھ کھیتوں میں گندم سنہری تھی اور کچھ میں خوشے ابھی ہرے تھے۔ مخالف سمت سے آنے والے پورٹر ملے جو کھیتوں میں گھس کر اپنی رشتہ دار خواتین سے باتیں کرنے لگے اور مٹر کی پھلیاں توڑ کر کھا کر خوش ہو رہے تھے کیونکہ پچھلے بہت دن سے وہ باسی روٹیاں اور ٹین بند خوراک کھا کر تازہ خوراک کے لیے ترس گئے تھے۔[184]

ہوشے سے آگے اڈونگستان نامی متروک شدہ آبادی تھی۔ چراکساہ دریا تھا۔ ہوشے سے نکلتے ہی صبح سویرے مقامی بچے اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے سیاحوں کے گرد جمع ہو گئے اور چاکلیٹ، سویٹ ٹافی وغیرہ کا مطالبہ کرنے لگے۔ حالانکہ ہوشے میں ایک جگہ عبارت درج تھی کہ ان کے بچوں کو سویٹس دے کر ٹر خانے کی بجائے کاپیاں اور پنسلیں تحفتاً دیں تاکہ وہ پڑھ لکھ سکیں۔[185] وہاں ایک بچے کا نام مشابرم خان تھا۔ چراک دریا اور گوندو گورو دریاؤں کے سنگم پر ایک شوخ رنگوں کا پل تھا۔ شائی چو کی خیمہ بستی میں بہت رونق تھی۔ اسے مصنف نے کے ٹو ٹریک کے دوران کوروفون کی خیمہ گاہ سے مشابہ قرار دیا ہے۔ یہاں کے سکس اور کے سیون کے بیس کیمپ کو بھی راستہ جاتا ہے۔ شائی چو میں کسی مہم کی کامیابی کی خوشی میں رات کو موسیقی پر مردانہ رقص کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے درجنوں پورٹر باہمی مقامی مخاصمت کے باوجود خوش تھے کیونکہ وہ ان کی کوہ نوردی کی مزدوری کی آخری شب تھی۔ عام پورٹر پھٹے پرانے کپڑوں جوتوں میں ہونے کے باوجود اچھا رقص کرنے والے پورٹروں پر نوٹ نچھاور کر رہے تھے۔ حالانکہ ان سے وہ اپنے لیے گرم کپڑے یا جوتے حاصل کر سکتے تھے۔ مگر وہ ان چیزوں کے بغیر رہ سکتے ہیں پر خوشی کے اظہار کے لیے اکھاڑے میں ناچتے کسی شخص پر نوٹ پھینکنے سے باز نہیں رہ سکتے۔[186]

شائی چو سے آگے مصنف کی توقع کے برعکس سیکڑوں غیر ملکی کوہ نورد واپس آتے دکھائی دیے۔ پہلے وقتوں میں ایک میدان اور چراگاہ گندو گورو کہلاتی تھی۔ بعد میں اس سے اوپر دو دن کی مسافت پر درہ دریافت ہوا تو اس بستی اور چراگاہ کے نام پر اس کا نام رکھا گیا۔ حسب روایت ٹیم میں شامل ہونے کے بعد راستے میں ایک پورٹر باغی ہو گیا۔ صرف کاندے اور ہوشے والوں کی چپقلش کے باعث حسین نامی پورٹر جو منتیں کر کے ٹیم میں شامل ہوا تھا اب بے دید ہو

گیا۔ اس نے نالہ پار کرنے کے لیے مدد کرنے سے انکار کر دیا کہ صاحب ہمارا کام بوجھ اٹھانا ہے آپ کی مدد کرنا نہیں۔ مصنف کا کہنا ہے:

"۔۔۔ مجموعی طور پر کاندے کے پورٹر زیادہ سادہ اور ہمدرد تھے جبکہ ہوشے سے جتنے بھی پورٹر بھرتی کیے گئے وہ قدرے لاپرواہ اور بیگانے تھے۔ کوہ نوردوں کی بے پناہ آمدن نے ان کا دماغ خراب کر دیا تھا۔"[187]

دل سنگ پا نامی جگہ کا لغوی مطلب ہے پھولوں کے کھیت مگر وہاں بہار چند روزہ ہوتی تھی۔ مصنف کے گزرنے کے دوران پھولوں کا یہ کھیت ویران تھا۔ مقامی پورٹر کے مطابق سیاہ گلیشیر مادہ اور سفید گلیشیر نر کہلاتا ہے۔ خپلو کے بازار میں ایک بلتی دکاندار کے نام کے آگے بگٹی دیکھ کر مصنف بہت حیران ہوا۔ لیکن وہ بلوچ بگٹی نہیں بلکہ اپنے والد کی رعب دار شخصیت کے باعث بگٹی تھا کہ والد کو لوگ بگٹی کہہ کر چھیڑتے تھے بعد میں ان کی آل اولاد اپنے نام کے ساتھ بگٹی لگانے لگی۔[188]

مصنف کے بقول پچھلے بیس سال سے شمال کے ہر سفر کے دوران سارے شمال کو خبر ہو جاتی تھی کہ فلاں سال مصنف کہاں دیکھے گئے۔ ہوشے سے شائی چو اور دل سنگ پا سوپٹس اور چاکلیٹوں کے رنگ برنگے پھینکے گئے ریپر سیاحوں کے لیے راستے کی نشاندہی کا کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ پتھروں کا مینار جسے بتی کہتے ہیں وہ بھی معاون ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ مقامی پورٹر اپنے ساتھیوں کی سہولت کے لیے راستے میں نشانی بناتے جاتے ہیں کہ وہ راستہ نہ بھٹکیں۔ غیر واضح راستے پر بڑے پتھر اوپر تلے رکھ کر یہ مینار بنایا جاتا ہے۔[189]

ہسپاں کی خیمہ گاہ میں آلودگی اور بو تھی۔ وہاں بہت رونق تھی۔ وہاں شمشال کے رہنے والے ایک شخص نے مصنف کو پہچان لیا اور ان کی کتاب کا تذکرہ کیا کہ وہ پڑھ کر لوگ شمشال جانے لگے ہیں۔ وہ محنت مزدوری کے لیے شمشال سے یہاں آیا تھا تاکہ کسی ٹیم کے ساتھ بطور پورٹر جا سکے۔

رتی گلی (2003ء)، مستنصر حسین تارڑ

مستنصر حسین تارڑ نے 1956ء میں کالج کی کوہ پیما ٹیم کے ساتھ رتی گلی کی چوٹی سر کی تب مصنف کو دھند میں رتی گلی جھیل میں برف کے تیرتے ٹکڑے راج ہنس کی طرح لگے۔ ماضی کی اس یاد کی بازیافت کے لیے مصنف نے تقریباً نصف صدی بعد 2003ء میں رتی گلی جھیل کا ایک اور سفر کیا۔ 1963ء میں کاغان کی جانب کیے گئے ایک اور سفر کی روداد بھی اس کتاب میں شامل ہے۔

پہلے وادیٔ نیلم کا نام کشن گنگا وادی تھا جسے بعد میں نیلم سے بدل دیا گیا۔ 1956ء میں مصنف کو ایبٹ آباد زیادہ صاف ستھرا ہونے کے باعث انگریزوں کا شہر لگا۔ بالا کوٹ تب بہت پسماندہ اور پتھریلے گھروں کا ایسا قصبہ تھا جہاں

ماچس بھی دستیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ تب لوگ کاغان کے نام سے بھی کم واقف تھے اور راستے سنسان ہوتے تھے۔ ناران بہت گمنام تھا۔ وہاں صرف ایک یا دو تنوری ہوٹل تھے اور صرف شام ڈھلنے سے پہلے پہلے آلو شوربہ ملتا تھا۔ یوتھ ہوسٹل کی نو تعمیر شدہ عمارت میں ان کا قیام تھا۔ اس کے چوکیدار نے ڈرانے کے لیے کہہ دیا کہ یہاں رات کو ریچھ اترتے ہیں اور ہر مرغوب چیز کو کھا جاتے ہیں۔[190] تب دریائے کنہار میں ٹراؤٹ اتنی زیادہ تھی کہ مقامی لوگ پانی میں ہاتھ ڈال کر نکال سکتے تھے۔ ایک ڈاک بنگلے کا خانسامہ پگڑی، اچکن اور چوڑی بیلٹ میں ملبوس تھا۔ سیف الملوک جھیل پر بھی کوئی اور سیاح موجود نہیں تھا۔ صرف راستے میں خانہ بدوشوں کے قافلے اپنے مویشیوں اور گھوڑوں کے ساتھ نظر آتے تھے۔ بوڑاوائی ڈاک بنگلے کا چوکیدار سیاحوں کے پاس ایک بوسیدہ رجسٹر لے آیا کہ اس پر اپنے تاثرات اور آنے جانے کا مقام لکھیں۔ جس پر بہت سے گورے مختلف وقتوں میں اپنے تاثرات قلم بند کر چکے تھے۔ بوڑاوائی سے کچی سڑک لولوسر جھیل اور چلاس بابوسر اور گلگت تک جاتی تھی۔ وادیٔ کشن گنگا کے راستے میں انھیں ایک تنہا آدمی ملا جو کسی میگزین میں چھپنے والی ہنزہ کی دوشیزہ کی تصویر دیکھ کر اس کے لیے ہنزہ جا رہا تھا۔ مہم سے پہلے انھوں نے طے کیا تھا کہ راستے میں ڈاک بنگلوں میں قیام کریں گے۔ ویرانوں میں رات بسر کرنی پڑی تو کسی گاؤں میں ٹھہر کر سادہ منش گاؤں والوں کی میزبانی کا لطف اٹھائیں گے۔ مگر راستے میں جب بھی کوئی مختصر آبادی آئی ان کے مکین انھیں دیکھ کر بھاگ جاتے تھے۔ مقامی باورچی نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ خاکی پتلونوں، فوجی بوٹوں کی وجہ سے مقامی لوگ انھیں فوج سمجھ کر بھاگ جاتے تھے۔ اور فوج سے ڈرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان دیہاتیوں کے انڈے، مرغیاں وغیرہ زبردستی قیمتاً خرید کر لے جاتے تھے۔ مگر تب ان کے لیے وہ کرنسی نوٹ بیکار تھے۔[191] رتی گلی چوٹی کی وجہ تسمیہ ایک سرخ چٹان ہے جس کے باعث یہ رتی گلی کہلاتی ہے۔

راستے میں ایک گوجر خانہ بدوشوں کی بستی میں رات رکے۔ انھوں نے بالٹی بھر کر بکری کا دودھ پیش کیا۔ مصنف کی ٹیم کے انسٹرکٹر نے ان گوجروں کو اپنے وہاں ہونے کا مقصد یہ بتایا کہ رتی گلی کے قریب دفن کسی پیر بابا کی زیارت کے لیے جا رہے ہیں۔ گوجر ان پیر بابا کے معتقد تھے یہ سن کر نرم پڑ گئے اور سب کو الاؤ کے گرد بٹھا کر دبانے لگے۔ انھوں نے ایک دنبہ ذبحہ کر کے الاؤ پر بھون کر انھیں پیش کیا۔[192] رتی گلی کی چوٹی سے مصنف کو رتی گلی کی جھیلیں نظر آئیں۔ ایک جھیل میں تیرتے برف کے تودوں پر انھیں راج ہنس کا گمان ہوا تھا۔

20003ء میں رتی گلی اور سرال جھیل کے لیے جاتے وقت جب مصنف بالا کوٹ سے گزرے تو وہاں کاٹھ کباڑ سے نئی تخلیق ہونے والی جیپوں کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

"بالاکوٹ خود ذرا سا بلند و بالا ہے اور وادیٔ کاغان کا دروازہ کہلاتا ہے۔ جہاں کاٹھ کباڑ اور بوسیدہ ٹائروں، متروک انجنوں اور ڈھانچوں سے ایسی شاندار جیپیں تخلیق کی جاتی ہیں کہ چینی جاپانی بھی انھیں دیکھ کر غش کھا جائیں کہ وہ بھی اپنی جدید ترین ٹیکنالوجی کی مدد سے ایسی شاہکار جیپیں تیار نہیں کر سکتے۔"[193]

بالاکوٹ میں دریائے کنہار پر ایک محفوظ نیا پل تعمیر ہو چکا تھا۔ پرانا پل بھی موجود تھا مگر منہدم ہونے کے قریب۔ نصف صدی پہلے وہاں ایک کچا جیپ ٹریک تھا جو ویران رہتا تھا، اب چوڑی شاہراہ تھی جس پر ٹریفک کا اژدہام تھا۔ اپنے پہلے سفر کے سات سال بعد مصنف نے 1963ء میں ناران کی بستی شاران اور پارس کا سفر اپنے دو دوستوں کے ساتھ کیا۔ تب شاران کے راستے میں ایک کھوکھے کے مالک نے انڈہ پراٹھا پوچھنے پر تعجب سے دیکھا کہ کیا مانگ لیا ہے۔ اس کے کھوکھے میں گیلے ہو چکے بھنے چنے اور گڑ تھا۔ وہاں ایک جنگل میں کٹائی ہو رہی تھی۔ شاران ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے بتایا تھا کہ اوپر جنگلوں میں رات بجلی گرتی ہے۔ وہاں سے گزرتے ہوئے جلے ہوئے درخت بھی نظر آ رہے تھے، تب وہاں آس پاس کالا ڈھاکا جنگل کے بارے میں مشہور تھا کہ اس میں مفرور قاتل اور ڈاکو بسیرا کرتے ہیں۔[194] رات میں راستے سے بھٹکنے پر مقامی لوگوں نے ان کی مدد کی اور مکئی کی سوکھی روٹی اور بکری کے دودھ سے تواضع کی۔ اگلی رات ایک ڈسپنسری میں بسر کی۔

2003ء میں ناران پہلے کی طرح ویران نہیں تھا۔ یہاں مصنف نے قدیم و جدید ناران کا تقابل کیا ہے۔ پہلے صرف ایک یوتھ ہاسٹل، ایک تنور ہوٹل اور ایک ڈاک بنگلے پر مشتمل تھا۔ اب یہی ناران مری کے بعد پاکستان کا پسندیدہ ترین ہل سٹیشن بن چکا ہے۔ بالاکوٹ سے آنے والی نئی سڑک اس میں سیاحوں کے ہجوم میں اضافے کا سبب ہے۔ اب اکثر ہوٹل مہنگے اور مخدوش تھے۔ مصنف نے کمرشلزم کی بدولت اس خوب صورت آبادی کی بدشکلی پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ کہ اسے با آسانی ابتدائی منصوبہ بندی سے ترتیب شدہ پہاڑی بستی میں تبدیل کیا جا سکتا تھا۔[195] ناران کا اکلوتا تجربہ کار گائیڈ بشیر زمان مصنف کو ان کی مطلوبہ منزل تک لے جا سکتا تھا۔ وہ مصنف کو گلگت بلتستان میں مل چکا تھا جہاں پہلے غیر ملکی کوہ نورد بہت زیادہ آتے تھے اب دہشت گردی کے ڈر سے بہت کم ہو گئے تھے۔ بشیر نے پچھلے سفر کے حوالے سے کہا کہ پہلے تو بوڑاوائی سے رتی گلی گئے تھے اب سرال جھیل کی وجہ سے باٹا کنڈی سے بوڑاوائی سے آگے بیسل تک جا کر لولوسر، دودی پت سر اور سرال جھیلوں سے ہو کر رتی گلی جائیں گے۔ رات گئے جیپوں میں سوار ہو کر مصنف اور ان کے ساتھی سیف الملوک گئے۔ جھیل کے کناروں پر اب بہت گند تھا۔ مصنف کے خیال میں ناران کے مقامی کرتا دھرتا افراد نے جھیل سیف الملوک کی بے حرمتی کر کے دولت کے لالچ میں اسے برباد کر دیا تھا۔ اب اس کے کنارے کھوکھوں، ریستورانوں، سیاحوں اور ان کے پھیلائے گند کا ہجوم ہوتا ہے۔ جھیل کے گرد خاردار تار لگا دی گئی

ہے ہر کھوکھے اور ریستوران نے اس تک جانے کی حد بندی کر رکھی ہے۔ مصنف ماضی میں اپنے خاندان کے ساتھ یہاں آنے کو یاد کرتے ہیں تب صرف ایک ہوٹل تھا اور دوپہر تک کوئی اور سیاح نہیں آیا تھا۔[196]

ناران سے بابوسر تک جیپ روڈ کو چوڑی شاہراہ میں تبدیل کرنے کے لیے کام جاری تھا۔ کاغان میں سوچ نامی گاؤں مصنف کا پسندیدہ ترین گاؤں تھا۔ وہاں کا مقامی شخص باورچی کے طور پر مصنف کی ٹیم کے ساتھ شامل تھا۔ اس نے بتایا کہ سردیوں میں وہاں بہت برف پڑتی ہے تو لوگ گھروں کے اندر سے ہی راستے بنا کر ایک دوسرے کے گھروں میں آتے جاتے ہیں۔[197] اب دریائے کنہار ٹراؤٹ سے تقریباً خالی ہو چکا ہے۔ سوچ سے آگے راستہ مرغزار جو سیاحوں کا پسندیدہ مقام ہے تک جاتا ہے۔ باٹا کنڈی سے جیپ ڈرائیور نے مقامی گائیڈ کے ساتھ جھیل لولوسر تک کا کرایہ سولہ سو روپے طے کیا مگر بعد میں مصنف کے ساتھیوں کو دیکھ کر ڈھائی ہزار روپے کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ پہلے اس نے سمجھا مقامی لوگ ہیں۔[198]

دریائے کنہار کے کنارے بڑاوائی میں چینی پگوڈا نما سرخ چھت والی نئی مسجد کی مصنف نے بہت تعریف کی ہے۔ وہاں وہ قدیم ریسٹ ہاؤس اب تک موجود تھا جہاں مصنف نے تقریباً نصف صدی قبل قیام کیا تھا۔ لیکن اب ریسٹ ہاؤس ارد گرد سے آبادی میں گھر چکا تھا۔ شاردا سے جل کھڈ تک بھی سڑک تعمیر ہو چکی تھی۔ بیسل میں جا بجا افغان خانہ بدوشوں کے خیمے تھے۔ یہ خیمے افغان جہاد کے دوران امریکہ نے مہیا کیے تھے۔ صدیوں سے خانہ بدوش ان وادیوں میں آکر عارضی پتھریلی پناہ گاہیں تعمیر کرتے یا بھیڑوں کی اون سے تیار کردہ کھردرے سیاہ خیموں میں قیام کرتے تھے جو بارش برف سے مکمل بچاؤ نہیں کرتے تھے۔ اب نائلون کے سفید خیمے بارش اور برف سے تحفظ دیتے تھے۔[199]

وہاں سفید خیموں کے ساتھ بہت قدیم پتھریلے گھر بھی موجود تھے۔ چپٹی ناکوں والے منگول بچے ہر جیپ کے پیچھے بھاگتے تھے۔ بیسل میں ایک اکلوتا ہوٹل تھا۔ جھیل لولوسر بہت وسعت والی تھی لمبائی میں زیادہ تھی اسی راستے سے سڑک آگے درہ بابوسر چلاس اور گلگت کو جاتی تھی۔ مصنف کی ٹیم کے ساتھ شامل باورچی حافظ قرآن تھا اور ایبٹ آباد کی الیاسی مسجد میں دینی تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ لولوسر جھیل کی کوئی خاص شباہت نہ تھی یہ ایک مسلسل جھیل تھی۔ کاغان میں گلگت بلتستان کی نسبت بہت مختصر گلیشیر تھے۔ جنھیں دیکھ کر مصنف کے ساتھیوں کو مایوسی ہوئی۔ بیسل میں چند سیاحوں سے ملاقات ہوئی جن کا کہنا تھا بیسل کے لوگ سیاحوں کو بہت غلط گائیڈ کرتے یں۔[200]

جھیل دودی پت سر سے نکلنے والے نالے کے آگے آبادی میں پتھروں سے بند بنایا گیا ہے۔ اس مقام کو ڈک کہتے ہیں اور گلی بھی۔ راستے میں ایک جگہ پھول بکثرت تھے۔ چرواہوں کی مختصر بستی میں اپلوں کے دھوئیں کی مہک والی ذائقہ دار چائے پی گئی۔ آگے ایک وادی میں گھوڑے بہت تھے۔ دودی پت جھیل کے آس پاس ایسی چراگاہیں ہیں جن

میں چرنے والے جانور زیادہ دودھ دیتے ہیں۔ جھیل دودی پت مصنف کو سیف الملوک سے مشابہ لگی۔ اس کا پانی نیلا تھا۔[201] آگے کا سفر مصنف اور ان کے ساتھیوں نے گھوڑوں پر بیٹھ کر طے کیا۔ مصنف کے خیال میں بلندیوں کے سفر میں مارموٹ کا سیٹیاں بجانا مصنف کے لیے اچھا شگون ہوتا ہے۔ درہ سرال گھڑ سواروں کے رکھوالوں نے بہت احتیاط کے ساتھ پار کرایا۔ ایک چڑھائی بہت مشکل تھی، اتنی مشقت کے باوجود وہ فوراً اگلے سفر کے لیے بغیر رکے تیار ہو گئے۔[202]

سرال ٹاپ پر مختصر سی آنسو جھیل تھی۔ وادی سرال اپنے تنہا حسن کے فریب میں قید تھی۔ صرف دو بلند دروں کے سوا اس میں داخلے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ درہ سرال کاغان اور آزاد کشمیر کو جدا کرتا ہے۔[203] سرال جھیل وادی کشمیر میں ہے۔ راستے میں ایک بے نام جھیل بھی نظر آئی۔ وادی سرال میں ایک پتھریلی چار دیواری وادی کا اکلوتا چائے خانہ تھی۔ گائیڈ کے مطابق اوپر پتھریلے گھر کشمیر کے اراکین پارلیمنٹ کے تھے۔ تب گائیڈ نے ایک رکن پارلیمنٹ کی کتھا سنائی کہ ایک دوشیزہ اس کے پاس فریاد لے کر آئی کہ اس کے ماں باپ اس کی شادی نکمے اور بیمار شخص سے کرنا چاہتے ہیں آپ مدد کریں۔ بوڑھے رکن پارلیمنٹ نے اسے تسلی دی اور خود اس سے بیاہ کر لیا۔[204] سرال جھیل میں برف کے تودے تیرتے خوش نما منظر پیش کرتے تھے۔ مقامی پورٹر وہاں تک جاتے راستے میں سے خشک ٹہنیاں اور لکڑیاں جمع کرتے آگے بڑھتے رہے تھے کیونکہ جھیل کے آس پاس بلندی پر کوئی درخت، جھاڑی زندہ نہیں رہتی۔ ان جمع شدہ لکڑیوں سے رات کو آگ جلائی گئی۔ جل کھڈ کے قریب ایک شخص سرکاری وردی پہنے آیا اور مصنف سے تفتیش شروع کر دی۔ وہ خود کو فاریسٹ گارڈ بتا رہا تھا۔ مصنف کا کہنا تھا کہ یہاں تو کوئی جنگل نہیں پھر کس کی حفاظت۔ اس نے جواب دیا کہ یہاں فاریسٹ آفیسر بھی موجود ہے آج اس کے دورے کا امکان ہے۔ اس لیے اس نے یونیفارم پہنا ہے ورنہ تو وہ کھیتی باڑی کرتا ہے اور بھیڑوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس کے بقول اوپر چوٹی پر نباتاتی پودوں اور تتلیوں کے پاس کچھ گورے تحقیق کے لیے رکے ہیں وہ چلاس کے لوگ جو گوروں کو مار کر جنت کمانے کی کوشش کرتے ہیں سے ان کی حفاظت کرتا ہے۔[205] رتی گلی جھیل کے بارے میں مقامی گائیڈ کا کہنا تھا کہ عجیب پر اسرار جھیل ہے اس میں پانی نہ کہیں سے داخل ہوتے ہیں نہ کوئی ندی نالہ اس سے نکلتا ہے۔ رتی گلی چوٹی پر بہت ہجوم تھا۔ وہاں چوٹی سے ایک بارات اتر کر آ رہی تھی۔ دلہا کاغان کے کسی گاؤں کا تھا اور دلہن کشمیر میں دواریاں کے قریبی علاقے کی تھی۔ اب رتی گلی پر سرخ پھول اور برفیں نہیں تھیں جو تقریباً نصف صدی قبل مصنف نے دیکھی تھیں۔

نوڑی نالہ کے پار گوجر گھر تھے۔ آگے متروک شدہ جیپ روڈ جو دراصل کاغان میں مٹروں کی اچھی فصل کی بدولت قائم کی گئی تھی۔ جب پورے پاکستان میں کہیں مٹر میسر نہیں ہوتے وادی کاغان کے مٹر مہنگے داموں ملکی منڈیوں میں فروخت ہوتے ہیں۔ اس لیے مٹروں کو کاغان سے باہر پہنچانے کے لیے وہ سڑک تعمیر کی گئی۔[206]

راکاپوشی نگر (2013ء)، مستنصر حسین تارڑ

2013ء میں جب مستنصر حسین تارڑ راکاپوشی کے بیس کیمپ کے سفر پر روانہ ہوئے تو واپسی پر شاہراہ قراقرم پر ایک سپاہی نے ان کی ویگن روک کر اندر سے تلاشی لی اور انھیں آگے جانے سے منع کر دیا کہ شاہراہ ہر طرح کی ٹریفک کے لیے بند ہے۔ ایسا دیامیر میں کوہ پیماؤں کو گولیوں سے مارنے کے واقعے کے باعث کیا گیا۔[207]

نگر کے گاؤں مناپن سے دو روزہ مسافت پر واقع راکاپوشی بیس کیمپ تک کے سفر کے لیے مصنف کو شمال کی سب سے زیادہ کوہ نوردی کرنے والے ڈاکٹر احسن نے اکسایا۔ یہ سفر مصنف نے چوہتر برس کی عمر میں کیا تھا۔ تھاکوٹ کے مقام پر دریائے سندھ پر کمانیوں والا آہنی پل اب متروک ہو چکا تھا۔ مصنف کو وہ دیدہ زیب لگتا تھا۔ اس کے مقابلے میں جدید پل بالکل سپاٹ لگا تھا۔ سیکیورٹی کے خدشات کے پیش نظر ہر جگہ چیکنگ کے حوالے سے مصنف کا کہنا ہے۔

> "ان دنوں پاکستان ایک گھیرے میں آیا ہوا ملک ہے۔ قدم قدم پر بیریئر ہیں، رکاوٹیں اور چیک پوسٹیں ہیں، آئی ڈی کارڈ آپ اپنے ماتھے پر چپکا لیں تو قدرے آسانی ہو جاتی ہے۔ تعصب اور مذہبی جنون شمال کی پر امن معصومیت پر اپنے مہیب سائے ڈال رہا ہے۔۔۔"[208]

داسو اور رائے کوٹ پلوں پر بعض چینی شیروں کے مجسمے مصنف کو بہت پسند تھے اب بت شکنوں نے وہ توڑ دیے۔ مسخ شدہ چہروں والے شیر دیکھ کر مصنف کو بہت دکھ ہوا۔ رائے کوٹ پل پر تاتو کے ایک پرانے ڈرائیور نے مصنف کو پہچان کر بتایا کہ اس دن ڈیڑھ سو لوگ فیری میڈو سے نیچے آئے اور پونے دو سو اوپر گئے۔ اس نے مصنف کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے فیری میڈو کو باہر کی دنیا میں متعارف کروا ان لوگوں کا رزق لگا دیا۔[209]

مصنف کے پرانے سفروں کی نسبت گلگت سے نگر اور ہنزہ جانے والے راستے بھی بدل چکے تھے۔ مناپن میں دیران ریسٹ ہاؤس میں اسرار حسین نے مقامی ثقافت کے نمائندہ پیراہنوں اور زیورات میں ملبوس اپنے بچوں کے ساتھ مصنف کا استقبال کیا۔ ان بچوں نے مقامی ٹوپیاں بھی اوڑھ رکھی تھیں۔ اہل نگر نے شاہراہ قراقرم کو اپنے علاقے سے گزرنے کی جگہ نہ دی۔ اس لیے پسماندہ رہ گئے۔ اس وجہ سے شاہراہ قراقرم قدرتی راستے سے ہٹ کر سندھ کے دوسرے کنارے پر جا کر سفر کرتی ہے۔ نگر کی سرحد پر یہ راستہ تبدیل کر کے ہنزہ میں چلی جاتی ہے۔ شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے دوران ہنزہ اور نگر والوں کے رویے کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں۔

> "شاہراہ قراقرم کو بنیادی منصوبے اور نقشے کے تحت ریاست نگر کے درمیان سے ہی گزرنا تھا کہ یہی قدرتی راستہ تھا لیکن جب شاہراہ تعمیر کے دوران نگر کے قریب ہوئی تو اہل نگر نے جن میں مذہبی رہنما بھی شامل تھے احتجاج کرنا شروع کر دیا کہ ہم اس شاہراہ کو اپنے علاقے میں سے نہیں گزرنے دیں گے کہ یوں ہمارے گھروں کی بے پردگی ہو گی۔ اجنبی لوگ اور غیر ملکی سیاح ہمارے قصبوں میں گھومتے پھریں گے۔ عریانی اور فحاشی کو فروغ حاصل

ہو گا وغیرہ۔ ادھر ہنزہ والے تو گویا پہلے سے منتظر تھے وہ مستقبل پر نگاہ رکھتے تھے آگاہ تھے کہ ایک بین الاقوامی اہمیت کی شاہراہ جس خطے سے گزرے گی اس کی قسمت بدل دے گی۔"[210]

اس لیے نگر اقتصادی ترقی، جدید سہولتوں اور سیاحوں کی منافع بخش تجارت سے محروم رہ گئی۔ مصنف نے نگر کو ہنزہ سے زیادہ زرخیز اور دل آویز قرار دیا ہے۔ یہاں رش لیک ہے۔ ہسپر گلیشیر یہاں سے شروع ہوتا ہے، راکاپوشی یہاں ہے۔ ہنزہ اور نگر کے درمیان قدیم عداوت اب بھی پائی جاتی ہے۔ مصنف کے خیال میں اسی عداوت کے باعث مشہور کر دیا گیا کہ نگر کے لوگ غصیلے، کھردرے اور پسماندہ ہیں۔[211]

اہل ہنزہ کا تعلیمی معیار حیرت انگیز ہے۔ لوگ ملنسار ہیں اور پہلے غیر ملکی سیاحوں کی کثرت کے باعث ملکی سیاحوں کو نظر انداز کرتے تھے اب توجہ دینے لگے ہیں۔ اہل ہنزہ اور نگر کے درمیان اسماعیلی اور شیعہ مسلک کا فرق بھی ہے۔ ہنزہ میں جماعت خانے ہیں نگر میں امام بارگاہیں۔ مصنف نے نگر کے لوگوں خصوصاً نوجوانوں میں یہ واضح تبدیلی دیکھی کہ اب ان کی شدید خواہش ہے ان کے علاقے کو دنیا میں توجہ ملے۔ مصنف نے تجویز دی ہے کہ ایک ذیلی شاہراہ تعمیر کر کے نگر سے گزاری جائے، اسے شاہراہ قراقرم سے منسلک کیا جائے۔[212]

دیران ریسٹ ہاؤس کے ڈائننگ روم میں راکاپوشی فتح کرنے آنے والے کوہ پیماؤں کی تصویریں، نگر کے حکمرانوں کی تصویریں، بندوقیں، نگری کشیدہ کاری کے نمونے سجائے گئے تھے۔ شمالی علاقوں کی قسمت بدلنے والے آغا خان رورل سپورٹ پروگرام کے شعیب سلطان کے بارے میں مصنف بتاتے ہیں کہ انھوں نے اسرار کو قائل کیا کہ اپنے آبائی گھر اور اس سے ملحقہ باغ کو ہوٹل میں بدل دیں۔ انھوں نے خود بنک سے قرضے کا بندوبست کیا۔ تب تک نگر میں رات بسر کرنے کے لیے سیاحوں کا کوئی ہوٹل نہیں ہوتا تھا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ انھوں نے اتنے قدیم ثقافتی ذائقوں والے کھانے پورے شمال میں کہیں اور نہیں کھائے جو یہاں کھائے۔ ناشتے میں مقامی جڑی بوٹیوں کی آمیزش والا آملیٹ اور مکھن والی روٹیاں تھیں۔ ریسٹ ہاؤس سے ملحقہ باغ میں ایک قدیم متروک شدہ مسجد تھی۔ اس ریسٹ ہاؤس میں ڈیڑھ درجن اکیلی خواتین قیام پذیر تھیں ان کے حوالے سے مصنف نے کسی پرانی مصنفہ کے شمال میں اکیلے آنے کی خواہش اور اپنے جواب کا تذکرہ کیا ہے کہ گلگت بلتستان والے عورتوں کی عزت کرتے ہیں، بری نظر سے نہیں دیکھتے۔ اکیلے پھرنے میں بھی کوئی خطرہ نہیں۔[213]

دوپہر کے کھانے میں پتھر کی ہانڈی میں تیار کردہ روغن گوشت تھا۔ نگر کے دور دراز کے باشندے مصنف کی آمد کا سن کر ملنے آئے۔ ان میں اساتذہ سرکاری اہلکار، ادیب، مذہبی سکالر، عام کسان شامل تھے۔ ان سب نے مشترکہ خواہش کی کہ فراموش کردہ ریاست نگر کا بھرپور تعارف میڈیا اور سفرناموں میں اجاگر کیا جائے۔ انھوں نے شکوہ کیا کہ مصنف نے بھی ہنزہ داستان لکھی نگر داستان کیوں نہیں لکھی۔ مصنف نے مقامی لوگوں کو بھی قصوروار ٹھہرایا کہ وہ

اپنے رویے میں لچک پیدا کریں۔ بیافو ہسپر کا آغاز ہسپر گاؤں سے ہونے کے باوجود کوہ نورد اپنے سفر کا آغاز سکردو سے کرتے ہیں کہ بلتی لوگ دھیمے اور مددگار ہوتے ہیں۔ ہسپر میں پورٹر سرکاری معاوضے سے زیادہ مطالبہ کرتے ہیں۔ اس رویے سے دلبرداشتہ ہو کر لوگ یہاں کا رخ کم کرتے ہیں۔ سیاحوں کی رہائش کے لیے سہولیات بھی کم ہیں۔[214] البتہ مصنف کا کہنا ہے کہ اہل نگر کے بارے میں کھردرے اور غصیلے ہونے کا تاثر غلط ہے یہ بہت مہمان نواز ہیں۔

راکاپوشی کا سب سے دل آویز نظارہ ہنزہ کے قصبے ناصر آباد کی بلند سطح سے ممکن ہے۔ مناپن میں زعفران کی کاشت بھی ہوتی تھی۔ راستے میں ایک مقامی شخص نے تحفتاً چیریاں مصنف کی ٹیم کو پیش کیں۔ اس کا کہنا تھا کہ نگر کی چیریاں کھایئے یہ ہنزہ میں نہیں ہوتیں۔ سیاچن جنگلی گلاب کی جھاڑی اور برفانی بلندیوں کی نشانی ہے کہ اونچے پہاڑوں کے علاوہ کہیں نہیں کھلتی۔ راستے میں نگر کے کسی سکول کے بچے اور استانیاں راکاپوشی کی کسی وادی میں کھانے پینے کے سامان کے ساتھ پکنک منانے جا رہے تھے۔ شمالی پہاڑی برفانی مسافتوں کی سب منزلیں طے شدہ ہیں۔ یہ قیام گاہیں پورٹروں کی آسائش کو مدنظر رکھتے ہوئے متعین ہوتی ہیں کوہ نوردوں کی آسائش کے مطابق نہیں۔ مصنف نے شمالی شاعر جوشی کا ذکر کیا ہے جو واخی شاعری کرتا تھا وہ پیدائشی کوہ پیما تھا اور مصنف کو راکاپوشی بیس کیمپ جاتے ہوئے ملا تھا۔[215]

مصنف کا کہنا ہے کہ اس سال اہل شمال بے حد خوش تھے کہ بہت عرصے بعد ملکی اور غیر ملکی سیاحوں نے ان کے خطے کا رخ کیا ہے۔ ان کے روزگار بحال ہوئے ہیں۔ مگر دیامیر میں غیر ملکیوں کے قتل کا سانحہ ہو گیا۔ ایک مقامی شخص نے کسی پچھلے سانحے کے حوالے سے بتایا کہ درہ بابوسر پر جنھوں نے درجن لوگوں کو ہلاک کیا تھا انھیں سزا نہیں ہوئی ان میں ایک دو ابھی بھی گلگت میں گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ سزا نہ ملنے پر جرم بڑھتا ہی ہے۔ دیامیر سانحے کی تفتیش کرنے والی ٹیم کو ایس پی چلاس اور کرنل سمیت مار دیا گیا۔[216]

بیس کیمپ سے واپسی پر ایک مقامی شکاری ملا جو کلہاڑی سے شکار کرتا تھا۔ اس نے پیاکن کے علاوہ بنگی داس کے ذریعے ایک متبادل راستے کا بتایا کہ وہ بہت خوب صورت ہے۔ مقامی عورتوں کے کھیتوں میں کام کرنے کے باعث وہ لوگ کوہ نوردوں کو وہاں سے جانے نہیں دیتے۔ نگر آمد پر دیر ان ریسٹ ہاؤس کے انچارج نے مصنف کو اپنا یادگار خاندانی چوغہ پیش کیا یہ وادی یاسین کے آخری گورنر اور نگر کے راجہ کی ملکیت رہا تھا۔ مصنف نے اپنے سفر نامے میں قدیم ہنزہ کی جھلک بھی پیش کی ہے جب اٹھائیس برس قبل پہلی بار اپنے بیٹے کے ساتھ وہاں گئے تھے۔

"جب التت یا کریم آباد کے گلی کوچے کچے تھے اور ان کے درمیان میں قل ندیاں بہتی تھیں۔ پتھریلے مکان تھے جو ازلوں سے اس صورت اور ساخت میں محفوظ چلے آتے تھے۔ گھروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور اہل خانہ آپ کو خوش آمدید کہتے تھے۔ خشک خوبانیاں اور بادام پیش کرتے تھے۔ صحنوں میں پھلدار درخت گھنے ہوتے تھے جن کے سائے میں التر گلیشیر سے پگھل کر اترنے والے پانی جھرنوں کی صورت ٹھنڈک کے ترل رل

ترل رل گیت گاتے تھے۔ بلتت کے قدیم گاؤں میں لامبی دموں والے غشپ پرندے اڑانیں کرتے تھے۔ خواتین قدیم لبادوں میں ملبوس ہوتی تھیں۔ ان کے سروں پر چوکور رنگ دار ٹوپیاں ہوا کرتی تھیں جن میں سے ان کی گندھی ہوئی مینڈھیاں شانوں تک آتی تھیں۔ صاف پانی میسر نہ تھا۔ پانیوں میں ریت گھلی ہوتی تھی۔ میں اور سلجوق ہنزہ ان کے چوبی برآمدے میں بیٹھے تقریباً کچا ساگ اور روٹیاں نگلتے کہ تب وہاں نہ چکن میسر تھا اور نہ کسی اور نوعیت کا گوشت۔"[217]

تب سکول جانے والی بچیاں اپنے قدیم لباس میں ملبوس ہوتی تھیں۔ کوکا کولا کی بوتلیں نایاب اور مہنگی ہوتی تھیں۔ انھیں ٹھنڈا کرنے کے لیے قل کے پانیوں میں ڈبویا جاتا تھا۔ اب وہاں دنیا بھر کے مشروبات ڈیپ فریزروں میں پڑے دستیاب تھے۔ اب یہ رونق والا بڑا شہر بن چکا تھا۔ ایگلز نیسٹ کو جانے والی نئی سڑک نے ہنزہ کے قدیم گاؤں کی پوشیدگی ختم کر دی تھی۔ ایگلز نیسٹ میں جابجا شمشالی ثقافت کے نمونے آویزاں تھے۔ ایگلز نیسٹ کی تعمیر کی کہانی مصنف نے اپنی کتاب میں شامل کی ہے جو علی مدد اور ان کے بھائی کے عزم اور حوصلے کی داستان ہے۔ ہنزہ کے بلند گاؤں دوئی تر میں بیس فٹ گھیر کا ہزار سالہ پرانا درخت بھی موجود تھا۔ اس گاؤں تک راستہ نہ ہونے کے باعث سیاح نیچے کریم آباد سے ہی چلے جاتے تھے۔ ایک دفعہ جاپانی سیاح آئے۔ گاؤں میں علی مدد نے اپنے کھیت میں عارضی خیمہ گاہ قائم کی تھی اس کے ماں باپ ایک جھونپڑے میں سیاحوں کے لیے چائے پانی کا انتظام کر کے رزق کماتے تھے۔ جاپانی سیاحوں نے انھیں مشورہ دیا کہ یہاں سیاحوں کی شب بسری کے لیے کمرے بنائیں، مالی معاونت کی پیشکش بھی کی۔ علی مدد نے 1994ء میں پہلے ایک کمرہ بنایا پھر 1996ء میں تین کمروں کا ہوٹل بنا کر آغاز کیا۔ تب وادی کے لوگوں نے بہت مذاق اڑایا کہ اتنا طویل راستہ نیچے سے اوپر طے کر کے کون پاگل اس ہوٹل میں ٹھہرنے آئے گا نقصان ہوگا۔ اس کی تعمیر میں دونوں بھائیوں اور ان کے والدین نے خود کمر توڑ محنت کی، چٹانیں توڑیں، پتھر ڈھوئے۔ ان کے کام کی تصاویر آج بھی اس میں لگی ہیں۔ اب نیچے کریم آباد والے شکایت کرتے ہیں کہ کہ جو بھی سیاح آتا ہے ہم پر نظر ڈال کر سیدھا ایگلز نیسٹ چلا جاتا ہے۔[218]

حراموش ناقابل فراموش (2017ء)، مستنصر حسین تارڑ

مستنصر حسین تارڑ نے حراموش کا سفر ساتھیوں کے ساتھ 2016ء میں کیا۔ شمالی علاقہ جات کا یہ ان کا آخری سفر نامہ ہے۔ حراموش شہر خاموش تھا۔ اس کے بارے میں گائیڈ بکس وغیرہ میں زیادہ معلومات نہ تھیں۔ کٹوال جھیل کے کنارے ایک امریکی جوڑے اور ایک جاپانی سیاح کے قتل کی خبریں تھیں۔ مصنف نے حراموش کے بارے میں

تہذیب سے کٹے نیم وحشی لوگ ہونے کے تاثر کو جھٹلایا ہے۔ ناران کی شاہراہ کی وسعت کی مصنف نے تعریف کی ہے مگر ٹریفک کے اژدہام سے دھوئیں کے زہریلے بادلوں اور آلودگی کا گلہ کیا ہے۔

مصنف نے ناران داخل ہونے پر 1955ء میں پہلی بار یادداشت میں محفوظ ناران کے سفر کی قدیم جھلک کا جدید جھلک سے موازنہ کیا ہے۔ تب وہاں صرف ایک یوتھ ہاسٹل، ایک ریسٹ ہاؤس اور گوجروں کے جھونپڑے اور کل دو تنور تھے۔ اب 2016ء میں آدھی رات کو بھی ٹریفک کا اژدہام ہے۔ سفید خیموں کی بستیاں، دکانیں، کھوکھے اور ہوٹل ہیں۔ خیموں کی عارضی بستیوں کے ایجنٹ ہر گاڑی کے شیشے بجا کر کہتے تھے آگے نہ جائیں سب ہوٹل فل ہیں۔ ایک خیمہ صرف دس ہزار میں ملے گا۔ مصنف نے اس روپے اور مہنگائی کے بارے میں کہا ہے کہ یہ ناران نہ تھا سیاحوں کا قتل عام تھا۔[219] بکنگ کے بغیر یہاں آنے والے سیاح بہت خوار ہوتے ہیں بلکہ اکثر ہوٹل ایڈوانس میں بکنگ کے بعد بھی منحرف ہو جاتے ہیں یا دوگنے کرائے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ تمام علاقے جہاں کبھی ویرانے اور سناٹے کی حکومت ہوتی تھی جیسے بیسل، جل کھڈ، باٹا کنڈی، بوراوائی اب سیاحوں کی کثرت سے پر رونق تھے بابو سر ٹاپ پر بھی یہی حال تھا۔ وہاں کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے:

"وہاں تو رونقیں لگی ہوئی تھیں۔ بسوں اور جیپوں اور کاروں کے گویا شوروم سجے ہوئے تھے اور اک ہجوم تھا، ہزاروں لوگ تو ہوں گے۔ بابو سر ٹاپ تو اس کے مداحوں کے ہجوم میں روپوش تھا۔"[220]

مصنف کو یہ رونق دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اب لوگ فطرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے دور دراز جانا شروع ہو گئے ہیں۔ گلگت میں گلگت بلتستان کے وزیر اعلیٰ نے شمال کے لیے مصنف کی خدمات کے اعتراف میں حسن کارکردگی ایوارڈ دینے کے علاوہ مصنف کے نام پر شمال کے بارے میں ہر سال بہترین سفر نامے یاڈاکو منٹری پر ایک ایوارڈ کے اجرا کا اعلان کیا۔ انھوں نے مصنف کو بلتستان کا غیر سرکاری سفیر قرار دیا۔ دیر ان ریسٹ ہاؤس مناپن میں چھوٹے بچوں نے پھولوں کے گلدستوں کے ساتھ مصنف کا استقبال کیا۔ وہ سب روایتی اور قدیم پیراہنوں میں ملبوس تھے۔ ان بچوں کے نام روح اللہ، انداز فاطمہ، مشال فاطمہ، ہمراز فاطمہ، کنیز فاطمہ، محمد علی تھے۔ شہروں والے اب ایسے نام رکھنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ نام رکھنے کے لیے اپنی قدیم ثقافت اور روایتوں سے وابستگی درکار ہے جو شہروں میں ناپید ہے۔[221] وہ بچے اپنی مقامی زبان میں استقبالیہ گیت بھی گا رہے تھے جس کا ترجمہ مصنف نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ مصنف کو پیش کردہ ناشتے کے لوازمات میں مقامی جڑی بوٹیوں کی آمیزش سے تیار کردہ آملیٹ اور مقامی سیبوں اور چیریوں کا تیار کردہ مارملیڈ شامل تھا۔

قدیم ہنزہ کے بارے میں مصنف نے بتایا ہے پہلے وہاں ویرانی تھی اور اب کہیں گاڑی پارک کرنے کی جگہ نہیں ملتی۔ پہلے سب گھروں کے دروازے کھلے ہوتے تھے۔ اہل ہنزہ خوبانیوں، شہتوتوں اور بادام کی گریوں سے تواضع

کرتے اب سیاحوں کی یلغار سے مجبور ہو کر اہل ہنزہ اپنے دروازے بند رکھتے تھے۔[222] اب شمال میں موٹر سائیکل سوار سیاحوں کی آمد کا رجحان بہت بڑھ گیا۔ تینتیس برس قبل کے سفر ہنزہ میں بلتت قلعے کے راستے میں ایک محراب نما پل پر کمرے کی کھڑکی کھلی تھی اور ایک خاتون نے مصنف کو ہنزہ کا پانی پینے کے لیے گلاس بھجوایا تھا۔ اب اس گھر سے نوجوان بچے اترے اور اصرار کر کے مصنف کو گھر لے جانے پر قائل کرتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ مصنف کی کتاب ہنزہ داستان کا ایک باب ان کے سکول کے نصاب میں شامل ہے اور وہ بہت فخر سے اپنے کلاس فیلوز کو بتاتے ہیں کہ مستنصر نے ان کی والدہ کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔ وہ گھر صمصام اللہ بیگ کا تھا یہاں وہ گرمیوں میں ٹھہرتے تھے۔ قدیم محرابی پل ان کے گھر کا حصہ تھا۔ وہ کوٹھڑی ڈیڑھ سو برس قدیم تھی۔ اس کے بارے میں گھر والوں کا کہنا تھا:

"یہ ایک عبادت گاہ ہے۔ پرانے وقتوں میں ہمارے امام کے احکامات تحریری صورت میں ہم تک پہنچتے تھے اور اس محراب کی کوٹھڑی میں انھیں محفوظ کیا جاتا تھا۔ ہنزہ کے لوگ شمال اور واخان سے یہاں آتے تھے اور امام کے احکامات کی زیارت کرتے تھے۔ ہم فخر کرتے ہیں کہ وہ مقام جہاں امام کے احکام رکھے جاتے تھے ہمارے گھر کا ایک حصہ ہے۔"[223]

مصنف نے اس امر پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ کمرشلزم کا عفریت جہاں قدیم ہنزہ کی ہر روایت اور ثقافت کو نگلتا جا رہا ہے وہاں قدیم گھر متروک کر کے ہوٹل بنائے جا رہے ہیں مگر اس قدیم محرابی پل اور کوٹھڑی کو محفوظ رکھا گیا ہے۔ وہاں مصنف کی تواضع چائے، میٹھے سموسوں اور مقامی لوازمات سے کی گئی۔ اس سال گلگت بلتستان میں عید کی چھٹیوں میں تقریباً پچیس ہزار کاریں داخل ہوئیں جبکہ کل پچاس ہزار کاریں وہاں رجسٹرڈ ہیں۔ اس لیے باہر سے آنے والی گاڑیوں کو پٹرول اور ڈیزل مہیا کرنا گلگت بلتستان حکومت کے لیے مشکل ہو گیا۔ وہاں ہوٹلوں میں چھ ہزار افراد کے قیام کی گنجائش تھی۔

مصنف نے دریائے گلگت کے لرزتے عالم پل کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیا ہے۔ یہ پورے گلگت کو بلتستان سے ملاتا ہے۔ سیاچن کے محاذ تک فوج کو ضروریات زندگی کا سب سامان پہنچانے کے لیے عالم پل ہی استعمال ہوتا ہے۔ مصنف نے ایک مستحکم پل کی اشد ضرورت پر زور دیا ہے۔[224] اکثر پاکستانی سکردو روڈ پر سسی سے اوپر پہاڑوں میں پوشیدہ حراموش وادی کے وجود سے بے خبر ہیں۔ مقامی جیپ ڈرائیوروں کے نام نامور گلوکاروں کے ناموں پر تھے۔ حراموش روڈ سیلاب کی یلغار سے کچھ جگہوں سے بہہ چکی تھی۔ حراموشی اپنی مدد آپ کے تحت بغیر حکومتی امداد کی آس لگائے راستہ بحال کر رہے تھے۔ سسی سے حراموش تک آنے والی سڑک کو سب مشترکہ طور پر سنبھالتے ہیں۔[225]

وادی حراموش کا مرکزی اور سب سے زیادہ آباد گاؤں دسو ہے۔ داسو نام کا ایک اور گاؤں شاہراہ قراقرم پر ہے یہ دسو ہے۔ پتھریلے اور کچے گھروندوں میں رہنے والے حراموشی بچے اور پھلدار درختوں کے نیچے بیٹھے حراموشی بزرگ مصنف کی جیپ گزرتے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ پھلدار درختوں کی کثرت پر مصنف تعجب سے کہتے ہیں:

"پورے شمال میں آج تک میں کسی ایسے گاؤں میں داخل نہ ہوا تھا جہاں ہر جانب اخروٹ کے گھناوٹ بھرے شجر، خوبانیوں کے درخت جن کی شاخوں سے کچھ کچے زرد سورج طلوع ہوتے تھے، سیب ڈالی ڈالی روشن روشن، شہتوت اور انجیر کی فراوانی۔ اور یہ سب ثمر، انگور کی بیلوں میں لپٹے ہوئے، کوئی ایسا گھروندا نہ تھا جس پر انگور کے خوشے سایہ نہ کرتے ہوں۔ پتوں میں پوشیدہ سرخ انار نہ جھانکتے ہوں۔"[226]

مصنف کو حراموش کی مہم سے بہت خوفزدہ کیا گیا تھا کہ حراموشیوں کی شہرت ایسی ہے کہ جان سے جانے کا خطرہ ہے۔ مگر وہاں مصنف کو ہر طرف گرمجوشی سے منتظر ہونے کی کیفیت نظر آئی۔ ایک چھت پر خشک خوبانیاں سمیٹتی بوڑھی عورت نے سیاحوں کو دیکھ کر دونوں ہاتھ بلند کر دیے۔ پوپلے چہروں والے بوڑھے حضرات نے بھی چہرے پر استقبالیہ مسکراہٹیں سجا رکھی تھیں۔ حراموشیوں کا کہنا تھا کہ امریکی جوڑے کو باہر کے لوگوں نے قتل کیا حراموشیوں نے نہیں۔ انھوں نے مجرموں کا تعاقب کر کے انھیں باندھ کر قانون کے حوالے کر دیا۔ مصنف کا کہنا ہے شمال میں برے لوگ کم ہیں بھلے لوگ زیادہ ہیں۔ غیر ملکی سیاحوں کو بھی ان علاقوں کی تہذیبی اقدار کا خیال رکھنا چاہیے۔

دسو سے آگے نشیب میں حراموش کا صرف ایک گھروندے پر مشتمل گاؤں حلیمل تھا۔ شمال میں دور افتادہ گاؤں کو اس میں جلنے والے چولہوں کی تعداد سے جانا جاتا ہے۔ یہ گاؤں کبھی ایک چولھے پر مشتمل ہوتا تھا۔[227] اب اسے آباد کرنے والے کی آل اولاد نے وہاں الگ گھر بنا رکھے تھے۔ اکلوتے گھروندے والے گاؤں کو آباد کرنے والے رحمت علی کی دیومالائی کہانی کا تذکرہ مصنف نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔

جیپوں کے سفر کے بعد پہلا پڑاؤ سلپی نامی ہرے بھرے گھاس کے میدان میں تھا۔ جس کے آغاز میں مویشیوں کا اجڑ چکا پتھریلا باڑہ تھا۔ اگلی سویر پورٹر شہری ٹیم کے کھانے کا تماشا دیکھ رہے تھے کہ یہ کیا کھا رہے ہیں۔ آگے سفر کے دوران مقامی حراموشی مصنف کو معمول کے راستے سے ہٹ کر ایک اور راستے پر لے گیا جہاں خوبانیوں اور شہتوت کے درخت تھے۔ وہاں کھیتوں میں ایک پتھریلا گھر سفید چٹانوں کے وزن سے کچلا گیا تھا۔ آگے حراموشیوں کا سایہ دار ڈیرہ سمر کیمپ تھا۔ شمال میں گھر آئے تھکے مہمان کا بدن دبانا قدیم میزبانی روایت ہے۔ قراقرمی اور ہمالیائی وادیوں کی بود و باش کی خاص ترکیب کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں:

"ان قراقرمی اور ہمالیائی وادیوں کی بود و باش ایک خاص ترکیب اور زندگی کرنے کی ایک ترتیب ہوتی ہے۔ ایک تو ان کی آبائی اور دائمی بستی ہوتی ہے۔ جہاں ان کے باقاعدہ گھر یا جھونپڑے ہوتے ہیں جہاں وہ صدیوں سے رہتے چلے آتے ہیں اور ایک اس وادی یا پہاڑی مسکن سے بلندی پر برفوں کی قربت میں ان کا عارضی گرمائی ڈیرہ ہوتا ہے جسے ہم "سمر کیمپ" کا نام دیتے ہیں۔ گرمیوں کا آغاز ہوتا ہے تو وہ اپنے ڈھور ڈنگر ہانکتے اکثر پورے خاندانوں سمیت بلند چراگاہوں کی جانب کوچ کرتے ہیں اور وہاں تب تک قیام کرتے ہیں جب تک کہ پہلی برفباری اور سردیوں کی ناقابل برداشت شدت کا آغاز نہیں ہو جاتا۔"[228]

مصنف نے گوجال اور شمشال کی چراگاہوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ تتو اور جیل کے لوگ گرمیوں میں فیری میڈوز چلے جاتے ہیں۔ ترشنگ کے باسی روپل اور ٹاپ میدان کا رخ کرتے ہیں۔ یہاں پھلدار درختوں کے علاوہ فصلیں تھیں اور جابجا آبشاریں تھیں۔ زمین ہموار تھی۔ جنگل کیمپ میں قیام سے قبل اسکرے پھنگی میں پڑاؤ ڈالا گیا۔ وہاں کھیت میں خیمے لگانے کے لیے مقامی کسان سے اجازت حاصل کی گئی۔ اگلے دن جنگل کیمپ کے راستے تک صرف اکا دکا مقامی لوگوں سے سامنا ہوتا رہا۔ جب کسی مسافر کے ہمراہ کوئی خاتون ہوتی تو ٹیم کے افراد احتراماً منہ موڑ کر کھڑے ہو جاتے کہ وہ گزر جائے۔ ایک جگہ حراموشی لڑکیوں نے رک کر انھیں خوبانیاں پیش کیں۔ ٹیم کے افراد حیران ہوئے کہ ان علاقوں میں اجنبی مردوں سے براہ راست ہم کلام ہونے کا رواج نہیں۔ مگر انھیں بزرگ سمجھ کر مخاطب کر کے خوبانیاں دیں۔[229]

آگے جنگل میں قدیم درخت کٹا گرا تھا جسے مصنف نے سر بریدہ لاش کہا۔ وہاں ایسے کئی درخت تھے جن پر مصنف نے بہت افسوس کا اظہار کیا ہے۔ حراموش پہاڑ کو اب تک صرف تین بار سر کیا گیا ہے۔ حراموش درے کے پار سکردو کی وادی روندو ہے۔ حراموش کو اتنا کم سر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بارے میں معلومات اور نقشے نہ ہونے کے برابر ہیں جبکہ دیگر پہاڑوں کے راستوں کا ایک ایک قدم ریکارڈ پر ہے۔ حراموش ابھی تک گمنام پہاڑ ہے۔ آگے گھنا جنگل تھا جہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچتی تھی۔ وہاں گڈریوں کے عارضی پتھریلے جھونپڑے تھے۔ لیکن جنگل کیمپ میں حراموشی ندی کے پانی گدلے اور ریت آلود تھے۔ آگے نسبتاً گمنام مانی گلیشیر تھا۔ ٹیم کے سب افراد اسے بمشکل عبور کر رہے تھے مگر وہاں کسی حراموشی گاؤں کی لڑکیاں شوخ کپڑوں کے ساتھ جو گرز پہنے اچھلتی کودتی بے خطر چلتی گئیں۔[230] مانی گلیشیر کی بلند دیوار پر معلق جنگل کے بعد کتوال جھیل کا آغاز ہوتا ہے۔ وہاں سنہری گھاس تھی۔ مصنف نے کتوال گاؤں کو اپنے پسندیدہ شمالی گاؤں ترشنگ کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔ اس چراگاہ میں جھونپڑوں کے گرد حراموشی جنگلوں سے تراشیدہ شہتیروں کی اور موٹی شاخوں کی باڑیں تھیں۔ اندر کھلے صحنوں میں ان کے مویشی اور مسلسل بارش سے کیچڑ بہت تھا۔ مصنف نے اسے بہت شاندار اور پر ہیبت برفانی قربت والا گاؤں قرار دیا ہے۔

مقامی حراموشی نوجوان مصنف کو اپنے گاؤں کی گلیوں سے گزارتا ایک بیٹھک میں لے گیا جہاں مقامی لوگ ان کے منتظر تھے۔ یہاں ایک الاؤ روشن تھا۔ چھت اور دیواریں دھوئیں کی کالک سے سیاہ تھے۔ وہاں موجود مقامی افراد کے حلیے کی منظر کشی مصنف اس طرح کرتے ہیں:

> "۔۔۔بوسیدہ برفوں کی گزیدہ اونی ٹوپیاں اوڑھے، ان کے پتھریلے لیکن وجاہت بھرے نین نقش الاؤ کی سلگاہٹ میں سرخ ہوتے تھے۔ ان کی گھنی داڑھیوں میں برفانی جفاکشی کی سفید دھاریاں جھلکتی تھیں۔۔۔"[231]

وہاں حراموش کی وادی کی تین نسلیں موجود تھیں اور مصنف کی منتظر تھیں۔ کمرے کے وسط میں الاؤ کے قریب ایک مستطیل شکل کا پتھر تھا جہاں مصنف کو اعزازی مہمان کے طور پر بٹھایا گیا۔ اپنی وہاں موجودگی کو مصنف نے سفر حراموش کا سب سے بڑا انعام قرار دیا۔ پتھر کے بائیں طرف ایک پرانا سیاہ ہو چکا صندوق ہے جس میں آٹا ہے۔ آٹے کے بارے میں وہاں موجود ایک شخص نے فخر سے بتایا:

"ادھر گندم نہیں ہوتا، آٹا گھی بھی نہیں ہوتا، نیچے پنجاب سے آتا ہے۔ آٹا بہت کم لوگوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔ کونے میں سیاہ ہوتے ایک صندوق میں کچھ چاول ہے، تھوڑا چینی ہے، کچھ دال ہے، پنجاب سے آتا ہے، سب نعمت ادھر سے آتا ہے۔"[232]

وہاں ایک ستون کے ساتھ خشک ٹہنی پر خشک ساگ کے ہار پروئے ہوئے تھے۔ شدید برفوں میں جب خوراک کے طور پر وہاں کچھ میسر نہیں ہوتا تو یہ بطور خوراک استعمال ہوتے ہیں۔ دھاگوں میں پرو کر مقامی عورتیں اسے سکھا لیتی ہیں۔ وہاں مقامی افراد کی اونی ٹوپیوں میں پھول اڑسے ہوئے تھے۔ کتوال کے گاوں میں بلند ترین کرکٹ گراؤنڈ تھا اور کرکٹ بیٹ مقامی لکڑی سے گھڑے گئے تھے، وکٹیں بھی پودوں کی ٹہنیاں تھیں اور گیند سرخ چیتھڑوں میں لپٹے پتھر تھے۔ مصنف نے ان کے کھیل سے لگاؤ کے جذبے کی تعریف کی ہے۔[233]

گاؤں کے پار چراگاہ کے کناروں پر ڈھلوانی کھیت کوئی مستطیل، کوئی چوکور اور کوئی لمبوترا تھا۔ ان کے گرد مویشیوں سے بچاؤ کے لیے لکڑیوں کی باڑیں تھیں۔ وہاں مقامی سبزیاں ساگ اور مٹر کاشت ہوتے تھے۔ یہ وسیع چراگاہ بالکل گمنام تھی۔ آگے کچھ جھونپڑیوں کے سامنے مقامی بچے تھے۔ ایک بچی کے بارے میں مستنصر نے بتایا کہ ایک میلی کچیلی بچی اپنے چھوٹے سے بھائی کو پوٹلی میں باندھ کر کمر پر لٹکائے ہوئے تھی۔[234] وہاں ایک عجیب چٹانی گھر تھا۔ جہاں چٹانوں کے درمیان بڑے شگاف کے آگے پتھریلی دیوار تعمیر کر کے کسی نے گھر بنا لیا تھا۔ اس میں ایک ناتراشیدہ کواڑ پر تالہ بھی لگا تھا۔

یہ میرا بلتستان (1984ء)، سلمیٰ اعوان

سلمیٰ اعوان نے 1984ء میں بلتستان کا یہ سفر کیا ان کے اپنے خیال میں اس تصنیف کا مقصد بلتستان کے تاریخی پس منظر میں جھانکتے ہوئے اس کے مسائل اور اس کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کو دلچسپ انداز میں قاری کے سامنے پیش کرنا ہے کہ کہ وہ جان لے کہ بلتستان کیا ہے۔ سلمیٰ اعوان نے اس سفر نامے کو ایک ناول کے انداز میں لکھا ہے جس کی مرکزی کردار عورت بلتستان کے دور دراز علاقوں میں جانے کی کوشش کرتی ہے اور گھروں کے زنان خانوں کی ثقافت کا باریک بینی سے جائزہ لیتی ہے۔ بلتیوں کے متعلق ان کا کہنا ہے:

"بلتستان کی وادیاں فطرت کی شاہکار، اس کے نظارے روح پرور، وہاں کے لوگ محنتی، جفاکش، مخلص اور پاکستان سے ٹوٹ کر پیار کرنے والے اور وہ علاقہ وسیع تہذیبی ورثے کا مالک۔"[235]

مصنفہ نے مختلف جگہوں کے بارے میں معلومات مختلف کرداروں کی زبانی قاری تک پہنچائی ہیں۔ انھوں نے بلتستان کے مختلف قدیم ناموں کا ذکر کیا ہے۔ چینی اسے بلور، لداخی بلتی یل، یا سری بتان، خلیجی ممالک تبت خورد، ایرانی بلتستان کہتے تھے۔ سکردو کے نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ گیارھویں صدی میں رینگمو گلیشیر کے اپنی جگہ سے سرکنے سے دریائے شیوق میں طغیانی آئی اور بلور سلطنت تباہ ہوگئی۔ اس کا دارالحکومت رگیاپل بہت عرصہ پتھریلے ریتلے میدان کی صورت پڑا رہا۔ اس لیے تبتی لوگوں نے اسے سکرم دو یعنی خشک اور ویران جگہ کا نام دیا جو بعد میں کثرت استعمال سے سکردو بن گیا۔[236]

شگری بالا میں ٹیلے پر قدیم رہائشی محل کے آثار تھے۔ سکردو بازار میں ایک بھی عورت نہیں تھی۔ بلتی گھر میں نشست کا سارا انتظام قالین پر تھا۔ کھانے سے پہلے ہاتھ دھلوائے گئے۔ خواتین نے ہاتھوں کے چھپے دھوئے۔ دادی جواری کے لباس کی تفصیل مصنفہ یوں بتاتی ہیں:

> "۔۔۔وہ سبز اونی کپڑے کی گن مو (قمیض) پہنے ہوئے تھی سیاہ ٹوپی جو بلتی مردانہ ٹوپی سے، ملتی جلتی تھی (جس پر چاندی کے منقش زیورات جنھیں طومار کہتے ہیں سلے ہوئے تھے) سر پر رکھے اور اس پر سیاہ چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اس نے گلے میں ملا پہنا ہوا تھا۔ (کپڑے کی پٹی پر بڑے بڑے فیروزے چاندی کے فریم میں جڑ کر سی دیے جاتے ہیں) ہاتھوں میں فیروزے کی انگوٹھیاں اور پاؤں میں بلم تھا۔ جس پر اتنی نفیس اور حسین و جمیل کڑھائی تھی۔۔۔"[237]

1971ء کی پاک بھارت جنگ میں بلتستان کی وادیاں ٹیفشی، تورتوک اور چولونکھا بھارت کے قبضے میں چلی گئی تھیں۔ کھانے کے بعد رکابیوں میں مقامی پھل گیلاش اور شوغون پیش کیے گئے۔ وہاں کھانے کے بعد موسیقی کی محفل سجیڈانگ شنگ (چھڑی) کے ساتھ ڈامن بجا کر حزنیہ گیت شگیشر پا گایا گیا۔ مصنفہ نے اس مقامی گیت کا ترجمہ کتاب میں شامل کیا ہے اور ابراہیم مقپون کا پس منظر بتایا ہے[238] مقامی گھر کے باورچی خانے میں صبح کے وقت مٹی کے چولہے لیپ دینے اور گھر کے بنے خشخاش لگے کلچے اور نمک والی چائے اور کلچے کا ذکر ہے۔ گھر کے بڑے کمرے میں ایک دیوار کے ساتھ تین گز لمبا اور ایک گز چوڑا پھولدار ریشمی روئی سے بھرا گدیلا بچھا تھا جو کشمیری طرز معاشرت کا اہم جز ہے۔[239]

صدپارہ جھیل کی سیر کے دوران علی شیر خان انچن کے سب سے بڑے تعمیری کارنامے دفاعی دیوار کا ذکر کرتے ہوئے مصنفہ کہتی ہیں:

> "رگیالفو (بادشاہ) علی شیر خان انچن کا سب سے بڑا تعمیری کارنامہ وہ دفاعی دیوار ہے۔ اس نے غور سے دیکھا۔ اسے ٹوٹی پھوٹی شکستہ فصیل کے ٹکڑے نظر آئے تھے۔ یہ دفاعی دیوار کرتخشہ اور کرگل کے درمیانی پہاڑ سے لے کر استور تک پہاڑی سلسلے کے اوپر بنائی گئی تھی۔ کم و بیش سو میل لمبی اس دیوار میں مناسب جگہوں پر صدر

دراز ے اور ان دروازوں پر پہرے دار متعین تھے۔ تھور گو پر بھی ایسی فصیل بنوائی گئی تھور گو دروازے سے پہاڑ کے اوپر صد پارہ جھیل تک۔"[240]

دیوسائی میں بکروالوں نے کیمپ لگا رکھے تھے۔ دیوسائی کی بلند ترین جگہ بر جی لا ہے۔ سکردو کی تیز ہواؤں کی وجہ دیوسائی ہے۔ سکردو کے علاقے سکیمدان کے پولو گراؤنڈ کے نزدیک تیسر ر گر کھور کا علاقہ کشمیری سناروں کا علاقہ تھا۔ چھنا کھور میں کاشتکار آباد تھے۔ مینڈوق گھر (پھول محل) مغل اور تبتی طرز تعمیر کا مرقع تھا مگر اب شکستہ دیواروں کی صورت کھڑا تھا۔ یہ علی شیر خان کی محبوب ملکہ گل خاتون کا محل تھا۔ چھومیک کے علاقے میں عورتیں گھاس کاٹتی تھیں اور چھتوں پر خوبانیاں اور شہتوت پڑے سوکھتے تھے۔ دریائے سندھ کا مقامی نام سنگے چھو ہے۔ قلعہ کھرپوچو تک پہنچنے کا راستہ ملکہ نے بنوایا تھا۔ مقپونوں کی شکست کا المیہ گیت جو امیر حیدر مصنفہ نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ قلعے کے بارے میں بتایا کہ سارا قلعہ ایک چبوترے پر بنا ہے۔ ڈوگرہ وزیر لکھپت رائے نے سارا قلعہ جلا دیا تھا۔ مہتر سنگھ نے دوبارہ تعمیر کرایا اور قلعے کے درمیان چٹان کھود کر حوض بھی بنایا جس میں پانی جمع کرتے تھے۔ اس میں پانی لانے کے لیے شمالی جانب سے دریائے سندھ کے کنارے تک زمین دوز راستہ موجود تھا۔[241] انچن اور مغل شہزادی کی داستان کا بھی ڈرامائی انداز میں منظر نگاری کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس داستان میں پولو کے لیے مخصوص دھنوں کا ذکر ہے۔ شہزادی کے زیورات، اس کے سنگ مرمر سے بنائے محل، نہر اور باغ کی تعمیر کا ذکر ہے۔ قلعے تک کا راستہ بنوانے پر بادشاہ انچن اس سے ناراض ہو گیا۔

بلتستان میں شمسی حساب سے ماہ اسد کا پہلا عشرہ شہدائے کربلا کی یاد میں مجالس عزا کے لیے مخصوص ہے۔ چھوربٹ کے علاقے کے ایک کردار غلام حیدر کا مصنفہ نے تفصیلی ذکر کیا ہے جس نے جنگ آزادی بلتستان میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس کی زبانی ڈوگرہ راج کے زمانے کے حالات، جنگ آزادی کا پس منظر اور جنگ کے حالات کا ذکر کیا ہے۔ ڈوگرہ راج کے دور کے قدیم بلتستان کی تفصیلی جھلک اس کردار کی زبانی کتاب میں شامل ہے۔ اس میں دریا پار کرنے کے لیے مشکوں اور لکڑی کے ڈنڈوں سے بنی کشتی ہلچو کزم، توت کے درختوں کی جڑوں کے چھلکوں سے بنی رسیوں کا پل، مقامی کھیتوں میں اگائے جانے والے اناج، زمین کے انتقال پر اعتراض، لگان، بیگار ٹیکس وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ بیگار پر کوئی چھوٹ نہیں تھی۔ ہر گھرانے کو سال میں چالیس دن تک پڑاؤ پر بیگار کی ڈیوٹی دینے کے علاوہ حکام کے کھانے پینے کا انتظام بھی اپنے پاس سے کرنا ہوتا تھا۔ حکام کے کتے بھی پالکیوں میں بٹھا کر بیگار کرنے والوں سے اٹھوائے جاتے تھے۔ مقامی غداروں نے ڈوگرہ حملے کی راہ ہموار کی تھی۔ ایک لوک رومانی گیت کا بھی ذکر ہے۔ ڈوگرہ راج سے آزادی کی جدوجہد کی تفصیل بھی فراہم کی ہے۔

شگر کے لوگ راجگی نظام کے خاتمے کے باوجود ان کی دم توڑتی جاگیری روایات کی پاسداری کرتے ہیں۔[242]
شگر کی سیر کے دوران منگولی خدوخال والے لوگوں کے بکتور یہ اصل ہونے کا پس منظر، کھیتوں میں عورتوں کے کمر پر چورونگ کسے کام میں مصروف ہونے، بچوں کے کرکٹ کی طرز کا مقامی کھیل جگہ جگہ کھیلنے، نو سو سال پرانی مسجد میں چوب کاری کے کام کی تفصیل اور پرانے محل فونگ کھر کا ذکر کیا ہے۔ وہاں دایاں ہاتھ پیشانی تک لے جا کر سلام کرنے کا دستور قدیم زمانے سے ہے۔ خانقاہ معلیٰ کے طرز تعمیر، کشادگی، کشمیری فنکاروں کی اسے بنانے سجانے میں محنت کا ذکر ہے۔ گندم کاٹنے کا تہوار ستروب لہ منایا جاتا تھا۔ بابرکت مخلوق ہلنو ہے۔ ہلال باغ مقامی رومانی لوک گیت ہے جو لداخی شہزادی کے انجن کی زندگی میں آنے کے پس منظر سے متعلق ہے۔ چند قدیم رواجوں میں نکاح انقطاعی تھا جو مخصوص مدت کے لیے ہوتا تھا اور دلھن سفید لباس پہنتی تھی۔[243]

مقامی بلتی گھروں کے بارے میں مصنفہ لکھتی ہیں۔

> "بلتستان میں دو منزلہ گھروں کا رواج ہے۔ سردیوں میں گھر کی نچلی منزل استعمال ہوتی ہے اور گرمیوں میں اوپر کی۔ مویشی وغیرہ بھی نچلی منزل میں رکھے جاتے ہیں۔ یہ سارا پتھروں کا بنا ہوا تھا۔۔۔ چھرا (بکری کے بالوں سے بنی ہوئی ڈیزائن دار دری) پورے کمرے میں بچھا تھا۔ سفید گاؤ تکیے دیواروں سے لگے ہوئے تھے۔"[244]

مقامی تہواروں پر مخصوص کھانا مرزن بنایا جاتا ہے۔ اس کے لیے ابلتے پانی میں آٹا ڈال کر حلوے کی طرح پر نمکین بناتے ہیں اور دیسی گھی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ چار چار پانچ پانچ خواتین مل کر ایک سینی میں کھاتی ہیں۔ لکڑی کے لمبے ڈبے دوغما میں دہی بلویا جاتا ہے۔ مسجد امبورک کا اور چھ برونجی کا احوال بھی بتایا ہے۔ گندم کی گہائی کے لیے زوموسے مدد لیتے ہیں۔ بھوسہ الگ کر کے گندم کو تھیلیوں میں ڈالنے کے دوران سب لوگ مکمل خاموش رہتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ایسے بدروحیں آتی ہیں اور اناج سے برکت اڑ جاتی ہے۔[245]

بلتی خواتین سردیوں کے لیے سبزیاں خشک کر کے محفوظ کرتی ہیں۔ ٹماٹروں کو چار ٹکڑے چھت پر ڈال کر سکھاتے ہیں۔ سیبوں کو بھی بچھاتے ہیں۔ سٹور میں مولیوں گاجروں کو دباتے ہیں۔ سوکھے ساگ اور پالک کو پیکٹوں میں بند کرتے ہیں۔ ٹماٹر سکھا کر پیستے ہیں۔[246] ایک مقامی گھر میں پیدائش کی خوشی میں بانٹنے والا کھانا پڑوپو تیار کیا جا رہا تھا۔ باجرے کے آٹے کے پیڑے ابال کر ان میں اخروٹ، بادام، دھنیا، نمک مرچ، مغز شامل کرتے ہیں۔ میٹھے سموسے ارزق بھی بانٹے جاتے ہیں۔ مقامی گھروں میں جھانکنے پر ایک عورت کنالی میں رکھی خوبانی کی گریاں تیل نکالنے کے لیے سوس (پتھر کی زمینی کونڈی) میں کوٹتی نظر آئی۔ ایک گھر میں مرگ ہوئی تھی ساتویں دن سوگ ختم کرانے کی رسم کے طور پر عزیز واقارب خواتین گھر کی خواتین کے سر دھلوانے اور کنگھی کرنے آئیں تھیں۔ یہاں مرگ اور ولادت پر رشتہ دار پکے ہوئے کھانوں کے ساتھ حاضری دیتے ہیں۔[247]

وہاں تین چار کلو وزن کے خربوزے پائے جاتے تھے۔ ایک مقامی گھر میں تھک شا پر پٹو بنایا جا رہا تھا۔ وہاں کھانے کے لیے خوبانی کے ٹکڑے کر کے انھیں جو کے خشک آٹے میں لتھیڑ کر کھانے کے لیے پیش کیے گئے۔ کونیس نامی آبادی کے کھیت اوپر پہاڑوں پر تھے جہاں پانی میسر تھا۔ لوگ وہاں جا کر کاشتکاری کرتے تھے زندگی کٹھن تھی۔ خپلو کے راجا کے محل میں شاہی خاندان کی زبوں حالی کا بھی ذکر کیا ہے کہ بدلتے حالات میں راجا لوگ معمولی نوکریاں کر رہے ہیں۔ ناشتے میں خوبانی کے رس کا گرم پیالہ دیا گیا۔ مسجد چقچن کو ایشیا کی خوبصورت ترین مسجد کہا گیا تھا۔ قدیم بلتی آرٹ زیادہ تر خپلو میں زندہ نظر آتا ہے۔ شاہی خاندان کے راجا افتخار علی خان اور ماجوری بلز کی محبت اور شادی کی داستان بھی بیان کی ہے۔ اس وقت کے شادی کے رسم ورواج کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

بلتستان میں تونگ درونگ متبرک نشان کے طور پر مستعمل ہے۔ بدھ مت کے دور میں سفید کپڑے پر گندم کے دانوں سے یہ نشان بنا کر دلھا دلھن کو برکت کے لیے اس پر بٹھاتے تھے۔ اب بھی قدیم محلوں، قلعوں، خانقاہوں، مساجد کے دروازے پر یہ نشان نظر آتا ہے۔[248] چھوربٹ نالے کے راستے پرانے وقتوں میں کشمیر کے لیے آمدورفت ہوتی تھی۔ سیاری سیکٹر میں فوج کے لیے رسل ورسائل کے انتظامات چھوربٹ کی اہم وادی پیون سے کیے جاتے ہیں۔ چھوربٹ کے ایک مقامی گھر کے بڑے کمرے کا نقشہ مصنفہ اس طرح کھینچتی ہیں:

"یہاں کونے میں چولھا جلتا تھا۔ دادی جواری ہر دو گوژینو (چنٹ والی شلوار) پر سیاہ فیتوں والا کرتا، سر پر فلو والی ٹوپی اور اس پر سیاہ چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔ کمرے میں چھوربٹ کا خوشنما پٹو (دری) بچھا ہوا تھا۔ کونے میں لالٹین جلتی تھی۔ دوسرے کونے میں آڑے رخ بندھی تار پر رضائیاں لٹکتی تھیں۔ چولہے کے پاس دیوار میں پھنسے تختوں پر برتن دھرے تھے۔"[249]

گھر کے بقیہ چھوٹے کمروں میں فرش پر نرم گھاس پر دریاں اور ان پر گدے رضائیاں بچھی تھیں۔ چھوربٹ کے علاقوں سکسہ اور سیاری میں پاک فوج کے لیے رسد ورسائل کی فراہمی اور باربرداری کے لیے مقامی انتظامیہ کے ٹھیکیدار عوام سے بیگار کے طور پر زبردستی باربرداری کا کام لیتے تھے جس سے تنگ آکر وہاں کے لوگوں نے اعلیٰ حکام تک اپنی مشکلات پہنچائیں۔ سیاچن نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سیا جنگلی گلاب کو کہتے ہیں۔ سفید پیلے گلابی رنگ والا سخت جان پودا ادھر نظر آتا ہے۔ مقامی کردار کی زبانی مصنفہ نے سیاچن جنگ کا پس منظر بھی بتایا ہے۔ سیاچن کی لڑائی سے بلتستان کے وہ علاقے بھی ترقی یافتہ ہو گئے جو دوسری صورت میں پسماندہ ہی رہتے۔ آرمی نے سڑکیں بنائی ہیں، بجلی کی فراہمی ممکن بنا رہے ہیں۔ لوگوں کو روزگار ملنے سے ان کی مالی حالت بدلی ہے۔ وہاں برفباری میں پہننے کے لیے کرسمہ گھاس سے تیار کردہ جوتے بنائے جاتے ہیں جو لوگ مقامی طور پر خود ہی بناتے ہیں۔ سردیوں کے لیے لکڑی کے صندوق ریگیم میں آٹا محفوظ کیا جاتا ہے۔ پیاز اور مرچ کی چٹنی کو سالن کے طور پر استعمال کر لیتے ہیں۔ سارے بلتستان کی طرح چھوربٹ میں بھی مویشیوں کو گرمیوں میں بلند چراگاہوں میں چھوڑتے ہیں۔ اور گھر کا ذمہ دار فرد ان کی دیکھ بھال اپنی

باری پر کرتا ہے اور ان کا دودھ خود لیتا ہے یہ رسم بجون کہلاتی ہے۔[250] چھوربٹ کے صدر مقام سکسہ کی موسم گرما کی چراگاہ قلان ہے۔

سردیوں میں داستان سننے کے لیے لوگ کسی ایک گھر میں جمع ہوتے ہیں۔ آنے والے دو سلام کرتے ہیں ایک میر محفل کے لیے اور دوسرا حاضرین کے لیے۔ کہانی سننے کے دوران خواتین چرخہ کاتتی تھیں۔ کیسر داستان سنائی گئی۔ وہاں مے فنگ تہوار کے لیے پڑوپو اور میٹھے کلچے تیار کیے جاتے ہیں۔ تیزی سے جلنے والی لکڑی کے ڈنڈے بنائے جاتے ہیں۔ بچے ٹولیاں بنا کر اپنی اپنی شلپائیں (لکڑیاں) اٹھا کر ساری وادی میں مختلف سمتوں میں گھومتے ہیں۔ چراغاں کا یہ منظر کسی بلند جگہ سے بہت خوش کن لگتا ہے۔ چھوربٹ میں لوگ کھیتوں میں ہل چلانے اور فصل کی چھانٹی کے لیے گھوڑے استعمال کرتے ہیں۔[251]

کھرمنگ کے نام کی وجہ تسمیہ اس کا مطلب زیادہ قلعوں والا علاقہ ہونا ہے۔ ماضی میں سکردو کو بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ رکھنے کے لیے یہاں متعدد قلعے اور فوجی چوکیاں تعمیر کی گئیں تھیں۔ یہ سرمک سے شروع ہو کر اولڈنگ تک سندھ کے آرپار آباد ہے۔ اس وادی کے تین گاؤں ہندور، موکرٹ اور مزبرا 1971ء سے بھارت کے قبضے میں ہیں۔ نوروز کے لیے چھوربٹ میں ابلے انڈوں پر رنگوں سے ڈیزائن بنائے جاتے ہیں پچی کاری کی جاتی ہے۔ چونکہ بلتستان پر ایرانی تہذیب کا اثر ہے اس لیے یہ تہوار جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ گھروں کی سجاوٹ کی جاتی ہے۔ خصوصی پکوان کلچے، زرچون اور ارزق تیار کیے جاتے ہیں۔ پہلے اس موقع پر انڈوں کے مختلف کھیل کھیلتے تھے۔ پولو کا میچ منعقد کیا جاتا تھا۔

شگر میں مقامی شادی کے تہواروں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ کھورسم کی شب محلے کی سماجی تنظیم کے ارکان انتظامات کے لیے دلھا کے گھر جاتے ہیں۔ مہندی میں پکے ہوئے کھانے کے تحفے کھ می کھل، کھب سے وغیرہ دلھن کے گھر لے جاتے ہیں۔ دریا پار کرنے کے لیے مشکیزوں اور لکڑی کے ڈندوں سے بنی سواری زخ تھی۔ پہلے دلھن کے لیے سفید عروسی لباس ہوتا تھا اب سرخ کا رواج ہو گیا ہے۔ کلچوں کے ٹکڑے وہاں لوگوں میں بانٹے جاتے ہیں جنھیں وہ ملیں اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ اگلے دن بارات کے ساتھ جائیں گے۔ عام شادیوں کے برعکس کھانے کی ابتدا مرزن کی بجائے ابلے سفید چاولوں، پالک گوشت اور سادہ گوشت سے ہوئی۔ ایک ایک سینی کے گرد چار چار پانچ پانچ لوگ بیٹھے تھے۔ کھانے سے پہلے آفتابوں سے ہاتھ دھلوائے گئے۔ باراتیوں کے کھانے میں ڈالا جانے والا مکھن لڑکے کے گھر والے بھیجتے ہیں یہ رسم مار بجوس کہلاتی ہے۔ بلتی سہرا بل تھود کہلاتا ہے۔ یہاں بارات دلھن کے گھر والے لاتے ہیں۔ بارات والے دن دلھا کو آس پاس کی بستیوں میں سیر کرائی جاتی ہے۔ دلھن کی رخصتی کے وقت چلاہو کی دھن بجائی گئی۔ لوگ ہفت بند پڑھنے لگے۔ دلھا کی دہلیز پر دلھن نے سیاہ بکرے کو ہاتھ لگایا، اسے ذبحہ کیا گیا اس کے خون کو پھلانگ کر

دلھن اندر آئی۔ اندر آکر چائے کلچہ کھانے کے بعد دلھن کا گھونگٹ الٹا گیا۔ آنے والے رشتہ دار پکے کھانوں یا مٹھائی کا تحفہ لاتے اور دلھا دلھن کے آگے رکھتے۔[252]

روندو کی وادی کے گاؤں طورمیک میں پانی کی قلت دور کرنے کے لیے مصنوعی گلیشیر کی افزائش کا ذکر کیا ہے۔ قلان کی سرسبز وادی مصنوعی گلیشیر کی مرہون منت ہے۔ مصنوعی گلیشیر کی افزائش کی تفصیل بھی بتائی ہے۔ بلتستان میں تہواروں کے موقع پر شوربے میں روٹیاں ڈال کر سینیوں میں پیش کیا جاتا ہے اور گوشت کی بوٹیوں کے ٹکڑے ہاتھوں میں دیے جاتے ہیں تاکہ مساوات کا عمل پورا ہو اور سب کو مل سکے۔[253] سلمیٰ اعوان کی اس کتاب میں بلتی ثقافت کے بہت سے مظاہر اور دلکش رنگ نظر آتے ہیں۔

میرا گلگت و ہنزہ (1986ء)، سلمیٰ اعوان

گلگت و ہنزہ کا یہ سفر سلمیٰ اعوان نے 1986ء میں کیا۔ شاہراہ قراقرم پر سفر کے دوران مصنفہ نے ہری پور کی مختصر تاریخ بتائی ہے اس کا اصل نام گل ڈھیری تھا۔ ایبٹ آباد کے مشہور پہاڑ سربن کی ادبی حیثیت اجاگر کی ہے۔ مان سنگھ نامی ہندو کے نام پر شہر مانسہرہ میں اوگی کے مقام پر بدھ تحریروں کا ذکر ہے۔ تھاکوٹ کا پل دنیا بھر میں اپنی نوعیت کا بڑا پل ہے یہ دس ماہ کی قلیل مدت میں تیار ہوا تھا۔[254] بشام سے ہربن تک سندھ کے دونوں جانب کے علاقے کوہستانی کہلاتے ہیں۔ ہزاروں برس قبل یہ سارا علاقہ ٹیکسلا کا حصہ تھا۔ کوہستانی لوگوں کے بارے میں مصنفہ کا کہنا ہے کہ یہ دلیر ہیں۔ ان کی اکثریت شین ہے۔ رسم و رواج آداب معاشرت میں یک رنگی ہے اس کے باوجود سندھ کے دونوں اطراف کے لوگ ایک دوسرے کی زبانیں بول اور سمجھ نہیں سکتے۔ شینوں کا تعلق عرب قریش سے بتایا جاتا ہے۔ پشتو دونوں طرف کے لوگوں کی رابطے کی زبان ہے۔ سندھ کے آرپار رہنے والے ایک دوسرے کے ساتھ شادی بیاہ نہیں کرتے۔ دائیں طرف کے لوگ زیادہ دینی، تعلیم یافتہ اور معاملہ فہم ہیں۔ لیکن جگلوٹ کے لوگوں کے بارے میں مقامی فرد کی زبانی خبردار کرتے ہوئے مصنفہ کہتی ہیں:

> "جگلوٹ کے باشندے بہت سنگدل اور سفاک ہیں۔ کسی کو قتل کرانا یا کرنا ان کے لیے معمولی بات ہے۔ جب کوئی مسافر ان کے گاؤں سے گزرے تو اسے لوٹے بغیر نہیں چھوڑتے۔ ایک معمولی ٹوپی کی خاطر بھی قتل کر دیتے ہیں قتل کرنے کے بعد مینار جیسے تین منزلہ مکان میں قلعہ بند ہو جاتے ہیں۔ یہ مکان گھڑی کہلاتا ہے۔"[255]

مقامی نوجوان نے مزید بتایا کہ دریا کا مشرقی علاقہ اب ہزارہ اور مغربی ضلع سوات کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔ قانون کا نفاذ عمل میں آنے سے اب قتل و غارت اور لوٹ ماریں کمی آئی ہے۔

چلاس سارے شمالی علاقوں میں سب سے زیادہ گرم ہے اس لیے یہاں کے لوگ گرمیاں شروع ہوتے ہی ٹھنڈی جگہوں پر چلے جاتے ہیں۔ بٹوگاہ نالے کے گرد چلاس کی قدیم ترین بستیاں ہیں۔ وہاں ایک مقامی گھر میں لکڑی کا فراخدلانہ استعمال تھا۔ لکڑی کی چھت، کھڑکیوں دروازوں کے ساتھ فرش بھی چوبی تھا۔ اس کمرے کی نشست آنگن سے تین زینے نیچی تھی۔ دیواروں پر لٹکتی بندوقیں چلاسی لوگوں کی جنگجویانہ ذہینیت کی مظہر تھیں۔[256] چلاس میں شنا زبان اور شنا قوم کے پس منظر کے بارے میں بتایا ہے۔ تعلیمی لحاظ سے استور شمالی علاقہ جات میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ چلاس قلعے میں پولیس کا دفتر تھا۔ مقامی شخص کی زبانی ڈوگرہ فوج کے حملے کے دوران اس قلعے کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ جہاں دن میں چلاسی مرد اور رات میں عورتیں بندوقیں تھام کر لڑتی تھیں۔ ڈوگروں کے قلعے کے حوض سے پانی ضائع کرنے کے بعد چلاسی اطاعت پر مجبور ہوئے۔[257]

وہاں سوموکی رسم ادا کر کے حقیقی بھائی بننے کا رواج ہے۔ جب دوستی کو محرم کے رشتے میں بدلنا ہو تو سومو بناتے ہیں۔ بکرے ذبحہ کر کے گاؤں والوں کی ضیافت کی جاتی ہے۔ چلاس کی ایک قدیم تاریخی روایت کا ذکر ہے جو چاق اور ماہ چاق کے بارے میں ہے۔ سندھ کے پار تھلپن گاؤں جانے کے لیے مشکوں اور بانس کے ڈنڈے سے بنی مقامی کشتی جالو استعمال ہوتی ہے۔ تھلپن میں چٹانوں پر قدیم آثار کنندہ ہیں جن کی نشاندہی مصنفہ نے کی ہے۔ ستھین دور کے کتبے اس عہد کی پوری نشاندہی کرتے ہیں۔ مصنفہ کے خیال میں شین ہی ستھین ہیں۔[258]

چلاس میں لڑکی والے شادی کے موقع پر لڑکے والوں سے پیسے لیتے ہیں۔ اسے دھاپ کہتے ہیں۔ چلاس میں چادریں اوڑھنے سے پہلے سروں پر ٹوپیاں پہننے کا دستور ہے۔ داریل کے لوگ پھولوں اور موسیقی کے بہت دلدادہ ہیں۔ کسی مقامی شاعر کا گیت گاڑی میں بج رہا تھا جس کا ترجمہ مصنفہ نے ڈرائیور سے پوچھ کر کتاب میں شامل کیا ہے۔ دیامیر میں شاعروں کے بارے میں وہ کہتی ہیں:

> "دیامر کی مختلف وادیوں، داریل کے عبدالحق، سازین کے صفدر، تھک کے گل اور گوہر آباد کے مولوی حسین کی خوبصورت شاعری شینا زبان کا قیمتی اثاثہ ہے۔۔۔ شینا چونکہ تحریری زبان نہیں اس لیے کلام سینہ بہ سینہ چلتا ہے اور یوں بہت سا ضائع بھی ہو جاتا ہے۔ بیشتر شعرا پڑھے لکھے نہیں تھے۔ بھیڑ بکریاں چراتے اور کھیتوں میں ہل چلاتے چلاتے ان پر آمد ہوتی۔"[259]

گئی داس میں مقامی جانور توشوں اور زیرے کے پودے نظر آئے۔ چلغوزے کے درختوں سے پھل توڑنا بہت دلچسپ عمل ہے۔ لوگ ٹولیوں کی صورت میں پہاڑوں پر آتے ہیں بہت دن وہاں رہتے ہیں۔ توڑتے وقت بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ آگ کے الاؤ دہکا کر توڑے ہوئے خول اس میں ڈالنے سے ان کے منہ کھل جاتے ہیں۔ رت جگا ہوتا ہے رقص اور گیت چلتے ہیں۔[260]

وہاں مقامی گھر میں مرد پرات کے گرد بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ بوٹیاں ہاتھوں میں اور روٹی چھوٹے چھوٹے ٹکروں کی صورت میں شوربے میں ڈوبی تھی۔ وہاں جڑی بوٹیوں سے علاج کا رواج ہے۔ موسمی بخار کے لیے آرٹی ویشا نامی بوٹی اکسیر سمجھی جاتی ہے۔ وادی بابوسر اور اس کے لوگوں کے بارے میں مصنفہ کہتی ہیں:

"۔۔۔ جہاں کے پہاڑ جنگلات سے بھرے ہوئے ہیں۔ جہاں سلاجیت، زمرد، نیلم، ابرق جیسی قیمتی اشیا پائی جاتی ہیں۔ جہاں کے لوگ قدامت پسند اور اپنی روایت پر مر مٹنے والے ہیں۔ جہاں کے لوگ قول کے پکے اور سچے مسلمان ہیں۔"[261]

گلگت کے راستے میں ویگن میں ایک مقامی مسافر خاتون نے رنگ برنگے موتیوں کا گلے کا زیور مشٹی پہنا تھا اور سر پر سرخ ٹوپی اور شوخ چادر تھی۔ چھمو نگر میں بچے سڑک کنارے سلور کے برتنوں میں تازہ پھل ایک ایک روپے فی تھالی فروخت کر رہے تھے۔ گلگت کے تاریخی پس منظر کے بارے میں مصنفہ نے بتایا ہے کہ اس کے پرانے نام گری گت، گلگوت، گلگشت رہے ہیں۔ گلگت کے ایک محلے کشروٹ میں پتھروں کے گھر، تنگ گلیوں، خوبانی، شہتوت کے درختوں کی چھاؤں اور گلیوں کے درمیان بہتی کھال تھی جس کے کناروں پر لڑکیاں کپڑے دھو رہی تھیں۔[262]

گلگت کے خوبصورت معلق جدید پل کے ساتھ 1905ء میں کرومبر جھیل میں گلیشیر کا حصہ ٹوٹنے سے سیلاب آجانے سے پرانے پل کے منہدم ہونے کا بتایا ہے۔ گلگت کے ایک تاریخی کردار جوار خاتون کی کہانی تفصیل سے مصنفہ نے اپنے سفرنامے میں شامل کی ہے۔ موجودہ گلگت کی زرخیزی، شادابی اور آبادکاری بہت اس کے کاموں کی مرہون منت ہے۔ اس نے رفاہ عامہ کے بہت کام کرائے۔ چلاس، استور، غذر اور گلگت میں سڑکیں اور نہریں بنوائیں۔ کوہل بالا اور کوہل پائیں اور سونی زیب نامی نہریں نکلوائیں۔ گلگت میں سید سلطان علی عارف کا مزار ویسی ہی اہمیت کا حامل ہے جو لاہور میں حضرت داتا گنج بخش کے مزار کو حاصل ہے۔ سلمیٰ اعوان نے شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے دوران جاں بحق چینی نوجوانوں کی یادگار کو دیکھ کر پاکستانی شہید نوجوانوں کی یادگار نہ بنائے جانے کا شکوہ کیا ہے۔ 1690ء میں جو تیال میں تاج مغل نے گلگت فتح کرنے کی خوشی میں مغل مینار بنایا جو ابھی تک اصل حالت میں موجود تھا۔ تاج مغل نے ہی یہاں اسماعیلی مذہب کو فروغ دیا جو بعد میں مولائی کہلایا۔[263]

چھ مربع میل پر محیط شاداب وادی نومل چین اور ہنزائی افراد پر مشتمل ہے۔ وہاں تعلیم کا خاصا رجحان ہے۔ لوگ بیلوں کی لڑائی شوق سے دیکھتے ہیں۔ وہاں ایک مقامی گھر میں دیواریں نقش و نگاری سے مزین تھیں۔ چھت میں دھواں باہر نکالنے کے لیے سوراخ سوموتھا۔ وہاں ایک آدمی کے پیٹ درد کے لیے کالی چائے میں کالی مرچ ڈال کر ابالی جارہی تھی جو پیٹ درد کا وہاں عام علاج سمجھا جاتا ہے۔[264] نلتر کے جنگلوں میں مارخور اور رام چکور کا شکار بھی ملتا ہے۔ نلتر سے وادی پنیال، اشکومن اور نگر تک راستے نکلتے ہیں۔ مقامی شاعر ڈاکٹر سید حسین جعفر حکیم کے اردو اشعار مصنفہ

نے اپنی کتاب میں شامل کیے ہیں۔ گلگت میں شادی شدہ بیٹی کے گھر بوڑھا باپ پٹو کا فرغل، خشک انگور اور درخت کی چھال جو جی میں لپیٹے مکھن جیسی سوغاتوں کے ساتھ بیٹی کے گھر آیا تھا۔ [265]

نسائی خوبصورتی کے لیے وادی یاسین بہت شہرت رکھتی ہے۔ پنیال کی مرکزی وادی سنگل ہے۔ وہاں کہیں تنگ کہیں کشادہ گلیوں میں اخروٹ کے درختوں اور انگور کی بیلوں کی بہتات تھی۔ پنیال لفظ پویال سے نکلا ہے جس کا مطلب سنسکرت میں پھلوں سے بھری تھالی ہے۔ یہاں بھی بیشتر آبادی اسماعیلی ہے۔ یہاں ایک مقامی گھر کے بارے میں مصنفہ بتاتی ہیں اس کے بڑے کمرے کی دیواریں پتھروں اور کچی اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ چھت بڑے تختوں پر مشتمل تھی جس کا درمیانی حصہ تکون نما گنبد کی مانند تھا۔ اخروٹ کے چار موٹے منقش ستونوں نے چھت کو سہارا دے رکھا تھا۔ سردیوں میں گنبد نما چھت کے نیچے آگ جلتی ہے جس کے گرد گھر کے لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ درمیان میں آگے ضعیف افراد کے لیے لکڑی کے پلنگ نما تختے بچھے تھے اور دونوں طرف لکڑی کی الماریاں تھیں۔ وہاں ہر گھر میں پرنس کریم آغاخان کی تصویریں تھیں۔ آنگنوں میں انگوروں سے شراب بنانے والی ہوزریاں تھیں۔ [266]

سنگل کی ملکہ تاجور نامی خاتون کی کہانی بیان کرتے ہوئے مصنفہ نے مقامی ثقافت کے بہت سے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اس میں لوک کرداروں یورمس اور رحمت جان ملنگ کا حوالہ بھی دیا ہے۔ تب گلاپور میں تاجور خاتون کے بھائی کو راجگی نظام سے نفرت تھی۔ ایک دن کی روداد اس کی زبانی یوں بیان کی ہے۔

"۔۔۔بابو (باپ) تھوداس (وادی یاسین کا گاؤں) اپنی سگی بہن کے پاس گیا ہوا تھا اور میں تھرنگی (بکری کے چمڑے کا مشکیزہ جس میں دودھ بلویا جاتا ہے) میں ہفتہ بھر سے سیب کے پتے بھر بھر کر اسے کوٹتی رہی تھی اس وقت اس کی مہندی رنگی کھال کو یہ جاننے کے لیے سونگھ رہی تھی کہ اس کی بو ختم ہو گئی ہے یا نہیں۔" [267]

انگوروں سے شراب بنانے کے لیے بیلوں سے اترے انگور گچھو چی شراب بنانے والی ہوزری میں ڈالے جاتے۔ شیشو گوٹ کا تہوار مناتے وقت لوگ روغنی روٹیاں بابو شرک لیے جو کے کھیتوں میں جاتے وہاں دعائیں پڑھ کر فصل کے چند خوشے توڑ کر گھر آکر دودھ کی پیالیوں میں ان کے دانے ڈال کر نوش کیے جاتے۔ گندم ذخیرہ کرنے کا صندوق تون کہلاتا تھا۔ پنیال پر اشکومن اور یاسین کی وادیوں کے بہت اثرات ہیں اس لیے فارسی، کھوار، بلتم اور واخی کے اس کی شنا پر گہرے اثرات ہیں۔ نسالو کا تہوار دسمبر میں بہترین جانور ذبح کرکے اس کا گوشت سردیوں کے لیے ذخیرہ کرنے کا تہوار ہے۔ مقامی خوراک میں پرے، پھلکوں، پھپھاؤں اور پنودیتوشا ایسا ساگ جس میں خوبانی کی گریوں کا گاڑھا دودھ اور آٹا ڈال کر پکایا جاتا ہے کا ذکر کیا۔ چیل کے درخت کی لکڑی کو چراغ کے طور پر استعمال کرتے جو روخ کہلاتی۔ قہوے کا برتن سماوار کہلاتا۔ یوبر وادی میں ڈمورا کے کھنڈرات میں انسانی ہڈیوں کے پنجر موجود تھے۔ وہاں یہ رواج تھا کہ دلہا دلھن کے شادی کے کپڑے اور زیورات کھنڈر میں محفوظ جگہ رکھے جاتے ان کی موت کے بعد لواحقین

انھی کپڑوں اور زیورات میں انھیں اس عمارت کے تہہ خانے میں چھوڑ جاتے۔ وہاں ابدو قبیلے کے بارے میں روایت تھی کہ اس برادری کا کوئی شخص مرتا تو ایک رات پہلے کھنڈر سے ڈھول بجنے کی آواز آتی لوگ کسی کے مرنے کا انتظار کیے بغیر قبر کھودنا شروع کر دیتے۔[268] تب دلھن کا عروسی جوڑا سفید ہوتا تھا۔ تب شادی کی رائج رسموں اور ڈوگروں کے ان علاقوں میں قابض ہونے کا بھی ذکر ہے۔

ہنزہ کے مقامی بوڑھوں کی زبانی جٹیال کے بارے میں معلومات دی ہیں کہ پہلے لوگ زمین نہیں خریدتے تھے اب کال پڑ گیا ہے۔ رحیم آباد کی زمین میر ہنزہ کی جائیداد ہے۔ تھول کی وادی میں انجینئرنگ کا بہترین شاہکار ہندی پل ہے۔ اس علاقے کی لوک کہانی بھبھوتن کا بتایا ہے۔ ہنزہ کے بارے میں جغرافیائی معلومات کے علاوہ اس کے مختلف حصوں اور ان میں آباد قومیتوں، ان کی زبان کے بارے میں معلومات دی ہیں۔ ہندی بہت قدیم گاؤں ہے جہاں پرانی تہذیب کے اثرات اب تک موجود ہیں۔ التت محل بالتی یل کے بادشاہ نے اپنی بیٹی کی شادی ہنزہ کے راجا سے کرنے پر اپنے معمار بھیج کر اس کی رہائش کے لیے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے صدر دروازے پر بدھ مت کے پیروکاروں کا مقدس نشان کنندہ ہے۔ قدیم ہنزہ میں آمد و رفت بہت دشوار تھی۔ گلگت جانے کے لیے چھلت کی چوکی سے باقاعدہ اجازت نامہ درکار ہوتا تھا۔ ہنزہ کے لوگوں کو شہر میں رات گزرنے کی اجازت نہیں تھی۔ سرد راتیں بھی لوگ شہر سے باہر غاروں میں گزارتے۔ مختلف امور کے لیے مہینے مقرر تھے۔ ستمبر کے آخر سے موت کا مہینہ شروع ہو جاتا۔ تب لوگ قبریں کھودتے، بیماروں اور بوڑھوں کی خوب تواضع کرتے۔ نمک کی شدید قلت تھی۔ کسی جاں بلب مریض کے لیے نمک تجویز ہوتا تو اس کی تلاش ہوتی۔ کسی کے پاس ہوتا تو وہ ڈلی کو پانی میں دو تین بار ڈبو کر پانی دیتا یہ اس کا بہت بڑا احسان سمجھا جاتا۔ میروں کی خدمت میں مقامی افراد کو بلا معاوضہ کام کرنا پڑتا۔[269]

جنگ آزادی کے ہیرو شاہ خان اور 65ء کی جنگ کے اہم کردار علی مدد کا ذکر کیا ہے۔ پولو کے کھیل کی تاریخ اور آغاز کا بتایا ہے۔ پولو مہنگا کھیل ہے۔ معدنیات سے بھرپور ہنزہ واٹر زود ہضم اور یہاں کے لوگوں کی درازی عمر کا سبب بھی ہے۔ ہنزہ کے تمدن میں مصنفہ کو مغربی کلچر کی ہلکی جھلک ملی۔ گھر صاف ستھرے، خواتین محنت کی عادی، دبلے اجسام کی مالک تھیں۔ تقریباً ہر جگہ اردو سمجھی اور بولی جاتی ہے۔[270] ہنزہ کے اہم تہوار 12 دسمبر اور 21 جون کو منعقد ہوتے ہیں۔ 21 مارچ کو جشن نوروز بھی اہم تہوار ہے۔ پرنس کریم آغا خان کی ولادت کا دن بھی اہتمام سے مناتے ہیں۔

گلگت میں ایک مقامی میزبان کے گھر میں لڑکیوں کی باتوں سے مصنفہ کو اندازہ ہوا کہ وہ کافی آزاد خیال ہیں۔[270] نوپورہ میں کارگاہ نالے کے دہانے پر تیس فٹ اونچی چٹان پر گوتم بدھ کا نو فٹ لمبا مجسمہ تراشا گیا ہے۔ مقامی زبان میں اسے یچھنی کے نام سے پکارتے ہیں۔ نوپورہ کا یہ مجسمہ قدیم وقتوں میں یہاں آنے والے زائرین کے لیے خیر و

برکت کی علامت تصور ہوتی تھی۔ نوپورہ میں قدیم آثار بھی ملے ہیں۔ اس کا قدیمی محل ہاپوکر پہاڑوں پر بنا تھا۔ نوپورہ سے کچھ فاصلے پر ایک قدیم غار ہے جس کی گہرائی اندر سے کوئی جان نہیں پایا۔ بہت سے مہم جوؤں نے پتہ چلانے کی کوشش کی پر انھیں واپس آنا نصیب نہیں ہوا۔[272] کارگاہ گاؤں گلگت کی چراگاہ ہے۔ یہاں اکثریت گوجر قوم کی ہے۔

شاہراہ قراقرم سے اندر آبادیوں میں بڑے بڑے نالوں پر ابھی تک قدیم طرز کے پل ہیں جالو اور ایک رسی پر مشتمل پل کو شنا زبان میں "دوٹ" کہتے ہیں۔ وسط ایشیا اور ہندوستان کے درمیان رابطے کا بڑا ذریعہ ان علاقوں میں قدیم شاہراہ تھی۔ ہندوستان سے ہاتھی دانت، بحیرہ روم کے علاقے سے شیشے اور تانبے کا سامان اور چین سے ریشم کی تجارت ہوتی تھی۔ قدیم ہنزہ میں اہتمام سے گندم اور جو کی کٹائی کے تہوار گنونی منانے کا ذکر ہے۔ ہنزہ کی اہم نہریں بربر اور ڈالد ہیں جو فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور باسٹھ میل رقبے کو سیراب کرتی ہیں۔[273]

ہنزہ کے روایتی گھر کو ممتاسکی حہ کہتے ہیں۔ وہاں جوتے گھروں کے اندر لے جانے کا رواج نہیں۔ بڑے کمرے میں درمیان میں چولھا اور اس کے ایک طرف خواتین اور دوسری طرف مردوں کے بیٹھنے کی جگہ ہوتی ہے۔ اسماعیلی طریق آداب میں سلام کی جگہ یا علی مدد کہنے کا رواج ہے۔ مصنفہ نے راجہ شری بدو کی کہانی روایتی انداز میں سنی جس کی وجہ سے تھموشلنگ کا تہوار منایا جاتا ہے۔ دریا سے سونا نکالنے کا طریقہ بھی بتایا ہے کہ سونے وال دریا میں جہاں بہاؤ تھوڑا سست ہوتا ہے اتر کر لکڑی کی بڑی ٹرے نما چیز لٹکاتے ہیں۔ اس میں دریا سے ریت نکال کر ڈالتے ہیں اس کی جالی دار چھت پر کنکر جمع ہوتے ہیں وہاں کہیں سونے کے ذرات بھی ہوتے ہیں جنھیں ایک مادہ ملا کر یکجان کیا جاتا ہے۔ گھروں کے دروازوں پر رسیوں میں پروئی پالک دھوپ میں خشک ہونے کے لیے لٹکائی گئی تھی۔ ٹماٹر زمین پر بچھا کر سکھائے جارہے تھے۔

نلت میں ایک مقامی گھر میں لکڑی کے چوکور ڈبے میں آٹے کی پنی خشکے میں مسل کر گوندھنے کا طریقہ مصنفہ کو انوکھا لگا۔ چھلت گاؤں پولو کے مایہ ناز کھلاڑیوں کے لیے شہرت رکھتا ہے۔ نگر کے لوگ سادہ ہیں مگر ہنزہ کی نسبت یہاں پسماندگی ہے۔ وادی بداپس میں جلدی بیماریوں کے لیے گرم چشمہ تھا۔ ولی آباد میں پیش گوئیاں کرنے والے کردار دانیال کے لیے ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں چیل کے پتوں پر انگارے ڈال کر دھونی دی جاتی ہے۔ مخصوص دھنوں پر دانیال ناچتا ہے اور پیش گوئیاں کرتا ہے۔ مقامی خوراک درم پھٹی خالص مقامی ناشتہ ہے۔ گندم کو پانی میں بھگوتے ہیں اس کی کونپلوں کو سکھا کر آٹا بناتے ہیں اس آٹے سے یہ تیار کیا جاتا ہے۔ ایک ادبی تقریب میں شریک مقامی ادیبوں اور دانشوروں محمد امین ضیا، محمد اکرم خان، عباس کاظمی، ہدایت اللہ اختر، منظوم علی اور دیگر کا تذکرہ ہے۔ گلگت کی علاقائی شاعری میں دانیال کا بھی اہم مقام ہے۔ اس میں قافیہ ردیف کا خیال تو نہیں رکھا جاتا مگر سچ کی جھلک ملتی ہے۔[274]

میر اسندر چترال (1997ء)، سلمٰی اعوان

سلمٰی اعوان کا یہ سفر 1997ء کا ہے۔ انھوں نے چترال سے پہلے اپنے خاندان کے ساتھ ناران، کاغان، بالا کوٹ کا سفر کیا جس کا احوال اس کتاب میں شامل ہے۔ اسی ذیل میں مانسہرہ کے کتبوں، گاندھیاں گاؤں میں شیو جی مہاراج اور چٹی گٹی کے ٹوٹے پھوٹے مندروں کا تذکرہ کیا ہے۔ سری پایہ کی وجہ تسمیہ وہاں مشہور روایات کے تناظر میں بیان کی ہے۔ دریائے کنہار کے دونوں کناروں پر بسنے والے بالا کوٹ کی شہرت شہدا کی سرزمین کے باعث ہے۔ سید احمد شہید کے مزار کی خستہ حالی اور جھیل سیف الملوک سے منسوب داستان کا ذکر بھی کیا ہے۔

چترال ایئر پورٹ کے بارے میں مصنفہ نے تجویز دی ہے کہ اسے وسعت دے کر بوئنگ طیاروں کے لیے قابل استعمال بنایا جائے کیونکہ پی آئی اے کے فوکر طیارے بہت پرانے ہو چکے ہیں۔[275] چترالی شاہی مسجد اور اس کا مینار مغل طرز تعمیر کا حامل ہے۔ دریائے چترال پر چیو پل بھٹو کے زمانے میں کالاشی شہری کے نام پر بنا۔ چترال کے اتالیق بازار کی خوبی یہ تھی کہ ہر پچاس گز کے بعد اس کا نام بدل جاتا جیسے شاہی بازار، کڑوپ بازار، رشست بازار، نیو بازار وغیرہ۔ بازار میں زیادہ تر دکاندار لمبی داڑھیوں والے تھے۔ کہیں کہیں نوعمر افراد بھی تھے۔[276] چترالی صحت کے سنہرے اصول جلدی سوؤ اور جلدی اٹھو کی عملی تفسیر ہیں۔ چترال کا شاہی قلعہ خستہ حال تھا۔ چترال کے ایک شہزادے سیف الرحمٰن کے دیر کے نواب کے بیٹے کی منگیتر سے شادی کے معاملے پر دیر اور چترال کی ریاستوں کے ایک دوسرے کے مد مقابل آجانے کا بھی تذکرہ ہے۔

آیون کالاش کی تینوں وادیوں کے راستوں کے لیے مرکزی گزر گاہ ہے۔ ایون وادی میں اترنے پر مصنفہ کو مایوسی ہوئی۔ گھروں کے آنگن صفائی ستھرائی سے عاری تھے۔ مقامی گھروں میں کہیں کہیں نوزائیدہ بچوں کے چہرے کو سرونگ (بالوں کی صفائی کے لیے بکری کے جلے سینگوں کے پاؤڈر) سے لیپا گیا تھا۔[277] کالاش کی سڑکوں کی خراب حالت کا بتانے کے بعد مصنفہ بمبوریت کے حوالے سے معلومات دیتے ہوئے کہتی ہیں:

> "بمبوریت تقریباً بارہ گاؤں پر مشتمل کالاش کی سب سے بڑی وادی ہے۔ چترال سے اس کا فاصلہ کوئی 38 کلو میٹر ہے۔ پہلوانده، کندیسار، احمد آباد میں مسلمانوں کی اکثریت، جبکہ کراکال، انشیر برون اور تبریک میں کالاشیوں کی کثرت اور شیخانده میں مکمل مسلم آبادی ہے۔"[278]

کالاش میں ہوٹلوں کی کثرت ہے۔ کالاشیوں کے لیے رقص عبادت ہے۔ یونانی ٹیچرز کا ایک وفد مقامی بچوں کو تعلیم دینے کے لیے آیا تھا۔ وہاں زیادہ تر گھر دو منزلہ اور چوبی تھے۔ یہ اندر سے سیاہی سے اٹے تھے۔ تختوں پر ایلومینیم، چینی اور لکڑی کے برتن سجے تھے۔ کسی گھر میں ایک آدھ کرسی میز ورنہ متعدد میں تخت پوش تھے۔ بڑے کمروں میں درمیان میں آگ جلائی جاتی اور چاول کے بھس اور رسیوں کی آمیزش سے بنی چٹائیاں چیسان بچھی

تھیں۔[279] مقامی بچے بچیاں ادائیں دکھا کر سیاحوں سے پیسے مانگ رہے تھے۔ بشالینی کے بارے میں مقامی گائیڈ نے بتایا کہ اسے لیڈیز نرسنگ ہوم کہہ سکتے ہیں۔ بشالینی میں کسی غیر کالاش عورت کے جانے سے وہ ناپاک ہو جاتی ہے۔ کراکال کے گاؤں میں قبرستان بہت قدیم ہے۔ پہلے وقتوں میں کالاشی مردوں کے ساتھ زیور کپڑے بھی تابوت میں رکھتے تھے۔ آیون کے چالاک لوگ انھیں چرا لیتے تھے اس لیے اب کالاشی صرف چارپائی کی قربانی دیتے ہیں اور کچھ ساتھ نہیں رکھتے۔ کراکال وادی کو بجلی ایک آبشار پر بنے بجلی گھر سے مہیا کی جاتی ہے۔ وہاں کی عبادت گاہ جستھاکن نئی تعمیر شدہ تھی۔ اس کی دیواروں کی آرائش گھوڑے کے منہ والے مجسموں اور بھیڑ بکریوں اور بے معنی تصاویر سے کی گئی تھی یہ سرما کے تہواروں کی رقص گاہ بھی تھی۔[280]

تبریک میں مصنفہ ایک مقامی مسلمان گھرانے کی مہمان بنیں۔ وہاں کے مرد پڑھے لکھے تھے ہوٹل چلاتے اور سرکاری ملازمتیں کرتے تھے۔ مقامی افراد کی زبانی ان کی ابتدا کے بارے میں مختلف آرا بیان کی ہیں۔ کچھ ان کی ابتدا دڑاوڑوں کی چینی شاخ سے جوڑتے ہیں، اسرائیلیوں، افریقہ کی قوم حوس، یونانیوں اور آریا سے ان کا تعلق ثابت کیا جاتا ہے۔ ان کے مذہبی گیتوں میں سیام کا تذکرہ ہے۔ اب وہاں کے نوجوان خود اپنی اقدار سے کسی حد تک گریز پا ہیں۔[281] مصنفہ نے ان کی توجہ اس طرف دلائی کہ تہذیبی انقلاب کیسے دستک نہ دے جب وہاں خواتین ہر ماہ ایک ہفتے کے لیے گھریلو دھارے سے الگ کر کے بشالینی بھیج دیتے ہیں۔ ان کے گھریلو انداز کی ایک جھلک مصنفہ اس طرح دکھاتی ہیں:

> "تھال میں خوبانیاں اور توت سجے تھے۔ اخروٹ کی گریوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر تھا۔ سیاہی سے اٹے کمرے میں نمدے پر بیٹھی کوڑیوں سیپیوں اور بکری کے سینگوں کی راکھ کے تلوں سے سجی عورت چپ چاپ ہماری گفتگو سنتی تھی۔ بہو نے لوبیا پکایا تھا توے پر پتلے آٹے کو پوڑے کے انداز میں ڈال ڈال کر روٹیاں بنائی تھی۔"[282]

چلم جوشی کے تہوار میں سردیوں کے بعد ڈھولچی شنگبھائے رسم ادا کرنے کے لیے نکلتے ہیں۔ مرد و زن جنگلوں میں جاتے ہیں کہ بیشا کے زرد پھول اور اخروٹ کی سنہری شاخیں لا سکیں پر اس احتیاط کے ساتھ کہ عورت پھولوں کو نہیں ہاتھ لگاتی اور مرد شاخوں کو نہیں چھوتے۔ کسی چھوٹے بچے کو نہلا دھلا کر پیالی میں بکری کا دودھ بچے کی انگلیوں سے پھولوں اور شاخوں پر چھڑکاؤ کر کے گویا گھر سے جنوں کو دیس نکالا دیتے ہیں۔ اس تہوار کی طویل رسموں میں عورتوں کا نہا دھو کر نیا لباس پہننا، گھروں میں چپاتیاں پکا کر تقسیم کرنا، اگلے دن رقص کرنے ناچ گاہ تک جانا اور لطف اندوز ہونا بھی شامل ہے۔[283]

مصنفہ کو ناشتے میں تازہ شہد کے ساتھ اخروٹ کی گری کے آمیزے سے بنائی روٹی اور انڈے کا آملیٹ دیا گیا۔ کالاش میں شہد بنانے کی گھریلو صنعت بہت عروج پر ہے لیکن کالاشی عورت کے لیے شہد کا چھونا چکھنا مذہبی نگاہ سے ممنوع ہے۔ مرغی اور انڈہ حرام ہونے کے پیچھے روایات ہیں۔ کالاشیوں کے چار بڑے دیوتاؤں اور قربان گاہ کے اندرونی حصے کی تفصیل بتائی ہے۔ کالاش میں کسی زمانے میں گھوڑوں کی حکمرانی سمجھی جاتی تھی اس لیے اسے دیوتا کا درجہ

حاصل ہے اور عبادت گاہیں اس کے سر سے سجتی ہیں۔ ایک مقامی گھر میں دودھ، پنیر اور میدے کے آمیزے کی روٹی گیلاڑ پکائی گئی۔ وہاں کے اہل خانہ چترالیوں کے کالاشیوں کو کافر، ملعون اور انتہائی ناپسندیدہ قوم گردانتے سے رنجیدہ تھے۔ جبکہ چترالی کہتے ہیں کہ کالاشیوں نے پورا چترال یرغمال بنایا ہے۔ ملکی اور غیر ملکی میڈیا کی کالاش وادیوں کو اہمیت دینے سے چترال کی اپنی شناخت پس منظر میں ہے۔ چلم جوشی، پور، چاؤمس وغیرہ تہواروں کے لیے راتوں کا انتخاب ان میں دلکشی پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ کالاشی رومان پسند لوگ ہیں۔ وہاں لڑکی کو بھگانا دراصل شادی کا طریقہ ہے۔ چاؤمس دس دنوں پر محیط ہوتا ہے۔ مصنفہ نے مقامی افراد کی زبانی اس کی تفصیلات جزئیات کے ساتھ بتائی ہیں۔[284]

کالاشیوں میں شادی کے لیے سات نسلی پیڑھیوں کی دوری ضروری ہے۔ والدین کی طے کردہ شادی کے علاوہ جو لڑکے لڑکیوں کو بھگا لے جاتے ہیں اسے ٹوالی کہتے ہیں۔ چلم جوشی اور چاؤموس کے تہواروں پر زیادہ تر ایسا کرتے ہیں۔ شادی شدہ عورت کو بھگانے کی صورت میں اس کے سابق شوہر کو دکن کی ادائیگی ضروری ہے یہ اس سے دگنا ہوتا ہے جتنا اس شوہر نے شادی پر خرچ کیا تھا۔ نکاح کی علامت کے طور پر وہاں بکرے کا جگر پکا کر دلھادلھن کے ہاتھ میں پکڑاتے ہیں اور کوئی قریبی عزیز تیز چھری سے اسے کاٹتا ہے۔ ایک ٹکڑے کا مرد اور دوسرے کا عورت کے ہاتھ میں رہ جانا نکاح کی علامت ہے۔ کالاشی مرد کی معاشرے میں حیثیت کا اندازہ اس کی بیویوں کی تعداد سے لگایا جاتا ہے۔ کالاشی بنانے کی رسم بھی دلچسپ ہے۔ چھ سال کے بچوں کو پہلی بار سیاہ اون کی شلواریں پہنا کر قربانی وغیرہ کر کے بچوں کو تنہا پرابا دیوتا بھیج کر کالاش بنایا جاتا ہے۔[285] مصنفہ نے چترال کے مشہور شاعر سیار بابا کا بھی ذکر کیا ہے۔ لواری ٹنل ہر چترال کی دکھتی رگ تھی۔

ریشین میں ایک مقامی گھر میں مصنفہ نے پانچ فٹ اونچے اور ڈیڑھ فٹ چوڑے کچے کوٹھے کو دیکھا پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہاں گرمی سے بچاؤ کے لیے دودھ رکھا جاتا ہے۔[286] چترالی قدیم طرز تعمیر کو نہیں چھوڑتے۔

"۔۔۔سامنے کی طرف مقامی گھر جس کی کچی دیواریں اور چوڑے دروازے یہ بتاتے ہیں کہ چترالی خواہ کتنا ہی امیر کیوں نہ ہو اس کو سکون اور طمانیت اپنے پرانے طرز تعمیر والے گھر میں ہی ملتی ہے۔"[287]

قبرستان میں سنی اور آغا خانی قبروں کی تخصیص کے لیے قبروں کے سرہانے اور پائنتی کی طرف لوہے کے لمبے پترے گاڑے جاتے ہیں۔ شوگرام بالا پائین میں پڑھائی کا اتنا رواج ہے کہ مسجد ہی مکتب بنی ہے۔ وادی چاول، گندم، جوار اور سبزیوں کی کاشت میں خود کفیل ہے۔[288]

سیار بابا کی لوک شاعری کا ذکر مصنفہ نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ ان کی مشہور نظم یار من ہمیں کا تذکرہ ہے۔ چترالی لوگ سالن میں سرخ مرچ کا استعمال کم کرتے ہیں۔ سلاد کے طور پر ہری پیاز کے آخری سرے تقریباً ہر گھر میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں دہی بنانے کا طریقہ مختلف ہے۔ کچے دودھ کو کسی برتن میں ڈال کر گرمی والی جگہ رکھ

دیتے ہیں۔ جب وہ پھٹ جائے تو دہی بنا خیال کیا جاتا ہے۔ ریشین میں مقامی لوگ سیار بابا کی محبوبہ کے زمانے سے لاعلم تھے۔ وہ حال میں جیتے تھے۔ مقامی گھر میں موٹی روٹی کی منفرد طریقے سے چولھے کی ایک دیوار سے ساتھ کھڑا کر کے سینکائی کی گئی۔[289] چترال کے شاہی محل کی تفصیل بتانے کے علاوہ شاہی خاندان کے اہم سرکردہ فرد کرنل مطاع الملک سے ملاقات کا احوال ہے۔ وہاں صاحب ثروت لوگ رواجاً کم عمر لڑکی سے شادی کرتے ہیں۔ افغانستان سے زمینی رابطے کی وجہ سے گرم چشمہ کی وادی قیمتی پتھروں کی مارکیٹ ہے۔ گرم چشمے کے پانی سے مستفید ہونے کے لیے وہاں ایک طرف غسل خانے بنائے گئے تھے جہاں پائپوں کے ذریعے چشموں کا پانی پہنچایا جاتا تھا۔ گرم چشمہ میں اونی پٹی بننے، دھونے، سکھانے کے عمل کا مصنفہ نے بتایا ہے۔

وہاں کے لوگوں میں لواری ٹنل کے حوالے سے بہت بے چینی تھی:

"لواری ٹنل وہ جلتا ہوا مسئلہ ہے جس سے آپ چترال میں داخل ہوتے ہی سامنا کرتے ہیں۔ آپکا ٹکراؤ کسی دکاندار سے ہو، آپ کی ملاقات کسی سرکاری ملازم سے ہو، ہوٹل کے کسی بیرے، سکول یا کالج کے کسی طالب علم، کسی دینی مدرسے کا کوئی استاد کوئی باریش بوڑھا، بھیڑ بکریاں چرانے والا کوئی چرواہا کسی سے بھی ان کے مسائل پر بات کرتے ہوئے تان لواری ٹنل پر آکر ٹوٹتی ہے۔"[290]

دروش ایک ترقی یافتہ علاقہ تھا۔ یہاں 27 پرائمری سکول، ہائے سکنڈری سکول، دستکاری سنٹر اور ٹیکنیکل سکول ہیں۔ وادی کی لڑکیاں ضلع دیر تک سکولوں میں پڑھانے جاتی ہیں۔ طبی میدان میں بھی یہ ترقی یافتہ علاقہ تھا۔[291]

مصنفہ نے کالاشیوں کی ایک میت کی تفصیل بتائی ہے جس میں کلہاڑیاں ٹکراکر میت کے گرد رقص کیا گیا۔ وہاں مرگ کی رسومات پر منوں کے حساب سے گوشت، چاول اور پنیر خرچ کیا جاتا ہے۔ وہاں ایک جاپانی لڑکی ایکو سے بھی ملاقات ہوئی جو کالاشی رسم و رواج میں رچ بس گئی ہے اور ان ہی کی طرح زندگی گزارتی ہے۔ دریائے لاسپور کے کنارے چھوٹی سی وادی شہید اس میں گاڑی خراب ہونے پر مصنفہ ایک مقامی گھر میں گئیں جس کے مہمان خانے کی تفصیل بتاتے ہوئے ان کا کہنا ہے:

"مہمان خانہ جدیدیت کے رنگ میں رنگا ہوا تھا مگر اصلی چترالی گھر اپنی روایتی آن بان کے ساتھ ہو بہو ویسا ہی تھا۔ الٹی کون کی سورت درمیان سے نکلی چھت ایک فٹ چوبی تختوں سے چار حصوں میں منقسم کمرہ جہاں بچھی پرالی پر رکھے گدوں پر حسب مراتب گھر کے افراد کے بیٹھنے اور لیٹنے کے انتظامات۔ وسط میں جلتا چولھا۔"[292]

کالاش میں مقامی کلچر میں شامل ہے کہ بکری کے سینگوں کی راکھ کو ہر پیدائشی بچے کے روئیں صاف کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ولادت والے گھر میں سوغات کے طور پر مہمان سناباچی کی ڈش لاتے تھے جو نمک والے پنیر اور زعفران کے آمیزے سے بنتی تھی۔[293] گل ولی خان جنھیں بابائے لاسپور کہا جاتا ہے کے گھر شادی پر مصنفہ گئی۔ وہاں پرانی تاریخ کے بارے میں پوچھنے پر ان کے کسی بچے نے کہہ دیا کہ چھوڑیے تاریخ میں کیا رکھا ہے اور ٹی وی لگا دیا۔

مہمان خواتین دوررویہ قطار میں بیٹھی کھانا کھارہی تھیں۔ وہاں سازندوں اور موسیقی کی محفل میں مصنفہ نے بروازی کی دھن پر اکیلے رقص اور دئی کی دھن پر بارہ لوگوں کا گروہی رقص بھی دیکھا۔ شادی والے گھر انھیں ناشتے میں بھنا گوشت، خستہ شاپیک اور خمیرہ پراٹھے کی طرح کی روٹی چھپتی اور چائے دی گئی۔ ولی خان کے بیٹے نے چترالی ٹوپی پر مرغ زریں کا پر لگایا ہوا تھا۔ دوپہر کو برآمدے میں مہمانوں کی دورویہ قطاروں میں سناگاچی اور اشپری سے تواضع کی گئی۔ چترالی گھر غربت اور امارت کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ ساخت میں ایک جیسے تھے۔ امرا کے گھروں میں سونے کی جگہ گدے جبکہ عام گھروں میں پرالی کی دبیز تہہ استراحت کا باعث تھی۔ ہر گھر کے صحن میں پھلدار درخت اور پچھواڑے موسمی سبزیاں اگی ہوتی تھیں۔[294]

ہرچین میں مصنفہ کو ایک کھال کے کنارے چند مرد بیٹھ کر لومڑی کی کھالیں اور سروں کی صفائی کرتے نظر آئے۔ مستوج وادی کی ثقافتی اہمیت کے بارے میں ایک مقامی فرد نے بتایا:

"۔۔۔وادی ثقافتی اعتبار سے بڑی امیر ہے۔ اس کے موسیقار، اس کے کہانی گو، اس کے لوگ، شاعر مرد خواتین سبھوں نے چترال میں اپنے نقش ثبت کیے ہیں۔ اس کی خواتین کتنی جیالی اور اولعزم اور کس قدر حوصلہ مند تھیں کہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی۔"[295]

علاقے کی لوک کہانی لوک بلوک کا ذکر بھی ہے۔ گرم چشمہ میں پری خوان سے ملاقات میں مصنفہ بہت مایوس ہوئیں اور اسے فراڈ قرار دیا۔ مصنفہ تیسری بار پوڑ تہوار دیکھنے چترال آئیں مگر تاریخ غلط پتہ چلنے سے بریر وادی کا یہ تہوار دیکھنے سے محروم رہیں۔ چترال میں میزبان کے گھر کھانے میں چاولوں کا خشکہ، مرغی کا شوربہ اور نان کے ساتھ ایک خاص چترالی ڈش پشوربرتھ جو پیاز، اخروٹ، قیمے، آٹے اور ہری مرچ پودینے دھنیے سے تیار ہوتی ہے موجود تھی۔ بریر میں انگوروں کے خوشے تہوار سے پہلے توڑنا ممنوع تھا۔ اگر کوئی توڑے تو اسے جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ وہاں مکئی کے بھٹے کو اخروٹ کی بھنی گری کے آمیزے کے ساتھ کھاتے ہیں۔ ایک مذہبی رہنما کی زبانی اس تہوار کی تفصیلات مصنفہ نے اپنی کتاب میں شامل کی ہیں۔ اس تہوار میں میوہ اتار رسم ہوتی ہے۔ جمع ہونے والے انگوروں کی شراب بنائی جاتی ہے کاروبار کے لیے بیچا نہیں جاتا۔ ہر گھر میں زون شراب بنانے کا آلہ ہوتا ہے۔ پتھروں کی ہوزری میں پاؤں سے کچل کر شراب بنتی ہے۔ بودلک کی رسم کے بارے میں مذہبی رہنما کا کہنا تھا کہ اب اس کا خاتمہ ہو چکا ہے البتہ قدیم زمانے میں رائج اس رسم کی تفصیل بتائی۔ اس رسم کی توجیہ دیتے ہوئے مذہبی رہنما کا کہنا تھا:

"بس یہ سمجھ لیجیے کہ ہمارا یقین ہے کہ بودلک کے وجود سے انسانی و حیوانی نباتاتی و جماداتی زندگی کے سوتے ابل پڑتے ہیں۔ وہ وادی کو خوشحالی کی پھوار میں بھگو دیتا ہے۔"[296]

میزبان کی زبانی چترال کے بارے میں، چیانتیار گلیشیر، چترالی قبائل اور زبان کے بارے میں مفید معلومات مصنفہ نے کتاب میں دی ہیں۔ سرخ کافروں کے بارے میں بتایا کہ بشگالی افغان سرخ کافر تھے جو انیسویں صدی میں

بھاگ کر چترال آئے۔ یہ مسلمان ہیں۔ بکرے کے پوست سے تیار کردہ پوستین پہنتے ہیں، سر پر پکول نما ٹوپی رکھتے ہیں۔ سردیوں کا لباس بور ہے۔ مرد سر کے بال لمبے رکھتے ہیں، کام چور ہیں۔ گھر چلانے کی ذمہ داری عورت پر ہے۔ گواریوں کے بارے میں بتایا کہ جنگجو اجڈ لوگ ہیں۔ نسل در نسل دشمنیوں میں الجھتے ہیں۔ واخی شریف طبع ہیں۔ چترالیوں کی شادی بیاہ کی تقریبات پر اب میدانی علاقوں کا رنگ غالب آنے لگا ہے کچھ مقامی رسمیں اب تک ہیں جیسے بارات کا دلھن کے گھر پہنچ کر چھڑی پھینکا جانا اور پکڑنے والے کو انعام دینا، دلھن کا دلھا کے گھر پہنچ کر اس وقت تک سواری سے نہ اترنا جب تک ساس سسر تحائف کا اعلان نہ کر دیں، دلھن کا میٹھی روٹیاں پکانا اور دلھا کا انھیں پلٹنا وغیرہ۔[297] جس بشالینی میں پہلے سیاحوں کی تانک جھانک ممنوع ہوتی تھی اب کراکال کی بشالینی کے ہر کمرے کو مصنفہ نے اندر سے دیکھا۔

کیلاش کتھا(1996ء)، ڈاکٹر عباس برمانی

ڈاکٹر عباس برمانی نے چترال اور کالاش کا یہ سفر 1996ء میں کیا۔ ایک کچی سڑک کنارے پیدل چلتے مقامی شخص نے جیپ کو رکنے کا اشارہ کیا اور برقعے میں ملفوف ایک مسلمان خاتون اور موتیوں اور کوڑیوں سے مزین سیاہ لبادے میں ملبوس سر پر موتیوں سے بنا تاج نما شوشوت پہنے ایک کالاش لڑکی کے ساتھ سوار ہوا۔ ڈرائیور نے ان کے سوار ہونے پر سرگوشی سے بتایا کہ یہ پردہ دار خاتون بھی پہلے کالاش تھی اور دوسری لڑکی جیسا بے حیائی والا لباس پہنتی تھی اب مسلمان ہو گئی ہے۔ اس نے لوگوں کے تیزی سے مسلمان ہونے پر شکر کا اظہار کیا کہ اس گاؤں کی زیادہ تر زمینیں بے وقوف کالاشیوں سے مسلمانوں نے سستے داموں خرید لی ہیں اور اب تمام ہوٹل اور دکانیں زیادہ تر مسلمانوں کی ہیں۔[298] کالاش میں حالات کے جبر اور لوگوں کو زبردستی مسلمان بنائے جانے پر مصنف نے تشویش کا اظہار کیا ہے۔

دریائے سندھ میں چلنے والی کیہل خانہ بدوشوں کی نقش و نگار سے مزین کشتیاں اب کم ہوتی جا رہی ہیں۔ پشاور سے چترال کی پرواز موسم سے مشروط ہونے کے باعث مصنف کو بذریعہ سڑک سفر کرنا پڑا۔ ویگن کی سواریوں میں مصنف اور ان کے دو ساتھی باہر کے تھے باقی سب مقامی افراد تھے۔ سوات اور دیر کا تقابل کرتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے کہ سوات برصغیر کی واحد فلاحی ریاست تھی، جہاں سڑکیں بنائی جاتی تھیں، مدرسے اور شفا خانے تھے جبکہ ریاست دیر میں راجاؤں کے وسیع حرم تھے اور نواب کے کتوں کے لیے اعلیٰ رہائش، خوراک اور طبی سہولتیں تھیں مگر عوام کے لیے بھوک، پیاس بیماری اور جبر کے سوا کچھ نہ تھا۔[299] مالاکنڈ پاس چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ درہ مالاکنڈ عبور کرنے کے بعد پہاڑوں پر روئیدگی بڑھنے لگی۔ ہر پولیس چیک پوسٹ پر ویگن ڈرائیور رشوت دیتا تو آگے جانے دیتے۔ درختوں کی ہونے والی بے جا کٹائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں:

"جبکہ دائیں طرف پہاڑوں پر درختوں کی بے انتہا قلت تھی، چوٹیوں کے نزدیک تو درخت بالکل مفقود تھے لیکن یہ نہیں کہ شروع سے ایسا تھا۔ درختوں کے کٹے ہوئے تنے بتاتے تھے کہ کبھی اس طرف بھی ویسے ہی سلسلہ ہائے اشجار ہوا کرتے تھے۔"[300]

راستے کی مشکلات کے حوالے سے حکومتی عدم توجہی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لواری ٹاپ کی درختوں سے محرومی کے مضر اثرات کا بتایا ہے۔ لواری ٹنل کے ادھورا رہنے سے چترالیوں کو درپیش مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس سے کوہ لواری کے ڈیڑھ دو گھنٹے کے مشکل سفر کی بجائے پندرہ منٹ میں سفر ممکن ہو گا۔ سرنگ بننے سے چترال کی تنہائی ختم ہو جائے گی ورنہ برفباری کے باعث چترال پورے ملک سے کٹ جاتا ہے اور بیرونی رابطے کا ذریعہ صرف ہوائی جہاز ہوتا ہے یا لوگ گرم چشمہ یا شاہ وا کے راستے سے افغانستان سے ہو کر پشاور جاتے۔ ترچ میر کا مطلب ہے تین سروں والا۔ اس کی تین چوٹیوں کی وجہ سے اسے یہ نام دیا گیا۔ ایک مقامی شخص نے ڈاکوؤں سے بچاؤ کے لیے سفر کے اختتام پر مختلف جگہوں پر چھپائی رقم نکالی کہ جیب میں صرف دو تین سو روپے چھوڑتا ہے باقی چھپا کر سفر کرتا ہے ورنہ ڈاکو سارا کچھ لوٹ لیتے ہیں۔ اس ویگن کو بھی پچھلے دنوں پکڑ لیا تھا ساٹھ ہزار دے کر چھڑوایا۔[301]

کالاشیوں کے بارے میں مصنف تاریخی معلومات دیتے ہیں کہ یونانیوں سے لے کر انگریزوں تک متعدد فاتح اقوام کے نقوش پاملتے ہیں۔ چترال نہ سوات کی مانند فلاحی ریاست تھی نہ دیر کی طرح ظلم وستم سے معمور۔ مجموعی طور پر یہاں کے عوام کی حالت زیادہ بہتر نہیں تھی۔ کالاش لوگوں کی چترال داخلے پر کافی عرصہ پابندی رہی تھی۔ چترالی بازاروں میں افغان دکاندار زیادہ تھے۔ سلاجیت کے علاوہ اونی پٹو کے ملبوسات، چغے اور خصوص کالاشی ملبوسات کی دکانیں تھیں۔ شیندور کے پولو میچ کے مقابلوں کا آغاز انگریزوں نے کرایا تھا۔ اب جشن شیندور نے قومی میلے کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ مصنف کے سفر کے زمانے میں ہر طرف شیندور فیسٹیول کا چرچا تھا ہر سواری وہاں جانے کے لیے تیار تھی بمبوریت جانے کے لیے بہت مشکل سے سواری ملی۔ چار سو روپے کرایہ کے عوض جیپ ملی وہ بھی ڈرائیور بمبوریت کا رہنے والا تھا اور ادھر ہی جارہا تھا ورنہ تو جیپ ڈرائیور حضرات بمبوریت کا نام سن کر ایسے تیوری چڑھا لیتے تھے جیسے شیندور کو منع کر کے ان کی توہین کر دی گئی ہو۔ شیندور جانے کے تین ہزار مانگ رہے تھے۔[302]

دریائے چترال کے کنارے قدیم اور خوب صورت مسجد تھی۔ ایون میں دریائے چترال کی بپھری موجوں سے بچنے کے لیے لوگوں نے طویل پختہ دیوار تعمیر کی تھی۔ اس کے پیچھے تہہ در تہہ کھیتوں کے سلسلے تھے۔ ایون کے بازار میں گندگی کے ڈھیر اور کھڑے گندے پانی کو مصنف نے اس علاقے میں انسانی پیدا کردہ واحد بدصورتی قرار دیا۔ ایون باغات کی بستی ہے۔ کالاشیوں کی سادہ لوحی کا ایون کی خوشحالی میں اہم کردار تھا۔ کیونکہ یہاں کے لوگوں نے سادہ لوح کالاشیوں کے باغات اور کھیت چند سکوں، چند بکریوں اور چند پرانی بندوقوں کے عوض ہتھیا لیے۔[303] ہوٹل کے لیے

ویگن ڈرائیور کا اصرار تھا کہ بروِن میں مسلمانوں کے ہوٹل میں ٹھہریں کراکال میں کافروں کے چکر میں نہ پڑیں۔ مسلمانوں اور کافروں کی چپقلش وہاں ہر جگہ نمایاں تھی۔

مقامی لوگ کسی بھی طرح کے نام رکھ لیتے ہیں۔ کالاش کافروں کے مسلمانوں جیسے نام بھی تھے۔ عبدالمتین، عبدالخالق، محمد خان، رام داس، بھٹو خان، مسٹر جناح، قائداعظم خان، الیکشن بی بی، طوفان گل، حجام خان اور بی بی سی جیسے نام بھی تھے۔[304] سڑکیں ترقی کی علامت ہونے کے ساتھ فطرت کی تباہی اور پرانی اقدار کے خاتمے، لوگوں کے رویے کی تبدیلی کی مظہر بھی ہیں۔ کالاشیوں کی رسموں کا تذکرہ کر کے مصنف نے ان کے عقائد اور پارسیوں کے عقائد میں مشابہتیں بتائی ہیں۔ جیسے پارسی اپنے مردوں کو دفن کرنے یا جلانے کی بجائے اونچے میناروں میں رکھ دیتے یا کسی کھلی جگہ۔ کالاشی میتوں کو تابوتوں میں رکھ کے قبرستان میں کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ اب زمین کی قلت اور آبادی کے بڑھنے سے تابوتوں کو زمیں میں دفن کرنے کا رواج ہوا ہے۔ آتش پرست پارسیوں کی طرح کالاشی بھی آگ کے ذریعے قربانی کرتے ہیں۔[305]

کالاشی خواتین مخصوص لباس میں کھیتوں میں کام کرنے میں مگن تھیں۔ چند بچوں کا جلوس ایک روپیہ دے دو، پیسے دے دو، مٹھائی دے دو کے نعرے لگاتا سیاحوں کے پیچھے تھا۔ ان کا مدعا پورا نہ کرنے پر سیاحوں کو بددعاؤں، طعنوں تشنوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کالاش مردوں کو حلیے سے بظاہر مسلمانوں سے الگ نہیں بتایا جاسکتا مگر خواتین اور بچیوں کے مخصوص لباس کی وجہ سے با آسانی شناخت کیا جاسکتا تھا۔ کالاشیوں کے مسائل کی اس سفر نامے میں جابجا عکاسی کی گئی ہے۔ شیخاندہ کالاشیوں کی بستی تھی جس پر نورستان سے آنے والے افغانیوں نے قبضہ جما لیا۔ یہاں کی قدیم بستی کے مکانات لکڑی کے تھے اور کالاش طرز کے تھے۔ بعض مکان سیمنٹ اور رنگ وروغن سے آراستہ تھے۔ یہ رنگ ٹرکوں کی طرح شوخ تھے۔ یہاں ہر اس علاقے میں جہاں پانی پہنچ سکتا تھا لوگوں نے فصلیں کاشت کی ہیں۔ ایک جگہ خالی میدان جانوروں کے لیے تھا کیونکہ ان کی معیشیت کا انحصار زراعت اور گلہ بانی پر ہے۔ جانوروں کے چارے کا خیال انھیں اپنی خوراک سے زیادہ رکھنا پڑتا ہے۔ اس میدان میں سردیوں کے لیے جانوروں کا چارہ ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ مقامی لوگوں کی آرا اور مسائل کو مصنف نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔

> "عبدالمتین کیلاش کا کہنا تھا کہ ہمارے لوگ سماجی دباؤ، مالی ترغیبات اور دہشت زدہ کیے جانے کی وجہ سے مسلمان ہو جاتے ہیں۔ ہمارے لڑکے جو چترال اور دیگر شہروں میں پڑھنے کے لیے جاتے ہیں ان کے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک ہوتا ہے لہٰذا وہ مجبوراً مسلمان ہو جاتے ہیں اور ایسا ہی ہمارے ملازم پیشہ لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔"[306]

مقامی لوگوں کی دیگر مشکلات میں ان کی ثقافت پر اعتراض، ثقافتی رسوم پر اعتراضات، ملازمتوں کے دروازے بند کیا جانا، روزگار کے مواقع چھیننا، ان کی چراگاہوں باغات پر قبضہ، آبادی بڑھنا، ماتم کی رسومات پر بہت اخراجات وغیرہ ہیں۔ لوگ ان اخراجات کے ڈر سے بھی مسلمان ہو جاتے ہیں۔ مسلمان ہونے والے کالاشی اس لفظ کو

اپنے لیے گالی تصور کرتے ہیں اور خود کو قریشی کہلواتے ہیں۔ متعدد کالاشی کسی جذباتی مجبوری کے باعث مسلمان ہوئے مگر اسلام میں مرتد کی سزا موت ہونے کے باعث وہ واپس اپنے مذہب میں نہیں جاسکتے۔ بمبوریت میں مسلمانوں اور کالاشیوں کی بستیاں الگ الگ تھیں۔ جب کوئی کالاش مسلمان ہو جائے تو وہ اپنی بستی چھوڑ کر مسلمانوں کے ساتھ جا کر رہنے لگتا۔ البتہ بریر میں مسلمان اور کالاشی بھائی ایک گھر میں بھی رہتے ہیں۔ مسلمان یہاں سیاحوں کی آمد کو ناپسندیدگی سے دیکھتے تھے مگر کالاشی انھیں خوش آمدید کہتے۔ عباس برمانی یہاں کے مستقبل کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں:

"جس دن ان وادیوں کا آخری کیلاش مسلمان ہو گیا، یہاں سیاحت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لاؤڈ سپیکر، نئے نئے مدارس، تبلیغی جماعتیں، دیواروں پر فرقہ پرست جماعتوں کی چاکنگ، ان پر سکون وادیوں کے طوفانی مستقبل کی خبر دے رہے ہیں۔"[307]

شیخانندہ کے مقامی بچے غلیلوں سے پرندوں پر حملہ آور ہو رہے تھے اور حلال پرندوں کو دیکھ کر حلال حلال کے نعرے لگا رہے تھے۔ مقامی لوگ دوسری چٹانوں پر بھی اپنے جانوروں کو خطروں سے آگاہ کرنے کے لیے مخصوص اشارے کرتے تھے تو وہ سمجھ جاتے تھے۔ مقامی میزبانوں نے سیاحوں کی تواضع چائے، پنیر، روٹی اور مکھن سے کی۔ مقامی روٹی کو انجی کہا جاتا تھا جو بظاہر سخت تھی لیکن منہ میں لقمہ رکھتے ہی گھل جاتی۔[308] سیاحوں کو دشوار لگنے والے راستوں پر مقامی افراد آرام سے چل لیتے ہیں۔ مارخور کی تفصیل بتانے کے ساتھ مصنف نے بلتی لوک گیت کا ترجمہ بھی دیا ہے جو شکار سے زخمی مادہ مارخور اور اس کے بچے کے درمیان مکالمے پر مشتمل ہے۔ کالاش قبرستان سے کئی لکڑی کے مجسمے چوری ہو گئے۔ پہلے اس حوالے سے رسمیں ہوتی تھیں تقریبات ہوتی تھیں اب اس چوری کی وجہ سے مجسمہ سازی ختم کر دی گئی ہے کیونکہ مسلمان یا ان مجسموں کو توڑ دیتے تھے یا غیر ملکیوں کو بیچ دیتے تھے۔[309] کافرستان میں محبت کے اظہار پر اور محبت پر کوئی پابندی نہیں۔ کالاشیوں کی موت کی رسومات کا تذکرہ کرنے کے بعد مصنف نے مالوش قربان گاہ کا راستہ پوچھے جانے پر مقامی بچوں کی چالاکی کا تذکرہ کیا ہے کہ ایک بچے نے باقیوں کو روک دیا اور ترغیب دی کہ پیسے دے کر گائیڈ لے لیں راستہ دشوار ہے۔ پیسے بٹورنے کے لیے ان بچوں کا مزید کہنا تھا اگر سیاح بڑے درخت کے تنے میں کچھ روپے رکھ دیں تو مہادیو مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔[310] مقامی مسلمان کالاشوں کو مسلمان کرنے کے لیے زیادہ محنت عورتوں پر کرتے ہیں۔ شادی شدہ عورت مسلمان ہو جائے تو اس کے شوہر کو تین ماہ کا وقت دیا جاتا ہے اگر اس دوران شوہر مسلمان ہو جائے تو ٹھیک ورنہ اس کی شادی کسی مسلمان مرد سے کر دیتے ہیں۔ یہاں شادی شدہ عورت بھی اپنے شوہر کو چھوڑ کر کسی اور مرد کے ساتھ رہ سکتی ہے بشرطیکہ وہ اس کے خاوند کو مطلوبہ رقم ادا کر دے۔ اس معاوضہ کی ادائیگی سے بچنے کے لیے بھی لڑکی لڑکا دونوں مسلمان ہو جاتے ہیں۔[311] گمبک ٹاپ عبور کرنے والے مقامی لوگ ایک نمایاں جگہ شاہ بلوط کی ٹہنی رکھتے ہیں تاکہ بعد میں آنے والوں کو علم ہو جائے کہ یہاں سے کتنے لوگ

گزرے۔ بریر میں چھ ماہ سے سڑک بند ہونے سے سیاحوں کا آنا جانا نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہاں بجلی ایک سال سے بند تھی۔

مصنف نے کالاشیوں کی شادی کی رسوم کے بارے میں بتایا ہے۔ دریائے چترال کے وسط میں ریتلے ٹاپوؤں پر سونے وال ریت چھان کر سونے کے ذرات نکالتے ہیں۔ ایون میں گلیشیر کی ریت ملی برف ملا کر مشروبات بیچے جا رہے تھے۔ دکاندار کی ہٹ دھرمی کا ذکر کیا کہ ناقص معیار کے باوجود پیسے زیادہ لیے۔ کالاشیوں کے تہواروں جوشی، چاؤمو، اچاؤ کا تذکرہ کیا ہے۔ کالاشیوں کا رقص ان کے لیے عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور ان کے فطرت کے ساتھ جڑے لگاؤ کا مظہر ہے اس میں کوئی نمائش نہیں تھی۔[312]

برف دریاؤں کے سفر (2001ء)، ڈاکٹر عباس برمانی

ڈاکٹر عباس برمانی نے 2001ء میں مستنصر حسین تارڑ کے ساتھ درہ گوندو گورو کا سفر کیا۔ کتاب کی ابتدا میں انھوں نے گلیشیرز کے وجود میں آنے ان کے سورج کی روشنی اور اپنے دباؤ سے پگھلنے سے ندی نالوں کے بننے اور دریاؤں کے جنم لینے کی وضاحت کرتے ہوئے گلیشیرز کو جمے ہوئے برف دریا قرار دیا ہے۔ گلگت کے مقامی افراد چنار ان قیام کے دوران مستنصر حسین تارڑ سے بہت گرمجوشی سے ملے۔ اہل گلگت ان کے منتظر رہتے ہیں۔ پی ٹی ڈی سی ہوٹل بشام میں دریائے سندھ کے بہنے کی آواز کی تعریف کی ہے۔ رائے کوٹ گلیشیر پر آنے والے ایولانچ کا حوالہ دیتے ہوئے مصنف کہتے ہیں کہ یہ کوہ نوردوں اور کوہ پیماؤں کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا مگر پہاڑوں کو قاتل کہنا زیادتی ہے۔ انسان ان گلیشیرز اور برفانی چوٹیوں پر آلودگی پھیلا کر ان میں مداخلت کر کے زیادتی کا مرتکب ہوتا ہے۔[313]

اس سفر میں مصنف سفر کرتے کرتے کسی ایک منظر کو دیکھ کر پچھلے سفروں کی یاد میں گم ہو جاتے ہیں اور قاری کو بھی ان مناظر میں شریک کرتے ہیں۔ بیشنگ گلیشیر کے روپل بچیوں کی عام گزرگاہ ہونے اور ان کے بھاگتے دوڑتے وہاں سے گزرنے پر مصنف تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔ خپلو میں پی ٹی ڈی سی موٹل کی عمارت کے جدید طرز تعمیر کے باوجود قدیم قراقرمی روایات میں رنگے ہونے کو انھوں نے بہت سراہا۔ دریائے شیوک کے کنارے بلندی پر واقع اس عمارت کے تہہ در تہہ بلند ہوتے لان میں پھولوں کے تختے تھے اور اطراف میں اخروٹ کے گھنے درخت تھے۔[314] گلمت اور گل کن گلیشیروں کی یاترا کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف بتاتے ہیں کہ وہ گوجال کے لوگوں کے حسن اخلاق کے اتنے گرویدہ ہوئے کہ باقاعدہ وہاں رہائش رکھنے کے بارے میں سوچنے لگے۔

سکردو میں مصنف کی ٹیم کو مقامی سیاحتی ادارے کے مینیجر نے گندو گورو عبور کر کے کنکورڈیا اترتے ہوئے اٹھارہ ہزار فٹ بلند گندو گورو چوٹی سر کرنے کی ترغیب دی۔ کوہ پیمائی آسان کرنے کے لیے مقامی لوگوں نے چوٹی سے رسے لٹکا کر سیاحوں کی چوٹی تک پہنچانے کو اپنے روزگار کا ذریعہ بنایا تھا۔ دریائے شیوک بہت وسیع اور پر سکون تھا۔ دریا

کے کنارے گرے سیب کو اٹھا کر دھو کر کھانے پر مقامی بزرگ نے منع کر دیا کہ یہ وہ مویشیوں کو کھلاتے ہیں اور اپنے پاس سے صاف ستھرے چمکدار سیبوں کو لینے پر اصرار کیا۔ خپلو میں خریداری کرتے ایک دکاندار نے اپنا نام تنویر رضا بگٹی بتا کر مصنف کو حیران کر دیا کہ بلوچ قوم بلتستان کے آخری سرے پر موجود ہے مصنف نے اس کے بلوچی ہونے پر گرمجوشی سے ہاتھ ملایا تو اس نے اپنے بلوچی ہونے کی نفی کی اور بگٹی کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے کہنے لگا:

"اچھا بگٹی۔۔وہ سربات یہ ہے کہ میرے والد مرحوم۔۔وہ سامنے فریم میں جن کی تصویر لگی ہوئی ہے۔۔وہ ایک بارعب شخصیت تھے، بڑے غصے والے تھے۔۔چہرے سے لگ رہے ہیں ناں۔۔ دوستوں نے انھیں بگٹی کہنا شروع کر دیا۔۔یوں ہمارا خاندان بگٹی ہو گیا۔"[315]

مصنف نے مستنصر حسین کہ زبانی قدیم خپلو کا ذکر کیا ہے جو اب بہت بدل چکا تھا۔ خپلو کی تاریخی چقچن مسجد کا پس منظر اور موجودہ حالت زار بیان کی۔ یہ محکمہ آثار قدیمہ کی شدید غفلت کا شکار تھی۔ مچلو میں ایک خانقاہ سے مصنف متاثر ہوئے۔ اس کے قریب پرانی خانقاہ کو گرا کر اسی طرح نیا تعمیر کرنے پر مصنف کہتے ہیں کہ پرانی خانقاہ کو اسی طرح یادگار کے طور پر باقی رہنے دیتے اور قریب نئی تعمیر کر لیتے کہ جگہ کا مسئلہ تو نہیں تھا۔ یہاں نور بخشی مسلک کے پیروکاروں کی کثرت تھی۔ مصنف کو شیعہ مسلک سے مختلف عقائد کے حامل نور بخشی بہت پسند آئے۔[316] مچلو میں ایک مقامی لڑکی کی شہتوت کی ٹہنیوں سے بنی خوبانیوں سے لبریز ٹوکری سے کسی ساتھی نے خوبانیاں خریدنی چاہیں تو وہ قیمت لینے پر رضامند نہیں ہو رہی تھی۔ مقامی لوگوں نے بصد اصرار اسے روپے رکھنے کو کہا۔ مسافروں کے ساتھ مقامی لوگوں کا رویہ گاہکوں کی بجائے مہمانوں کا سا تھا۔ مچلو سے آگے تلیس گاؤں میں کھیتوں، کیاریوں کی بجائے گھروں کی دیواروں، چھتوں، دریچوں میں رکھے خالی گملوں، گھی تیل کے خالی ڈبوں، لکڑی کے کھوکھوں اور پیٹیوں میں دلکش پھول موجود تھے۔ تلیس سے آگے جیپ میں ایک مقامی سکول ٹیچر سوار ہوا جو ہر موڑ پر وہاں ہونے والے حادثات کا تذکرہ کرتا تھا۔ اس نے انھیں پالتو یا کاشت کردہ گلیشیر بھی دکھایا جسکی عمر پچیس سال تھی اور مقامی لوگوں کے مطابق وہ جڑ پکڑ چکا تھا اب تیزی سے بڑھنے کی امید تھی۔ اس نے مصنوعی گلیشیر کی افزائش کے طریقے پر بھی روشنی ڈالی۔ کئی سال مسلسل دیکھ بھال کے بعد یہ مصنوعی گلیشیر آبادی کی پانی کی ضروریات پوری کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔[317]

کاندے سے آگے مقامی جیپ ڈرائیوروں کے فلمی انداز میں پنجابی بولنے پر استفسار کیا گیا کہ کہاں سے ہیں تو ان کا کہنا تھا کہ پنجاب میں نوکری کی ہے، ان کی ٹیم کے ایک فرد کے انھیں طنزیہ کہنے پر کہ پنجابی صرف مولاجٹ کی زبان نہیں شاہ حسین اور بلھے شاہ کی بھی زبان ہے ان کا کہنا تھا کہ ہم نے ان کی فلمیں نہیں دیکھیں۔[318] جیپوں میں موجود پانی کے کنستر جنھوں نے انھیں بہت تنگ کیا تھا وہ انسانی ہمدردی کے ناطے کاندے کے سیلاب سے متاثرین کے عارضی ٹھکانوں تک پہنچانے کے لیے تھے۔ ہوشے کے شدید موسم کے بارے میں مصنف نے بتایا:

"ہوشے قراقرم کے ویران برفستانوں کے کنارے آخر انسانی آبادی ہے۔ اور اتنی بلندی پر ہے کہ یہاں سال میں صرف ایک ہی فصل کاشت کی جاتی ہے اور وہ بھی بعض اوقات نہیں پکتی ۔ پھلدار درختوں پہ پھل نہیں لگتے۔ لگتے ہیں تو پک نہیں پاتے۔ شدید برفباری ہوتی ہے۔ گندوگورولا کو راستہ کھلنے سے پہلے یہاں معدودے چند سیاح آتے تھے جو ماشابروم جانے والے ہوتے تھے۔"[319]

ہوشے سے پورٹر اور گائیڈ کے طور پر مصنف کی ٹیم میں شامل ہونے والے حسین نے ماہر باورچی ہونے کا دعویٰ کیا متعدد ڈشوں کے نام بتانے پر وہ دھوکے میں آ گئے۔ بعد میں اس کی وجہ سے ٹیم کو بہت خواری اٹھانی پڑی۔ ہوشے کی کیمپنگ سائٹ میں مصنف کو التر گلیشیر کے نالے کے کنارے گزاری رات یاد آئی۔ التر گلیشیر سیاہ رنگت کا حامل ہے۔ اس کی برفوں کی تہوں میں بھی ریت شامل ہو چکی ہے ان میں موجود معدنیات اہل ہنزہ کی طوالت عمر اور یہاں آنے والے سیاحوں میں پیٹ کی بیماریوں کا سبب ہیں۔[320] التر گلیشیر کے نالے کے کنارے ایک مقامی چرواہے کے کہنے پر انھوں نے اپنا خیمہ بولڈر کی آڑ میں لگایا تو رات کو آنے والے برفانی طوفان کی زد سے بچ گئے ورنہ وہ کہیں اور بہتر منظر کے پاس لگا رہے تھے۔

ہوشے میں سیاحوں کی گہما گہمی مختصر عرصے کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے تب اہل ہوشے اس رونق کو دیکھنے کے لیے اپنے گھروں سے باہر نکل آتے ہیں۔ پورٹروں کے حوالے سے اہل سکردو اور اہل ہوشے میں غیر تحریری معاہدہ ہے کہ ہر ٹیم آدھے پورٹر ہوشے اور آدھے سکردو سے لیتی ہے۔ ہوشے میں پولیس کا رویہ سیاحوں کے ساتھ بہت شائستہ تھا۔ اس سال وہاں بے شمار غیر ملکی سیاح تھے مگر اس کے بعد بہت کم ہو گئے۔ ہوشے سے آگے روانہ ہوتے وقت پورٹروں میں سامان تلوا کر تقسیم کیا جاتا ہے ساتھ ان کا راشن بھی انھیں دیا جاتا ہے۔ ہوشے کے سنہری کھیتوں سے گزرتے ہوئے بچوں نے مٹر کی پھلیاں سیاحوں کو تحفتاً دیں۔ یہاں ایک بورڈ پر درج تھا کہ سیاح بچوں کو نقد پیسے، ٹافیاں یا چاکلیٹ کی بجائے کاپیاں پنسلیں دیں۔

گوندوگورو کے راستے میں ایک دریا پر بنے پل کو مصنف مقامی انجینئروں کی مہارت کا شاہکار گردانتے ہیں۔ اس کے تختے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ اس پر مقامی آرٹسٹوں نے شوخ رنگوں کے ساتھ اپنے فن کے جوہر دکھائے تھے۔ مقامی افراد کے مزاج کی بات کرتے ہوئے مصنف نے ایک پورٹر علی موسیٰ کے ہر وقت مدد کے لیے تیار رہنے کی تعریف کی ہے۔ کیمپنگ سائٹ میں کے ٹو سے آنے والی ٹیم کے پورٹروں نے آخری کیمپ کی خوشی میں محفل موسیقی کا اہتمام کیا تھا۔ آلات موسیقی کے طور پر ایک ڈھول، چند کنستر اور برتن تھے۔ مقامی پورٹر رقص کرتے تھے اور گیت گاتے تھے۔ مصنف نے بلتی، بروشسکی، شناکی اور واخی گیتوں کے فرق کا پتہ ان زبانوں سے وابستہ پورٹروں کے متعلقہ گیتوں پر روشن ہوتے چہروں سے لگایا۔ باورچی ہونے کا دھوکا کرنے والے گائیڈ نے ٹیم لیڈر کے منع

کرنے کے باوجود باقی پورٹروں کے ساتھ تیزی سے سفر کیا اور مشکل مقامات پر ٹیم کی مدد نہیں کی۔ استفسار پر بے حسی کا رویہ اپناتے ہوئے کہا کہ ہمارا کام بوجھ اٹھانا ہے ٹیم کی مدد کرنا نہیں۔

مصنف پسو گلیشیر کی یاد تازہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ وہاں راستے کی نشاندہی کے لیے مقامی افراد پتھروں سے چھوٹے چھوٹے مینار بناتے ہیں جو آنے والوں کو سمتوں کے تعین میں مدد دیتے ہیں۔ مقامی پورٹر ان پتھروں پر سے گزرتے ہوئے ان پر اور پتھر رکھتے جاتے ہیں۔ [321]

میر اسندھو سائیں (2001ء)، ڈاکٹر عباس برمانی

ڈاکٹر عباس برمانی نے مختلف اوقات میں دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ سفر کیا اس کے کنارے آباد بستیوں میں رہے۔ اس سفر نامے میں انھوں نے دریا کے بہاؤ کے رخ پر سندھ کے ساتھ ساتھ سفر کی تفصیل دی ہے جو مختلف وقتوں میں کیا گیا۔ دریائے سندھ کے مختلف نام سندھ، سندھ ساگر، سندھو، اباسین، مہران، سنگھے کھمب، شیر دریا، مائی انڈس ہیں ہندوؤں کی مقدس کتب میں اس کا تذکرہ ہے۔ اس کے کنارے دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک پروان چڑھی۔

> "سندھو سائیں کو اگر وادی سندھ کی تہذیب کا پروردگار کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ ہندوستان کا تو نام بھی اسی کے نام سے مشتق ہے۔" [322]

مصنف مختصراً دریائے سندھ کے طویل سفر کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس کا نقطہ آغاز تبت سے ہوتا ہے۔ یہ ہمالیہ میں بہتا لداخ میں داخل ہوتا ہے پھر بلتستان میں داخل ہو کر مختلف ندی نالوں، دریاؤں کو اپنے دامن میں سمیٹتا تربیلا، اٹک، کالا باغ سے ہوتا ہوا پنجاب اور سندھ کے میدانی علاقوں میں بہتا ٹھٹھہ کے قریب ڈیلٹا بناتا 2887 کلو میٹر طویل سفر کر کے بحیرہ عرب میں جا گرتا ہے۔ مصنف کا یہ سفر کئی سفروں کا مجموعہ ہے کبھی دریائے سندھ میں کشتیوں کا سفر، کبھی سندھ کے کنارے شاہراہوں کا سفر، کبھی پیدل یاترا، کبھی سندھ کنارے موجود وادیوں کا سفر جہاں سے ندی نالے بہتے سندھ میں شامل ہوتے ہیں اور کبھی ان گلیشیرز تک کا سفر جن کا پانی پگھل کر دریائے سندھ کا حصہ بنتا ہے۔

سکردو کے بارے میں عباس برمانی کا کہنا ہے یہ ایک پیالہ نما وادی ہے جس کے اردگرد بلند و بالا پہاڑ ہیں۔ اس میں دریا، صحرا بھی ہے، دیوسائی سے اٹھتی یخ ہوا اور صحرا سے اٹھنے والی گرم ہوا بھی ہے۔ سکردو کے صحرا میں مصنف نے گلاب دیکھے۔ بلتستان کے بارے میں جغرافیائی معلومات دیتے ہوئے ان کا کہنا ہے کہ یہاں ڈیڑھ سو ایسی چوٹیاں ہیں جن کی بلندی بیس سے اٹھائیس ہزار فٹ تک ہے۔ متعدد چھوٹے گلیشیروں کے علاوہ چالیس ایسے گلیشیر ہیں جن کا شمار قطبین سے باہر دنیا کے سب سے بڑے گلیشیروں میں ہوتا ہے۔ یہاں کے قدیم مذہب کے بارے میں ان کا کہنا ہے:

"آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل یہاں کے باشندے ہندومت کے پیروکار تھے۔ وشنو، شیو اور کرشن کی پوجا ہوتی تھی۔ آٹھویں صدی میں یہاں بدھ مت پھیلا۔ بدھ مت مبلغین نے چٹانوں پر مہاتما بدھ کی تعلیمات اور تصاویر کندہ کیں اور اسٹوپے بنائے جو یوسف حسین آبادی کے بقول اشاعت اسلام کے بعد منہدم کر دیے گئے یا ان کی جگہ مساجد تعمیر ہوئیں۔"[323]

بلتستان کے قدیم ناموں میں بلور، بلتی یول، تبت خورد شامل ہیں۔ سکردو بازار میں صفائی نہ ہونے کے برابر تھی۔ بازاروں میں سیاحوں کے علاوہ مولوی صاحبان جبہ و دستار پہنے خاصی تعداد میں تھے۔ یہاں علما کا اثر ورسوخ بہت ہے یکم محرم سے چہلم تک موسیقی کی مکمل ممانعت ہے۔ ہوٹلوں میں ٹیلی ویژنوں پر بھی صرف خبریں اور مذہبی پروگرام ہی دیکھے جاسکتے ہیں۔[324] بلتستان کے تہواروں میں جشن نوروز، اور موسم سرما میں مے فنگ دھوم دھام اور رقص و سرور کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ نوروز کی رسومات میں انڈوں پر مختلف رنگوں کے نقوش بنا کر بچوں کو تحفتاً دیے جاتے ہیں۔ نشانہ بازی اور پولو کے مقابلے ہوتے ہیں۔ بہار کے تہوار مندوق ہلتا نمو کو مصنف بلتستان کا سب سے خوب صورت تہوار قرار دیتے ہیں۔ اس کا لفظی مطلب ہے نمائش گل۔ اب یہ تہوار صرف دیہات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک بلتی لوک گیت میں بھی اس تہوار کا ذکر ہے جس کا ترجمہ مصنف نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ اس سے ایک دن پہلے گاؤں کے نوجوان موسیقاروں اور سازندوں کے ساتھ پہاڑوں میں جا کر وہاں مقیم چرواہوں کے پاس قیام کرتے ہیں۔ پھول چنتے ہیں، ٹوپیوں میں سجا کر ان پھولوں کے گلدستے اور ہار بنا کر بید کی شاخوں میں سجاتے ہیں۔ اگلی صبح واپس آتے ہیں تو راستے میں پھول بانٹتے آتے ہیں۔ شہنائی اور ڈھول کی تھاپ پر رقص کرتے ہیں۔ اس موقع پر سات افراد ہاتھ میں تلواریں لے کر بھی رقص کرتے ہیں۔ خواتین بالوں میں پھول لگائے مختلف سبزیاں پکا کر گھر گھر تقسیم کرتی ہیں۔[225]

سکردو میں کھرفوچے کی سیڑھیاں شہزادی گل خاتون نے پہاڑ ترشوا کر بنوائی تھیں۔ اس نے گنگوپی نہر کھدوا کر زمین کی سیرابی کا بھی انتظام کرایا۔ قلعہ شکست وریخت کا شکار تھا۔ اس کی تعمیر کا پس منظر بھی بتایا ہے اس کی تعمیر میں استعمال ہونے ولے گارے میں دیگر اشیا کے ساتھ بارہ لاکھ انڈے بھی ڈالے گئے تھے۔[326] مقپون لفظ کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے عباس برمانی کا موقف ہے کہ اس کی اصل ہر مقپون ہے جس کا مطلب ہے سالار لشکر۔ کشمیری راجاؤں کے سالار لشکر ابراہیم کے اقتدار پر قبضے سے مقپون سلطنت کی ابتدا ہوئی۔ مقپون حکمران انچن کی انتظامی صلاحیتوں کی تعریف، شہزادی گل خاتون کے فلاحی کاموں کا ذکر کر کے مصنف نے مقپونوں کی آپس کی چپقلش، ناانصافی اور ڈوگروں کی سازشوں کے نتیجے میں بلتی حکومت کے خاتمے اور ڈوگرہ راج کی ابتدا کا بتایا ہے۔ ڈوگرہ دور کے ایک حکمران کے دور میں یہاں ترقیاتی کام ہوئے:

"مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں سرینگر سے سکردو ٹیلی فون لائن بچھائی گئی۔ سکردو میں موسمیاتی رصد گاہ قائم کی گئی۔ مڈل سکول کا اجرا ہوا اور سکردو سے کارگل تک خچر ٹریک بنایا گیا۔"[327]

باقی ڈوگروں میں مہتہ سنگھ نسبتاً بہتر حکمران تھا ورنہ باقی سب استحصالی اور ظالم تھے۔ بلتیوں سے بیگار لیتے تھے۔ صدپارہ نالے کی طرف جاتے راستے میں ایک ندی پر خواتین کپڑے دھو رہی تھیں۔ مذہبی عمارت اہل حدیث کمپلیکس کی تفصیل بھی بتائی ہے۔ ایک جگہ قدیم بدھ آثار پر اپنے نام لکھ کر لوگوں نے انھیں بگاڑنے کی کوشش کی تھی۔ ایک مجسمے پر رائفلوں سے نشانہ بازی کی گئی تھی جس پر مصنف نے دکھ کا اظہار کیا۔ کارگاہ کی چوٹی سے سنگ تراشوں نے رسوں کے ساتھ لٹک کر چٹان پر بدھا کے نقوش ابھارے تھے۔ صدپارہ نالے میں کچھ لوگ مچھلیاں پکڑ رہے تھے ایک آدمی نے ڈھائی کلو کی مچھلی پکڑنے پر کہا صاحب یہ تو کچھ بھی نہیں یہاں بیس کلو تک وزنی مچھلیاں بھی پکڑی گئی ہیں۔ مصنف نے بارود کے دھماکے سے مچھلیاں پکڑنے کے طریقے کو انتہائی وحشیانہ قرار دیا ہے۔ دیوسائی کی شیوسر جھیل کے راستے میں جونیپر، برچ کے درختوں کے سلسلوں کے بعد چھوٹی جھاڑیاں اور سیا جنگلی گلاب تھے۔ ہسپر ٹاپ سے آگے گوجروں کا سرائے دو جھونپروں اور ایک چھپر پر مشتمل تھا۔ یہاں گوجروں کے قافلے رکتے تھے۔ وہاں موجود گوجروں نے انھیں ترش مکھن اور دہی کے ساتھ موٹی روٹی اور چائے پیش کی۔ گوجر خانہ بدوشوں کے سفر کی بابت بھی مصنف نے بتایا ہے۔[328] زوہ اور یاک کے فرق کی نشاندہی بھی کی ہے۔ زوہ یاک اور گائے کی خصوصیات رکھنے والا جانور ہے اس کا دودھ زیادہ گاڑھا ہونے کے باعث زیادہ مکھن بنتا ہے۔ مارموٹ کو بلتی میں فیا کہتے ہیں جو سرنگوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملے ہوئے غاروں میں چھپ کر ایک دم کسی جگہ سے غائب ہو کر کسی دوسری جگہ سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔

وہاں جیپ کے مقامی ڈرائیور نے انھیں جھوٹی داستانیں سنائیں جس میں سے ایک میں تو سندھ کا کشمیر سے آنا بتایا۔ گوجر خانہ بدوشوں کے قافلے کو دیکھ کر مصنف بلتستانی درویش شاعر بوا جوہر کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے اشعار پر کسی راجا نے نحیف گھوڑا انعام میں دیا جو راستے میں ہی مر گیا۔ اس کی قبر بناتے وقت وہ کہتا تھا گھوڑے نے آج کے دن تین خوشیاں مختلف افراد کو دیں۔ پہلی اپنے حوالے سے کہ وہ پیدل تھا اب سوار ہوا، دوسری راجا کو کہ اس نے شاعر کو بیمار اور مریل گھوڑے پر ٹرخا دیا تیسری چیل کوؤں کو کہ گھوڑے کے مرنے پر انھیں وافر خوراک ملی۔[329] دیوسائی میں جنگلی حیات والے ریچھوں کی نقل و حرکت کو مانیٹر کرتے ہیں۔ وہاں برفانی چیتے بھی پائے جاتے ہیں۔

سکردو سے چلتے عالم پل تک دریائے سندھ ساتھ بہتا ہے پھر ہنزہ کی طرف چلا جاتا ہے۔ گلگت میں بہت گرمی تھی۔ گلگت کے قریب جلال آباد نامی بستی پر پچھلی صدی میں اسی کی دہائی میں مخالف فرقے سے تعلق رکھنے کی پاداش میں افغانیوں نے حملہ کر کے انسانوں مویشیوں سمیت نذر آتش کر دیا تھا۔[330] جگلوٹ میں دریا کے کنارے چٹانوں کے

سوراخوں میں جنگلی کبوتروں کے گھونسلے تھے۔ یہاں سیاہی مائل اور سبزے سے محروم قراقرم، سرخی مائل اور کافی حد تک سرسبز ہندوکش اور سبزے سے ڈھکے ہمالیہ کے عظیم سلسلے آپس میں ملتے ہیں۔ بونجی کا گلگت کی آزادی کی تاریخ میں اہم کردار رہا۔

گوریکوٹ میں سکول کے کھیل کے میدان میں فٹ بال کا میچ ہو رہا تھا جس میں تماشائی بہت پر جوش تھے۔ مصنف کا مقامی گائیڈ علی رحمت ہر معاملے میں مشورہ کر کے پھر بتانے کی بات کرتا تھا۔ ترشنگ میں سکول کے قریب، کھیتوں، پگڈنڈیوں میں ہر طرف بچے سکول کی طرف رواں دواں تھے۔ وہاں سو فیصد بچے سکول جاتے ہیں اور اعلیٰ تعلیم کے لیے بڑے شہروں کا رخ بھی کرتے ہیں۔ لاتوبو جاتے ہوئے مصنف کو یار محمد شکاری بھی ملا جس نے اس علاقے میں موجود آخری ہرن کو بھی مار دیا تھا۔ اپر روپل میں خواتین کھیتوں میں کام کر رہی تھیں۔ ایک خاتون مشک میں دہی ڈال کر ہلا ہلا کر بلو رہی تھی۔ وہاں بچے کھیتوں میں پیسے مانگتے تھے جبکہ لوئر روپل میں مانگنے والے بچے نہیں تھے۔ لاتوبو میں فوجیوں کی مشقوں کے حوالے سے ہونے والے ماحولیاتی نقصان کے بارے میں ایک مقامی آدمی نے بتایا:

"صاحب فوجیوں نے ادھر بہت گندہ کیا، وہ برابڑا درخت کاٹ کر آگ لگاتا ہے۔ جنگل سب فوجیوں نے تباہ کیا، چکور بہت مارا۔ علی مدد کہتا تھا۔ "ادھر پہاڑ خالی ہو گیا ہے۔ برباد ہو گیا ہے، ننگا ہو گیا ہے۔ ادھر سارا جنگل تھا۔ جب ہم چھوٹا تھا تو ہرن اور ریچھ ترشنگ کے کھیتوں میں چرتا تھا اب کچھ نہیں ہے۔ لوگوں نے فوجیوں نے، حکومت نے سب نے مل کر جنگل کو تباہ کیا ہے۔"[331]

فیری میڈو جاتے ہوئے راستے پر مقامی لوگ مصنف اور انکی ٹیم کو منع کرتے تھے کہ ان کی جیپ آگے تک نہیں جا سکتی وہ ان کی جیپ کرائے پر لے کر جائیں۔ مقامی لوگ اپنی مناپلی کی وجہ سے سیاحوں کو بہت ڈراتے ہیں۔ کوہستانی لوگوں کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے کہ وہ تندخو اور ترش تھے جتنے مرضی خلوص، عاجزی اور مٹھاس بھرے لہجے میں ان سے بات کرنے کی کوشش کی جاتی وہ دوستانہ انداز اختیار نہیں کرتے تھے۔[332] یہاں آباد درد قبائل قدیم آریا ہیں۔ یہ بنیادی طور پر گلہ بان اور چرواہے رہے۔ دیگر آریاؤں کی زبانوں میں خاصی تبدیلیاں آئیں مگر دیگر علاقوں سے کٹے ہمالیائی خطوں میں موجود آریا قبائل کی زبانوں میں بہت کم تبدیلی آئی۔ رائے کوٹ میں مصنف نے رحمت نبی کے خیمہ ہوٹل میں قیام کیا۔ وہاں ایک سرسبز چراگاہ میں لکڑی کے بنے مکانات تھے وہ مقامی لوگوں کا سمر کیمپ تھا۔ برفیں پگھلنے پر وہ اپنے مال مویشی کے ساتھ وہاں منتقل ہو جاتے تھے۔ وہاں ایک قدرتی حالت میں ورجن فاریسٹ موجود تھا اب اس کو بھی کاٹا جا رہا تھا۔ راستے میں کوہ نوردوں کی کسی ٹیم کے آنے پر کسی کوہستانی گدھے کے ساتھ تصویر اتارنے پر ایک سخت گیر پورٹر نے ترشی سے منع کر دیا کہ فوٹو نہ لینا۔ چلاس کے راستے کو مصنف ایک جیسا بنجر، بے روح، سبزے سے محروم اور آنکھوں پر گراں گزرنے والا لینڈ سکیپ قرار دیتے ہیں۔[333]

بشام کے قریب مصنف نے تیز دریا کی گزر گاہ کے ساتھ ابھری چٹانوں پر بمشکل پاؤں جما کر کھڑے لوگوں کو مچھلیاں پکڑتے دیکھ کر ان کی ہمت کو سراہا۔ بشام بازار غیر ملکی اور سمگل شدہ سامان سے بھرا تھا مقامی مصنوعات اور اسلحے کی دکانیں بھی تھیں۔ بشام سابق سوات ریاست کا حصہ ہے۔ مصنف کے بقول سوات پاکستان کی واحد فلاحی ریاست تھی۔ سوات کی قدیم تاریخ بیان کرنے کے ساتھ مصنف نے دریائے سندھ کے کنارے قدیم ہنومان مندر کا بھی ذکر کیا ہے۔ قلعے ہمیشہ عقوبت خانے رہے ہیں۔ مصنف نے کھر فوچے، التت بلتت قلعوں کے عقوبت خانوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

جہاں پریاں اترتی ہیں (2008ء)، ڈاکٹر اقبال ہما

ڈاکٹر اقبال ہما نے 2008ء میں دئینتر پاس ٹریک کا سفر کیا اس سفر نامے کا عنوان "جہاں پریاں اترتی ہیں" ہے۔ دئینتر پاس کے بارے میں جغرافیائی معلومات فراہم کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں کہ یہ 4700 میٹر بلند دشوار گزار پہاڑی درہ ہے اور گلگت کی وادی نلتر کو نگر کی وادی دئینتر سے ملاتا ہے۔

جگلوٹ میں قراقرم، ہندوکش اور ہمالیہ تینوں پہاڑی سلسلوں کے ملنے کے مقام کی تفصیلی وضاحت کی ہے۔ جگلوٹ سے ذرا آگے نظر آنے والے ایک خوبصورت پہاڑ کو مصنف کی ٹیم کے کچھ افراد نے نانگا پربت اور کچھ حراموش قرار دیتے رہے مگر وہ حراموش تھا۔ گلگت پہنچنے پر مصنف نے پرانے گلگت کی بابت بتایا کہ کسی زمانے میں گلگت بس سٹینڈ شہر کا مرکز ہوتا تھا اب شہر سے چند کلو میٹر دور منتقل ہونے سے شہر جانے کے لیے ٹیکسی کی ضرورت پیش آتی ہے۔[334]

گلگت کے کاروباری مراکز این ایل آئی مارکیٹ اور نیا بازار ہیں۔ ٹریکنگ کے سامان کی زیادہ تر دکانیں سینما بازار میں ہیں مگر چیزوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ اور سیزن کے دنوں میں تو مجبوراً گاہکوں کو منہ مانگے داموں چیزیں خریدنی پڑتی ہیں۔ ایک مقامی شخص نے بتایا کہ دیانتر کا صحیح تلفظ دئیں تر ہے۔ جس کا مطلب ہری بھری جگہ ہے۔ ان علاقوں میں پورٹروں کے بندوبست کو مصنف دردِ سر قرار دیتے ہیں۔ ان کی ٹیم کے لیے تمام انتظامات ایک گائیڈ نما پورٹر نے سنبھالے۔ گلگت کے رمضان ہوٹل کو کھانے کے لیے مصنف نے مقامی افراد اور سیاحوں میں یکساں مقبول قرار دیا ہے۔

نومل روایتی پہاڑی قصبہ ہے لیکن بچوں کے لباس و اطوار دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اب وہاں روشن خیالی پروان چڑھ رہی ہے۔ نومل سے سات کلو میٹر دور نلتر پاس کو مقامی زبان میں کلیتی نلتر کہا جاتا ہے جو شیعان علی کا گڑھ ہے۔ نلتر کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے کہ یہ دراصل جاگوت نامی بستی کی اضافت ہے۔ اس کے دوسرے قصبوں میں ناگر، گوعت، کھیوٹ، چھوئی، دلان، چمار سو، بشاگری اور بدلو شامل ہیں۔ جن کی زیادہ تر آبادی گوجر ہے اور اسی مکتب فکر سے

تعلق رکھتی ہے۔ ان کی زبان گوجری ہے۔ یہ سوات سے یہاں آکر آباد ہوئے۔ نلتر کو برطانوی دور حکومت میں گلگت کے ہل سٹیشن کے طور پر آباد کیا گیا۔ یہاں سکی انگ چیمپین شپ باقاعدگی سے منعقد ہوتی ہے۔[335]

نلتر کا قدیم نام جاگوٹ کے علاوہ نیلودر بھی ہے۔ یہاں آلو کے کھیت بنفشی مائل گلابی پھولوں سے ڈھکے تھے۔ نلتر عمدہ قسم کے آلوؤں کی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔ وہاں مقامی ریستوران میں مصنف کی ٹیم کو آلوؤں کی کئی ڈشیں پیش کی گئی تھیں۔ نلتر کی اہم تعمیرات کا بھی مصنف نے تذکرہ کیا ہے۔ نلتر جھیل کے راستے میں بنگلا نامی بستی ایک عارضی بستی ہے جہاں بکروال موسم گرما کے چند ماہ گزارتے ہیں اور معاوضے پر مقامی باشندوں کے مویشی دور دراز چراگاہوں میں لے جاتے ہیں اور سردیوں میں مالکان کے حوالے کر کے اپنے مستقل ٹھکانوں پر چلے جاتے ہیں۔ نلتر جھیل کے راستے میں صنوبر، دیودار اور بھوج پتر کے جنگلات ہیں۔ اس جھیل کو بشکری جھیل یا کوتی جھیل بھی کہتے ہیں۔ بنگلا کی طرح گوپا نامی بستی بھی گرمیوں میں آباد ہونے والی بکروال بستی ہے۔ یہاں لکڑی اور پتھروں سے بنائے گئے جھونپڑے ہیں۔ اس بستی کے بکروالوں کی کٹھن زندگی کے بارے میں مصنف کہتے ہیں:

> "مغربی ٹریکرز کے اعزاز میں شیفرڈ ہٹس کی رومانیت یقیناً آشکار ہو جاتی ہو گی ہمارے حصے میں گوپا کے چند ایسے نونہال آئے جن کے جسم پر موجود لباس ناکافی تھا۔ پاؤں میں جوتے ناکافی تھے، ہڈیوں پر منڈھا ہوا گوشت ناکافی تھا اور ان کی رگوں میں دوڑنے والے خون کے سرخ خلیات ناکافی تھے۔ ان بچوں کو دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ یہاں زندگی کتنی کٹھن تھی۔ ایک یا دو کمروں پر مشتمل کچے پکے مکانات، ضروریات زندگی نایاب، صحت کی سہولیات مفقود اور تعلیم؟"[336]

کچھ بچے گوپا سے بہت مشکل راستہ طے کر کے نلتر سکول میں پڑھنے کے لیے جاتے تھے۔ بچیوں کے لباس کا کپڑا معمولی تھا مگر اس پر کشیدہ کاری اور موتیوں سے دلکش بنایا گیا تھا۔ مصنف کے بقول اب شمالی علاقہ جات کے بچے این جی اوز کی کوششوں سے ڈالر کی بجائے قلم طلب کرتے ہیں۔[337] لوئر شاہنی میں ایک جگہ ان کا گائیڈ عالم خان بالٹی میں چائے لایا اور بالٹی چمچ سے بجانے کا مطلب تھا کہ دور سے پتہ چل جائے کہ چائے آرہی ہے۔ گائیڈ کے بقول گورا لوگ فوراً اس پیغام کو سمجھ جاتے ہیں۔ یہ چائے اس علاقے کا خاص تحفہ ہے، خالص دودھ والی چائے جس میں مکھن ملا ہوتا ہے۔[338]

راستے کے ایک پڑاؤ نیلو لوٹ کا مطلب تھا سبزے کی ڈھیری۔ وہاں درختوں کے بوسیدہ تنوں کے بے ہنگم ڈھیر کو مصنف نے جلانے والی لکڑیاں سمجھا مگر مقامی افراد نے وضاحت کی کہ بہک ہے اور اس کی لکڑی جلانا معاشرتی اور اخلاقی جرم سمجھا جاتا ہے۔ بہک میں بارش سے بچاؤ کے لیے قیام کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی کثیر المقاصد پناہ گاہیں بکروالوں کی پیشہ وارانہ زندگی کا اٹوٹ انگ ہیں۔ وہاں پورٹروں نے ٹیم کے ڈبہ بند کھانوں کو اپنی روزی پر لات مارنے کے مترادف قرار دیا کہ جب خشک راشن سے خود کھانا بنا کر تیار کرتے تھے تو ٹیم کے افراد کے ساتھ پورٹرز کے لیے

بھی کھانا بچ جاتا تھا۔[339] ایک چراگاہ میں پڑاؤ کے دوران زوہ اور زومو نے مصنف کی ٹیم کو گھیر لیا۔ پورٹرز نے بتایا کہ یہ نمک مانگ رہے ہیں کیونکہ ان کا مالک ہر ہفتے آکر انھیں نمک کھلاتا ہے۔ وہاں مختلف لوگوں نے اپنے جانوروں کی نشانی کے لیے کوئی نہ کوئی مخصوص نشان لگایا ہوتا ہے اور وہ وہاں چرتے رہتے ہیں۔[340]

مصنف نے اس سفر کے دوران نظر آنے والی ٹوئن ہیڈ پیک اور لوئر شاہنی پیک سر کرنے کی تاریخ بتائی ہے۔ پہاڑی راستے پر سفر کے دوران مقامی پورٹر راستے کی نشاندہی کے لیے پتھروں کے مینار بناتے ہیں۔ سنوڈوم کی چوٹی سے دئیں تر پاس کا راستہ مقامی لوگوں میں پریوں کے راستے کے طور پر مشہور ہے۔ وہاں جو پہلے ٹاپ پر پہنچ جائے اس کے لیے اذان دینا ضروری ہے۔ مقامی لوگوں میں یہ روایت بہت مضبوط ہے کہ اذان نہ دینے سے نیچے اترتے وقت کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔[341]

فروری میں نلتر میں سعدیہ خان کپ سکی انگ چیمپین شپ منعقد ہوتی ہے جس میں صرف خواتین اور بچے حصہ لے سکتے ہیں۔ نلتر گلیشیر کے کنارے اگی جڑی بوٹیوں میں پیلے رنگ کے مقامی پھل خوش ذائقہ تھے اور میو کہلاتے تھے وہ پورٹرز نے توڑ کر انھیں دیے۔ مقامی پورٹر ان راستوں میں اندھیرے میں بھی نشانیاں دیکھ کر سفر جاری رکھتے ہیں۔ دئیتر میں مقامی رواج کے مطابق تحفہ دینے والے شخص کو خالی ہاتھ لوٹانا اس کی توہین کرنے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔[342]

ایک روایتی پہاڑی گاؤں تالنگ کے بارے میں مصنف بتاتے ہیں:

> "تالنگ ان گھڑے پتھروں اور ناتراشیدہ درختوں کے تنوں سے بنائے گئے ایک یا دو کمروں کے مکانات پر مشتمل روایتی پہاڑی گاؤں ہے۔ یہ گھر ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر بنائے گئے ہیں اور آبادی وسیع علاقے میں بکھری ہوئی ہے۔ گاؤں کی نمایاں خصوصیت ایک خوبصورت پولو گراؤنڈ ہے جہاں باقاعدہ ٹورنامنٹ منعقد ہوتا ہے جس میں ارد گرد کی بستیوں کی ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔ گندم کی کٹائی کے بعد پولو گراؤنڈ میں ایک عظیم الشان جشن منایا جاتا ہے۔ جس میں لوک رقص اور گدھا دوڑ کے مقابلے شامل ہوتے ہیں۔"[343]

وہاں مقامی لوگ نام کے حکیموں سے علاج کرتے ہیں جو زخم پر راکھ کی پٹی سے زخم ٹھیک ہونے کی توقع کرتے ہیں۔[344] تالنگ کے بعد آنے والی بستی کو مصنف پتھر کے دور کی نمائندہ تصور کرتے ہیں۔ یہاں بیشتر مکانات دور دور بکھرے تھے اور اکثر کی چوکھٹ کواڑوں سے بے نیاز تھی۔ ایک مقامی سکول ٹیچر نے بتایا کہ گاؤں خالی نظر آنے کی وجہ عورتیں کھیتوں میں کام کر رہی ہیں اور مرد خرید و فروخت کے لیے برداس یا گلگت جاتے ہیں۔ گھروں کے دروازے صرف جانوروں کے کمروں کو لگائے جاتے ہیں کہ بکری کے بچے باہر نکل کر بیمار نہ ہو جائیں۔ انسانی رہائشی کمروں کے لیے وہ لوگ درختوں کی شاخوں اور گھاس سے بنا یا ڈیڑھ فٹ موٹا پردہ استعمال کرتے ہیں جو رات کو دروازے کے سامنے کھڑا کرتے ہیں اور صبح کے وقت ہٹا دیتے ہیں، مستقل دروازے استعمال نہیں کرتے۔[345]

دئیں تر کے دامن میں خودرو جھاڑیوں میں رنگ برنگے پھلوں کو مقامی زبان میں بھنگر وسو کہا جاتا ہے۔ دئیتر بستی سے آگے پہاڑی نالے کے راستے میں جڑے پتھر رکھ کر مصنوعی آبشار بنائی گئی تھی جس کا پانی نالیوں میں تقسیم ہوتا کھیتوں کی آبپاشی کے کام آتا تھا۔ وہاں ایک خیمے میں چند مقامی افراد کھانا کھا رہے تھے انھوں نے بے حد اصرار سے مصنف کو شریک کیا کہ کھانے کے وقت یہ مہمان کو کھائے بغیر نہیں جانے دیتے۔ وہ روٹی کے ساتھ سبز مرچ اور چینی ملا مکھن اور گاڑھا نمک والا دہی کھا رہے تھے۔ وہ لوگ مقامی لوگوں کی ضرورت کا سامان خرید کر جگہ جگہ خیمہ نشین ہو کر فروخت کرتے تھے۔[346] چھلت نگر کا سب سے بڑا شہر ہے۔ برطانیہ نے بلتستان پر تسلط قائم کرنے کے لیے چھلت فتح کر کے اپنا فوجی ٹھکانہ بنایا۔ اب چھلت وادی چپروٹ میں ٹریکنگ کے دروازے کی حیثیت رکھتا ہے۔ گلگت کے بازاروں میں ہر ماہ کی اٹھائیس تاریخ کو کاروباری چھٹی ہوتی ہے۔

کے ٹو برفانی وادیاں (2011ء)، ڈاکٹر اقبال ہما

ڈاکٹر اقبال ہما نے کنکورڈیا کا سفر 2011ء میں کیا۔ کنکورڈیا ٹریک کے بارے میں معلومات دیتے ہوئے ان کا کہنا ہے کہ یہ دنیا کا مقبول ترین اور خوبصورت ترین ٹریک ہے۔ غونڈوغورو لا ٹریک کنکورڈیا ٹریک کی جدید توسیع ہے۔ اسے گونڈوگورو یا گندوگورو بھی کہتے ہیں۔ بلتی زبان میں درست تلفظ غونڈوغورو ہے جس کا مطلب ہے پتھروں کا علاقہ۔ اس ٹریک کے بارے میں تکنیکی معلومات بھی اس سفرنامے میں شامل ہیں۔ اس کی تسخیر کوہ پیمائی کا درجہ چہارم سمجھی جاتی ہے۔ شاہراہ قراقرم پر مختلف اہم مقامات کے بارے میں مصنف نے معلومات فراہم کی ہیں۔ حویلیاں سے چین کے شہر کاشغر تک ریلوے لائن کے سروے کا آغاز ہو چکا ہے۔ دریائے گلگت پر پرانے پل کے ساتھ نیا فرہاد پل تعمیر کیا گیا ہے جسے عرف عام میں عالم پل کہا جاتا ہے۔ چھمو گڑھ نامی پلپر بچے تازہ انجیر چھوٹی چھوٹی ٹوکریوں میں بیچ رہے تھے۔ تازہ انجیر شمالی علاقہ جات کا تحفہ سمجھا جاتا ہے۔ عالم پل کو بلتستان کا دروازہ کہا جاتا ہے۔ شگر کی آخری آبادی اسکولے فطرت کے برفانی عجائب گھر میں داخلے کا دروازہ سمجھی جاتی ہے۔ استک نالے کے بعد روندو کی طرف جاتے ہوئے مصنف کو خوبانیوں کا باغ نظر آیا مگر کوئی خوبانی بیچنے والا نہیں تھا۔ ڈرائیور نے باغ کے قریب ہائی ایس روک کر کہا جتنی مرضی کھائیں باغ کا مالک اعتراض نہیں کرے گا۔[347]

سکردو بازار میں کوہ پیمائی کا سامان خریدنے انھیں بازار جانا پڑا تو مشہور کوہ پیما حسن صدپارہ کی دکان پر جانا ہوا جو آٹھ ہزار فٹ سے زائد چھ چوٹیاں سر کرنے والے پہلے پاکستانی ہیں۔ سکردو کی ادبی محفل میں مصنف شریک ہوئے اور سفرنامے میں وہاں کی ادبی شخصیات کا مختصر تعارف دیا ہے جن میں احسان دانش، حسن حسرت، حشمت کمال الہامی، انور

بلتستانی، محمد عباس کھر ٹرونگ، بشارت حسین ساقی شامل ہیں۔ صدپارہ جھیل سے ایک کلو میٹر پہلے ست پڑا گاؤں ہے جو صدپارہ کہلاتا ہے۔ اس کے اصل نام کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے:

"ست پڑ" ایک اہم تاریخی پس منظر رکھنے والا مقام ہے۔ یہ سات مختلف قبائل کی بستیوں کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے "ست پڑا" یعنی سات پڑاؤ والا مقام کہلاتا تھا۔ سات پڑاؤ علی شیر خان انچن نے بسائے تھے۔ ست پڑا کو صد پارہ کہلانے والوں نے ظاہری حسن کا لبادہ پہنا کر اس کی رومانیت اور دلکشی میں اضافہ کیا مگر معنوی حسن سے محروم کر دیا ہے۔"[348]

ست پڑا میں وہ مفتوح بسائے گئے جنھیں شیر علی انچن مختلف علاقوں سے گرفتار کر کے سکردو لایا تھا۔ اہل سکردو کی پانی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے انچن نے یہ جھیل بنوائی۔ حسن صدپارہ کے تعارف میں مصنف نے بتایا ہے کہ عام طور پر بلتی چھوٹے قد کے ہوتے ہیں لیکن حسن صدپارہ ان کی نسبت طویل قامت کے تھے۔ مصنف نے حسن صدپارہ سے کیا گیا تفصیلی انٹرویو کتاب میں شامل کیا ہے جس کے مطابق حسن صدپارہ کا نام حسن اسد ہے مگر علاقے سے محبت کی نشانی کے طور پر وہاں گاؤں کا نام اپنے نام کے ساتھ لگاتے ہیں۔ کوہ پیمائی کا شوق انھیں روٹی کمانے کے لیے پورٹر بننے سے پیدا ہوا۔ حسن صدپارہ نے پاکستانیوں کی اپنے ہیروز کے لیے بے قدری کا شکوہ کیا ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کے بعد بھی ائیر پورٹ پر کسی سرکاری افسر نے ان کا استقبال نہیں کیا گاؤں کے لوگوں نے پھولوں کے ہار پہنائے۔ نیپال میں سیاحوں اور کوہ پیماؤں کے لیے سہولیات کا پاکستان کی صورتحال سے موازنہ بھی کیا ہے۔ حسن صدپارہ کو سکردو میں کوہ پیمائی کا سکول قائم کرنے کی خواہش ہے وہ کوہ پیمائی کو قومی کھیل کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ پہاڑوں کو پاکستان کا سب سے بڑا خزانہ قرار دیتے ہیں۔

اس کے بعد مصنف نے کوہ پیمائی کے بارے میں مفصل معلومات دی ہیں کہ اس کا آغاز کب ہوا، بطور مشغلہ اس کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی۔ دنیا میں بلند ترین چوٹیوں اور کوہ پیمائی کی مروجہ قسموں کا بھی ذکر کیا ہے۔ شگر کو بلتستان کی سیاسی، سماجی اور عسکری تاریخ کا اہم باب قرار دے کر وہ بلتستان کا باغ کہتے ہیں۔ شگر کے شاہی قلعے اور امیر ہمدانی کی قائم کردہ امبورک مسجد کا بھی بتایا ہے۔ اسکولے روڈ کے راستے میں آنے والی آبادیاں حشوپی، الچوڑی، ہور حسین اور حیدر آباد ہیں۔ حیدر آباد کا قدیم نام بونگ لا ہے۔ حیدر آباد وادی باشا میں داخلے کا دروازہ ہے۔ تیسر باشا وادی کا اہم قصبہ ہے۔ ٹریک کے راستے میں جابجا آنے والے پڑاؤ کے مصنف نے اصلی نام مع مقامی زبان میں ان کا مطلب بتایا ہے۔ اپالی گون کا اصل نام اپو علی گونڈ ہے جس کا مطلب بابا علی کی بستی ہے۔ چھونگو سے آگے گرم پانی کے چشمے کے پاس میو کیسر ہے جسے کیسر فوڑٹ بھی کہا جاتا ہے۔ مقامی گائیڈ کے مطابق قلعہ تانبے کے رنگ کا بڑا پتھر ہے جس میں بلتی لوک داستان کے ہیرو کیسر نے اپنی ملکہ کو رکھا تھا اور روایات کے مطابق جنات نے اسے پگھلا دیا تھا۔[349]

کیسر نامہ کا شمار دنیا کی طویل ترین نظموں میں ہوتا ہے۔ پانچ سو سال پرانی یہ رزمیہ نظم انیس جلدوں اور دس لاکھ الفاظ پر مشتمل ہے۔ اسکولے تاریخی و دفاعی قصبے کی مختصر تاریخ بتانے کے بعد مصنف اس کے بدلاؤ پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔ چار سال پہلے اور چار سال بعد کے اسکولے میں بہت فرق تھا۔ اب مقامی سیاحوں کی زیادہ آمد ورفت کے باعث اسکولے کی گلیوں کے راستے لکڑی کے تختے لگا کر بند کر دیے گئے ہیں تاکہ مقامی آبادی کا پردہ رہے۔ بدلتے اسکولے کی جھلک دکھاتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے:

> "مکانات کا طرز تعمیر یکسر تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ مکانات کی چھت پر شہتوت اور بید کی چھڑیوں سے بنے ہوئے بالاخانے بہت کم نظر آتے ہیں۔ اسکولی نے وضع قطع ہی نہیں بدلی اپنا تاثر بھی تبدیل کر دیا ہے۔۔۔ آج کا اسکولی سکردو کے کسی نواحی قصبے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ کیمپنگ سائٹس کے ارد گرد تعمیر کیے گئے بازاروں میں خلوص اور شانتی کے بجائے لوٹ کھسوٹ کا راج تھا، اسکولی کے باشندوں کے چہرے پر استقبالیہ کے بجائے کاروباری مسکراہٹ تھی۔۔۔"[350]

مصنف نے بلتستانی قواعد کا ذکر کیا ہے جن کی رو سے ایک پورٹر پچیس کلو سے زیادہ وزن اٹھانے کا پابند نہیں اور فی پڑاؤ کے حساب سے نرخ مقرر ہیں بیافو گلیشیر کا اختتامی ملبہ مرغ کی کلغی کی شکل میں پھیلا ہے۔ بلتی میں بیافو کو مرغ کہتے ہیں اس لیے یہ بیافو گلیشیر کہلاتا ہے۔ مصنف نے دریائے برالدو کے غلط العام نام کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو دراصل بالتورو گلیشیر سے نکلنے کے باعث دریائے بالتورو ہے۔ سنو لیک سے باہر جانے والے راستوں درہ ہسپر، خوردپن پاس، لپ کے لا اور سوکھا لا کے بارے میں جغرافیائی معلومات دی ہیں۔ کے ٹو کی پہلی معاوضاتی سٹیج کورو فون کا قدیم نام پڑی ون ہے۔ سفید رنگ کا بڑا پتھر اس نام کی وجہ تسمیہ ہے۔ جھولے کیمپنگ سائٹ کا پرانا نام غورے سا کر تھا۔ دریائے دومردو کو پار کرنے لیے یہاں جھولا پل بنایا گیا تھا۔ اس لیے جھولا کیمپنگ سائٹ کہلانے لگی۔ بعد میں وہاں لکڑی کا پل بنا دیا گیا، پھر فولادی رسوں کے معلق پل سے بدل دیا گیا۔ اس خیمہ گاہ میں فائبر گلاس ٹائلٹ جدیدیت کا احساس دلاتے ہیں۔ اس خیمہ گاہ کی صفائی ستھرائی کا انتظام ایم پی جی او نامی تنظیم نے سنبھالا ہے۔ بارودمل میں منجنگ کے ڈیرے پر مصنف کو پیپسی کی بوتل 500 روپے میں پڑی۔[351]

پئی یو خیمہ گاہ پہلے اپنی غلاظت کے باعث منفی شہرت رکھتی تھی مگر اب ایسا نہیں رہا۔ بالتورو گلیشیر سے پہلے مقامی پورٹر رقص و سرور کی محفل ضرور سجاتے ہیں۔ ٹین کے کنستر اور پلاسٹک کے کین آلات موسیقی کے طور پر استعمال کیے گئے۔ پئی یو میں پورٹر ایک دن اضافی قیام کرنا پسند کرتے ہیں کیونکہ آگے کے سفر میں گلیشیر پر وہ اپنے لیے کھانا تیار نہیں کرتے سارے سفر کے لیے اکٹھی روٹیاں یہیں پکاتے ہیں۔ آٹے نمک اور گھی سے تیار کردہ خاص قسم کی روٹی پھئی ذخیرہ کر لیتے ہیں اور چائے میں ڈبو کر کھاتے ہیں۔ ایک مقامی گائیڈ کا کہنا تھا کہ عام طور پر بلتی پورٹر ایماندار

ہوتے ہیں مگر ایک آدھ پورٹر ہلکی پھلکی بے ایمانی کرتا ہے اور جو چیز ہاتھ لگ جائے اسے چھپا دیتا ہے کہ واپسی پر یا اگلے چکر میں وہاں سے اٹھالے گا۔[352]

مقامی افراد کے مطابق پئی یو نام کی وجہ تسمیہ پئی پیک سے آنے والے نالے کا نمک والا پانی ہے۔ پرانے زمانے میں مقامی لوگ یہاں بیٹھ کر بڑے بڑے برتنوں میں پانی گرم کر کے نمک بناتے تھے اور بطور ٹیکس راجہ کو پیش کرتے تھے۔ وہ اپنے کھانوں میں نمک کے استعمال سے ناواقف تھے۔ مصنف کے بقول پئی یو نالے میں سونے کے ذرات تلاش کرنے والوں کے حوالے تاریخ میں ملتے ہیں۔ پئی یو میں پورٹروں کے لیے بکرے ذبح کرنے کی روایت بالتورو کی دہشت کے باعث ہے۔ یہ قربانی کیے بغیر ٹریکر بالتورو پر قدم رکھنے کی ہمت نہیں کرتے تھے اور قربانی کا گوشت خود کھانے کی بجائے پورٹروں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ پورٹروں کا حق سمجھا جانے لگا۔ بعد میں بکروں کی قیمتوں میں اضافے پر پورٹروں اور کلائنٹس میں جھگڑے ہونے لگے۔ 2011ء میں پورٹر قربانی کے بکرے کے بدلے دو سو روپے اضافی معاوضہ وصول کر کے خوشی محسوس کرتے تھے۔[353]

مقامی لوگوں کا یقین ہے جو اردوکس پہنچتا ہے وہ کنکارڈیا ضرور پہنچتا ہے۔ اور جو اس راستے میں اٹکے اس کا کنکارڈیا پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔ مصنف کی تجویز کے مطابق دریائے بالتورو کا یاکنگ (پہاڑی دریاؤں کے طوفانی دھاروں میں کشتی رانی کا کھیل) کی تربیت اور مقابلوں کے لیے دنیا کا بہترین مرکز بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بالتورو گلیشیر پر قدم رکھنے سے پہلے پورٹروں نے باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ ان کے مطابق للی واہ سے للی گو تک کا سارا علاقہ منحوس سمجھا جاتا ہے کیونکہ روز لینڈ سلائیڈنگ ہوتی ہے۔ ایک پوری کیمپنگ سائٹ پہاڑ کے گرنے سے تباہ ہو گئی تھی۔ ٹرانگو ٹاورز کا نام مقامی زبان میں براک چھے کہلاتا ہے۔ اردوکس ایک تاریخی خیمہ گاہ ہے۔ مارٹن کانوے نے اسی مقام کو بیس کیمپ بنا کر بالتورو گلیشیر کے سروے کیے تھے۔ ایک غیر ملکی کوہ پیما پالاؤسکی کی زبانی مصنف نے گلیشیر اور مورین کے بارے میں تفصیل سے بتایا ہے۔ بالتورو گلیشیر پر جابجا بانس بکھرے تھے جن کے بارے میں گائیڈ نے بتایا کہ فوج نے فون تاروں کے لیے بانس کے کھمبے لگائے تھے جو برفباری میں ایک سیزن بھی نہیں نکال سکے۔[354]

غوروون کا مقامی نام بیانگو ہے جس کا مطلب ہے ایسا ویرانہ جس کی زمین بھربھری ہو۔ غوروون سے غوروٹو کی طرف جاتے ہوئے چند نوجوان ٹریکرز مصنف کو ملے جو گھوڑوں پر لد کر واپس جا رہے تھے۔ اسکولی تک چالیس ہزار فی گھوڑا دے کر جا رہے تھے۔ مصنف نے نرخ بہت زیادہ ہونے کی نشاندہی کی تو گھوڑے والوں نے بے مروتی سے کہا منہ مانگا کرایہ نہیں دینا چاہتے تو بے شک گھوڑا چھوڑ دیں۔[355]

مشہور چینی سیاح فاہیان مستاگ پاس کے راستے برصغیر میں داخل ہوا تھا۔ مستاگ ٹاور کے دامن میں شر اگن نامی قدیم بستی کے آثار کے بارے میں مصنف بتاتے ہیں:

"بلتی روایات کے مطابق مستاگ ٹاور کے دامن میں "شراگن" نامی بستی آباد تھی۔ جس کے آثار قدیمہ (پتھروں کی دیواریں، پتھر کے برتن اور دوسرے کھنڈرات) 1930ء میں دریافت۔ اس علاقے میں ہونے والی گلیشیر کی نقل و حرکت اور بے تحاشا برف باری کے باعث ان آثار قدیمہ کو" قابل زیارت" بنائے رکھنا ممکن نہیں تھا۔ ایک دفعہ نمودار ہونے کے بعد وہ دوبارہ غائب ہو چکے ہیں۔۔۔ان کھنڈرات سے گھوڑوں کی نعلیں، جنگی ہتھیار اور دھات سے بنائے گئے زیورات بھی دریافت ہوئے جو مختلف کوہ پیما اور پورٹر اپنے گھر لے گئے۔"[356]

ایک فوجی کی زبانی سیڈل پیک کی چوٹی پر فوجی چوکی بنانے کی وجہ مصنف نے یہ بتائی کہ اس سے آگے سیاچن گلیشیر شروع ہو جاتا ہے تو اس پر نظر رکھی جاسکے اس لیے وہاں چوکی قائم کی گئی۔ نگر کے رہائشی مقامی فوجی کا نام دمش تھا جس کا مطلب اس نے پھولوں کا باغ بتایا۔ مصنف کے خیال میں کنکارڈیا کے نام کی ایک وجہ تسمیہ یہ ہے کہ رومی زبان میں ملن کی دیوی کنکارڈیا کہلاتی ہے اور بلتی روایت کے مطابق کچھ گلیشیر نر اور کچھ مادہ ہوتے ہیں اس لیے اس جگہ کو کنکارڈیا کا نام دیا گیا جہاں بالتورو مٹیالے رنگ کا نر اور سفید رنگ کا گاڈون آسٹن مادہ گلیشیر کا سنگم ہے۔ دوسری روایت کے مطابق پیرس کے مشہور چوک کی نسبت سے اسے یہ نام دیا گیا کیونکہ یہاں پانچ برفانی شاہراہیں ملتی ہیں۔ اس علاقے میں موجود سارے گلیشیرز اور چوٹیوں کا مصنف نے تفصیلی تعارف بیان کیا ہے اور جغرافیائی معلومات دی ہیں۔ براڈ پیک کا مقامی نام پھل چن گنگری ہے جس کا مطب ہے وسیع پہاڑ۔ سنوڈم کا مقامی نام سیاگنگری ہے جو غلط العام ہو کر کنگری مشہور ہو چکا ہے۔ چوغولیزا کا مقامی نام چھوگولنگسا ہے۔

کنکورڈیا سے آگے علی کیمپ حوالدار محمد علی کے نام سے منسوب ہے جس نے بالتورو اور ہوشے کو ملانے والا راستہ 1980ء میں بہت جدوجہد کے بعد دریافت کیا تھا۔ اس کوشش کی تفصیل مصنف نے فراہم کی ہے۔ اس سے سکر دو واپسی کا راستہ مختصر ہو گیا اور ہوشے گاؤں کے لیے روزگار کے نئے مواقع فراہم ہوئے۔ غوندوغورولا کا کنٹرول ہوشے کے باشندوں کے ہاتھ میں ہے۔ انھوں نے باقاعدہ تربیت حاصل کر کے ایک ریسکیو ٹیم بنائی ہے جو معاوضہ لے کر ٹریکرز کو درہ عبور کرنے میں مدد دیتی ہے۔ مقامی پورٹرز کے مطابق گلیشیر پر گاناوغیرہ کرنے سے خرابی ہوتی ہے اس لیے لاء کراس کرنے کے بعد کرتے ہیں۔ منیر کیمپ حوالدار علی کے نائب کے نام سے منسوب ہے وہ ہوشے والا راستہ دریافت کرنے میں محمد علی کے ساتھ شامل تھا۔ مقامی پورٹر نے گونڈوغوروکا پرانا نام غت پے غورو بتایا جس کا مطلب ہے لڑھکنے والی جگہ۔

خوژپانگ یا ہسپانگ بلتی لفظ تھیوسانگ کی بگڑی شکل ہے جس کا مطلب ہے نیلاہٹ مائل سرسبز چراگاہ۔ یہ کیمپنگ سائٹ لینڈ سلائیڈ ایریا کے بعد تھی۔ دال سمپاروایتی کوہستانی چراگاہ ہے جس کا نام نگر والوں کے خصوصی پکوان سمپا سے منسوب ہے۔ جو یا گندم کے دلیے کو مکھن میں گوندھ کر پیڑا بنا کر گرم کیے پتھروں میں دبا کر پکاتے تھے اور

یاک کے دودھ کی چائے کے ساتھ نوش کیا جاتا تھا۔ مقامی بکروال مسافروں کی تواضع سمپا اور دال سے کرتے تھے اس لیے اس کا نام دال سمپا پڑ گیا۔

مصنف نے اپنے پچھلے سفر کے دوران اس جگہ ایک غیر ملکی کوہ نورد کی زبانی کے ٹو کے بارے میں تفصیلی معلومات دی ہیں کہ اسے سر کرنے کے کون کون سے راستے ہیں اور کوہ پیمائی کے دوران کہاں کہاں کیمپ لگائے جاتے ہیں۔ اس کوہ پیما نے لٹل کریم کی بہت تعریف کی تھی۔ سائی چھو نامی خیمپ گاہ چارا کو سانالے کے دائیں کنارے واقع ہے۔ سائی چھو کا مطلب ہے جنگلی گلاب۔ وہاں لکڑی کے تختوں پتھروں اور تنوں سے تعمیر کردہ مسجد قدیم بلتی طرز تعمیر کی حامل ہے۔[357] جس طرح پئی یو میں بالتورو سے پہلے پورٹر جشن مناتے ہیں اسی طرح سائی چھو میں ٹریک کے کامیابی سے اختتام پر خوشی میں جشن مناتے ہیں۔ اس کے بعد ہوشے تک مصنف کو کبھی کبھی ثقافتی منظر بھی نظر آتا رہا۔ بلتی رواج کے مطابق گاؤں کے ارد گرد فصلیں کاشت کی جاتی ہیں۔ کھیتوں میں صرف عورتیں کام کرتی ہیں۔ مخصوص بلتی لباس پہنے پشت پر باندھی گئی ٹوکری میں مقامی خواتین نظر آئیں۔ ہوشے سے پہلے ایک میدان میں مقامی بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ایک کمرے میں قائم عجائب گھر میں قدیم بلتستانی ہتھیاروں، اوزاروں، لباس اور برتنوں پر مشتمل نوادرات کی نمائش کی گئی تھی۔ کرکٹ کھیلنے والے بچے سیاحوں کو استقبالیہ رقص اور گیت پیش کرکے اپنی بستی میں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔[358]

روایتی ہوشے قصبہ تیزی سے تبدیلی کی زد میں ہے۔ تنگ گلیوں پتھریلے مکانات کی مرکزی بستی کے گرد بہت سی عمارتیں جدید رنگ لیے ہوئے تھیں۔ معروف لٹل کریم کو اپنی دکان میں کھاد تول کر دیتے دیکھ کر مصنف کو اس کی نا قدری پر بہت افسوس ہوا۔ ان کے سیاحت کے دوران کے اہم واقعات کو مصنف نے اپنے سفر نامے میں جگہ دی ہے۔ ہوشے کے اہم قصبے مچلو کی اہمیت بیان کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں یہاں سے دنیا کی پانچویں بلند ترین اور پاکستان کی بلند ترین آبادی سالتورو کے لیے راستے نکلتے ہیں۔ بلتی زبان میں دریائے شیوک گنگ چھوئی کہلاتا ہے۔ گھانچے اس کی تبدیل شدہ شکل ہے۔ اس کا دار لحکومت خپلو تین خوب صورت وادیوں شیوک، کارگل اور کھرمنگ پر مشتمل ہے۔ یہاں سات سو سالہ قدیم چقچن مسجد اور قدیم شاہی قلعہ تھوڑے سے کھر ہیں۔ کرپس نامی قصبے میں نور بخشی فرقے کی مرکزی خانقاہ ہے۔ آخری باب میں مصنف نے قراقرم اور ہمالیہ کے بارے میں جغرافیائی معلومات اور کے ٹو سر کرنے والی مہمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔

پھول دیوسائی کے (2010ء)، ڈاکٹر محمد منیر مرزا

ڈاکٹر محمد منیر مرزا نے دیوسائی کا سفر 2010ء میں کیا۔ دیامیر کے مقامی لوگوں کی توہم پرستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں:

"مقامی لوگ غربت اور افلاس کا نمونہ ہی نہیں بلکہ حد درجہ جہالت کی وجہ سے توہم پرستی میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ نانگا پربت کی چوٹی پر پریوں کی ملکہ کا شاندار محل ہے جس تک پہنچنا ناممکن ہے کیونکہ اس کی حفاظت کے لیے لمبے لمبے سانپ اور اژدھے اور انسانوں کو نگل جانے والے بڑے بڑے مینڈک پہرہ دیتے ہیں۔"[359]

اتنے عرصے بعد مصنف کو چلاس کی ترقی اور بڑھتی آبادی اور رونق دیکھ کر اسے چلاس تسلیم کرنے میں تامل ہوا۔ انھوں نے قدیم زمانے کے اس چلاس کا ذکر کیا ہے جہاں بحالت مجبوری بس کی خرابی کے سبب کچھ گھنٹے ٹھہرنا پڑا تھا تو صرف اکا دکا ہوٹل تھے۔ یہ علاقہ بدھ دور میں بھی اہمیت کا حامل تھا۔ چٹانوں پر کندہ تحریریں تاریخ کے گوشوں کو بے نقاب کرتی ہیں۔ استور میں آبشاروں سے بجلی پیدا کرنے کے لیے لوگوں نے جنریٹر لگا رکھے تھے۔ چھوٹے بچے جابجا اپنے صحنوں میں لگے انگور اور سیب توڑ کر مسافروں کو فروخت کرنے کے لیے کھڑے تھے۔ مصنف کا کہنا ہے استور قدیمی تاریخی شاہراہ پر واقع ہے جو گلگت اور کشمیر کے صدر مقام سری نگر کو آپس میں ملاتی ہے۔ تمام تجارتی و فوجی قافلے استور کے راستے ہی گلگت اور سری نگر کے درمیان آتے جاتے تھے استور کی سرخ اور گلابی رس والی لذیذ چیری کی مصنف نے بہت تعریف کی ہے۔ راما جھیل کے ہندوانہ نام کے پس منظر کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے:

"حیران کن بات یہ ہے کہ اتنی بلند اور دور افتادہ چوٹی پر جھیل کا نام "راما جھیل" کیسے پڑ گیا؟ جو خالصتاً ہندوانہ نام ہے اور اس پورے علاقے میں ہندوؤں کا نام ونشان بھی نہیں ملتا۔ لیکن جس طرح بدھ مت کے آثار مانسہرہ، سوات، چلاس اور نیلم ویلی میں شاردا کے مقام پر ملتے ہیں ہو سکتا ہے اس طرح صدیوں پہلے ہندوؤں کی مذہبی کتاب "رامائین" میں اس کا ذکر ہو اور اس وجہ سے اسے راما جھیل کہتے ہوں۔۔۔ گویا صدیوں پہلے اس خطے میں ہندومت کے اثرات موجود تھے۔ ورنہ راما جھیل اور گنیش پل کبھی بھی معرض وجود میں نہ آتے۔[360]

مصنف نے یہاں کے جانوروں یاک، زوہ اور زومو کے بارے میں بھی معلومات دی ہیں۔ ترشنگ اور چورت گاؤں والوں میں کبھی کبھار تلخی ہو جاتی ہے۔ زیادہ تر سیاح ترشنگ میں اتر کر وہیں سے پورٹر لے لیتے ہیں اور چورت والے محروم رہ جاتے ہیں اس بات پر دونوں گاؤں والوں کی لگتی ہے۔[361] ترشنگ میں روپل ہوٹل میں ڈائننگ روم خیمے پر مشتمل تھا جو کسی کورین سیاح سے ہوٹل کے مالک نے سستے داموں خریدا تھا۔ ترشنگ کے ایک سکول کے بارے میں مصنف بتاتے ہیں کہ امام بارگاہ کے بڑے ہال کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصے میں پرائمری سکول بنایا گیا تھا جہاں چار نوعمر اساتذہ دس بارہ چھوٹے طالب علموں کی چار کلاسوں کو ایک ایک کونے میں سبق پڑھا رہے تھے۔[362]

"۔۔۔وادی ترشنگ میں بچوں کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دینے کا رواج فروغ پاتا دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔۔۔ وادی ترشنگ بڑی خوش حال نظر آئی۔ عورتیں چمکیلے اور بھڑکیلے لباس کو زیادہ پسند کرتی دکھائی دیں۔ مکانات پنجاب کے گاؤں کی طرح اکٹھے نہیں بلکہ الگ الگ جگہوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ مکانات زیادہ تر کچے اور پتھر اور

گارے سے بنائے گئے تھے جن میں کھڑکیاں اور روشن دان برف باری کی شدت سے ڈرتے ہوئے نہ ہونے کے برابر تھے۔"[363]

استور، ترشنگ اور شگر کے آلوؤں کی سارے پاکستان میں بہت مانگ ہے۔ ترشنگ میں آلو کے ساتھ ساتھ ساگ اور دیگر سبزیوں کے کھیت بھی تھے جن میں عورتیں کام کر رہی تھیں۔ یہاں کی دکانوں میں تیار شدہ ملبوسات، ٹوتھ پیسٹ، سٹیشنری، صابن، گولیاں ٹافیاں دیکھ کر مصنف نے لوگوں کی خوش حالی کا اندازہ لگایا۔ بچے بھی کمتر لباس میں نہیں تھے اور کوئی بچہ گداگری یا ڈالروں کے لیے ہاتھ پھیلاتا نظر نہیں آیا۔ یہاں کے لوگ سادہ طرزِ زندگی کے عادی تھے۔ جانوروں کے سردیوں میں رہنے کے احاطوں کو بھک کہا جاتا ہے جہاں مقامی باشندے چارہ اکٹھا کر کے سردیوں میں جانوروں کو خوراک بھک میں ہی دیتے ہیں۔

وہاں ایک مقامی پورٹر نے مصنف کو اپنا پورا نام لکھنے کے لیے کہا کہ ولدیت کے ساتھ لکھو کیونکہ ہر چوتھے آدمی کا نام سلطان ہوتا ہے والد دادا کے نام کے بغیر کسی اور سلطان کا گمان ہو سکتا تھا۔ دیوسائی میں پھولوں کی 360 قسمیں پائی جاتی ہیں جو قوت بخش دیسی نسخوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ قدیم دور میں سنیاسی انھیں کھوجنے کے لیے پیدل آیا کرتے تھے۔ مارموٹ کوہستانی عقاب کا من پسند شکار ہے۔ دیوسائی نام کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مصنف کو مقامی ڈرائیور نے کہا کہ یہ جنوں، پریوں، چڑیلوں اور دیوؤں کی سرزمین ہے چودھویں کے چاند کی رات پریوں کی شہزادی چندر مکھی شیوسر جھیل میں نہانے آتی ہے۔ مقامی افراد کے بوڑھے پریوں کے لیے کھانے پکا کر پہاڑوں پر رکھ جاتے تھے اور اگلے دن خالی برتن لے جاتے تھے۔ بعد میں ڈرائیور نے تسلیم کیا کہ یہ صرف توہمات ہیں جو ان کے بڑے بوڑھے اس مہلک میدان سے ڈرانے کے لیے انھیں سنایا کرتے تھے۔ بڑا پانی پر پل بننے سے پہلے لوگوں کو بہت مشکلات تھیں۔ مقامی لوگ پیدل دریا عبور کرتے تھے اور بلیڈ سے زیادہ تیز سنگریزے انھیں لہولہان کر دیتے تھے۔ وہاں مچھر بہت موٹے اور موذی تھے۔ وہاں مصنف کو پالتو جانوروں کے بہت ریوڑ نظر آئے جو چرنے کے لیے آئے تھے۔ 1995ء میں بھی مصنف سکردو آئے تھے اور جھیل صدپارہ تک بھی آئے۔ اب ڈیم بننے کی وجہ سے جھیل ڈیم کے بلند ذخیرہ آب میں ڈوب چکی تھی۔ صدپارہ جھیل کے نزدیک منٹھل گاؤں میں قدیم بدھ آثار پائے جاتے ہیں۔ ایک بڑی چٹان پر بدھ کی 23 شبیہیں بہت ہنرمندی سے کھدی ہیں۔[364]

بلتستان کی قدیم تاریخ، پس منظر اور جغرافیائی معلومات کی فراہمی کے ساتھ مصنف نے یہاں کے لوگوں کی نسل اور زبان کے بارے میں بھی بتایا۔ تبت کلچر کے ساتھ ہم آہنگی کے باعث اسے تبت خورد بھی کہتے تھے۔ بلتی ادب کی بابت بتایا ہے کہ یہ فارسی اور عربی کی آمیزش سے وجود میں آیا ہے۔ بلتی شاعروں میں راجا محمد علی شاہ، صبا شگری، فدا حسین، شمیم بلتستانی، راجا حسین علی خان اور اخوند سلطان کے نام نمایاں ہیں۔ بلتی موسیقی میں ایرانی موسیقی کی

آمیزش کا بھی ذکر کیا ہے۔ 71ء کی جنگ میں کئی گاؤں بھارت کی تحویل میں جانے سے بیشتر خاندان تقسیم ہو گئے۔ سکر دو گلگت روڈ پہلے پیدل گزر گاہ تھی۔ 1968ء میں جیپوں کے لیے سڑک بنی اور 1980ء میں اسے وسیع کر کے ٹرکوں بسوں کے لیے کھولا گیا تو بلتستان کے سماجی و معاشی انقلاب کا آغاز ہوا۔[365]

شگر کے تاریخی قلعے میں دیسی کم اونچی چھتوں والے کمرے تھے۔ محرابی دروازے، پتھر کے چکنے فرش ترشے سیاہ سنگ مرمر سے بنے تھے۔ کچن میں پڑے برتن بہت وزنی پتھر سے بنائے گئے تھے۔[366] یہاں شگر کے اماچہ خاندان کے آغاز کے بارے میں مشہور مقامی روایت کا ذکر کیا ہے۔ دریائے شگر کے آہنی رسوں سے بنے عارضی پل کو دیکھ کر مصنف نے یہاں مستقل پل بنانے کی اہمیت پر زور دیا۔

پربتوں کا شیندور (2011ء)، ڈاکٹر منیر مرزا

ڈاکٹر منیر مرزا شندور فیسٹول دیکھنے 2011ء میں گئے۔ پہلی بار وہ لواری عبور کر کے 1962ء میں چترال گئے قدیم سفر کا بھی ساتھ ساتھ ذکر موجود ہے۔ دریائے سوات کی بدولت سوات کی زرعی اراضی اور بجلی کی فراہمی کا تذکرہ کیا ہے۔ انگریزوں نے مالاکنڈ کی پہاڑیوں میں سرنگ بنا کر دریائے سوات کے پانی سے بجلی پیدا کی تھی سرنگ کی نہر کا اس علاقے کے زرعی انقلاب میں اہم کردار رہا اسی کی بدولت گنا اور تمباکو یہاں سب سے زیادہ پیدا ہوتا ہے۔[367] مصنف نے حالیہ سفر کرتے ہوئے 1962ء کے سفر اور ماضی اور حال کی تبدیلیوں کا تقابل کیا ہے۔ لواری ٹاپ کے بارے میں مقامی لوگوں کا کہنا تھا کہ اس پر نادیدہ شیطانی قوتوں اور انجانی بلاؤں کا بسیرا ہوتا ہے جو غیر مقامی سیاحوں کے لیے رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں۔ وہاں شدید طوفان کے باعث پاکستان کے دو فوکر طیارے تباہ ہو گئے تھے۔[368] کالاش کی آبادی کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف نے بتایا کہ کافرستان کو اب کالاش کہتے ہیں جو تین وادیوں پر مشتمل ہے۔ اسے سکندر اعظم کے ساتھ آئے سپاہیوں کی نسل نے آباد کیا تھا۔ بریر، بمبوریت اور رنبور میں بمبوریت کو مرکزی وادی کی اہمیت حاصل ہے۔ کافروں کے جشن، تقریبات اور جانوروں کی قربانی زیادہ تر اسی وادی میں کی جاتی ہے۔ بریر کی وادی میں کھلے بکسوں میں مردے پھینکنے کی وجہ سے قبرستان کی تعفن زدہ فضا کا سامنا کرنا پڑا۔ رہائشی مکانات میں لوگوں کی عدم موجودگی کی وجہ مرکزی وادی میں تین دن سے جاری مردے کی تقریبات تھیں۔ 1962ء میں بمبوریت وادی کے وسط میں لکڑی کے چھوٹے سے کھوکھے کو عبادت گاہ بنا کر وہاں چند مسلمان ہو چکے افراد نماز ادا کرتے تے۔ وہاں ایک جرمن سیاح نے ریچھ پر حملہ کر کے مارنے کے بعد اس کی کھال سوکھنے کے لیے رکھی تھی۔ قدیم بمبوریت کی جھلک مصنف اس طرح دکھاتے ہیں:

> "کافرستان کی بمبوریت وادی اس وقت صاف ستھری اور جنگل وادی تھی۔ ہمارے جیسا کوئی کوئی سر پھرا ادھر کا رخ کرتا تھا۔ پیسے کا لالچ نہیں تھا۔ عاجزی، انکساری اور خلوص کا دور دورہ تھا۔ ہم نے صرف دس روپے میں آٹھ نو کافر

لڑکیوں کا ہو ہو کی آواز والا ڈھول کے ساتھ رقص دیکھا تھا اور دو روپے فی مرغ کے حساب سے دس مرغ بھی کھائے تھے۔"[369]

تمر گرہ کے نام کی وجہ تسمیہ مصنف یہ بتاتے ہیں کہ سکندر اعظم کے خزانے کا کچھ حصہ کافرستان کے غاروں میں چھپایا گیا تھا اس کی تلاش میں امیر تیمور کے سپاہی یہاں سے گزرے تو انھوں نے اس علاقے کا نام تیمور گڑھ رکھ دیا جو پشتو لب و لہجے کی بنا پر تمر گرہ ہو گیا۔ مینگورہ کا بٹ خیلہ بازار دنیا کا طویل ترین بازار ہے۔ تمر گرہ میں نرالا دستور ہے کہ سیلاب کے بعد جو چیز جسے ملے وہ مال غنیمت کے طور پر اس کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ یہ ریاست دیر کا صدر مقام ہے یہیں سے باجوڑ کو راستہ جاتا ہے اور مقامی لوگ بلا روک ٹوک افغانستان جاتے تھے۔ دونوں ملکوں میں ان کی رشتہ داریاں تھیں۔ دیر اور چترال کے درمیان برف باری کے دوران بھی رابطہ بحال رکھنے والی لواری ٹنل کا آغاز 1971ء میں ہوا تھا۔ مصنف کے یہاں سفر تک یہ مکمل ہونے کے باوجود افتتاح کے مرحلے سے نہیں گزر سکی تھی۔ سوات اور دیر کے گرد و نواح کے دکاندار گلیشیر سے برف کے بلاک بنا کر ویگنوں میں لاد کر دیگر علاقوں کے بازار میں بیچنے سے خوب کمائی کرتے تھے۔ برف باری کی وجہ سے درہ لواری بند ہونے کے دنوں میں اہل چترال افغانستان کی حدود میں جا کر پاکستان آتے ہیں۔

کافرستان کے باشندوں کے مذہبی عقائد کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ ساتھ دیوتاؤں اور روحوں کو بھی مانتے ہیں۔ جنوں بھوتوں، چڑیلوں پریوں پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ بیرونی دنیا سے رابطہ نہ ہونے کے باعث قدیم تہذیب پر قائم ہیں۔ خواتین موٹا اونی لباس پہنتی ہیں۔ لمبے چوغے کو کمر پر پٹکے سے باندھتی ہیں۔ سر پر کوڑیوں، موتیوں اور چھوٹی گھنٹیوں سے مزین ٹوپی نما پٹکا پہنتی ہیں۔ لوگ رقص و نغمے کے دلدادہ ہیں اور سال بھر کسی نہ کسی مذہبی تہوار میں مشغول رہتے ہیں۔ ان کے بال سیاہ اور نیلی آنکھیں خوبصورتی کا موجب بنتی ہیں۔ اپنی پراسراریت، قدامت پرستی اور ارواح پرستی اور رقص کے انداز کے باعث یہ پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ بودلک سے متعلقہ معلومات کو مصنف نے سنی سنائی اور من گھڑت قرار دیا ہے۔[370]

چند گھروں پر مشتمل پرانا ایون گاؤں اب بڑے قصبے میں بدل چکا تھا جہاں ہوٹل بکثرت تھے۔ یہی حال بمبوریت میں تھا پہلے باہر سے کم سیاح آتے تھے مگر اب اتنی مخلوق آنا شروع ہو گئی کہ بوڑھی عورتیں بھی تصویر اتروانے کے پیسے مانگتی ہیں۔ مصنف نے اسے بناوٹی بمبوریت قرار دے کر اصلی بمبوریت کی گمشدگی پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔[371] اب کافرستان میں مردوں کو دفنانے کا رواج ہو چکا ہے۔ وہاں مقامی دکانوں پر لاہور کے بازاروں سے خریدی گئی سستی چیزیں بوڑھی کالاش عورتیں غیر ملکی سیاحوں کو مقامی مصنوعات کہہ کر خوب بھاری قیمت وصول کرتی ہیں۔ پہلے یہاں کسی کو روپے ڈالر کا علم نہیں ہوتا تھا۔ اب کسی سے بات بھی کریں تو پیسوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ایک دکان میں

کافرانہ لباس کو صرف ہاتھ لگا کر دیکھنے کے خاتون دکاندار نے سو روپے طلب کر لیے۔[372] 1962ء میں یہاں تہ در تہ صدیوں پرانے لکڑی کے ڈھانچہ نما مکانات تھے جنھیں دیکھ کر قبل از مسیح کی بنی پتھروں کی بستیوں کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ اب اینٹوں سے بنے پکے مکانات، پکی گلیاں، نالیاں، نلکے، خوبصورت سیڑھیاں تھیں۔ گھروں میں زیادہ تر بوڑھی عورتیں اور بچے ہوتے ہیں کیونکہ یہاں کی خواتین آرام طلب مردوں کی نسبت زیادہ جفاکش ہیں۔ اب حکومت نے یہاں اسلام کی تبلیغ پر پابندی لگا دی ہے کہ صدیوں پرانا کلچر اصل حالت میں محفوظ رہے۔

نئے چترال میں زیادہ آبادی اور تمام سہولیات دیکھ کر مصنف کو خوشگوار حیرت ہوئی کہ بہت تھوڑے عرصے میں بہت زیادہ تبدیلی آئی۔ مصنف نے 1993ء کے چترال کی جھلک دکھائی ہے وہاں کے پٹھان لوگ جب کسی بات پر زور پیدا کرتے تو کافر کا خطاب دیتے۔ گرم چشمہ کے مقام پر روس افغان جنگ کے دوران امریکہ کے ہیلی کاپٹروں کے ذریعے اتنا اسلحہ اتارا گیا تھا کہ اسے رکھنے کی جگہ نہیں رہی تھی۔ یہاں سے افغانیوں نے گدھوں پر لاد کر غاروں میں چھپا دیا۔[373] 1993ء میں چترال آمد پر یہاں کے سرکردہ لوگوں سے ایک ملاقات کے دوران ان کے حلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

> "کھانا لگانے سے پہلے ہمارا تعارف عمائدین چترال اور علاقے کے بڑے بڑے سرداروں سے کرایا گیا۔ جو لمبے لمبے چترالی چوغوں اور مرغ زریں کے پروں والی چترالی سفید برف ٹوپیاں پہن کر خصوصی طور پر ہمیں شرف ملاقات بخشنے دور دراز کی وادیوں سے تشریف لائے تھے۔ عمر رسیدہ، کمر خمیدہ، گرم سرد چشیدہ، سرخ و سفید چہرے اور مضبوط جسم والی یقیناً یہ تاریخی شخصیات تھیں جنھوں نے انگریزی راج کو کبھی تسلیم نہیں کیا ہوگا۔ ان میں کوئی امیر الملک، کوئی عظیم الملک اور کوئی سر تاج الملک لقب رکھتا تھا۔"[374]

چترال کے تاریخی قلعے کی طرف کم سیاح جاتے ہیں۔ وہ کالاش کی قدیم تاریخ و ثقافت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ مصنف نے چترال کی شاہی جامع مسجد کی تاریخ بیان کی ہے۔ مصنف نے لوک داستانوں کے بیان سے لومڑی اور کوے کو متبرک مقدس سمجھنے اور مرغی اور انڈے کو حرام سمجھنے کے عقیدے پر روشنی ڈالی ہے۔ چترالیوں اور کالاشیوں کے دیگر توہمات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ گرم چشمے پر چند بچے ٹوکریوں میں تازہ پھل لیے سیاحوں کو فروخت کرنے بیٹھے تھے۔ شندور میلہ دیکھنے کے لیے زیادہ تر لوگ گلگت سے شیندور آتے ہیں کیونکہ راستہ نسبتاً بہتر ہے جبکہ چترال سے شیندور کا راستہ مشکل اور خراب ہے۔ شندور تک مصنف کو جابجا چیکنگ کے مراحل سے گزرنا پڑا۔ مستوج سے بروغل وادی کی طرف راستہ مشکل تھا۔

شیندور کا قدیم نام مصنف نے سیندور ہونے کا امکان ظاہر کیا ہے کہ ان علاقوں میں اور بھی ہندوانہ نام ملتے ہیں جیسے گنیش پل اور راما جھیل وغیرہ۔ اتنی طویل جھیل ہونے کے باوجود اس میں سے کوئی دریا نہیں نکلتا اس کا پانی اس کے اندر ہی رہتا ہے۔ وادی شیندور ایک چراگاہ ہے جہاں گرمیوں میں زومو اور زوہ چرنے کے لیے آتے ہیں۔ باقی سارا سال

بے آباد رہنے والی اس وادی میں صرف شیندور فیسٹول کے موقع پر چار پانچ دن کے لیے رونق ہوتی ہے۔ سردیوں میں جھیل جمنے سے گلگت سے پیدل چترال آنے والے گھوم کر آنے کی بجائے اس کے اوپر سے گزر جاتے ہیں۔[375]

مصنف نے پولو کے تاریخی پس منظر اور اس کھیل کے قواعد وضوابط کے بارے میں مفصل معلومات دی ہیں۔ جولائی میں شیندور میں ہونے والے تہوار میں فائنل زیادہ تر گلگت اور چترال کی ٹیموں کے درمیان ہی ہوتا ہے۔ اس لیے لوگوں میں جوش وخروش بالکل پاک بھارت کرکٹ میچ کی طرح ہوتا ہے۔ پولو میچ کے آغاز پر دھنوں اور اس کے دوران بجنے والی دھنوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ شیندور فیسٹیول کے دوران پاک فوج کی طرف سے پیراگلائیڈنگ کا مظاہرہ بھی ہوا۔ گلگت چار سال بعد چترال سے میچ جیتا تھا اس جیت کی خوشی میں گلگت روڈ پر ہر آبادی میں بچے گلگت جیت گیا کے نعرے لگاتے گاڑیاں روک کر چندہ مانگتے رہے۔[376] مصنف کے بقول وادی پھنڈر کو اپنی دلکشی کے باعث چھوٹا کشمیر بھی کہا جاتا ہے۔ مشرف نے کارگل شہید لالک جان شہید کی خدمات کے اعتراف میں اس کے آبائی گاؤں وادی یاسین تک سڑک بنوا کر یہاں کے باشندوں کے دل جیت لیے تھے۔

1965ء میں جب مصنف ہنزہ گلگت کی سیاحت کے لیے آئے تو گلگت سے ہنزہ تک سڑک کا نام ونشان نہیں تھا۔ صرف ایک پگڈنڈی تھی جس پر گھوڑوں کے ذریعے یا پیدل سفر کیا جاتا تھا۔ یاسین تک بھی ذرائع آمدورفت مفقود تھے۔ انھوں نے خچر پر سامان لاد کر پیدل سفر شروع کیا تھا۔ وادی یاسین میں مویشی چرانے والی لڑکیوں نے سروں پر رنگ دار گول ٹوپیاں پہنی ہوتی تھیں۔ اب مصنف نے یہاں کی ترقی، صاف ستھرا ماحول، صاف مکانات، پڑھے لکھے مکین اور پختہ سڑک دیکھ کر اسے بہت سراہا۔ آغا خان ترقیاتی فنڈز کا یہاں صحیح استعمال ہوا تھا۔ یہاں کے رہن سہن کے حوالے سے منیر مرزا کا کہنا ہے:

> "سڑک کے دائیں بائیں جگہ جگہ آبادی دکھائی دے رہی تھی۔ عام طور پر مردوں کا لباس شلوار قمیض یا پینٹ شرٹ جبکہ عورتیں قمیض اور دوپٹہ میں ملبوس نظر آئیں۔ عورتوں میں پردہ کا رواج نہیں۔ لوگ پرامن اور لڑائی جھگڑوں سے دور رہتے ہیں۔ یہاں کے طالب علم آغا خان فنڈ سے وظائف لے کر کراچی، لاہور اور اسلام اباد کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے پاکستان میں سب سے زیادہ تعلیمی معیار اسی وادی کا ہے جو اسماعیلیوں کا گڑھ کہلاتی ہے۔"[377]

مارخور ریسٹورنٹ میں ناشتے کے ذکر پر مصنف نے مارخور کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں۔ اسماعیلیوں کے عقیدے کے مذہبی پس منظر سے بھی آگاہ کیا ہے کہ یہ شیعوں کے مسلک سے کس طرح مختلف ہے۔ گوپس میں سڑک پر ایک بڑا سانپ نظر آنے پر مقامی ڈرائیور نے انھیں بتایا کہ کسی جاندار کو مارنا ٹریفک کے اصولوں کے خلاف ہے۔ پرنس کریم کی سالگرہ پر ان علاقوں میں عام تعطیل ہوتی ہے۔ گاکوچ میں بازار بند تھا۔ اشکومن میں پہاڑوں پر پڑی لکیروں کو ضعیف العقیدہ لوگ کسی بڑی بلا کے پہاڑوں پر سے اترنے کے آثار بتاتے ہیں۔ یہاں کی قدیم

تہذیب کے بارے میں مقامی ڈرائیور نے مصنف کو بتایا کہ اشکومن کی تاریخ بہت قدیم ہے کبھی کبھی یہاں ہزار ہا سال پرانے زیورات ملتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں تہذیب اور کاریگری عروج پر رہی۔[378] اشکومن سے روس کی سرحد اور بروغل کی طرف جانے کے کئی پیدل راستے ہیں۔ اشکومن میں مصنف کو ایک صحتمند رجحان نظر آیا کہ ایک مخصوص جگہ سارے اشتہارات اور پوسٹر چسپاں تھے ہر جگہ نہیں۔

گلگت کے بارے میں مصنف بتاتے ہیں کہ یہ بہت قدیم ہے۔ چٹانوں کو تراش کر بدھ کا بنایا گیا مجسمہ سیاحوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ گلگت سے مختلف علاقوں کی طرف جانے والے اہم راستوں کی نشاندہی کی ہے۔ جدید گلگت کے بارونق بازار کے بارے میں مصنف کا مشاہدہ ہے:

> "روز افزوں آبادی اور نت نئی مارکیٹوں کے معرض وجود میں آنے سے گلگت اب بڑے شہروں کی صف میں شامل ہو گیا ہے۔ بڑی بڑی مارکیٹوں میں چین کی بنی ہوئی ہر قسم کی گھریلو اشیا، ملبوسات، کراکری، کمبل اور بچوں کے کھلونے وافر تعداد میں دستیاب ہیں۔ کوہ پیمائی کے لیے جانے والے اکثر سیاح یہیں سے ہی ہائکنگ ٹریکنگ اور سیاحت کی دوسری اشیا کے ساتھ ساتھ خیمے بھی مناسب قیمتوں پر حاصل کر لیتے ہیں۔"[379]

مصنف نے گلگت کے لوگوں کے محیر العقول واقعات پر یقین کا ذکر کیا ہے۔ آدم خور راجہ کا قصہ بھی بیان کیا ہے۔

لداخ سے وادی مہران تک (2013ء)، ڈاکٹر محمد منیر مرزا

ڈاکٹر محمد منیر مرزا کے اس سفرنامے کے ٹائٹل پر "دریائے سندھ کے آغاز (لداخ) سے بحیرہ عرب تک گرنے تک کا سفر" کے الفاظ درج ہیں مگر سفر صرف صوبہ سندھ کے چند شہروں حیدر آباد، میر پور اور ماتلی کا ہے۔ دریائے سندھ کے جغرافیے کا ذکر صرف ایک صفحے پر ملتا ہے۔ کہ مہاساگر یا شیر دریا لداخ کی سنگلاخ چٹانوں اور کشمیر کی مانسرور جھیل سے نکل کر شیوک، بلتورو، شگر، ہنزہ، نلتر، غدر، روپل، گلگت کا پانی اپنے اندر شامل کرتا ہے۔[380] ان جغرافیائی معلومات کے علاوہ باقی سفرنامہ سندھ کے چند علاقوں تک محدود ہے۔

دو سفر (۱۹۵۳ء)، محمد خالد اختر

محمد خالد اختر پیشے کے اعتبار سے الیکٹریکل انجینئر ہیں۔ انھوں نے ناول اور سفرنامے بھی لکھے۔ "دو سفر" ان کے ۱۹۵۳ میں کیے گئے سفر سوات اور سفر کاغان کی روداد ہے۔ مردان سے سیدو شریف کی بس میں بیٹھتے ہی مصنف کو اندر سواتی فضا نظر آئی۔ مسافر گول طلے دار ٹوپیوں میں جفاکش پہاڑیئے تھے، بیشتر سلیٹی ملیشیا کی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھے۔ ان میں بہت تمبا کو کھانے والے اور تھوکنے والے تھے۔[381] باٹا خیل کا بازار بہت لمبا تھا۔ خیبر پختونخواہ اور پنجاب

کے ہوٹلوں کی فضا کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے کہ پنجابی ایسی مسافر نوازی کی روایات سے بیگانہ ہیں جبکہ خیبر پختونخواہ کے ہوٹلوں میں اپنائیت کی گھریلو فضا ہوتی ہے۔ وہاں ہوٹل میں کھانے سے پہلے اور بعد میں مسافروں کے ہاتھ چلمچی سے دھلائے گئے۔ وہاں کے عوام سوات کے بادشاہ صاحب کے بہت معترف تھے کیونکہ ان سے پہلے یہاں امن کے حالات اچھے نہیں تھے۔ سوات کے ہر چھوٹے بڑے گاؤں میں برج نما قلعہ موجود تھا یہ ایک طرح سے ان کا قومی نشان تھا۔ سیدو شریف کی سب سرکاری اور عوامی عمارتیں ایک ہی سڑک پر تھیں۔ وہاں کے مقامی لوگوں کو قدرتی نظاروں میں کوئی رعنائی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ مینگورہ جاتے ہوئے راستے میں نظر آنے والی خانہ بدوش عورتوں کے حلیے کی جھلک دکھاتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے:

"۔۔۔ پھر بیدکاری کے وہی قلعے اپنے مرغزاروں میں ایستادہ تھے۔ خانہ بدوش پہاڑی عورتیں سڑک پر سے گزرتیں۔ یونانی ناکوں اور تیکھے نقوش کی عورتیں۔ اور قدرے جھکی ہوئی سیاہ کپڑوں میں ملبوس اور وحشیانہ زیورات میں لدی پھندی۔ ان کے سروں پر گول ٹوکریاں ہوتیں، کنبے کی کل کائنات ان ٹوکریوں میں ہوتی۔ ہر قسم کے بھانڈے اور ہر رنگ کے چیتھڑے۔ ان کے مرد (کاہل بدمعاش) اپنے گدھوں اور خچروں پر سوار ہوتے۔ ان لوگوں کی زندگی سخت ہے مگر گوناگوں دلچسپی کی۔ وہ خدا کے گھر کی کھلی چھت کے نیچے رہتے ہیں اور ہمیشہ ایک جگہ راہ پیما رہتے ہیں۔"[382]

مرغزار جاتے ہوئے جس تانگے پر مصنف سوار ہوا اس کے کوچوان کا نام اتوار کو پیدا ہونے کے باعث اتوار گل تھا۔ وہ سیدو شریف میں پہلا تانگا چلانے والا تھا۔ مرغزار کے سنگ مرمر کے سفید محل کی دلکشی کو مصنف نے بہت سراہا ہے۔

دوسرا سفر کاغانی مہم کے عنوان سے ہے۔ ایبٹ آباد میں ایک ہوٹل میں مصنف نے بہت تلخ یادوں کے ساتھ رات گزاری کہ وہاں کا عملہ بالکل معاون نہیں تھا۔ تب سارے ایبٹ آباد میں بہت ڈھونڈنے سے صرف ایک جگہ سے ڈبل روٹی دستیاب ہو سکی۔ لوکل ٹرانسپورٹ پر سفر کرتے ہوئے ساتھی مسافروں کے رویوں اور مقامی لوگوں کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار بھی کیا۔ بسوں کا عملہ پنجابیوں کی نسبت شائستہ مزاج کا تھا۔ کاغان کے دروازے بالاکوٹ میں مقامی جیپ ڈرائیور نے کاغان کے پہاڑوں کی خطرناکی سے بہت ڈرایا۔ تب کاغان میں سڑک پر چند دکانوں کے علاوہ بس ایک غریبانہ ہوٹل نظر آیا۔ ناران میں ایک غار نما ہوٹل میں مصنف نے اپنی مہم کے ساتھیوں کے ساتھ رات بسر کی۔ وہاں مقامی معززین سیاحوں کو دیکھنے اور ان سے تبادلہ خیال کرنے آئے۔ ایسی دورافتادہ جگہوں پر ایک چائے خانہ یا ہوٹل شام کو مقامی لوگوں کے لیے چوپال کا کام دیتا ہے۔ وہاں چھوٹے لوگ سیدوں کے مکانات اور ان کی املاک سے بہت متاثر تھے۔ مصنف اور اس کے ساتھی چودہ سالہ گائیڈ کی رہنمائی میں جھیل سیف الملوک کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک بوڑھا آدمی اپنی عورت اور بچے کے ساتھ اترتا نظر آیا۔ اس کے خچر پر سامان لدا تھا۔ وہ

بیمار بچے کو ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے ناران جارہا تھا۔ پوری وادی میں ایک ڈاکٹر تھا جو ہفتے میں ایک دن کے لیے ناران آتا تھا۔[383] کاغان کے گوجروں نے مصنف کو اپنے ساتھ جانے اور بکرا حلال کر کے کھلانے کی دعوت دی۔ مصنف کو وہ صفائی سے نابلد لگے۔

سینہ ءسنگ پر ریشم کارستہ (۱۹۷۹ء)، مسعود سلطان کھیسر

مسعود سلطان نے شاہراہ قراقرم کا یہ سفر اس کی تکمیل کے فوراً بعد کیا۔ اس کے متعلق جغرافیائی معلومات اور اس کے تعمیری مراحل جزئیات کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ بشام کے بازار میں اکثر دکانوں پر غیر ملکی سامان تھا۔ دوبیر کی چوکی پر مصنف اور اس کے ساتھیوں کی گاڑی روکی گئی۔ تب چینیوں کے سوا کسی غیر ملکی کو شاہراہ قراقرم پر سفر کی اجازت نہیں تھی۔[384] پتن سے آگے چند مقامی افراد نے اپنے پیشوں کے بارے میں بتایا کہ زیادہ تر جانور پال کر اور تھوڑی بہت کھیتی باڑی کر کے گزر بسر کرتے ہیں۔ وہ لوگ اور ان کے باپ دادا کبھی بشام سے آگے نہیں گئے تھے۔ داسو کے علاقے کمیلا میں ایک جیل کے احاطے میں انھیں رات گزارنا پڑی۔ اسسٹنٹ سپرٹنڈنٹ جیل نے اس علاقے میں ہونے والے جرائم کی نوعیت کے بارے میں بتایا:

> ”وہی زر، زن اور زمین والے مسائل یہاں بھی درپیش ہیں۔ رشید صاحب بولے پہلے نمبر پر زر کو لیجیے۔ یہاں غربت بہت زیادہ ہے۔ اس لیے لوٹ مار کے واقعات اکثر رونما ہوتے رہتے ہیں۔ جب آمد و رفت بہت کم تھی تو بھرے بھرائے ٹرکوں کو لوٹ لیا جاتا تھا۔ دوسرے نمبر پر زن ہے۔ زن کے لیے قتل و غارت یہاں معمول کی بات ہے۔“[385]

سڑک بننے کے باعث وہاں زمین کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی۔ رجسٹریشن سسٹم نہیں تھا زمین بیچتے یا خریدتے وقت بس جرگے کو اطلاع کرنی پڑتی۔ اس لیے لکھت پڑھت نہ ہونے کے باعث زمین کے ایک ٹکڑے کے کئی دعویدار اٹھ کھڑے ہوتے۔ وہاں مقامی افراد کے پاس دوربین اور رائفل لازمی ہوتی تھی۔ پہاڑ کی کھوہ میں وہاں ایک خاندان رہائش پذیر تھا۔ سازین سے کچھ آگے گرمی کے باعث سڑک کا تارکول پگھل گیا تھا۔ گلگت میں پنکچر لگانے والے کا کہنا تھا کہ یہاں بجلی آنے کے بعد سے زیادہ گرمی پڑنا شروع ہوئی۔ وہاں ایک لوڈر کے بمپر کے نیچے ٹوٹی پھوٹی جوتی جھول رہی تھی جس کا مقصد نظر بد سے محفوظ رکھنا تھا۔[386]

ہنزہ میں عالیشان نامی ہوٹل میں لالٹین جلا کر روشنی فراہم کی جارہی تھی۔ ہنزہ کے گدلے پانی کا ذکر کیا ہے کہ رنگت میں سرمئی ہونے کے باوجود پانی کا ذائقہ عام پانی جیسا تھا اور وہ بے بو تھا۔ ہنزہ میں خوبانی سے بیماریوں کا علاج بھی کیا جاتا تھا۔ ایک مقامی صوفی صاحب کے خیال میں ہنزہ میں شفا بخش اور قوت بخش تین چیزیں ہیں: خوبانی، صحت افزا ہوا اور معدنیات ملا پانی۔ مقامی لوگوں کے مطابق ہنزہ میں تب تک صرف ایک لڑکی کی شادی راولپنڈی میں کی گئی ورنہ آپس میں ہی رشتے کرنے کا رواج تھا۔

سفر در سفر (1981ء)، اشفاق احمد

اشفاق احمد کا چند دوستوں کے ساتھ بظاہر یہ وادی کاغان اور جھیل سیف الملوک کا سفر نامہ ہے لیکن سفر سے زیادہ مصنف اور ان کے ساتھیوں کے طویل مکالموں اور مصنف کے تاثرات و مشاہدات اور واردات و کیفیات کا اظہار ہے۔ خارج سے زیادہ اندر کے سفر پر مبنی ہے۔ دریائے کنہار کے کنارے مقامی جیپ ڈرائیور جیپ چلاتے ہوئے اپنی مہارت پر فخر کر رہا تھا کہ اس سڑک پر جیپ چلانا صیب ہمارا ہی کام ہے کوئی دوسرا شکس ایک منٹ نہیں چلا سکتا ڈینجرس ہے۔ وہ صاحب کو صیب بولتا تھا۔ جرید کی طرف جاتے ہوئے گوجر خانہ بدوشوں کے قافلے جا بجا تھے۔ ایک جگہ مقامی عورت اور بچہ جا رہے تھے انھیں دیکھ کر ڈرائیور نے کہا اس علاقے کے لوگ بہت غریب ہیں۔ عورت کے سر پر جزدان میں قرآن پاک لپٹا تھا اور بچے کی گود میں مرغی تھی۔ ڈرائیور نے کہا اس بچے کی ساری دولت یہ مرغی ہے۔ اس سے پوچھنے پر کہ وہ بیچے گا اس نے انکار کر دیا کہ وہ اسے انڈوں پر بٹھائے گا۔ مرغی بیمار تھی ابھی وہ اسے دم کروا کر واپس لا رہا تھا۔[387]

جرید میں اخروٹ کی لکڑی کا کارخانہ تھا وہاں عمدہ قسم کا فرنیچر بنتا تھا۔ اس میں لکڑی کا کام جاری تھا۔ کچھ لٹھے سوکھ رہے تھے، کچھ کو آگ کے قریب سکھایا جا رہا تھا۔ کچھ کی تراش خراش ہو رہی تھی۔ کچھ پر کاری گر نقش و نگار کھود رہے تھے۔ آگے پھاگل کے علاقے میں ایک چھوٹا بچہ بکریوں کی رکھوالی کر رہا تھا۔ گوجر خانہ بدوشوں کے بارے میں مصنف کہتے ہیں:

> "گوجروں کے قافلے میدانوں سے واپس پہاڑوں کی طرف جا رہے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی زندگیوں میں کبھی گرمی نہیں دیکھی۔ یہ حدت اور دھوپ اور امس سے ناآشنا ہیں۔ پہاڑوں پر دور دور اپنی بھیڑ بکریاں چراتے ہیں۔ اس گلہ بانی کے سہارے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہلی برف باری ہوتی ہے تو یہ اپنے ریوڑ ہانک کر نیچے اترنے لگتے ہیں۔ سردی ان کے پیچھے دبے پاؤں سفید بلی کی طرح لپکتی آتی ہے اور گے آگے نچائیوں اور نیوانوں میں اترتے جاتے ہیں۔ نومبر دسمبر تک پاپیادہ چلتے یہ مانسہرہ، نوشہرہ، بالا کوٹ اور حویلیاں تک پہنچ جاتے ہیں۔۔۔ مارچ کا مہینہ آجاتا ہے۔۔۔ گوجر اپنا مال مویشی جمع کر کے اوپر چڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ پیچھے پیچھے گرمی آگے آگے گوجروں کے قافلے اور ریوڑ۔"[388]

ڈرائیور کا کہنا تھا ناران پہنچ کر مسجد میں جمعہ ضرور پڑھا جائے اس سے مقامی لوگ راضی ہوں گے اور سمجھیں گے وہ ان کے بھائی ہیں۔ کاغان کے گاؤں میں سیدوں اور جدونوں کی کوٹھیاں تھیں۔ باقی کچے پکے چھوٹے چھوٹے گھروندے تھے۔ اس علاقے کے مالک یہ جدون اور سید ہیں۔ کاغان میں داخلے کی سڑک کنارے سیدوں کا منشی بیٹھا تھا جو ایک روپیہ فی بھیڑ اور دو روپے فی گائے کے حساب سے گوجروں سے چرائی اجرت لے رہا تھا۔ گوجروں کو ریوڑ چرائی کا یہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔[389] کاغان سے پہلے ایک جگہ ٹراؤٹ مچھلیوں کی ہیچری تھی۔ ناران میں تار گھر خرب ہونے سے

ریسٹ ہاؤس میں مصنف اور ان کے ساتھیوں کو داخلے کی اجازت نہ ملی۔ چوکیدار نے بغیر تحریری ثبوت کے انھیں وہاں ٹھہرانے سے انکار کر دیا۔ تار گھر خراب ہونے سے تار پہنچ نہیں سکا تھا۔ ناران بازار میں آٹے دال، کھل، بنولے، گھری ساز، فلیٹ بوٹ، چپلی کباب، چائے، صابن، خشک میوہ جات، جیپ ٹائر، جیپ بیٹری وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ دیواروں پر مرزائیوں کے خلاف نعرے لکھے تھے۔[390]

جھیل سیف الملوک کے راستے میں مقامی لوگوں نے انھیں پیدل وہاں تک چڑھائی سے ڈرا کر باز رکھنے کی کوشش کی وہ پچھلے عرصے میں حادثات کی مثالیں دیتے رہے۔ مقامی لوگوں نے قبر پر لاگت کے حوالے سے پوچھنے پر بتایا کہ قصبے کے لوگ مفت کھود دیتے ہیں بس جگہ کے حصول میں دقت پیش آتی ہے۔ قبروں کے تعویذ لکڑی کے بنائے جاتے ہیں کیونکہ اخروٹ عام ہونے سے اس کی لکڑی سستی پڑتی ہے۔ اندر پتھر اور باہر لکڑی کا بکسا بناتے ہیں۔[391] مقامی لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ پریوں کا علاقہ ہے جب تک کوئی سلام کے جواب میں وعلیکم السلام نہ کہے اس سے بات نہیں کرنی چاہیے کیونکہ وہ آدمی نہیں ہوتا پری کا روپ ہوتا ہے۔[392] ایک جگہ سروں پر ساگ کی گٹھڑیاں اور ہاتھوں میں دودھ کے خالی برتن اٹھائے گوالے ملے۔ گلیشیر کاٹ کر راستہ بنا کر واپس آنے والے مزدور بھی گزرے جنھوں نے ہاتھوں میں کدالیں اور پھاوڑے اٹھائے ہوئے تھے۔ جھیل سیف الملوک کے راستے میں ایک کوہستانی کا کسی مقامی پھول کے بارے میں کہنا تھا اسے سونگھ کر پندرہ منٹ کے لیے سونگھنے والا ہوش و حواس میں نہیں رہتا۔ پورے پندرہ منٹ بعد ایک دم واپس اصلی حالت پر آجاتا ہے۔[393]

سفر نصیب (1981ء)، مختار مسعود

مختار مسعود کی تصنیف "سفر نصیب" کے پہلے حصے میں پہلا مضمون "برف کدہ" دراصل کے ٹو ہوائی سفاری سفر کے تاثرات و مشاہدات پر مبنی ہے۔ اسلامی ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس کے سلسلہ میں آئے ہوئے مہمان صحافیوں کو خصوصی طور پر کے ٹو سفاری کے ذریعے اس سفر پر لے جایا گیا۔ مصنف نے فضا سے نظر آنے والے ہر اگلے مقام کے بارے میں اپنے ماضی کے وہ سفر یاد کیے ہیں جب وہ مختلف اوقات میں ان علاقوں میں گئے اور رہے۔ اس لیے یہ مقام کی بجائے کیفیت کا سفر ہے جو یادداشتوں پر مبنی ہے۔

تربیلا پر سے گزرتے ہوئے مصنف نے تربیلا ڈیم کی تعمیر کے مراحل بیان کیے ہیں اور آنے والی تبدیلی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جھیل کے بھر جانے سے اس کا پانی دور دراز کے خشک علاقوں کو سیراب کرے گا۔ زرخیزی بڑھنے سے فرد اور معاشرہ دونوں بدل جائیں گے۔ خانہ بدوش مستقل ٹھکانے بنائیں گے۔ مویشیوں کی جگہ مشینیں لے لیں گی۔ ابھی جو کیچڑ نچوڑ کے پانی پیتے ہیں طرح طرح کے مشروبات پئیں گے، فتنے، عداوتیں، عدالتیں بڑھ جائیں گی۔[394]

سوات کے ماضی و حال حال کا تقابل کیا ہے کہ اولین سفر میں مصنف کو دو دن سفر میں لگے تھے اور دو جگہ رک کر داخلے کا اجازت نامہ دکھانا پڑا تھا تب سوات بہت خوب صورت اور گمنام تھا آج مشہور اور پامال ہے۔ پہلے سوات تک صرف ایک کچا اور تنگ راستہ جاتا تھا جسے شام کو ہی لنداخی پر پھاٹک لگا کر بند کر دیا جاتا تھا۔ بحرین سے آگے کچی شاہراہ بھی نہیں تھی صرف پگڈنڈیاں تھیں۔ سیدو اور مینگورا دو الگ الگ گاؤں تھے۔ دریائے سوات پر دو چار پل بھی چرچراتی لکڑیوں کے تھے۔ تب لکڑیاں اونٹوں پر لادتے تھے اس لیے جنگل گھنے تھے اور ان میں جانور بہت ہوتے تھے۔ سفر میں اکثر ایک گود میں اپنا بچہ اور دوسری میں بکری کا بچہ لے کر سفر کرنے والے چرواہے نظر آجاتے تھے۔ پن چکیوں کا مخصوص شور ہوتا تھا۔ اب سیدو اور مینگورہ مل کر شہر بن گئے ہیں۔ لکڑی کی جگہ کنکریٹ کے پلوں نے لے لی ہے۔ سڑکیں پختہ ہیں کارخانے وجود میں آ گئے ہیں۔[395] اب ان علاقوں میں تعمیرات کی بھرمار نے ہر غیر معمولی منظر کو عام منظر میں بدل دیا ہے۔ پہلے کالام میں ایک چٹان پر مچان کے ساتھ صرف ایک سبز کیبن ہوتا تھا جس میں بیٹھ کر کوہ فلک سیر کا دلفریب نظارہ دیکھا جاتا تھا۔ اب کسی نے اس سطح مرتفع کو قطعات میں تقسیم کر کے فروخت کیا تو بدوضع، بدرنگ، بے محل، بے موقع عمارتیں وجود میں آ گئیں۔ گبرال میں مصنف کا کئی بار جانا ہوا۔ دو سیاحوں کے لوٹے اور مارے جانے پر مقامی فرد کا کہنا تھا پہلے ریاست چھوٹی تھی ہر چھوٹی بات پر نظر رکھتی تھی اب حکومت بڑی ہے اسے چھوٹی ضرورتوں کے لیے فرصت نہیں۔ پہلے وہاں ایسے کوئی واقعات نہیں ہوتے تھے۔ جس چھاپے اور مجرموں کے فرار کی خبر مصنف نے اخبار میں پڑھی وہ شخص دل بہلانے گبرال آیا ہوا تھا۔ وہاں عمومی طور پر جیسے نام ہوتے ہیں اس کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے:

"یہاں ہر شخص خان ہے ہر دوسرا شخص گل ہے اور ہر تیسرا شخص گل خان ہے۔"[396]

مصنف کے خیال میں ریاست سوات کے ادغام کی وجہ زمرد کی کانوں کی شہرت بھی تھی۔ ناران وادی طویل اور تنگ ہے، سوات کشادہ تھی۔ ناران میں جنگل گھنے اور کھیت کم ہیں۔ یہاں بڑے اور بھدے پہاڑ ہیں۔ سڑک ناہموار ہے۔ مصنف نے کاغان بابوسر روڈ کی قدمی پیمائش بھی کی تھی۔ دریائے کنہار کے کنارے قیام کے دوران مصنف جھیل سیف الملوک اکثر جاتے رہے تھے۔ تب جھیل کے راستے میں ایک گلیشیر کو عبور کرنا پڑتا تھا جس پر تازہ شاخیں بچھا کر جیپ پار جاتی تھی۔ ایک مشکل موڑ پر پیدل چلنے والے چوپایوں کی طرح چڑھتے تھے۔ مصنف نے جھیل کو ہر زاویے سے دیکھا۔ ایک دفعہ وہاں محکمہ جنگلات کے کسی افسر کی دعوت میں دنیا جہان کی نعمتیں موجود تھیں حالانکہ اس کوہستانی علاقے میں آٹا اور نمک بھی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔[397]

گبرال، پھنڈر اور شرینگل کے سفروں میں مصنف کو یہ خلش رہی کہ ان کے آگے کیا ہے کیونکہ وہ تینوں اپنی اپنی جگہ کسی علاقے کا اختتام تھیں۔ پار کیا ہے جاننے کی خلش اس ہوائی سفر کے دوران نکلی جب دیکھا کہ پھنڈر کے

پہاڑوں کے دوسری طرف گبرال ہے اور اس کی پشت پر شرینگل ہے۔ پھنڈر میں ایک جگہ پہاڑ کو ہموار کر کے ہیلی پیڈ اور قیام گاہ بنایا گیا۔ ایک طرف جھیل ہے دوسری طرف دریائے غذر۔ گرمیوں میں ان پہاڑوں پر یاک پھرتے تھے۔ چترال میں مصنف کا ویسے جانا نہیں ہوا تھا جس طرح باقی وادیوں میں قدم پہنچے۔ مصنف نے دیر کو چترال کا دروازہ اور سوات کو صحن قرار دیا ہے۔ پہاڑوں میں لوگوں کے دو گھر بنائے جانے کا ذکر کرتے ہوئے ان کا کہنا ہے کہ سردیوں اور گرمیوں کی رہائش کے لیے دو الگ الگ گھر بنائے جاتے ہیں۔ ترچ میر کی چوٹی بادلوں میں گھرے ہونے کے باعث جہاز اس کے زیادہ قریب نہ گیا اور راستہ بدل لیا۔ لواری سرنگ کا چرچا بہت تھا مگر کام کی رفتار بہت سست۔

ایک دفعہ مصنف جیپ کے دشوار سفر سے ضلع غذر پہنچے اور اس کے صدر مقام گاکچ میں ٹھہرے۔ وہ راستہ بہت خطرناک تھا۔ جیپ سے زیادہ پیدل سفر کے لیے مخصوص تھا۔ کئی جگہ سڑک کے کنارے پتھر نصب کرنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ وادی گوپس میں مکان ساتھ ساتھ بنے تھے۔ ہر مکان کے ساتھ ایک باغ تھا۔ باغ کی دیوار کے شگاف سے پانی کا نالہ نکلتا تھا۔ مکان کے کھڑکیاں دروازے گلی میں کھلتے تھے۔ کمروں کی دیواریں مصالحہ سے چنے پتھروں سے بنی تھیں۔ سڑک بہت تنگ تھی اور جیپ کی چھت خوبانیوں کے درختوں کی شاخوں سے ٹکراتی تھی۔[398] گوپس کے دوسرے کنارے ایک مقام کا نام آب حیات تھا جہاں گوپس کے راجہ کا گھر تھا۔ وہ وضع دار اور مہمان نواز تھے۔ ان کے بارے میں مختار مسعود کا کہنا ہے:

> "طویل قامت چھریرا بدن، روشن اور مہربان آنکھیں، سرخ و سپید رنگ۔ راجہ صاحب نے چترالی ٹوپی پہن رکھی تھی اور اچکن کے سارے بٹن بند تھے۔ اچکن پرانی تھی۔۔۔ سبزہ زار میں بادام کے پیڑ کے نیچے صوفے لگے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی پلنگ بچھا ہوا تھا جس پر گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر راجا صاحب بیٹھ گئے۔ سامنے پتھر کا دومنزلہ سادہ سا بنگلہ تھا جس کے ایک کنارے چیری کے درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔"[399]

چیری کے درختوں کے نیچے پکا ہوا پھل گرا تھا۔ راجہ صاحب نے ان درختوں سے پھل توڑ کر کھانے کی عام اجازت دے رکھی ہے مگر آب حیات منزل سے پھل باہر نہیں لے جاسکتے۔ وہ زائد پھلوں کو بیچنے پر بھی آمادہ نہیں ہوتے۔ باغ میں آڑو، انار، سیب، شہتوت، ناشپاتی، امرود کے تختے الگ الگ بنے ہوئے تھے۔ تب گوپس میں کاغذات بہت مشکل سے پہنچتے تھے۔ کمیابی اور لاگت کے لحاظ سے وہ کاغذ ورق کی بجائے چاندی کا ورق بن جاتا۔ راجا صاحب اپنی سوانح لکھنے میں مصروف تھے۔ راجا صاحب نے 1947-48 کے جہاد کشمیر کا آنکھوں دیکھا حال بتاتے ہوئے کہا کہ ان کے ساتھیوں کے پاس جوتے تک نہیں تھے وہ پاؤں پر رسیوں سے کپڑے اور کھالیں لپیٹے لڑ رہے تھے۔ آب حیات نام کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ چند سال سے انھوں نے اس علاقے کو آباد کیا تب سے وہاں کوئی موت نہیں ہوئی تھی۔[400]

دریائے غذر کے کنارے حاکمانہ روایت کے مطابق ٹراؤٹ کے شکار کے دوران علاقے کے تین مانے ہوئے شکاریوں نے الگ الگ عام اور عارضی بنسیوں سے اتنی مچھلیاں شکار کر لیں جتنی مصنف کے سارے ساتھیوں نے مل کر

بھی نہیں پکڑی تھیں۔ مصنف نے ان تینوں کو عمر کے معمولی فرق کے ساتھ دوست سمجھا مگر وہ دادا بیٹا اور پوتا تھے۔ ستر برس سے زائد دادا جی نے اس دن گھر آنے جانے کے لیے دس میل اور مچھلیاں پکڑنے کے لیے دس میل مزید پیدل سفر کیا تھا۔ وہاں کھیتی باڑی کے لیے کھیت نہیں اس لیے وہ سردیوں میں لکڑیاں چیرتے اور گرمیوں میں جانور چرا کر گزر بسر کرتے تھے۔[401]

اس سفاری سفر سے پندرہ برس پہلے مصنف کی پہلی بار نلتر آمد ہوئی تھی تب پوری وادی میں صرف ایک پختہ کمرہ تھا۔ صرف دو سیاحوں کے ٹھہرنے کی گنجائش تھی۔ وادی کے آخر میں جھیل تھی لیکن اس کے لیے جنگل میں سے راستہ بنانا پڑا تھا۔ اس کے کنارے پیپرس کا درخت تھا جو ازمنہ قدیم سے مخطوطات کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ مصنف نے وادی نلتر میں رہنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ لیکن اتنے سال بعد پچھلے برس دوبارہ وہاں جا کر بہت مایوسی ہوئی۔ نومل جا کر پتہ چلا پرانی سڑک متروک ہو چکی ہے۔ جھیل کے گرد مالکانہ قطعات بنے ہوئے تھے۔ پہلے جہاں اکا دکا کھیت تھے اب جا بجا اونچی منڈیروں والے کھیت تھے جنھوں نے سارا منظر بدہیئت کر دیا تھا۔ جگہ جگہ مکانوں اور کھیتوں کی دیواریں تھیں۔ جھیل جوہڑ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس میں بہت درخت گرے ہوئے تھے جن کی لکڑی پانی میں ڈوب کر سیاہ ہو چکی تھی۔ جھیل کے ساتھ ٹیلے پر جانوروں کا باڑہ تھا۔ جھیل کے کنارے تعمیراتی ملبہ موجود تھا۔ کسی نے جھیل میں سیاحوں کے لیے مصنوعی جزیرہ بنانا چاہا تھا مگر سامنے پہاڑ سے برف کا تودہ گرنے سے ہر طرف تباہی پھیل گئی۔[402]

ہوائی سفاری کے سفر سے دس سال پہلے ہنزہ کے سفر میں مصنف کو بہت مشکل پیش آئی تھی۔ جیپ اس راستے پر بہت مشکل سے چلتی تھی۔ پہلے اس راستے پر گرمیوں میں گھوڑوں اور سردیوں میں یاکوں پر سفر کیا جاتا تھا۔ اب اسے ذرا چوڑا کر کے جیپ کا راستہ بنا لیا گیا تھا۔ بیشتر پل زنگ آلود زنجیروں، گھسی میخوں اور پھٹے تختوں کی مدد سے بنائے گئے تھے۔ ایک خطرناک موڑ سے مصنف کا واپس پلٹنے کو جی چاہا مگر جیپ موڑنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ ہنزہ کو دیکھ کر مصنف کو مایوسی ہوئی۔ مختصر سی بستی اور ہر طرف خاک اڑ رہی تھی اور گرمی تھی۔ پانی میں بھی مٹی اور ریت تھی۔ مسافروں کو بہلانے کے لیے مقامی طور پر اس گدلے پانی کی خوبیوں کے قصے گھڑے گئے۔ میر آف ہنزہ کو یہاں راکاپوشی کے بعد سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔[403] لاول ٹامس کی فلم کے لیے ہنزہ میں نقلی جشن بہار منعقد کیا گیا تھا۔ اس فلم سے ہنزہ کی شہرت بڑھی تو ریاست کو کچھ فائدہ ہوا کے استفسار پر میر آف ہنزہ نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا ریاست کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بدیسی سیاح جو یہاں آتے ہیں جاتے ہوئے خالی ڈبے اور بوتلیں ہنزہ کو دے جاتے ہیں اور جو سیاح ان کے مہمان خانے میں رہتے ہیں ان کے اخراجات اور نخرے انھیں برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ ہنزہ کے پہلے سفر میں وہاں ایک زیر تعمیر بجلی گھر بھی تھا جس کے انتظام کے لیے کوئی ڈپلومہ انجینئر بھی یہاں آ کر نہیں رکتا تھا

سب ملازمت سے استعفے کی دھمکیاں دیتے تھے۔ اب ایک نگران مل گیا تھا جو یہاں سے جانے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اس کے حلیے کا فرق مقامی لوگوں سے مصنف اس طرح واضح کرتے ہیں:

"یہ دھان پان سا کم عمر لڑکا اس ماحول میں سب سے مختلف نظر آیا۔ یہاں کے لوگ خوش رنگ، بھرے جسم، نکلتے قد، ڈھیلے کپڑوں اور چترالی ٹوپیوں والے رفتار میں آہستہ، گفتار میں خاموش، تعلیم میں کورے۔ یہ ڈپلومہ یافتہ، سانولا، اکہرا بدن، میانہ قد، پھرتیلا اور باتونی لڑکا تھا جس نے بش شرٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔"[404]

مصنف کا اہل خانہ کے ہمراہ ہنزہ کا اگلا سفر آسان تھا جو شاہراہ قراقرم پر ہوا۔ خنجراب میں تنومند پالتو یاک تھے۔ اب وہاں بہت تبدیلی آگئی تھی۔ لوگوں کا ہجوم تھا۔ کئی رابطہ سڑکیں وجود میں آئیں، نئی بستیاں بس گئی تھیں۔ کشادہ بارونق بازار تھے، ہسپتال، مدرسے اور دفاتر تھے۔ بجلی کا انتظام وسیع پیمانے پر تھا۔

سکردو میں مصنف کی پہلی آمد ڈکوٹا جہاز پر ہوئی تھی۔ تیس نشستوں سے آدھی نکال کر فرش پر سامان رکھا گیا تھا۔ مصنف نے سکردو کو دو دریاؤں سندھ اور شگر کا سنگم اور دو جھیلوں کچورا اور ست پڑا کا مسکن قرار دیا ہے۔ ہوائی اڈے سے شہر تک جاتے ہوئے صرف سفر کی دشواری کی باتیں ہوتی رہیں۔ ایک جگہ تھوڑے سے درختوں کا جھنڈ تھا جسے یہاں جنگل کہا جاتا تھا۔ گلگت اور سکردو میں ہر اس مقام پر جہاں شہریوں کی سوچ کا گزر بھی نہ ہو سکے ایک مقامی راجا کا محل مل جاتا ہے۔[405] مصنف کے خیال میں ان بکثرت محلات کو حویلیاں کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ کچورا میں ایک ہوائی جہاز سے سفر کی بجائے قیام کا کام لیا جاتا تھا۔ اب ہوائی سفاری کا جہاز سکردو سے آگے حیران کن عجائبات عالم کی طرف محو پرواز تھا۔ ہیسپر، بیافو، بتورا، بالتورو اور سیاچن گلیشیر آگے کنکورڈیا میں دنیا کے عظیم الشان پہاڑ۔ سب پہاڑ یکساں بھی تھے اور ہر پہاڑ یکتا بھی۔ اصل میں سب ایک مگر صورتیں جدا جدا تھیں۔

کرن تتلی اور بگولے (۱۹۸۷ء)، پروین عاطف

"کرن تتلی اور بگولے" پروین عاطف کے مختلف ممالک اور پاکستان کے کچھ علاقوں کے سفروں کی تفصیل پر مبنی ہے۔ پروین عاطف اپنے بیٹے اور بھتیجے کے ساتھ چترال اور کالاش گئیں۔ دریائے چترال کے دوسرے کنارے افغان مہاجرین کا جم غفیر آباد تھا۔ ڈی سی آفس میں پی اے چترال کے پولو کھلاڑیوں کی مہارت پہ فخر کر رہا تھا کہ انگریز انھیں ابھی تک لندن بلاتا ہے۔ وہاں مصنفہ کی پولو کے مقامی کھلاڑی اسلم جان سے ملاقات بھی ہوئی۔ اس نے بتایا کہ ایک لاکھ کا پولو کا گھوڑا اپنے بیٹوں کے لیے لیا ہے تو مصنفہ نے تعجب سے کہا ایک لاکھ میں تو جاپان کی ٹیوٹا کرولا کار آجاتی ہے تو اس کا کہنا تھا اپنے اپنے شوق کی بات ہے اس گھوڑے کا چھت سے اوپر قد دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔[406]

بمبوریت پہنچنے پر مصنفہ کو ہر طرف جابجا لڑکیوں اور خواتین کی ٹولیوں کو دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔ وہاں ایک ہوٹل کا نام بے نظیر تھا جہاں مصنفہ نے قیام کیا۔ عورتوں کی مخصوص پناہ گاہ بشالینی میں جانے کی کوشش پر مقامی خواتین

نے بہت شور وغل کیا کہ ان کے مذہبی عقیدے کے مطابق غیر مذہب کے مرد یا عورت کے اندر جانے پر دیوتا ناراض ہوتے ہیں۔[407] وہ ان کی مقدس عمارت تھی۔ وہاں راستے میں اخروٹ، ناشپاتی، سیب اور کچنار کے درخت تھے۔ مصنفہ نے کالاش کی قدیم معاشرت کی جھلکیاں بھی دکھائی ہیں کہ جب انگریز سیاح پہلی بار اس وادی میں پہنچے تو یہاں جائیداد اور پیسے کا تصور بھی نہیں تھا۔ کھیتی باڑی، زمیں مویشی سب سانجھا تھا۔ دریاؤں سے نکلی کوڑیاں سودے بازی، لین دین اور حساب کتاب کے ساتھ ساتھ خواتین کے لباس کی سجاوٹ اور ہار سنگھار کے لیے بھی استعمال ہوتی تھیں۔ وہاں ایک مقامی نوجوان سیف اللہ کی زبانی مصنفہ نے کالاش کو درپیش مسائل کی بہت عمدہ عکاسی کی ہے۔ دیگر پاکستانی علاقوں کے مولوی حضرات انکی کافر کہہ کر بہت تذلیل کرتے ہیں اور انھیں اخلاقیات کا درس دیتے ہیں۔

سوات کے سفر کے دوران مصنفہ نے دیگر ممالک کی خوبصورتیوں کے چرچوں کا اپنے وطن سے موازنہ کرتے ہوئے حکومتوں کی غفلت کا گلہ کیا ہے کہ دیگر ممالک اپنے سیاحتی مقامات کی نوک پلک سنوار کر رکھتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں کوئی انھیں پوچھتا نہیں۔ کالام کے ایک مقامی گھر کے بارے میں پروین عاطف بتاتی ہیں:

> ”وہ کافی کشادہ اور مقابلتاً صاف ستھرا سا گھر تھا۔ بڑا سا صحن برآمدہ اور دو کمرے۔ برآمدے میں رنگین پائیوں کا پلنگ و پیڑھے اور کھری لکڑی کی ایک کرسی رکھی تھی۔“[408]

وہاں گھر میں مقامی خواتین شہری عورتوں کو دیکھ کر شرما کر اندر بھاگ گئیں۔ مصنفہ نے خان صاحب سے اس کی بیوی کی خوبصورتی کی تعریف کی تو اس کا کہنا تھا خوبصورت کو کیا کرے گا جتنا کمایا تھا اس کے ساتھ شادی میں خرچ ہو گیا۔ ان علاقوں میں شادی کے لیے ساری کوشش مرد کو کرنی پڑتی ہے۔ سوات میں مقامی موسیقی صرف مردوں کے لیے مخصوص تھی۔ بند محلوں سے باہر مردانہ تفریح کے لیے خصوصی طور پر بنائے حجروں میں مقامی موسیقی کی سہولت موجود تھی۔ خواتین کے وہاں سے گزرنے پر پابندی تھی۔[409]

لیڈی فنگر (1997ء)، ڈاکٹر محمد عمران اسلم

ڈاکٹر محمد عمران اسلم کا ہنزہ اور التر گلیشیر کا یہ سفر 1997ء میں ہوا۔ ساہیوال سے راولپنڈی ٹرین کے سفر میں راستے میں آنے والے تاریخی شہروں اور قصبوں کے بارے میں مفید معلومات دی ہیں۔ قائد اعظم یونیورسٹی میں مصنف کے دوست نے انھیں استور جانے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا:

> "یار تم لوگ استور ضرور جاؤ مسافت طے کرنے پر جب انسان وہاں کے باسیوں کا رہن سہن دیکھتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے دور جدید کی تمام سہولیات سے یہ لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی مدد آپ کے تحت پن بجلی گھر بھی بنا رکھا ہے تقریباً ہر گھر پہ ڈش انٹینا نصب ہے۔"[410]

راولپنڈی سے گلگت کے تین راستوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف نے جغرافیائی معلومات فراہم کی ہیں کہ کاغان، بابوسر ٹاپ، چلاس اور گلگت کا راستہ 593 کلو میٹر اور قدیم ترین ہے۔ راولپنڈی سے گلگت براستہ سوات 753 کلو

میٹر طویل اور بذریعہ تھاکوٹ گلگت 656 کلو میٹر طویل عام استعمال ہونے والا راستہ ہے۔ شاہراہ ریشم کے نام کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے ڈاکٹر عمران تارخ کنگھالتے ہیں کہ 53 قبل مسیح میں پارتھین اور رومی فوجوں کی لڑائی میں پارتھیوں نے ریشم کے بڑے بڑے پرچم کھولے تیز دھوپ میں جن کی چمک سے رومی سپاہی اور گھوڑے بدک گئے انھیں شکست ہوئی۔ بعد میں رومیوں نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ پارتھیوں کے پاس وہ ریشم دور مشرق سے چین سے آئی تھی۔ اس طرح چین کو باہر کی دنیا سے ملانے والی شاہراہ نے شاہراہ ریشم کالقب پایا۔[411]

ٹیکسلا میں پہاڑوں کو کاٹ کر بجری بنانے کو ناپسندیدگی سے دیکھتے ہوئے مصنف نے اس کے متعلق قدیم تاریخی، مذہبی و ثقافتی معلومات دی ہیں۔ ایبٹ آباد کی کشادہ سڑکوں، پارکنگ کی سہولت اور عمارتوں کی خوبصورتی کو سراہنے کے بعد مصنف الیاسی مسجد کے چشمے کے بارے میں یہاں مشہور روایت کا ذکر کرتے ہیں کہ کسی بزرگ کی کھنڈی جھیل سیف الملوک میں گر پڑی۔ جس کی مسافت ایبٹ آباد سے آج بھی کم و بیش ایک دن کی ہے۔ کئی روز بعد جب وہی بزرگ واپسی پر الیاسی مسجد نماز کے لیے اس چشمے پر وضو کر رہے تھے تو اس چشمے نے وہی کھنڈی اگل دی تب سے مشہور ہے کہ یہ چشمہ جھیل سیف الملوک کے میٹھے پانیوں کی پیداوار ہے۔[412]

ٹھنڈیانی سے وادی گل، ڈکری اور میراں جانی کے راستوں کی وضاحت کی ہے۔ مانسہرہ سے آگے ایک مقامی خان صاحب سے مصنف کو پتہ چلا کہ وہاں آبائی زمین فروخت نہیں کی جاتی صرف نسل در نسل تقسیم ہوتی ہے۔ اگر کوئی باہر کا شخص کسی مقامی خاندان سے اچھا تعلق بنائے تو اسے گھر بنانے کے لیے جگہ دیتے ہیں اور وہ خان کہلاتا ہے جس کے پاس روزانہ ڈیڑھ سو تک آدمی اپنی حاجات کے لیے آتے ہوں اور مسائل کے حل کے ساتھ رہائش وطعام جیسی سہولیات سے بھی مستفید ہوتے ہوں۔[413]

تھاکوٹ میں مسجد میں آنے والے مقامی نمازی اپنے ساتھ اسلحہ ضرور لاتے کیونکہ وہ ان کا زیور ہے۔ وہاں کوئی شخص داڑھی کے بغیر نہ تھا۔ انڈس کوہستان کی وادیوں کے بارے میں جغرافیائی معلومات بھی اس سفر میں ملتی ہیں۔ یہاں گھنے خودرو جنگل ہیں کوہستانی رہزن بہت تیزی سے پہاڑوں پر چڑھتے ہیں اور پتھروں سے بچنے کے لیے پاؤں سے گھٹنوں تک پہاڑی بکرے کی کھال کو تہہ در تہہ لپیٹے ہوتے ہیں۔ گلگت کے راستے میں ذوکھڑ میں ایک سفری ہوٹل پر ایک مقامی لڑکے کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے بتایا:

> وہ اس سیزن میں پہلی بار اپنے والد کے ساتھ اس سفری ہوٹل کو چلانے آیا تھا جو کہ ان کے خاندان کی کفالت کا واحد ذریعہ تھا۔ موسم سرما کا پورا سیزن انھیں اپنے سامنے دکھائی دینے والی برف پوش چوٹیوں میں واقع اپنے گھر جو کہ تقریباً ایک دن کی پیدل مسافت پر واقع تھا میں گزارنا پڑتا تھا۔"[414]

اس ہوٹل میں صرف سالن اور چائے کے پیسے وصول کیے گئے چپاتی اور سلاد مفت تھا سالن بھی بہت سستے داموں میسر تھا۔ اس علاقے میں دریائے سندھ ذرا سا بھی سبزہ پیدا کرنے سے قاصر ہے جبکہ میدانی علاقوں میں یہی دریا

لاکھوں ایکڑ رقبے کی سیر ابی کا سبب بنتا ہے۔ دریائے سندھ کی طاقت اور اس کے پانیوں سے سونا نکالنے والوں کے بارے میں بھی مصنف بتاتے ہیں۔ اس میں ٹنوں وزنی ریتلا کیچڑ دوڑتا ہے جو معدنیات کا خزانہ ہے۔ مارو قوم کے باسی از منہ قدیم سے سندھ کے پانیوں سے سونا جدا کرنے کا فن جانتے ہیں۔[415] دنیا کی بلند ترین شاہراہ قراقرم نے اپنی تعمیر کے دوران ہر ڈیڑھ کلو میٹر کے ٹکڑے کے بعد ایک انسانی جان کی قربانی لی۔

رائے کوٹ پل پار کر کے شاہراہ قراقرم پر ایک منجی ہوٹل میں ایک حمام میں تازہ پانی کا انتظام اس طرح تھا کہ کسی چشمے کا بہتا پانی درخت کا تنا کھوکھلا کر کے حمام تک پہنچایا جاتا اور حمام بھرنے پر اس تنے کو اٹھا کر اونچے پتھر پر رکھ دیا جاتا تھا۔[416] یہاں انسانی زندگی حقیقت سے قریب تر ہے۔ یہاں سیب حجم میں بڑے تھے، آدھا کلو کے قریب ایک سیب اور میدانی علاقوں کے سیبوں سے زیادہ رس بھرے تھے۔ ہنزہ میں گھروں کے گرد باغات تھے۔ سرسبز درختوں کے جھرمٹ میں کاٹیج نما گھر دور سے اچھا منظر پیش کرتے تھے۔ کریم آباد کے باسیوں کا رہن سہن گلگت سے بالکل مختلف ہے۔ کریم آباد میں غیر ملکی سیاحوں کے مزاج کے مطابق قیام کی سہولتیں ترتیب دی گئی تھیں۔ ان علاقوں میں جابجا سہولیات کی فراہمی اور تعلیم کا معیار بہتر بنانے میں آغا خان کی خدمات قابل تعریف ہیں۔ چھتوں پر خشک کی جانے والی خوبانیاں شدید برفباری کے دنوں میں یہاں مقامی افراد کی غذائی ضروریات پوری کرتی ہیں۔

یہاں مقامی لوگوں کے وزن اٹھا کر با آسانی مشکل راستے طے کرنے کا ذکر مصنف کرتے ہیں:

"یہ ایک مقامی دہقان تھا جو اپنی پیٹھ پر رکھی ٹوکری میں خوبانیوں کا وزن اٹھائے آگے بڑھ رہا تھا اس ڈھلوانی راستہ پر وزن اٹھانے کا یہ طریقہ بڑا کارگر تھا جس سے آدمی اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے پہاڑی نشیب و فراز کو با آسانی طے کر لیتا ہے۔"[417]

لیڈی فنگر اور التر گلیشیر کے راستے میں مصنف کو ڈائنامیٹ سے اڑائی گئی چٹانیں نظر آئیں جہاں رنگ برنگے قیمتی پتھر بھی موجود تھے وہیں ایک چٹان تلے مارخور بھی نظر آیا۔ مصنف نے اسے پہاڑوں کا شہنشاہ قرار دیا ہے اور اس طرح کھلے قدرتی ماحول میں ناپید ہوتی نسل کے جانور کو دیکھنے کو معجزہ قرار دیا ہے۔ التر گلیشیر عبور کرنے کے بعد وہاں موجود اکلوتے ہوٹل میں انھیں پتھر کے برتنوں میں وہیں ایک ننھی سی جھیل کے کنارے اگا پالک نما ساگ جو ہی پالک پیش کیا گیا۔[418]

نانگا پربت کے حضور (2003ء)، اجمل سعید پراچہ

اجمل سعید پراچہ نے چلاس کو اپنا بیس کیمپ بنا کر نانگا پربت، بابوسر، داریل، تانگیر وادی، تھور اور استور کی طرف سفر کیا اور فطری مناظر سے لطف اندوز ہوئے۔ وہ وادی تانگیر میں سیتل، وادی داریل میں یشوٹ، تھور میں کھلی، تھک میں بابوسر، کھنر میں ہرپے، بٹوگاہ میں سمال، نانگا پربت کے دامن میں فیری میڈوز اور استور میں راما جھیل، کالا پانی، برزل اور چلم کو فطری حسن کی منہ بولتی تصاویر قرار دیتے ہیں۔ مانسہرہ سے دیامیر پہنچنے کے مصنف نے دوراستے

بتائے ہیں ایک وادی کاغان میں بابو سر سے ہوتا ہوا چلاس تک جاتا ہے اور دوسرا شنکیاری، بٹ گرام، بشام اور کوہستان کے علاقوں سے گزرتا چلاس سے ملتا ہے۔ پہلا راستہ دوسرے کی نسبت کم طویل ہے مگر دشوار ہے اس لیے کم استعمال ہوتا ہے۔ شاہراہ قراقرم والا راستہ سارا سال کھلا رہتا ہے دوسرا پہلے سال کے چھ ماہ برفباری کی وجہ سے بند رہتا تھا۔ بیس سال میں بننے والی شاہراہ قراقرم کی تعمیر میں چوبیس ہزار پاکستانیوں اور 9500 چینیوں نے حصہ لیا۔ اس کی تعمیر پر آنے والی لاگت کا بھی بتایا ہے۔ تھاکوٹ کے مقام پر پہنچنے پر سفر نامہ نگار دریائے سندھ کے بارے میں معلومات دیتا ہے اسے مقامی طور پر اباسین یعنی دریاؤں کا باپ کہا جاتا ہے۔ یہ دریا 3200 کلومیٹر طویل سفر طے کرتا ہے۔[419]

بشام سے آگے دبیر قصبے کی جہ شہرت اس کا لذت و تاثیر بھرا پانی ہے۔ داسو باقاعدہ سیاحتی مرکز نہ ہونے کی وجہ سے یہاں بہت کم لوگ ٹھہرتے ہیں۔ مقامی باشندوں کے علاوہ اکا دکا ہنزہ گلگت جاتے ہوئے رکنے والے لوگ تھے۔ وہاں سورج غروب ہوتے ہی اکثر دکانیں بند ہو جاتیں۔ چلاس کا شاہراہ قراقرم والا کنارہ ضلع کوہستان کی حدود میں جبکہ دریا پار کا علاقہ ضلع دیامیر کی حدود میں شامل تھا۔ اسی خطے میں بھاشا ڈیم کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا۔ دیامر کو مصنف شنا زبان کا لفظ قرار دیتے ہیں جس کا مطلب ہے پرستان جو ننگا پربت کا مقامی نام ہے۔ اس کی نسبت سے 1973ء میں اس علاقے کو یہ نام دیا گیا۔ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ ہر تحصیل اپنی جداگانہ تاریخی، سماجی و تہذیبی روایات کی حامل ہے۔ چلاس گزشتہ عہد میں اہم مذہبی، ثقافتی و تجارتی مرکز تھا۔ اسی لیے اس کے گردونواح میں صدیوں پرانے چٹانی کتبے ہیں۔ استور کو کشمیر خرد بھی کہا جاتا تھا۔ یہاں آباد قومیتوں کے بارے میں بھی معلومات دی ہیں زیادہ تر شین نسل کے لوگ آباد ہیں۔ مصنف نے ان کے عربی النسل ہونے کے نظریے کی حمایت کی ہے۔ دیگر آبادیوں میں یشکن، سید، گجر، ڈوم اور کمین ہیں۔ ڈوم اور کمین اس خطے کے قدیم باشندے سمجھے جاتے ہیں لیکن اب ان کی حیثیت کمتر درجے کی ہے۔[420] شنا زبان کے بارے میں پائی جانے والی غلطی کی نشاندہی کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں کہ شنا زبان کو عام طور صرف شنا قوم سے منسوب کیا جاتا ہے جبکہ یہ یہاں بسنے والے تمام لوگوں کی مشترکہ زبان ہے۔ کشمیر سے قربت کی بنا پر استور کی شنا پر کشمیری لہجے کا اثر نمایاں ہے۔ غذر، گوپس، یاسین اور اشکومن میں بولی جانے والی شنا پر چترال کی کھوار زبان کے اثرات ہیں جبکہ کوہستان میں یہ پشتو کے لہجے سے ملتی ہے۔ شنا آریائی زبان ہے مگر اپنی قدامت اور وسعت کے باوجود یہ مکمل تحریری زبان نہیں بن سکی کیونکہ اس کی مخصوص آوازوں کے لیے حروف تہجی کا تعین نہیں ہو سکا۔

دیامر کے علاقے الگ الگ سیاسی و سماجی روایات کے علمبردار ہوتے ہوئے بھی مجموعی تاریخی حیثیت سے دردستان سے وابستہ ہیں۔ مصنف نے شمالی علاقہ جات کی قدیم تاریخ اور نمایاں حکمرانوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ خواتین میں نمایاں حکمرانوں کے طور پر ملکہ نور بخت اور جواری خاتون اہم ہیں۔ چلاس سے چالیس کلومیٹر قبل کھنبری نالہ دیسی مچھلی کی فراوانی کے لیے مشہور ہے۔ تھور کے قرب و جوار میں خروشتی اور برہمی زبانوں کے چٹانی کتبے ہیں ہڈور نالے

کے گرد چٹانی کتبوں میں آٹھویں صدی کے برہمنی عقائد ورسومات کی تشہیر ملتی ہے۔ گیچی نالے کے قریب پرانی آبادی میں ایک غار میں یہاں سے برآمد ہونے والے قدیم برتن نمائش کے لیے رکھے گئے ہیں۔

"گیچی نالے سے چلاس تک تقریباً سات کلو میٹر کا علاقہ آثار قدیمہ سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں سے دریافت ہونے والے پیشتر چٹانی کتبوں کا تعلق قبل مسیح کے دور سے ہے۔ جن کے ذریعے اس دور کے رسم و رواج، مشاغل اور طرز معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے۔"[421]

اس علاقے سے بدھ مت کے آثار بھی بہت ملے ہیں۔ بٹو گاہ سے ملنے والے قدیم آثار کی مصنف نے تفصیل سے وضاحت کی ہے کہ وہ کیا ظاہر کرتے ہیں اور کس دور سے متعلق ہیں۔ معلومات کی اس سفر نامے میں بھرمار ہے۔ تھک گاؤں میں زیادہ آبادی سواتی قبیلے کی تھی۔ پیر غلام نصیر جو چلاسی بابا کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں کی علمی و ادبی خدمات اور ان کی کتابوں کا مصنف نے ذکر کیا ہے۔ بٹو گاہ کے قریب سرکاری عمارتوں، اس کی قدیم و جدید آبادیوں کا بتایا ہے۔ چلاس کے قدیم قلعے میں اب پولیس دفاتر تھے۔ اہل چلاس کی قدیم زمانے سے دلیری کی صفات کے حوالے سے شہرت کے متعلق مصنف کہتے ہیں:

"اہل چلاس عہد عتیق سے ہی اپنی بے باکی اور جنگجوانہ صلاحیتوں کی بدولت تمام شمالی علاقوں میں پہچانے جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یہ خطہ بہت کم بیرونی تسلط کا شکار رہا۔ یہاں کے حکمرانوں نے کئی بار استور، گلگت، دراس اور شگر تک پیش قدمی کی۔"[422]

استور پر چلاس سے بہت حملے ہوئے۔ استور کے حکمران راجہ علی جبار نے کشمیر سے مدد مانگی۔ اس طرح ڈوگرہ فوج کے استور پر حملے کی راہ ہموار ہوئی مگر اہل استور بھی سکھوں کے تسلط میں چلے گئے۔ قلعے کے ساتھ چلاس کا بازار روایتی چھوٹی چھوٹی دکانوں پر مشتمل تھا۔ چلاس ایئر پورٹ کا منصوبہ نصف مکمل کر کے ادھورا چھوڑنے کی نشاندہی کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں کہ اس میں رکاوٹ مقامی بستی خالی کرنے کا تنازع ہے۔ مصنف نے ان لوگوں پر افسوس کا اظہار کیا ہے جو اپنی ترقی کی راہ میں خود رکاوٹ ہیں۔ چلاس کے آثار میں تحریری نمونے سنسکرت کے قدیم رسم الخط خروشتی اور براہمی میں ہیں۔ کچھ علاقوں میں سوگداز زبان کے کتبے بھی ہیں۔ بابو سر نالے سے آگے کندہ کاری کے نمونے ختم ہو جاتے ہیں جس سے ماہرین آثار قدیمہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ قدیم راہ گزر نہیں تھی۔[423]

کھنبری نالے کے راستے میں محکمہ ماہی پروری نے مچھلی کی افزائش کے لیے تالاب تعمیر کیے تھے۔ کھنبری نالے میں زیادہ تر شکار جال کی مدد سے ہوتا ہے۔ فیری میڈو کا مقامی نام فنتوری ہے۔ تاتو سے فیری میڈوز تک خچروں کے ذریعے سیاحوں کی آمد و رفت مقامی لوگوں کی آمدن کا بڑا ذریعہ ہے۔ تاتو سے فنتوری تک فی کس تین سو روپے وصول کیے جاتے ہیں۔ نانگا پربت کے پہلو میں گلیشیر ماہرین ارضیات کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ فنتوری بیس پچیس گھرانوں پر مشتمل چھوٹا سا گاؤں عاجزی و انکساری کے پیکر لوگوں کا ہے۔ بیال کے راستے میں درختوں کی بے دریغ

کٹائی ہو رہی تھی جس پر مصنف نے تشویش کا اظہار کیا ہے کہ اگر یہ سلسلہ نہ رکا تو کوہسار سبز جنگلات سے محروم ہو جائیں گے۔ چلاس اور کاغان کو ملانے والا درہ بابو سر اس لیے بہت اہم ہے کہ دونوں جانب سے سیاح یہاں آتے ہیں۔

بابو سر کے راستے میں ڈسر نامی گاؤں کی وجہ شہرت میٹھے انگور اور شہتوت ہیں۔ وہاں بجلی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اعشاریہ چھ میگا واٹ کا پن بجلی گھر بھی ہے۔ یہاں قصبوں کی زرخیزی دیکھ کر مصنف ان میں محنت کرنے والے کسانوں کی ہمت کو داد دیتے ہیں جنھوں نے نامساعد حالات اور قدیم زرعی آلات کے باوجود وافر اناج، سبزیاں اور پھل پیدا کر کے عمدہ مثال قائم کی۔ تب چلاس سے بابو سر ذرائع آمدورفت کم ہونے کے باعث مقامی لوگوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ انھیں زیادہ سفر پیدل اور جانوروں پر کرنا پڑتا تھا۔[424]

بابو سر کا ایک قصبہ لوشے علاقے بھر کے جنگلات سے لکڑی کی کٹائی کے بعد ذخیرے کا مرکز ہے۔ یہاں سے لکڑی کو دیگر علاقوں میں بھیجا جاتا ہے۔ جنگلات سے لکڑی یہاں تک پہنچانے کے لیے روایتی طریقے استعمال ہوتے ہیں جنھیں مہان اور پترو کہتے ہیں۔ مہان میں کٹے ہوئے درخت کو ندی کے تیز پانیوں میں پھینکا جاتا ہے۔ اک شخص ان کی نگرانی کرتا ساتھ جاتا ہے رکاوٹوں کو بھی دور کرتا ہے اور جہاں درخت باہر نکالنا مقصود ہو خاص طریقے سے بند بنا کر باہر نکالتا ہے۔ دوسرے طریقہ تیرو میں درختوں کو خاص طریقے سے کاٹ کر جوڑ کر راستہ بناتے ہیں اور مسلسل اوپر سے نیچے لگاتے جاتے ہیں کہ درخت مطلوبہ جگہ پہنچ جاتا ہے۔ ابر دا میں پولو کے لیے بید کی جڑ کا گول حصہ گیند کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ پولو کے لیے گلگت میں بلہ، استور میں تھوپ، سکردو میں میتھو اور چلاس میں بولو لفظ استعمال ہوتا ہے۔ البتہ پولو کے میدان کے لیے مشترکہ نام شوارن ہر جگہ استعمال ہوتا ہے۔[425]

مصنف نے درہ بابو سر کی تاریخ بتانے کے ساتھ دیامیر میں موجود دیگر اہم دروں کی تفصیل بھی دی ہے۔ جیسے عالم پی لہ، بلک لو، چاچوک، برزل، قمری، کنجوت، شونتر۔ گئی داس میں موجود جھیل تک پہنچتے ہوئے مصنف کو بھورے رنگ کا مقامی جانور بہت نظر آیا جسے مقامی زبان میں تشونگ کہا جاتا ہے جو پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر چاروں طرف دیکھتا ہے اور خطرہ محسوس کر کے سیٹی نما آواز میں اپنے ساتھیوں کو مطلع کرتا ہے اور وہ سب محفوظ جگہ چلے جاتے ہیں۔ اش گاہ ندی کے حوالے سے ریچھوں کا ذکر کرتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے:

> "ایک مقامی شخص نے میرے استفسار پر مجھے بتایا کہ "اش" ریچھ کو کہتے ہیں اور کبھی گئی داس اور اس کی نواحی پہاڑیاں ریچھوں کا مسکن ہوا کرتی تھیں۔ جوں جوں اس خطے میں انسانی عملداری میں اضافہ ہوا یہ جانور رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہوتا گیا۔ یہ بھی کتنی افسوسناک بات ہے کہ ریچھ جو اس خطے کا اصل باسی تھا اور اش گاہ کے پانیوں سے مچھلی شکار کر کے اپنے پیٹ کی آگ بجھاتا تھا آج اپنے نام کی بازگشت چھوڑ کر کہیں اور جا بسا یا پھر انسانی ستم ظریفی کا نشانہ بن گیا۔"[426]

دیامیر کی وادی داریل قدیم زمانے سے تہذیبی، مذہبی اور تاریخی اعتبار سے ممتاز مقام کی حامل ہے۔ اسلام سے قبل بھی یہ خطہ بڑا مذہبی مرکز تھا۔ بدھ مت کے ماننے والے یہاں کثیر تعداد میں آباد تھے۔ یہاں پھوگچ کے مقام پر بہت بڑی درسگاہ ہوتی تھی۔ یہ علاقہ راجگان گلگت کے زیر اثر رہنے کے باوجود مقامی راجوں کی حکومت میں رہا۔ یہاں مختلف حکومتوں کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے مصنف راجہ پختون ولی کا تذکرہ خصوصیت سے کرتے ہیں کہ اس نے بہت منظم طریقے سے داریل پر کامیاب حکومت کی۔ شیتل میں پائے جانے والے آثار قدیمہ کے نمونے بہت نایاب شمار ہوتے ہیں۔ یہ وادی پورے خطے میں منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ شمالی علاقہ جات میں اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ جس نے یہاں آکر داریل و تانگیر نہیں دیکھا اس نے کچھ نہیں دیکھا۔

ساتھ ہی مصنف نے سیاحتی نکتہ نظر سے یہاں سہولیات کے فقدان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس لیے یہ علاقے سیاحوں کی رسائی سے دور ہیں۔ داریل کے صدر مقام گماری کے لوگوں کی مذہب سے عقیدت مسلم ہے۔ یہاں چادر اور چار دیواری کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ یہاں بازار میں خواتین عام نظر نہیں آتیں اگر کوئی دکھائی دیتی بھی تو باپردہ۔ اسلحہ بردار داریل کے نوجوان خاصی تعداد میں دکھائی دیے۔[427] یہاں اسلام کی اشاعت میں نمایاں کردار سوات کے دو بزرگان دین صدی بابا اور حضرت باباجی صاحب زدہ اور کابل کے حضرات اخون اور مکھلی کے سید مجذوب پیر کا ہے۔ داریل میں مخصوص طرز تعمیر کے قلعہ نما مکانات کی افسوسناک وجہ بتاتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے:

"۔۔۔ یہ بات اپنی جگہ افسوسناک ہے کہ یہاں کے لوگوں کی زندگیاں دشمنی کی آگ میں جھلس رہی ہیں۔ یہاں قلعہ نما گھروں کی تعمیر میں بھی یہی راز مضمر ہے۔ ان مکانات کی دیواریں مضبوط پتھروں سے چنی جاتی ہیں اور ساتھ ہی چالیس پچاس فٹ اونچا ایک مینار بھی تعمیر کیا جاتا ہے۔ اس مینار سے نہ صرف دشمن پر نظر رکھی جاسکتی ہے بلکہ بوقت ضرورت دشمن کے حملے کا مناسب جواب بھی دیا جاسکتا ہے۔ وادی داریل میں ہمیں کوئی مرد بغیر اسلحہ کے اور کوئی عورت بغیر پردہ کے نظر نہ آئی۔"[428]

یہاں کاغذ کی طرح پتلی اور بڑی روٹی کا رواج تھا۔ روادار اور مہمان نواز ہونے کے ساتھ ساتھ شمالی علاقوں کے لوگ روایات کے معاملے میں سخت ہوتے ہیں۔ داریل کے لوگ خواتین کی تصویر اتارنے پر برہم ہو جاتے ہیں۔ داریل اور تانگیر کے فرق کا اندازہ ان کے مکانات کے طرز تعمیر کے فرق سے ہوتا ہے کہ وہاں دشمنی کے باعث مکانات قلعہ نما ہوتے ہیں جبکہ تانگیر میں لکڑی کے چھوٹے دو منزلہ مکانات کا رواج ہے۔ یہاں لوگوں کے درمیان داریل کے مقابلے میں دشمنی کم ہے۔ جگلوٹ بازار میں لوگوں کے ہجوم کو کندھوں پر بندوقیں اٹھائے دیکھ کر کسی جھگڑے کا گمان ہوا مگر وہ ظہر کی نماز ادا کر کے نکلے تھے وہاں بندوق ہر وقت اپنے پاس رکھنا ان کی روایت ہے۔[429] داریل تانگیر میں اسلام باقی شمالی علاقہ جات کی نسبت دیر سے اٹھارویں صدی میں پھیلا۔ اس تاخیر کا سبب یہاں کے لوگوں کی فطری درشت خوئی اور سخت گیری کو قرار دیا جاتا ہے۔ اسلام سے پہلے یہاں کا قدیم مذہب پردہ گمنامی میں ہے۔ تانگیر میں دو

منزلہ مکانات میں اوپری منزل کے لیے سیڑھیاں باہر کی سمت سے بنائی جاتی ہیں تاکہ اسے بوقت ضرورت مہمان خانے کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ یہاں اکثر لوگ اپنے ملکیتی رقبوں میں الگ الگ رہتے ہیں۔ یہاں ٹوپی میں پھول سجانے کے حوالے سے روایت ہے کہ عاشق ہمیشہ اپنی جیب اور بے وقوف اپنی ٹوپی میں پھول سجاتا ہے۔[430] سیتل میں پتھروں سے چنی چار دیواری کے ایک مہمان خانے کے فرش پر دیدہ زیب قالین بچھے تھے۔ گاؤ تکیے تھے۔ دیواروں پر خودکار بندوقوں کے ساتھ ایک مارخور کی کھال آویزاں تھی۔

کمین زیادہ تر غلامانہ زندگی بسر کرتے ہیں جبکہ گجر بھی نسلی اعتبار سے کمتر سمجھے جاتے ہیں۔ گجر باہمی لڑائیوں میں لاٹھی اور کلہاڑی کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔[431] کھلی میں روایتی طعام کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے بتایا ہے کہ ایک بڑی سی قاب میں دودھ دیسی گھی اور روٹیاں لائی گئیں۔ دودھ کو پرات میں انڈیل کر روٹی کے ٹکڑے نرم کیے گئے پھر دیسی گھی اور نمک شامل کیا گیا۔ وہاں دوران سفر ایسے ہی کھانے کا رواج تھا تاکہ توانائی بھی برقرار رہے اور اس کی تیاری بھی مشکل نہ ہو۔ استور دفاعی نقطہ نظر سے بہت اہم ہے۔ اسے کشمیر خرد بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے پرانے ناموں اسورہ، حسور اور حسورہ بھی رہے۔ اس کے قدیم آبادکار یا وادی سندھ سے ہجرت کر کے آباد ہوئے یا ترکستان سے پامیر کے راستے پہنچے۔ استور کی دیدہ زیب وادیوں میں لاؤس، گوری کوٹ، رٹو، کودائی اور میر ملک ہیں۔ اس کی جھیلوں میں راما، گودائی اور سرکن اہم ہیں۔ استور سے گلگت جانے کے لیے قدیم اور جدید راستوں کا بھی مصنف نے تذکرہ کیا ہے۔ استور میں سیاحتی سہولیات ناپید تھیں۔ ہوٹل نہ دیکھ کر مصنف کو دکھ ہوا۔ لاؤس گاؤں کے لوگوں کو دستکاری سے خاص لگاؤ تھا۔

دھماکہ لیک سوات (2006ء)، آغا سلمان باقر

محمد حسین آزاد کے پڑپوتے آغا سلمان باقر نے سوات کا سفر 2006ء میں کیا۔ ان کا سفرنامہ پڑھ کر قاری سوات کی تہذیب و معاشرت کے نئے زاویے سے آگاہ ہوتا ہے۔ سوات سے تعلق رکھنے والے مصنف کے ایک مقامی ساتھی جمشید سوات میں ہینڈی کرافٹ کے حوالے سے مشہور نام ہے۔ ان کے والد طویل العمر ہیں۔ ایک سو دس سال کے صحتمند حاجی صاحب اب بھی فجر کے بعد اپنی دکان خود کھولتے ہیں۔ وہ بحرین میں نوے سال سے پنساری کی دکان چلا رہے ہیں۔ وادی بشمال میں سرسبز کھیتوں کی بہت تعریف کی ہے مصنف نے انھیں آرسی میں زمرد کی طرح جڑاؤ قرار دیا ہے۔ ان میں ٹماٹر یاقوتوں کی طرح دکھتے ہیں۔ عورتیں مردوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کر رہی تھیں۔ جابجا سواتی لکڑی کے گھر تھے۔ دریائے سوات میں کبھی پانی کم نہیں ہوتا بعض جگہ اپنی گہرائی میں یہ پانچ سوفٹ تک گہرا ہے۔ مصنف کا سفر بحرین سے بچھتر کلومیٹر کے فاصلے پر دو پہاڑوں کے درمیان حادثاتی طور پر ظہور میں آنے والی دھماکہ جھیل تک کا ہے۔ راستے میں کالام روڈ کی خستہ حالی کا مصنف نے شکوہ کیا ہے۔

مقامی لوگ پانی کو اس کے مقام سے نکلتا دیکھ کر پہچان جاتے ہیں انھیں ہر پانی کی تاثیر معلوم ہوتی ہے ورنہ ہر چشمے کا پانی صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ کالام ہائی وے پر 2004ء میں ہونے والی ریکارڈ برفباری کا ذکر کرنے کے بعد مصنف اس دوران یہاں پھنس جانے والے شادی شدہ جوڑوں کی مشکلات بیان کرتے ہیں۔ تب ہر طرح کی آمد و رفت بند ہونے سے پانڈی لوگوں نے اپنے ٹوکروں میں دلھنوں کو بٹھا کر فی ٹوکرا تین ہزار کرایہ لے کر انھیں پیدل اس مشکل راستے سے باہر نکالا تھا۔[432] سوات کی اصلی اور وادی کی قدیم زبان کوہستانی ہے۔ مصنف کے خیال میں سوات کے عام لوگوں کی محبت میں ریاکاری نہیں بلکہ سادگی آمیز محبت ہے۔ مصنف کے سفر سے بارہ تیرہ سال پہلے وادی کالام دیومالائی کیفیات کی حامل تھی۔ وہ اسے جھرنوں کی وادی کہتے تھے تب یہاں صرف ایک خالد ہوٹل تھا اور ہر چیز اپنی قدرتی حالت میں تھی۔ مگر اب ہوٹلوں کی کثرت کے باعث یہ کنکریٹ کے شہر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ موجودہ کالام کے بارے میں مصنف کا موقف یہ ہے:

> "پورے سوات میں کالام سے زیادہ تعداد میں ہوٹل کہیں اور موجود نہیں ہیں۔ اور سب کے سب جدیدیت میں اپنی اپنی جگہ بے مثال ہیں۔ ان کا انٹیریئر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ لکڑی چونکہ آج بھی یہاں کالام کے علاقے میں بہت سستی اور ارزاں ہے اسی لیے سب ہوٹلوں میں لکڑی کا کام، چوبی دروازے اور دیواروں کی وال ٹو وال پینٹنگ ایک سے بڑھ کر ایک دلکش ہے۔"[433]

سوات کے ہوٹلوں میں کاروبار کے لیے لوگ سیاحوں کو متاثر کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ دریائے سوات کا پانی جادو کے توڑ کے لیے مشہور ہے۔ سوات کالام میں جنگلات کے بے تحاشا کٹاؤ سے برف باری کم ہوتی ہے اور سیاحتی سیزن اب چار کی بجائے پانچ ماہ کا ہو گیا۔ گرمی بڑھ گئی ہے مگر ہوٹل مالکان خوش ہیں کہ سیزن لمبا ہو گیا ہے۔ مصنف نے تیزی سے کٹائی کے سوات پر مرتب ہونے والے بھیانک اثرات کا نقشہ کھینچا ہے۔ سوات میں سیاحت سب سے منافع بخش پیشہ ہے۔ سیاحوں کے ساتھ ناروا سلوک کے باعث کچھ سال پہلے سیاحوں نے یہاں آنا چھوڑ دیا تو لوگوں کا روزگار بہت متاثر ہوا۔ تب لوگوں نے سوات کی ثقافتی بحالی کے لیے مذہبی تحریکوں کا بائیکاٹ کیا تو سوات کی معاشی سرگرمیاں بحال ہوئیں۔ مصنف پورے سوات میں سب سے زیادہ صاف سڑکیں کالام میں قرار دیتے ہیں۔ بحرین اور کالام والوں کی آپس میں پرانی لگتی ہے۔[434] اس لیے مصنف کے بحرین کے دوست نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے بقول کالام کی صفائی کی وجہ ہوٹل مالکان کا زیادہ سے زیادہ سیاحوں کو اپنی طرف کھینچنا ہے۔ یہاں 350 نئے ہوٹل بنے ہیں جن میں مقامی سواتیوں کی ملکیت اوسطاً پانچ فیصد سے زیادہ نہیں۔ کالام کو جدید اسکوائر کی صورت ترتیب دیا گیا ہے۔ دریا کے کنارے قائم ہوٹل عام ہوٹلوں سے چار گنا زیادہ کرایہ مانگتے ہیں۔ مصنف نے ہوٹل ایجنٹوں کی چاپلوسی اور چالاکی کی بھی نشاندہی کی ہے۔ کالام کے قدیم روایتی چائے خانہ میں پوست کے ڈوڈوں والی چائے پلائی جاتی ہے۔ زیادہ

ہوٹلوں کی چھتیں سرخ روغن سے آراستہ تھیں۔ وہاں روٹیاں بڑے سائز کی تھیں۔ مصنف کالام بازار میں دکانداروں کی تجاوزات کی وجہ سے سڑک کی تنگی کا شکوہ کرتے ہیں۔ سوات کا مانکیال پہاڑ اب تک ناقابل تسخیر ہے کیونکہ نوکیلا ہے۔

دریائے سوات کے ایک طرف لکڑی کے قدیم گھروں سے بنا صدیوں پرانا قدیم گاؤں آباد ہے جبکہ دوسری طرف سڑک کے پار جدید کالام ہے۔ یہاں آنے والے سیاح دریا کے پانی کو آلودہ کرتے ہیں۔ سوات میں یہ رواج ہے کہ جو بھی گاڑی یا ٹرک اوشو کے جنگل سے آتا ہے اپنی پیشانی پر اس جنگل کی ٹہنیاں سجائے آتا ہے۔ وادی انتزوڑ کا ابشرون قبرستان پورے سوات میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس سے جڑی مقامی روایت کے مطابق یہ پاک قبرستان ہے اور سارے یہاں دفن ہونے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ یہاں قبروں پر منفرد آرائش کاری ملتی ہے۔ مقامی روایت کے مطابق حضرت سلیمانؑ اپنے جنات کے لشکر کے ساتھ اس جگہ سے گزرے تھے۔ مصنف نے دیوسائی کے مقامی لوگوں کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ وہاں کھلنے والے اتنے منفرد قسم کے پھولوں کی وجہ یہ ہے کہ دنیا بھر سے جنات اور پریوں نے ان پھولوں کو لا کر یہاں بکھیر دیا تاکہ ان کے بچے کھیلیں۔ مانکیال، چترال کے بالائی علاقوں، گلتری، شندور، یاسین اور نانگا پربت پر مقامی روایات کے مطابق جنات کی بستیاں ہیں۔[435]

دریائے انتزوڑ کے آگے سڑک بہت تنگ تھی۔ وہاں اگر کسی موڑ پر آمنے سامنے سے دو گاڑیاں آجائیں تو چڑھنے والی جیپ یا گاڑی کا پہلا حق سمجھا جاتا ہے۔ اترنے والے کو کہیں رک کر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ پہاڑی علاقوں میں ڈرائیونگ کی اخلاقیات ہے۔[436] مقامی ڈرائیور نے سڑک کی مرمت کے حوالے سے بتایا کہ یہاں غریب کسان خود کاشتکاری سے فارغ ہو کر بلا معاوضہ سڑک کی مرمت کرتے ہیں تاکہ ان کی فصلوں کی پیداوار خیریت سے سڑک سے گزر جائے۔ ان کے پورے سال کی محنت اسی پیداوار سے جڑی ہوتی ہے۔ یہاں کے ڈرائیور انتہائی کم جگہ پر خطرناک موڑوں پر بھی جیپ کسی نہ کسی طرح گزار لیتے ہیں۔

آغا حسن باقر کے اس سفر نامے میں بہت طویل مکالمے ملتے ہیں ایسی ہی ایک مکالمے بازی میں مصنف نے کچھ سال پہلے کا واقعہ سنایا کہ سوات میں ٹورسٹ کو گاہک کی بجائے مہمان کہنا ان کی زندہ روایت ہے۔ وہاں ہوٹل میں قیام کے دوران بالکونی کے سامنے روایتی گھر تھا۔ قدیم سواتی گھر کا نقشہ مصنف یوں کھینچتے ہیں:

> "اس گھر کا نقشہ کچھ ایسے تھا۔ فرنٹ پر ایک لمبا برآمدہ، پرانے سواتی طرز کا۔ وہی لکڑی کے ستون۔ ستونوں کے ماتھے پر لکڑی کی قدیم سواتی چوب کاری کی جھالر۔ پورے برآمدے میں لکڑی کی چھدری جافری نما ریلنگ۔۔۔ اس کے برآمدے میں کل چھ درے تھے یعنی ہر کمرے کے سامنے دو درے تھے، ان دروں میں لوہے کے چھکو لٹکے ہوتے تھے جن میں گھر والوں کے پیاز، لہسن، ٹماٹر یا انڈے رکھے صاف نظر آتے تھے۔"[437]

وہاں رہنے والی ایک لڑکی نے اپنی شادی کسی بوڑھے سے طے کیے جانے پر دریا میں کود کر اپنی جان دے دی۔ اس زمانے میں آٹھ بجے کے بعد کسی دکان سے کچھ ملنے کی امید نہیں ہوتی تھی۔ ڈوبتی لڑکی کو بچانے کے لیے کی جانی والی کوششوں کی منظر کشی مصنف اس طرح کرتے ہیں:

"کچھ لوگ لنگوٹیاں چڑھائے، رسے اپنی کمروں سے باندھے، ایک خاص طرح کے بانس لیے جن کے آگے لوہے کے ہک لگے ہوئے تھے باری باری غوطہ خوری کر رہے تھے اور پانی کی گہرائی میں جا کر پتھروں کے نیچے سے ان بانسوں کے ہکوں میں اس لڑکی کو پھنسانے کی کوشش کرتے۔"[438]

سوات میں رہنے والے سواتی کوہستانی ہیں جبکہ پٹھان خیبر پختونخواہ کے رہنے والے کہلاتے ہیں۔ ہر سواتی یہ تسلیم کرتا ہے کہ اس کے آباؤ اجداد کی تاریخ یونانی حملہ آوروں کی آمد اور قیام سے جڑی ہے۔ مصنف نے یہاں بدھ مت کے عروج کے بارے میں بھی معلومات دی ہیں۔ یونانی، منگولی اور آریائی لوگوں کے ملنے جلنے سے سوات یا گندھارا تہذیب نے جنم لیا جس کا مرکز پورا علاقہ کوہستان تھا۔ یہاں کے قدیم آباؤ اجداد کا اصل مذہب بدھ مت تھا۔ کسی کے گاؤں میں کھیتوں میں دور دور بنے ہوئے یک منزلہ چھوٹے گھر تھے۔ جن کے گرد لکڑی کی باڑ تھی۔ مختصر رہائشی حصے کو چھوڑ کر باقی میں کاشت کی جاتی تھی۔ مکان دور ہونے کی وجہ مصنف کے نزدیک یہ تھی کہ کسان اپنے قطعہ زمین کے مرکز میں گھر بنا کر اپنی فصل پر دور دور تک نظر رکھ سکتا تھا۔[439] یہاں کھیتوں میں زیادہ تر با پردہ خواتین کاموں میں مشغول تھیں۔ مرد چشموں سے آنے والے کھالے بنا رہے تھے یا لکڑیاں کاٹ رہے تھے یا چھتوں کی مرمت میں مگن تھے۔

دھماکہ لیک وادی باکھر میں ہے۔ یہاں سیاہ رنگ کے چار ہیبت ناک پہاڑ تھے جو جلے ہوئے لگتے تھے۔ نیا باکھر گاؤں صدیوں پرانے گاؤں کا عکس نو تھا۔ پہاڑوں کے دامن میں آباد اس گاؤں پر سیاہ جلے پتھروں کی برسات ہوئی اور جھیل وجود میں آئی۔ مصنف نے جھیل بننے سے پہلے پرانے گاؤں کا نقشہ اور راستے کی پوری تفصیل دینے کے ساتھ مقامی لوگوں کی زبانی جھیل وجود میں آنے کا پورا واقعہ بھی تفصیل سے بتایا ہے۔ ایک دھماکے کے نتیجے میں وجود میں آنے کے باعث اس کا نام دھماکہ جھیل رکھا گیا۔ جھیل کے پتھروں کے گرد سیاہ اور سرخ پتھروں کی قدرتی فصیل بن گئی تھی۔ اب یہاں سیاحوں کے لیے سہولیات تھیں۔ کشتی کی سیر کے لیے خود ساختہ بورڈ گھی کے ٹین کو کاٹ کر اس کی چادر سیدھی کر کے سیاہی سے لکھا گیا تھا "موٹا بوٹ میں جھیل کی سیر کرو، صارف 10 روپیہ میں ایک چکر" وہاں جھیل کنارے سالم بکرا خرید کر مصنف کے ساتھیوں نے روسٹ کیا اور مقامی افراد کے ساتھ اکا دکا سیاحوں کو بھی پیش کیا۔

واپسی کے راستے میں رات کے اندھیرے میں ایک سنسان جگہ مصنف کی ٹیم کی جیپ خراب ہوگئی۔ وہاں دریا پار بستی تھی مگر اندھیرے میں کوئی پل نظر نہیں آتا تھا۔ ڈرائیور کے مطابق پہاڑی اصول ہے کہ جہاں دریا کے پار بستی ہو قریب ہی دریا پر کوئی پل بھی ہوتا ہے۔ تلاش کرنے پر وہاں رسوں سے بنا ایک پل نظر آیا جس پر سے تمام لوگ بہت

ڈر ڈر کر گزرے۔ جبکہ مقامی لوگ اسے ڈھائی من کی کی گندم کی بوری کے ساتھ بھی پار کر لیتے ہیں۔ بچے وہاں سے روز گزر کر سکول جاتے ہیں اور تو اور بیمار افراد کو چارپائی پر ڈال کر دو آدمی دو اطراف سے گزر کر پل پار کر لیتے ہیں۔ ان کے ڈرنے پر پل کی بابت مقامی افراد نے بتایا۔[440]

جس گھر میں ان کے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا وہ سیڑھی دار کھیتوں کو عبور کر کے چشمے کے کنارے تھا۔ محمد زادہ صاحب نے کہا سب لوگ پہلے ان کے گھر جائیں کہ مہمان خدا کی رحمت ہوتے ہیں۔ گھر میں پھلدار درخت تھے، صحن میں ایک حوض تھا جس میں چشمے کا پانی تھا۔ بانیہ کا درخت سواتی لوگوں میں خوش بختی کی علامت تصور ہوتا ہے وہ بھی وہاں تھا۔ گھر کا دروازہ دادا کے زمانے سے لگا پڑپوتے کے زمانے تک خیریت سے چلا آرہا تھا۔ ستونوں والے برآمدے سے گزر کر سب لوگ روایتی سواتی طریقے سے سجے کمرے میں پہنچے۔ کمرہ گیس سلنڈر لیمپ سے روشن تھا، دیوار پر کچھ قدیم تصاویر تھیں، شیلفوں پر برتن سجے تھے۔ قرآن پاک کی رحل اور اس کے غلاف پر کڑھائی کی گئی تھی۔ مٹی کی قدیم سواتی سیاہ مٹی کی ہنڈیا، پراتیں، گلاس چمچ وغیرہ تھے۔ لکڑی کے صندوق پر کنگھیاں اور پتھر کے کھلونے رکھے گئے تھے۔ تانبے کے قدیم برتن صراحی وغیرہ بھی موجود تھی۔ تمام چیزیں صاف اور مٹی کی تہہ سے پاک تھیں۔ شیلفوں پر کڑھائی شدہ غلاف تھے۔ کمرے کے دونوں پلنگوں پر سلیقے سے فرش تک لٹکتی چادریں تھیں۔ پلنگ اتنے بڑے تھے کہ تین تین تکیے رکھ کر بھی ان کی کشادگی پر فرق نہ پڑتا۔ وہ کمرہ گھر کے بزرگ محمد زادہ صاحب کا ذاتی کمرہ تھا۔ وہاں کمرے میں داخلے سے پہلے جوتے اتارنے کی روایت تھی۔[441]

اسی سالہ محمد زادہ صاحب کی تین بیویاں اپنی آل اولاد کے ساتھ اس گھر میں بخوبی اکٹھی رہتی تھیں۔ باون سال سے محمد زادہ صاحب ہر ماہ مسلسل محفل میلاد منعقد کراتے ہیں۔ پہلے ان کی تواضع قہوے سے کی گئی۔ وہاں ہر گھر میں تین تین چار چار خاندان اکٹھے آباد تھے۔ مختصر بستی تھی اور ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا رواج تھا۔ اسی سال کے ہو کر بھی وہ مشکل راستہ عبور کر کے پہاڑ پر جا کر فصلیں کاشت کرتے تھے۔ وہاں اس بستی میں ہفتے میں ایک بار ڈاکیا آتا۔ یہ لوگ اس مختصر گاؤں کے پہلے مہمان تھے۔ سوات کے گاؤں کا تہذیبی اصول ہے کہ مہمان پہلے جس گھر میں پہنچتا ہے اسی کو میزبانی کا خاص موقع ملتا ہے۔ وہاں باقی گھروں میں بھی جو جو پکا تھا سب نے لا کر مشترکہ طور پر تواضع کی۔ مہمانوں کا بھوکا سونا توہین آمیز سمجھا جاتا۔ وہاں پانی پینے کے لیے گلاس کی بجائے چینی کے بڑے کشادہ پیالے تھے، سالن ڈالنے کے لیے تانبے کی قلعی شدہ پلیٹیں تھیں۔ میزبان مہمانوں کو دستر خوان پر چھوڑ کر خود نکل گئے۔ وہاں مہمان کو کھانے پر اکیلا چھوڑنے کا رواج ہے تاکہ وہ بغیر ہچکچاہٹ کے کھا لے۔ وہاں روٹیاں بڑی بڑی تھیں۔ آخر میں زود ہضم قہوہ دیا گیا۔ یہاں بزرگوں کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔[442]

وہاں سکول دریا پار کی بستی میں تھے۔ چھوٹے بچوں کو نوجوان کندھوں پر سوار کرا کے پل پار کراتے۔ یہاں کے کل انیس بچے سکول جاتے ہیں۔ محمد زادہ صاحب کی لاڈلی بیٹی سکول کے لیے پل پار کرتے ڈوب کر جاں بحق ہو گئی تھی اس کا اور اس کے دادا کا انتقال ایک ہی دن ہوا۔ گاڑی کی خرابی اگلے دن ٹھیک ہو سکتی تھی اس لیے رات سب کو وہیں گزارنی پڑی۔ اس گاؤں میں چشمے کا پانی سارے گھروں میں تالاب کی صورت گزرتا تھا اور لوگ اس کی صفائی کا بہت خیال رکھتے۔ خالص سواتی ناشتے میں پراٹھے اور کھیرے کا سالن تھا اور خالص دودھ سے بنی چائے۔ اس علاقے کا نام بانڈے کو تھا۔ مقامی لوگ ساتھ ساتھ اس آبجو کی صفائی کا خیال رضاکارانہ طور پر کرتے تھے اور پانی کو مقدس سمجھتے تھے۔ یہ ہر گھر کے صحن سے ہو کر گزرتی اور ہر کام کے لیے یہی پانی استعمال کیا جاتا۔ صرف کھانے پینے کے لیے گاؤں کے آخری سرے پر موجود قدرتی چشمے کا پانی استعمال کیا جاتا جس میں سردیوں میں بھی گرم پانی آتا ہے۔[243] کھیتوں کی طرف جاتے مصنف نے وہ چشمہ دیکھا جہاں ایلومینیم کے گھڑوں میں لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں۔ وہاں بہت بلندی پر پہاڑ پر وادی کے لوگوں کے کھیت تھے۔ وہاں مہمانوں کو واپسی کے لیے دریا تک چھوڑ کر آنے کی روایت ہے۔

سفر نامہ اسکردو (۲۰۰۶ء)، مزملہ شفیق

مزملہ شفیق کراچی کے ایک کالج میں لیکچرار ہیں۔ یہ سفر انھوں نے کالج کی ساتھی خواتین کے ساتھ کیا۔ پہلے اس کا عنوان "پانچ نڈر" رکھا گیا تھا۔ عام علاقوں میں اکیلی خواتین کے سفر کو معیوب سمجھا جاتا ہے مگر سکردو میں انھیں بالکل اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔

> "۔۔۔مگر شکر ہے کہ بلتستان میں لوگ بس ایک بار پوچھ کر چپ ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ پانچ مستورات ان کی ذمہ داری بن جاتی ہیں۔ یہ شریف قوم پانچ اکیلی لڑکیوں پر قطعی شیر نہیں ہوتی۔ اس بات کا ہمیں پہلے سے ہی پتہ تھا اس لیے ہم نے کسی مرد کو لے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"[444]

مزملہ نے دریائے سندھ اور شاہراہ قراقرم کے بارے میں جغرافیائی معلومات دی ہیں۔ اس علاقے میں اساتذہ کے پیشے کو بہت عزت دی جاتی ہے۔ مصنفہ اور ساتھیوں کا کالج میں پڑھانے والا تعارف بہت مواقع پر ان کے لیے مفید ثابت ہوا۔ یہاں زیادہ تر زوہ کا گوشت ملتا ہے پنجاب سے آنے والا گوشت اور دودھ محدود ہوتا ہے اس لیے لوگ سبزی کو گوشت پر ترجیح دیتے ہیں۔ حسین آباد کا قدیم نام کھفچوں بدھ دور کی یادگار ہے۔ اسے ۱۹۷۱ء میں بدلا گیا۔ سکول جانے والی مقامی بچیاں تھوڑی بہت اردو میں گفتگو کر لیتی تھیں۔ ایک خاتون میٹھے چاولوں کی دیگچی کو پوٹلی میں باندھے لے جا رہی تھی۔ اشارے سے حال پوچھنے پر انھوں نے فوراً دیگچی کھول کر مہمان نوازی کرنا چاہی۔[445] مزملہ نے بلتیوں کو دھیما پایا، یہاں کسی کو اونچا اور تیز بولتے نہیں سنا۔ کھرفوچے قلعے اور ہلال باغ کی تاریخ بھی سفر نامے میں شامل ہے۔ ہلال باغ کے لوک گیت کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ یہاں دریا کے دلدلی کناروں کو مقامی زبان میں چھمک کہتے ہیں جس کے لفظی معنی چشمہ کے ہیں۔ ایک جگہ درختوں کے تنوں پر مختلف رنگوں کے ریشمی کپڑے بندھے تھے جن کا مقصد بکریوں

کے تنوں پر چڑھ کر شاخیں کھانے سے بچاؤ تھا۔ شمالی علاقوں میں بوقت ضرورت لوگ کچھ بھی بن جاتے ہیں جیسے ہوٹل مینیجر، باورچی، پورٹر، ڈرائیور، گائیڈ یا موٹر بوٹ چلانے والا۔ مزملہ نے مختلف مقامات اور اشیا کے مقامی نام اور مطالب بھی بتائے ہیں۔ ژھوق ویلی کی وسعت، سکون اور خوبصورتی کی بہت تعریف کی ہے اسے لکھا "ژھوق" اور پڑھا "سوق" جاتا ہے۔ لوئر اور اپر کچورا کی چمک دمک نے اس کے حسن کو ماند کر دیا ہے اس لیے کم لوگ ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ سکر دو کے چیف انجینئر کاظم صاحب کے گھر چائے کے ساتھ ایک خاص قسم کی روٹی کیسر پیش کی گئی جو بلندی کے لیے مفید ہے اسے کھانے سے متلی اور چکر نہیں آتے۔ اسے بیسن، آٹے اور جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے۔[446] پاکستانی شمال کی نسبت بلتیوں کے اندر خود کو بدلنے اور اپنا معیار زندگی بہتر کرنے کی خواہش کم ہے۔ سکر دو کے بازاروں میں گلگت کی نسبت کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔ مزملہ نے کراچی اور سکر دو کے موسم اور سبزیوں کا موازنہ کیا ہے۔ دیوسائی اہل سکر دو کا طرہ امتیاز ہے وہ اس کے بارے میں بہت اشتیاق سے سیاحوں سے پوچھتے ہیں کہ کیسا لگا۔ خپلو میں ایک جگہ سکول میں بچے درختوں کے نیچے بیٹھ کر پڑھ رہے تھے۔ خپلو کے راجا کے قدیم محل میں ملازموں کی کوٹھریاں بہت اندھیری اور قدیم تھیں۔ مزملہ کے مطابق اہل سکر دو نمک مرچ بہت کم کھاتے ہیں اور اہل ہنزہ خوش پوشاک اور تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔

نانگا پربت کے سو چہرے (2018ء)، مزملہ شفیق

اس سفر نامے کا پہلا حصہ مزملہ شفیق کے مختلف سفروں کے دوران مختلف مقامات سے نانگا پربت کی جھلک دیکھنے کے حوالے سے ہے جبکہ دوسرا حصہ گلیات کے سفر پر مبنی ہے۔ شاہراہ قراقرم کے پہلے سفر کے دوران مصنفہ نانگا پربت کی پہلی جھلک دیکھ کر مبہوت رہ گئیں۔ صدپارہ میں سکر دو کی خاص پہچان مارخور اور ہمالیائی ریچھوں کے اسٹیچوز ہر چوک میں نصب ہیں۔[447] مزملہ نے چھ مختلف مقامات سے نظر آنے والی نانگا پربت کی جھلک کا تذکرہ اس سفر نامے میں کیا ہے۔ دو دفعہ شاہراہ قراقرم، ایک بار نتھیا گلی، ایک دفعہ راما لیک، پھر دیوسائی شیوسر جھیل کے مقام پر اور فیری میڈوز سے۔ مزملہ کے گلگت سفر کے دوران گلگت شہر شیعہ سنی فسادات کے باعث بند تھا۔ ایک مقامی ٹیکسی ڈرائیور نے راستے بند ہونے کے باوجود انھیں مطلوبہ ہوٹل تک پہنچایا۔ گلگت سے آگے خشک خوبانی کو مقامی زبان میں پھپھورے کہتے ہیں۔ فیری میڈوز تک مزملہ نے اکڑ دیونامی گھوڑے پر سفر کیا جس کا مطلب تھا تیز۔ مزملہ کا کہنا ہے کہ فیری میڈوز سے نانگا پربت کا منظر نیچے موجود درختوں کے باعث مکمل نظر نہیں آتا جبکہ بیال سے بغیر کسی رکاوٹ کے واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ مزملہ کی ایک ساتھی کو گھوڑے سے گرنے کے باعث چوٹ لگی مگر پورے فیری میڈو اور تاتو میں کوئی ڈاکٹر اور کلینک نہیں تھا۔ کسی حادثے کی صورت میں گلگت ہی جانا پڑتا تھا۔[448]

قراقرم کے برف زاروں سے (2010ء)، جواد شیرازی

پاک ائیر فورس کے پائلٹ جواد شیرازی کا یہ سفرنامہ بیافو گلیشیر، سنولیک، لک پے لاء، برالڈو گلیشیر اور شمشال کے سفر پر مشتمل ہے جو انھوں نے تین ساتھیوں کے ساتھ کیا۔ شاہراہ قراقرم کی خستہ حالی کے متعلق ان کا خیال ہے کہ اس میں ریشمی کچھ نہیں اس کے درمیان پڑے گڑھے، شکستہ حالت، پتھروں، بجری اور سیمنٹ کے اس مجموعے کو سڑک کہتے شرم آتی ہے۔[449] سکردو میں پھولوں اور درختوں کے جھرمٹ میں گھرے ایوی ایشن کے سکواڈرن میں قیام کیا۔ ان کی ٹیم میں شامل ڈاکٹر احسن اور شیخ ذیشان شمالی علاقہ جات کا چپہ چپہ گھوم چکے تھے۔

گورا بازار سے کچن ٹینٹ عاریتاً لیا گیا۔ غیر ملکی سیاح نہ ہونے سے سکردو میں رونق نہیں تھی۔ اخلاق اور میٹھی زبان بلتیوں کا خاصہ ہے۔ وہاں ایک دکاندار نے شجاعت کا پوچھنے پر سختی سے انکار کیا کہ وہ کسی شجاعت کو نہیں جانتا بعد میں اسی شجاعت سے گرمجوشی سے ملنے پر اس سے استفسار کیا گیا تو اس کا کہنا تھا یہ تو شجاعت بیگ ہے شجاعت نہیں۔ حسن صدپارہ کے ٹو سر کرنے والے چھٹے پاکستانی ہیں۔ لیکن باقی پانچ پاکستانی رجب علی شاہ، شاہین بیگ، نذیر صابر، اشرف امان، مہربان شاہ اور قدرت علی کے کارنامے کا اعتراف پھر بھی کسی حد تک کیا گیا مگر حسن صدپارہ اس سے بھی محروم رہے۔ پہلے سکردو بازار میں ان کی دکان تھی اب وہ کسی تعمیراتی ٹھیکیدار کے ساتھ تھا اسی لیے کشمیر گیا تھا۔ اپنے ہیروز کی ناقدری پر مصنف نے دکھ کا اظہار کیا ہے۔ گوئٹے مالا کی ایک ٹیم گشابرم 1 اور ایک نیپالی ٹیم براڈ پیک سر کرنے آئی ہوئی تھی۔

مصنف نے عظیم ہوابازوں کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے ناممکن لگتے ریسکیو آپریشن انجام دے کر بہت کوہ پیماؤں کی زندگیاں بچائیں۔ سکردو میں مصنف کی ملاقات ٹیم میں شامل گائیڈ عبدل اور پورٹر ذیشان سے ہوئی جن کے لب و لہجے اور وضع قطع سے ان پر گورے ہونے کا گمان ہوتا تھا۔[450] شگر میں ہواؤں میں بہت شدت تھی۔ تین سال بعد شگر آنے پر یہ مصنف کو بہت بدلا لگا۔ اس تبدیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

> "میں پورے تین سالوں بعد ادھر لوٹا تھا لوگوں میں اور ماحول میں ایک واضح تبدیلی تھی۔ اکثر نے کان کے ساتھ موبائل فون لگائے ہوئے تھے اور سڑک کے ساتھ دکانوں کی تعداد میں اضافہ تھا۔ قدرتی رنگ آہستہ آہستہ مادیت کے رنگ میں مل رہا تھا۔ عورتیں بھی اب کوئی شرمیلی نہیں تھیں اور ماضی کی طرح کسی جیپ کو دیکھ کر اپنا منہ چھپانے کی بجائے بے باکی سے تکتی تھیں۔"[451]

شگر سے آگے تیسر، گلاب پور، ارندو نامی گاؤں تھے۔ اس سے آگے سونے جیسی چمک والی سپنٹک چوٹی سات ہزار میٹر سے بلند ہے جسے گولڈن پیک بھی کہا جاتا ہے۔ شگر وادی کا آخری گاؤں حیدر آباد تھا۔ داسو میں فوجی چیک پوسٹ پر تمام افراد کے اندراج اور اجنبیوں سے تفتیش کے علاوہ فوج کی طرف سے جاری کردہ اجازت نامہ بھی طلب کیا جاتا تھا۔ مقامی ڈرائیور کا کہنا تھا کہ وہ نیند کے بغیر بھی دو دو تین تین دن تک موٹر چلاتا ہے۔ اپالی گون سے آگے نالہ

بچھڑنے سے رات کے وقت راستہ بند تھا۔ ایک گاؤں کا نام چھاپو تھا جس کا بلتی میں مطلب تھا ٹوٹا ہوا۔ ہر گاؤں میں پرائیویٹ سکولوں کے بورڈ لگے تھے۔ اسکولے کو تین اطراف سے سرسبز کھیتوں نے گھیر رکھا ہے۔ کچے پکے گھر تھے۔ وہاں ایک لسانی بنیادوں پر قائم سیاسی جماعت کے امیدوار کا اشتہار دیکھ کر مصنف کو دکھ ہوا۔ مقامی لوگوں کے مطابق اس جماعت کی آمد سے پہلے انتخابات پر امن ہوتے تھے اب دھونس دھاندلی کا کلچر شروع ہو چکا تھا۔[452]

اسکولے گاؤں میں بچوں کے چہروں پر سرخی تھی، بال چمکدار تھے مگر تن پر پورے کپڑے اور پاؤں میں جوتے کم ہی تھے۔ نو تعمیر شدہ اسکولے میوزیم ایک گھر میں بنایا گیا تھا۔ جہاں اسکولے کی قدیم تاریخ اور قدیم تصاویر محفوظ کی گئیں تھی۔ خواتین کے لباس کشیدہ کاری والے کالے گھیر دار تھے۔ مٹی کے کچھ بڑے برتن بھی تھے۔ ٹیموں کی کم آمد کے باعث اسکولے میں بہت سے پورٹر اب یہ پیشہ چھوڑ چکے تھے۔ اسکولے سے آگے ایک گاؤں ٹیسٹی بھی نظر آیا مگر چونکہ اس تک کوئی ٹریک نہیں جاتا اس لیے مواصلاتی رابطہ نہ ہونے کے باعث یہ دنیا کی نظروں سے اوجھل ہے اور اسکولے کو ہی آخری گاؤں سمجھا جاتا ہے۔[453]

قیصر گراؤنڈ سے دائیں طرف جھولا پل سے بالتورو جانے والوں کے لیے راستہ تھا۔ کوروفن کے قریب سے بیافو گلیشیر کا آغاز ہوتا ہے۔ قیصر گراؤنڈ میں جابجا بکھرا جانوروں کا فضلہ ماحول کے قدرتی حسن کو داغدار کر رہا تھا۔ بیافو گلیشیر میں پتھر، ریت مٹی دیکھ کر کسی کوہ نورد کو پہلی نظر میں یوں لگتا جیسے کسی تعمیراتی کمپنی کا سامان بکھرا پڑا ہو۔ گلیشیر کی تہوں اور مورین کی وضاحت کے بعد مصنف گلیشیر پر چلنے کا طریقہ بتاتے ہیں۔ نملا میں سیاہ رنگ کا پرندہ ہرپن نظر آیا، وہاں گلابی پھولوں کا نام شیکمن تھا۔ بلتی اور شمشالی پورٹروں میں واضح تفریق تھی۔ شمشالی سمارٹ، خوش مزاج، خوش لباس اور نسبتاً تعلیم یافتہ تھے جبکہ بلتی پورٹر مفلوک الحال، پھٹے جوتوں والے، تعلیم سے مکمل بے بہرہ تھے۔ پورٹروں کا سردار ان کے برابر تنخواہ لینے کے باوجود کوئی بوجھ نہیں اٹھاتا بس سب کی نگرانی کرتا ہے۔ بلتی پورٹر روٹی پکا کر نمک ملی چائے کے ساتھ کھاتے تھے۔ شمشالی آپس میں واخی میں بات کرتے تھے۔[454]

بیانتھا کیمپ میں پچھلی ٹیموں کے پھینکے گئے کچرے کے علاوہ کثیر تعداد میں مارخور کے سینگ بکھرے ہوئے تھے جنھیں یقیناً شکار کیا گیا ہوگا۔ بلتی پورٹروں نے راستے میں زیادہ وزن اٹھانے سے انکار کر دیا تو شمشالی پورٹروں کو زیادہ اٹھانا پڑا جو انھوں نے بغیر اعتراض کے اٹھایا۔ نارفوگورو کا بلتی میں مطلب سرخ پتھر تھا۔ کیمپ کے تعین کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا جاتا ہے جو محفوظ ہو، پانی دستیاب ہو۔ اس لیے مصنف مشورہ دیتے ہیں کہ برسوں سے آزمودہ کیمپوں میں ہی قیام کو ترجیح دی جائے۔ لک پے لا پر غیر مقامی پاکستانی باشندوں کی یہ تیسری ٹیم تھی جو یہاں پہنچی۔ لپک لا عبور کرنے کی خوشی میں پورٹروں نے جو جو واخی گیت گایا اس کا ترجمہ مصنف نے کتاب میں شامل کیا ہے۔ برالڈو کا مطلب نا

معلوم ہے۔ مصنف نے ان علاقوں کے پہاڑوں، گلیشیروں کے ناموں کو قدرت کا سربستہ راز قرار دیا ہے کہ پتہ نہیں کن زمانوں سے ان کے یہ نام ہیں۔

ویسیم میں ایک شکستہ ہٹ موجود تھا جو ان شمشالیوں کی جائے پناہ تھا جو سردیوں کا پورا سیزن اپنے جانوروں کے ساتھ یہاں گزارتے ہیں۔ وہاں چینی حاجیوں کے غار بھی تھے جو صدیوں سے ان کٹھن راہوں سے گزر کر حج کو جاتے تھے۔ چکار شمشالیوں کی چراگاہ ہے وہ خاصی سرسبز تھی۔ راستے میں مقامی لوگوں کے پتھروں سے بنائے نشان نظر آئے۔ ولیو نامی ایک بڑے پتھر کے بارے میں گائیڈ نے بتایا کہ ہر سال اٹھائیس جولائی کو یاک ریس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جو شمشال پاس سے شروع ہو کر ولیو میں ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد رقص و موسیقی اور دعوت کا بندوبست ہوتا ہے۔ جیتنے والے یاک کا مالک اگلے سال کے لیے عزت و احترام کا حقدار سمجھا جاتا۔[455] شیورت شمشالیوں کی ایک اور چراگاہ تھی۔ اس کے قریب ایک روایتی شمشالی گھر میں مصنف اور ان کے ساتھی گئے یہ گائیڈ عبدل کا تھا۔ اس کی بہن شمشال میں کوئی گرلز کالج نہ ہونے کے باعث سوست میں پڑھتی تھی۔ انھیں بڑی پرات میں کافی بڑی روٹی مکھن اور پنیر لگا کر پیش کی گئی۔ یہ شلپنڈوک یہاں کی خاص خوراک تھی۔ یہاں کے لوگوں کے رنگ سرخی مائل تھے، بچوں کے بال سنہرے تھے۔ شمشال پاس کے آغاز والا علاقہ پامیر بھی کہلاتا ہے۔ رات کو گاؤں والوں نے مصنف اور ان کے ساتھیوں کی دعوت کی۔ بوڑھی واخی عورت نے استقبال کیا ور ململینڈا نامی روایتی طعام پیش کیا۔[456]

گاؤں والوں نے پورٹروں کے اعزاز میں صبح دعوت کی۔ وہاں ایک جگہ موسمی تغیرات اور ارضیاتی تبدیلیوں کا ریکارڈ رکھنے والا جاپانی موسمی راڈار نصب تھا۔ ارباب پریون کیمپ میں پورٹر ذیشان نے انکشاف کیا کہ ان پہاڑوں پر مارخور اور بلیو شیپ وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ صوبہ سرحد کا ایک سیاستدان ہر سال اپنے انگریز دوست کے ساتھ آتا ہے اور ان کا بے دریغ شکار کر کے لے جاتا ہے۔ ایک جگہ اترائی میں شمشالیوں نے اپنی مدد آپ کے تحت راستہ بنایا تھا۔ راستے میں ان کی ملاقات محقق سلمان رشید سے ہوئی جو چراگاہ شیورت تک جا رہے تھے۔ ڈچ فوزین سے آگے دو پورٹر بھائیوں نے اپنی مرحومہ والدہ کی یاد میں ایک پتھریلا راستہ بنایا تھا۔

دریائے شمشال کے ساتھ تین گاؤں آباد ہیں۔ پہلا گاؤں امین آباد تھا۔ دوسرا گاؤں وسطی شمشال تھا اس سے آگے خضر آباد تھا۔ تیسرے گاؤں کا نام فرمان آباد تھا۔ دوسرے گاؤں سے پہلے ایک شخص لکڑیاں کمر پر اٹھائے ملا۔ شمشالیوں کا ایندھن کے لیے دور دراز سے لکڑیاں کاٹ کر لانا یہاں معمول میں شامل ہے۔ شمشال میں بہت سبزہ تھا۔ وہاں چشمے کا پانی جا بجا چھوٹی چھوٹی نالیاں بنا کر گھروں تک پہنچایا گیا تھا۔ ہر جگہ ٹیم کا پرتپاک استقبال ہوا۔ پورٹر اپنے علاقے میں پہنچ کر بہت خوش تھے۔ ایک امریکی این جی او کے لگائے جنریٹروں کی بدولت وہاں چند گھنٹوں کے لیے بجلی آتی تھی۔ شمشالی کوہ پیما خواتین کا بھی ذکر کیا ہے۔ خضر آباد میں کے ٹو سر کرنے والے رجب علی کا گھر بھی تھا۔ شمشال

تک جیپ ٹریک 2003ء میں مکمل ہوا۔ پورٹر نے بتایا کہ ایک دفعہ شدید لینڈ سلائیڈنگ سے جیپ ٹریک مکمل طور پر بند ہو گیا۔ مرمت کے ذمہ دار ٹھیکیدار اور مزدور بھی بھاگ گئے تب باہمت شمشالیوں نے بغیر کسی معاوضے کے 66 فٹ ٹریک کا ٹکڑا خود تعمیر کیا۔ عطاء آباد جھیل کی تباہی کی وجہ سے شاہراہ قراقرم زیر آب آنے سے پسو اور گلگت کے درمیان زمینی ٹریفک کے لیے بند تھی۔ آرمی کے ہیلی کاپٹر مسافروں اور سامان کی باربرداری کا واحد ذریعہ تھے۔

کے ٹو کہوں کہ چھگوری (2012ء)، عرفان الحق

عرفان الحق کے کنکورڈیا کے اس سفرنامے میں معلومات کا ذخیرہ وافر ہے۔ دنیا کی بلند ترین آٹھ ہزار میٹر سے بلند چودہ چوٹیوں میں سے پانچ پاکستان میں ہیں ان میں سے چار کنکورڈیا سے نظر آتی ہیں۔ یہ اصطلاح روم کے ایک چوک سے مستعار شدہ ہے۔ قراقرم کے پہاڑی سلسلے کو مصنف ایشیا کی براعظمی تقسیم کا نشان قرار دیتے ہیں۔ کسی با اختیار شخصیت کے مہمانوں کی تعداد زیادہ ہونے کے باعث مصنف کی ٹیم کی سکردو کے لیے سیٹیں کنفرم نہ ہو سکیں پی آئی اے کی اجارہ داری کو مصنف نے تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ دیامیر بھاشا ڈیم بننے سے شاہراہ قراقرم کا 120 کلومیٹر حصہ روٹ بدل کر بنایا جائے گا۔ بلتستان میں پتھروں پر قدیم کندہ تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ خپلو تجارت کا اہم مرکز تھا۔[457] سکردو کے بارے میں مصنف نے امکان ظاہر کیا ہے کہ یہ سکندریہ سے بنا ہوگا۔ یہ فرض کیا جاتا ہے کہ اس خطے کی معلومات سکندر اعظم کے سپاہیوں کے کسی دستہ کے ذریعے دنیا کو ملی ہوں گی جو ہنزہ بھیجا گیا۔ ہنزہ میں سکندر آباد نامی قصبہ بھی اس خیال کو تقویت دیتا ہے۔ مصنف کا مزید کہنا ہے کہ سکندریہ کا سکردو بننا زیادہ مشکل نہیں۔ پہلے یہاں دریائے سندھ کو پار کرنے کے لیے چمڑے کے مشکوں میں ہوا بھر کے اسے بانس سے کھینچتے تھے یہ ٹیکنالوجی مقدونیہ کی تھی۔[458] مصنف نے اس علاقے اور یونان میں مماثلتیں تلاش کرنے کی واضح کوشش کی۔

سکردو سے آگے شگر کی وجہ شہرت زہر امہرا پتھر اور اس سے بنی اشیا ہیں۔ مصنف مختلف علاقوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتے جاتے ہیں کہ الچھوڑی میں قیمتی پتھروں کی کانیں ہیں۔ داسو قیمتی پتھروں کے کاروبار کا علاقہ ہے۔ مقامی ڈرائیور جیپ کو پرشور ندیوں کے پانیوں سے مہارت سے گزار لیتے ہیں۔ برالڈو گورج کے دونوں طرف پتھروں کی اونچی چٹانیں ہیں اور گہرائی میں دریا۔ گورج کی چوڑائی بمشکل اتنی ہے کہ اس پر تختہ رکھ کر اسے عبور کیا جا سکے۔ اب یہ راستہ متروک ہو چکا ہے۔ تھنگل میں ایک سکول کا بورڈ لگا تھا پہلے سڑک تھنگل تک تھی اب اسکولے تک جا چکی ہے۔ تھنگل میں اکثر سڑک دریا برد ہو جاتی ہے۔ لینڈ سلائیڈ کا علاقہ مسافر پیدل پار کرتے ہیں دوسری طرف موجود دوسری جیپوں میں بیٹھ کر آگے کا سفر طے کرتے ہیں۔ اسکولے کو روایتی بلتی گاؤں جیسا قرار دیتے ہوئے مصنف کہتے ہیں:

"اسکولے گاؤں دور افتادہ پہاڑوں میں بسنے والے ایک روایتی بلتی گاؤں جیسا ہی ہے۔ ویسا ہی طرز تعمیر پتھروں کے گھروندے نچلے حصہ میں مویشی اور اوپر کے حصہ میں ان کے مالک۔ بنیادی سہولتوں سے محروم۔ کم تر معیار زندگی۔ یہاں سیاحوں کے آنے سے زندگی کا پہیہ ذرا آسانی سے چلنے لگا تھا۔"[459]

مقامی پورٹروں کے بارے میں بتایا ہے کہ ان کے لیے بوجھ کی تقسیم اور پڑاؤ کی اجرت وزارت سیاحت طے کرتی ہے۔ موسمی تغیر و تبدل، ناکافی لباس اور غیر معیاری جوتوں کے باوجود یہ خوش رہتے ہیں اور ہر کیمپنگ سائٹ پر گانا بجانے کو تیار رہتے ہیں۔ اسکولے میں گندم کی کٹائی نومبر دسمبر میں کرتے ہیں۔ پہاڑی کے ماتھے پر بنے ٹیڑھے میڑھے مخدوش راستے کو پتری کہتے ہیں۔ شمالی علاقوں میں نالے سے مراد دریا یا گلیشیر کا راستہ ہوتا ہے۔ ماضی میں نالوں کے اوپر آمدورفت کے لیے سٹیل کی تار کا جھولا ہوتا تھا جس میں بیٹھ کر پار جایا جاتا تھا۔[460] مصنف نے اس کے طریق کار کی بھی وضاحت کی ہے۔ جھولا کیمپنگ سائٹ میں شمسی توانائی سے چلنے والی روشنیاں، فائبر گلاس کے ٹوائلٹ بنائے جانے کے اقدام کو مصنف سراہتے ہیں کہ اس سے ماحولیاتی آلودگی کم کرنے میں مدد ملے گی۔ مقامی پورٹر یخ بستہ ندیوں میں ننگے پاؤں جوتے ہاتھ میں پکڑ کر اور پشتوں پر بوجھ سنبھالے بے خوفی سے پتھروں پر پھلانگتے گزرتے تھے۔ راستے میں مختلف جگہوں میں آنے والی تبدیلیوں کا ذکر بھی مصنف ساتھ ساتھ کرتے ہیں کہ پہلے وہاں کیا تھا اور اب کیا ہے۔ پائیو کے درخت عرصہ دراز سے پورٹروں کو ایندھن فراہم کرتے تھے مگر اب ان کی جگہ مٹی کے تیل نے لے لی ہے اس لیے پورٹر لکڑی کاٹتے ہیں نہ جلاتے ہیں۔ پہلے پورٹر یہاں روٹیاں پکاتے تھے۔ اب بہت سے پورٹر گھروں میں بنے دیسی اوون میں روٹیاں پکا کر لے آتے ہیں۔ آبشاروں اور ندیوں پر بنائے گئے بجلی گھر سے بہت سستی بجلی فراہم ہوتی ہے۔[461] پائیو کی کیمپنگ سائٹ میں نماز اور وضو کے لیے بھی جگہ مخصوص تھی۔

گلیشیر میں مورین بننے کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں یہ دراصل پہاڑوں پر پڑنے والی برف کے کھسکنے سے اس کے ساتھ ریت اور مٹی آنے سے بنتی ہے اور اس پر چلنا دشوار ہوتا ہے۔ مصنف کے خیال میں کوہ پیماؤں کی اکثریت ماحول کو صاف رکھنے کے لیے کوشاں ہوتی ہے مگر پورٹر کم پرواہ کر کے منفی کردار ادا کرتے ہیں۔ للی گو کیمپنگ سائٹ لینڈ سلائیڈنگ کے باعث تباہ ہو چکی تھی۔ یہاں مارخور کے شکار کے حوالے سے عرفان الحق کا کہنا ہے:

"پورٹروں کے مطابق للی گو کے اوپری ڈھلوانوں پر اب بھی مارخور پائے جاتے ہیں۔ لیکن مقامی لوگ اب ان کا شکار نہیں کرتے تھے بلکہ غیر ملکیوں کو اس کا شکار کھلایا جاتا ہے۔ ان سے اس شکار کی مد میں ہزاروں ڈالر فیس کے طور پر وصول کیے جاتے ہیں جو وادی کی فلاح و بہبود پر خرچ کیے جاتے ہیں۔"[462]

مصنف نے یہ تجویز دی ہے کہ پورٹروں سے آخری منزل تک کی رقم طے کر لی جائے یہ پڑاؤ کے حساب سے طے کیا جائے یا اپنی مرضی سے۔ طے شدہ پڑاؤ کے چکر میں پورٹر دیکھا بھالا راستہ ہونے کے باعث پہلے پہنچ جاتے ہیں اور ٹیم کے ارکان بعد میں پہنچتے ہیں۔ مصنف نے راستے میں ہر مقام کی تاریخ اور ہر چوٹی تسخیر کرنے کی تاریخ بیان کی ہے۔

اردوکس کیمپنگ سائٹ میں پورٹر اور ٹیم کے ارکان کے ناچ گانے کا ذکر ہے ایک ہسپانوی خاتون نے ہسپانوی خانہ بدوشوں کے روایتی رقص کا مظاہرہ کیا۔ الپائن طریقہ کوہ پیمائی میں مختصر سامان کے ساتھ کم از کم بیرونی سپورٹ کے ذریعے چوٹی پر پہنچا جاتا ہے۔ برالڈو پر ہر جگہ کی مناسبت سے مصنف موسم کا تذکرہ کرتے ہیں۔ درہ خنجراب سے پہلے درہ مستاگ چین تک آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ پرانی شاہراہ درہ منتکا سے گزرتی تھی اس کے علاوہ درہ کلک بھی چین جانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ کنکورڈیا لفظ کو مصنف نے لاطینی لفظ قرار دیا ہے۔

ماؤنٹ ایورسٹ اور کے ٹو کا مصنف نے موازنہ کیا ہے کہ اسے ہر سال سیکڑوں کوہ پیما سر کرتے ہیں جبکہ کے ٹو کسی سال کسی بھی کوہ پیما کو یہ اعزاز نہیں بھی دیتی۔ مصنف نے ہر اہم چوٹی کے بارے میں مفصل معلومات دینے کے ساتھ عام لوگوں کی رہنمائی کے لیے ٹریکنگ سے متعلقہ اصطلاحات کی بھی وضاحت کی ہے۔ کنکورڈیا سے علی کیمپ جاتے ہوئے اس کو حوالدار علی کے نام سے منسوب کرنے کی وجہ بتائی ہے کہ کیسے انھوں نے ہوشے کی طرف کا یہ راستہ تلاش کیا۔ انھوں نے ایک بار گوندوگورولا ٹاپ سے شکار کے دوران چوغولیزا، گشابروم، کے ٹو وغیرہ کو دیکھا تھا جب وہ ہرمن بوہل کے ساتھ چوغولیزا سر کرنے والی ٹیم کے ساتھ گئے تو انھیں یاد آیا یہ چوٹیاں وہ پہلے بھی دیکھ چکے ہیں اس لیے یہاں سے ضرور ہوشے کی طرف راستہ ہوگا جہاں سے جلد پہنچا جا سکے۔ مقامی لوگوں کی مدد سے وہ یہ راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دریافت سے ہوشے والوں کے لیے اضافی آمدنی کے مواقع پیدا ہوئے۔ ہوشے ریسکیو ٹیم گوندوگورولا پر رسے لگاتی ہے تاکہ لوگ آسانی سے پہنچ جائیں۔ ان رسوں کو چیک کرنے کے لیے ریسکیو ٹیم کے ارکان جاتے رہتے ہیں۔ یہ رسے نصب کرنا جان جوکھوں کا کام ہے کہ پوری ٹیموں کی زندگی کا انحصار رسی پر ہوتا ہے۔ گوندوگورولا میں مصنف کی ٹیم موسم کی خرابی کے باعث تین چار دن کے لیے پھنس گئی۔ شمال میں ہر ٹاپ پر اذان دینے کی روایت ہے۔ ہوشے کی کیمپنگ سائٹ میں پرانے نئے سامان کی خرید و فروخت کی دکان بھی تھی۔ واپسی پر مقامی باورچی یونس نے انھیں اپنے گاؤں میں پر تکلف چائے کی دعوت دی۔ جب مصنف لیلیٰ پیک سر کرنے آنے والی ایک اطالوی ٹیم کے ساتھ بطور رابطہ آفیسر آئے تھے تو ہوشے کی کیمپنگ سائٹ میں ایک رجسٹر پر وہاں آنے والے سیاحوں کی قومیت اور آمد کا مقصد درج کیا جاتا تھا۔ وہاں مصنف کو یاک کے مکھن والی چائے ملی۔ آخری باب میں مصنف نے لٹل کریم نامی ہائی پورٹر کے کارناموں کی تفصیل دی ہے جو غیر ملکیوں میں بہت مقبول ہیں انھوں نے کئی مرتبہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر غیر ملکی کوہ پیماؤں کی جان بچائی۔

دیوسائی میں ایک رات (2013ء)، محمد احسن

محمد احسن کا یہ سفر نامہ سکردو اور دیوسائی کے 2013ء میں کیے جانے والے سفر کا احوال ہے۔ انھوں نے اس سفر نامے میں گلیشیر کے لیے اردو لفظ سیل یخ استعمال کیا ہے جب وہ دیوسائی کے لہریے میدان کی برف پوش پہاڑیوں

اور ان کے درمیان گلیشیرز کی موجودگی کا ذکر کرتے ہیں۔ دیوسائی کے پھولوں اور مٹی کی خوشبو مخصوص ہے جو کہیں اور نہیں پائی جاتی۔ یہ جڑی بوٹیاں اور پھول کسی اور علاقے کی مٹی قبول نہیں کرتے۔ دیوسائی میں مصنف کو لمبے بالوں والے زوہ اور ایک سفید لومڑی نظر آئی۔ دیوسائی میں ایک بلند چٹان سے نانگا پربت کا روپل فیس نظر آیا۔ مصنف نے دیوسائی کو ایسا خطہ قرار دیا ہے جس کی دنیا بھر میں اور مثال نہیں۔ اس سال نانگا پربت کے جنوب مغربی دیامیر بیس کیمپ میں غیر ملکی سیاحوں کے قتل کے سلسلے میں گلگت بلتستان کی جغرافیائی تقسیم اور مذہبی تقسیم کے حوالے سے معلومات دی ہیں۔ دیوسائی پہنچنے کے تین راستوں بذریعہ وادی نیلم، بذریعہ استور اور بذریعہ سکردو کا ذکر کیا ہے۔

راولپنڈی میں گلگت کی بس میں سوار ہوتے وقت مصنف نے گلگتی کنڈکٹر کو کہا سامان کی کوئی رسید یا نمبر دے دیں تاکہ گم نہ ہو۔ اس نے کہا آپ کو پنجاب کی عادت ہے آپ گلگت بلتستان جارہا ہے وہاں ایسے چوری چکاری والے کام نہیں ہوتے۔[463] ایک خان صاحب نے موٹر سائیکل کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر بس کی چھت پر رکھا۔ بس میں سوار چند گلگت کے نوجوانوں کو مصنف نے وسطی ایشیائی سمجھا:

"۔۔۔ مجھے لگا کہ بس میں وسطی ایشیائی ممالک کے چند فارنر لڑکے چڑھے اور سب سے پچھلی سیٹوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ گلگت کے لڑکے تھے۔ گلگت بلتستان کے آسودہ حال باشندے ساری دنیا کے کوہ پیما اور سیاح دیکھ کر ان کے رنگ میں رنگے جا چکے ہوتے ہیں۔ چونکہ گلگتیوں اور بلتیوں کے خدوخال جنوبی ایشیائی ہونے کی بجائے بالترتیب وسطی ایشیائی اور تبتی ہیں اس لیے پہلی نظر میں وہ لوکل نہیں لگتے۔"[464]

راستے میں مصنف نے ہر مقام سے گزرتے ہوئے اس کے بارے میں معلومات دی ہیں۔ سطح مرتفع پوٹھوہار کے بارے میں مفصل معلومات دی ہیں۔ مارگلہ کا مطلب مصنف نے سانپوں کی آماجگاہ بتایا ہے۔ مارگلہ سے پیر سوہاوہ، مری کے راستوں، اللہ دتا گاؤں کی غاروں کے بدھ آثار، ٹیکسلا، واہ، حسن ابدال وغیرہ کے بارے میں معلومات کی فراوانی ہے۔ شاہراہ قراقرم کی تاریخ اس کی تعمیر کے بارے میں مفصل معلومات ہیں۔ قدم قدم پر معلومات کی کثرت اکتاہٹ کا سبب بنتی ہے۔ مشہور دروں کا ذکر کیا ہے۔ شاہراہ قراقرم اور شاہراہ ریشم کے فرق کی وضاحت کی ہے۔ قدیم شاہراہ ریشم شاہراہ کی بجائے راستہ تھی اس پر نئی سڑکیں بنائی جاتی رہی ہیں۔ پہلے شاہراہ قراقرم کا آغاز ایوب پل سے ہوتا تھا اب حسن ابدال سے۔ ایوب پل سے آگے ایک مقام مسلم آباد کا اصل نام کھوتا قبر ہے مصنف نے اس نام کا تاریخی پس منظر بھی بیان کیا ہے۔ ایبٹ آباد کا پرانا نام وادی اوراش ہے۔ ہر مقام کی معلومات فراہم کرنے کے علاوہ کہیں داخلی واردات کا بھی تفصیلی تذکرہ ہے۔

مانسہرہ کا اصلی نام مہان سرا اور پکھلی سرکار تھا۔ پاکستان کا ہر بڑا چھوٹا دریا، ندی نالہ دریائے سندھ میں ہی ملتا ہے۔ دریائے سندھ کو شیر دریا، سندھ ساگر، سندھو کہا جاتا ہے۔ مختلف زبانوں میں سندھو ندی، سندو، سندو سائیں، اباسین، زودسند، نھر السند، سنگے زنگبو، انڈس نہری اور نیلپ اس کے نام ہیں۔ اس کا ماخذ کوہ کیلاش ہے۔ یہ اس کے جس

گلیشیر سے نکلتا ہے تبتی کلچر میں اس کا نام شیر ہے۔ دریائے سندھ کے طویل سفر اور مختلف دریاؤں کے اس میں شامل ہونے کی تفصیل دی ہے۔ بشام سے داسو تک شاہراہ قراقرم کے خطرناک ہونے کی شہرت ہے۔ اس کی تعمیر کے دوران سب سے زیادہ اموات بھی اسی حصے میں ہوئیں۔[465]

انڈس کوہستان کے بارے میں جغرافیائی معلومات فراہم کرتے ہوئے مصنف نے بتایا ہے کہ اس کا ہیڈ کوارٹر داسو ہے۔ اسے ماضی میں باغیوں کی سرزمین کے طور پر یاغستان بھی کہا جاتا ہے۔ احتیاطاً یہاں رات کو سفر نہیں کرنے دیا جاتا اور دن کو بھی گاڑیوں بسوں کے قافلے بنا کر پولیس کی نگرانی میں چلا جاتا ہے۔[466] دبیر سے آگے کے مقامات کے موسم کی وضاحت کرنے کے لیے مصنف نے مون سون کے بارے میں مفصل معلومات دی ہیں۔ مون سون ہواؤں کے نہ پہنچنے سے داسو سے آگے خشکی زیادہ ہے۔ داسو سے کاغان تین روزہ پیدل ٹریک ہے۔ زیادہ تر پہاڑی ٹریک نالوں کے ساتھ ساتھ ہی چلتے ہیں۔ جب مصنف کا گزر دیامیر بھاشا ڈیم کے پاس سے ہوا تو اس کے افتتاح کو تین سال گزر چکے تھے مگر تعمیری کام کوئی نہیں ہوا تھا۔ اس کی تعمیر سے تاریخی آثار قدیمہ کے نقصان کے خدشات ہیں۔ چلاس میں ایئرپورٹ موجود ہے مگر فعال نہیں۔ چلاس میں غربت مکاؤ پروگرام کے دفتر کے باہر ایک بوڑھے کو بری طرح ڈانٹ ڈپٹ کر عمارت سے باہر رہنے پر مجبور کیا گیا۔ بٹوگاہ نالے کے قریب ایک چٹان پر اہم بدھ سٹوپا ہے۔ چلاس کبھی بھی ٹھہرنے کی جگہ نہیں رہا ہمیشہ گزرگاہ رہا۔ البتہ مصنف نے قیاس کیا ہے کہ چلاس ائیرپورٹ فعال ہونے سے کاغان اور فیری میڈو جانے والے سیاحوں سے چلاس بارونق ہو سکتا ہے۔[467] نانگا پربت اور کے ٹو کے موازنے کے بعد نانگا پربت کے پہاڑی سلسلہ سمجھے جانے کے غلط تاثر کی نفی کی ہے۔ اس کی بلندی کی رفتار سب سے زیادہ ہے۔

جگلوٹ میں آرمی کے گودام ہیں جغرافیائی حیثیت سے یہ بہت اہم علاقہ ہے۔ شمالی علاقوں کی آزادی کی پہلی تحریک جگلوٹ سے شروع ہو کر دیگر علاقوں تک پھیلی۔ اس کے دریا پار بونجی کا علاقہ قدیم دور سے جنگی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ جگلوٹ میں تین عظیم پہاڑی سلسلے قراقرم، ہندوکش اور ہمالیہ آپس میں ملتے ہیں۔ مصنف نے اس حوالے سے ارضیاتی معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ دریائے گلگت پر عالم پل کے قریب فرہاد پل تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے قریب چٹانوں پر کھروشتی زبان میں قدیم نقش نگاری کے آثار ہیں جو قدیم زبانوں کے آخری شواہد میں سے ہیں۔ بلتستان کو تبت خورد کہے جانے کے بارے میں مصنف کا موقف ہے:

> "تبت خورد یعنی چھوٹا تبت۔ بلتستان کے لوگوں کا رہن سہن، موسم اور جغرافیہ تبت سے ملتا جلتا ہے کیونکہ ان کے آباؤ اجداد وہیں سے آئے مگر ظاہر ہے سطح مرتفع تبت تو دنیا کا بلند ترین سطح مرتفع ہے۔ اور بلتستان کا جغرافیہ اس سے مطابقت تو رکھتا ہے مگر مکمل طور پر اس جیسا نہیں۔ جغرافیائی طور پر اصل مطابقت سطح مرتفع دیوسائی کی موجودگی سے وجود میں آتی ہے جسے بعض محققین نے تبت پاکستان بھی لکھا ہے۔"[468]

گلگت بلتستان میں لیلیٰ نامی تین چوٹیاں ہیں۔ اسٹک سکردو اور جگلوٹ کے عین درمیان میں ہے۔ بلتی اور شنا زبانوں میں بڑے نالے، چھوٹے دریا اور بعض دفعہ گلیشیر کو لنگما بولتے ہیں۔ حراموش کے دامن سے آنے والے ایک نالے کا نام کھوتیا لنگما تھا۔ مصنف کو سکردو میں بہت روشن شہاب ثاقب نظر آئے۔ لفظ سکردو کا مطلب بھی مصنف نے شہاب ثاقب بتایا ہے۔ سکردو کی آب و ہوا میں نمی نہ ہونے کے باعث شہاب ثاقب زیادہ نظر آتے ہیں۔ حوطو گاؤں میں قائم کیڈٹ کالج سکردو پورے بلتستان میں اپنی طرز کا واحد کالج ہے۔ سکردو ائیر پورٹ آرمی اور ائیر فورس کا مشترکہ ایئر بیس بھی ہے۔ چونیتس گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد مصنف راولپنڈی سے سکردو پہنچے۔ سکردو ہوٹل میں ٹھہرنے کے بعد ہوٹل کے ملازم دروازہ کھٹکھٹائے بغیر کمرے میں آتے رہے۔ مصنف نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ یہاں زیادہ فیملیز کے آنے کا رواج نہیں زیادہ تر مہمات کے لیے مرد کوہ پیما ہی آتے ہیں۔[469]

مصنف کو دیوسائی جانے کے لیے وہی گائیڈ میسر آگیا جو مستنصر حسین تاڑر کے ساتھ جا چکا تھا۔ پہلے وہ پورٹر تھا اب وزارت سیاحت کی طرف سے لائسنس یافتہ گائیڈ۔ اس نے دیوسائی کی شتونگ پیک سر کی تھی۔ صدپارہ گول نالے کو مقامی زبان میں ہرگسہ کہتے ہیں۔ گائیڈ نے مصنف کو منع کیا کہ علی صاحب نہ کہا جائے بس علی خان کہہ لیں کہ پورا نام علی خان نمبر دار ہے۔ سکردو بازار کی ایک جھلک مصنف اس طرح دکھاتے ہیں:

"سکردو بازار کا وہی نقشہ تھا جو پاکستان کے کسی بھی شہر میں ہوتا ہے۔ سڑک کے ارد گرد گندگی کے ڈھیر، بجلی کے کھمبوں اور تاروں کا ایک جنگلاتی و گنجلاتی نظام، عمارات ٹوٹ پھوٹ کا شکار، میل زدہ کپڑوں میں زیادہ تر اہل سکردو یا مضافاتی علاقوں کے باشندے۔ مگر سکردو اور اس کے مضافاتی علاقوں کی خوب صورتی کے سامنے یہ سب مسائل ہیچ ہیں۔"[470]

مصنف کو بازار میں اور سکردو میں غیر ملکی سیاح بالکل نظر نہ آئے صرف مقامی لوگ ہی تھے۔ دہشت گردی کے واقعات کی بدولت غیر ملکی سیاحوں کی آمد و رفت بہت کم ہو گئی تھی۔ حالانکہ گلگت بلتستان پر امن علاقے ہیں۔ تب تک گلگت بلتستان کی جیلوں میں صرف چودہ افراد قید تھے۔ یادگار چوک کے قریب بنک کے باہر لوگ پر سکون قطار میں کھڑے تھے، بقیہ پاکستان کی طرح بد نظمی نہیں تھی۔ ایک کیفے کا نام اپنا الڈ ینگ ننگ ژھوق کیفے تھا۔ ژھوق کیک نما شے سکردو کی سوغات ہے۔[471] گائیڈ علی کی زبانی علی خان انچن اور ملکہ گل خاتون کے حوالے سے تاریخی معلومات مصنف کی کتاب میں شامل ہیں۔ انچن مسلمان مقپون راجا تھا۔ ملکہ سے منسوب تعمیرات کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہاں بدھ مت کے آثار جا بجا ہیں۔ بدھ دور کا مشہور نشان سواستکا اب بھی کئی عمارتوں کے باہر کھدا ہوا ملتا ہے۔ چھور بٹ وادی لداخ سے بلتستان آنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ پی ٹی ڈی سی کے ٹو موٹل میں اٹالین میوزیم تھا جس کے باغ میں ایک گورے نے ان کی آمد پر بہت برا منایا وہ کسی مشین پر دیوسائی کا موسمیاتی ڈیٹا ریکارڈ کر رہا تھا۔ سکردو میں جلوس کی وجہ

سے کئی سڑکیں بند تھیں مگر راستے صرف پاکستانی سیاحوں کے لیے بند کیے گئے تھے غیر ملکی گوروں کو گزرنے دیا جا رہا تھا۔ استفسار پر پولیس والے نے کہا انھیں روکنے کی اجازت نہیں اور وہ نقصان پہنچانے نہیں آتے۔[472]

ایک سڑک کا نام ماگلی سپونگ روڈ تھا جسے گائیڈ ناگلی سپ ون پڑھ رہا تھا کیونکہ بلتی زبان میں گ آخر میں آئے تو سائلنٹ تصور ہوتا ہے۔ صدپارہ روڈ بننے سے پہلے لوگ برجی لا کے راستے دیوسائی جاتے تھے جو بہت مشکل راستہ تھا۔ مقامی لوگ بدھا کو بدے بدے پکارتے ہیں۔ شمالی علاقہ جات میں پہاڑی نالوں کے بلند حصوں سے دو تین فٹ چوڑی نالیاں نکالتے ہیں اور ڈھلوان بناتے ہوئے نیچے واقع گاؤں تک لاتے ہیں انھیں قل کہتے ہیں۔ شمالی علاقہ جات کے اکثر ڈرائیور وقت اور ایندھن بچانے کے لیے اہم مقامات کو نظر انداز کرتے گزر جاتے ہیں۔ ان کے خیال میں عام سیاحوں سے ان علاقوں کی سیاحت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا حالانکہ ان کی معیشیت کے لیے عام سیاح بہت ضروری ہوتے ہیں۔

صدپارہ کا اصل نام ست پڑا ہے جو سات گاؤں انجن نے بسائے تھے مگر خوبصورتی کے باعث صدپارہ ہو گیا۔[473] یہاں مصنف نے ناران کا نام نراں اور شتڑاں سے شاران بننے کی بھی وضاحت کی ہے۔ صدپارہ جھیل کا جزیرہ ڈیم بننے سے ڈوب گیا۔ پہلے جھیل دل کی مانند تھی اور درمیان میں جزیرہ دلفریب لگتا تھا۔ لوگ کشتی میں بیٹھ کر وہاں تک جاتے تھے مگر اب بڑا ڈیم بننے سے جھیل کی خوب صورتی متاثر ہوئی ہے۔ یہ قدرتی جھیل نہیں تھی نالہ تھا جس کے سردیوں میں خشک ہونے سے اہل سکردو کو مسائل کا سامنا ہوتا تھا۔ اس لیے علی شیر انجن نے یہاں ڈیم بنوایا تھا جس سے صدپارہ جھیل وجود میں آئی۔ مصنف نے جا بجا ارضیاتی معلومات بھی دی ہیں۔ دیوسائی روڈ پر نالے کے کنارے ہر رنگ اور شکل کے پتھر تھے جس کا مطلب کسی زمانے میں وہاں گلیشیرز کا سرکنا تھا۔ جو پتھر جتنا گول ہو وہ اتنی ہی بلندی سے سرکتا آیا ہوتا ہے۔ اس کے نوکدار سرے رگڑیں کھانے سے ہموار ہو چکے ہوتے ہیں۔ گائیڈ کو اپنے گاؤں صدپارہ پر بہت فخر تھا۔ دیوسائی نیشنل پارک میں داخلے کے وقت فی کس چالیس روپے وصول کیے گئے اور شناختی کارڈ نمبروں کا اندراج کیا گیا۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہ رقم ریچھوں کے تحفظ پر خرچ کی جاتی ہے۔ جیپ ٹریک بنانے کے لیے چونکہ پہاڑ کھودا گیا تھا اس لیے اندر کی چٹانیں بھی ظاہر ہو رہی تھیں جن میں لوہے کی آمیزش تھی۔ لوہے کی آمیزش والی چٹانوں کو مصنف نے سطح مرتفع دیوسائی کی تحقیق کا اہم باب گردانا ہے۔

دیوسائی ٹاپ کو ملک پاس اور ملک لا بھی کہا جاتا ہے۔ دیوسائی میں ایک جگہ خیمے پر ریڈ کریسنٹ سوسائٹی لکھا نظر آیا جس کی وضاحت مصنف نے کی کہ زلزلہ زدگان کی مدد کے لیے آنے والے جو خیمے پاکستانی مارکیٹ میں فروخت ہو گئے یہ ان میں سے ایک تھا۔ خیمے کے دو حصے تھے ایک ریسٹوران اور دوسرا رہائشی ہوٹل۔ دیوسائی ٹاپ کو علی ملک پاس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ علی ملک وادی سے گزر کر برجی لا جایا جاتا ہے اور اس وادی میں جانے کے لیے اس بلند مقام سے گزرنا پڑتا تھا اس لیے اس کا نام علی ملک پاس بھی ہے۔ مصنف کی فراہم کردہ ارضیاتی معلومات کے مطابق دیوسائی کا

سارا علاقہ آتش فشانی چٹانوں پر مشتمل ہے۔ دیوسائی میں گلدستوں کی شکل میں جا بجا پھول تھے۔ وہاں ائیر فورس کی چھاؤنی بھی تھی۔ دیوسائی ٹاپ سے شتونگ جاتے ہوئے وٹوپائی، بلوم دوے، اور پھوتے داس جیسے مقامات گزرے تھے۔ بلتی میں شتونگ کا مطلب ہے گوشت کی دکان۔ پہلے یہاں مچھلی کا گوشت شکار کر کے بیچا جاتا تھا اس لیے نام شتونگ پڑا۔ اب شکار پر پابندی ہے۔ بڑا پانی پر پرانے پل کے سامنے موجود بھدے سے نئے پل کو مصنف نے مخصوص رنگ وروغن کر کے اس کے پس منظر میں ضم کرنے کی تجویز دی ہے۔ مصنف نے بلتیوں کی نمایاں خوبی بیان کی ہے:

"بلتستان کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ یہاں کے لوگ سیاحوں کا مذاق نہیں اڑاتے۔"[474]

ان علاقوں میں جا بجا نظر آنے والے پتھر کے مینار جنھیں مقامی زبان میں بوتھیاں کہتے ہیں دراصل مقامی لوگوں کے خاص سگنل ہوتے ہیں جو پیچھے آنے والوں کے لیے راستے کی نشاندہی کا کام کرتے ہیں۔ کیونکہ رات کے وقت دیوسائی مقامی لوگوں کے لیے بھی دن سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ دیوسائی کی رات میں ستاروں کے ہوش ربا منظر کے بیان میں مصنف نے فلکیاتی معلومات کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ دیوسائی پر یہ منظر جتنا واضح نظر آیا ویسا دنیا میں کم جگہوں پر آتا ہے۔ مقامی لوگ دیوسائی کو سونگھ کر موسم کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ ایک جگہ شمس کٹ پر تاریخی بوتھیاں تھیں۔ ان علاقوں میں قدیم زمانے سے یہ رواج تھا کہ کسی مہم پر جاتے اور آتے ہوئے اپنی تعداد کے مطابق پتھروں سے بوتھیاں بناتے تھے اس طرح شہیدوں اور غازیوں کی تعداد کا اندازہ ہو جاتا تھا۔[475]

دیوسائی میں پائے جانے والے ہمالین مارموٹ کے بارے میں بھی مصنف نے معلومات دی ہیں کہ پاکستان اور دنیا بھر میں یہ کہاں کہاں پایا جاتا ہے۔ کالا پانی نام کی وجہ تسمیہ اس میں کالے پتھروں کی تعداد کا زیادہ ہونا تھا۔ پہلے اس ندی پر پل نہیں تھا اسے جیپوں سمیت عبور کرنا پڑتا تھا اب پل بننے سے آسانی ہو گئی ہے۔ شیوسر جھیل کے قریب کالا سیاہ پہاڑ کے پیچھے سے استور کے لیے چلم نالہ نکلتا ہے۔ ایک اور راستہ درہ برزل کے ذریعے گلتری، منی مرگ سے ہو کر وادی نیلم کے قصبے دومیل تک جاتا ہے۔ دیوسائی کے زیریں حصے گلتری کو چھوٹا دیوسائی بھی کہتے ہیں۔ شیوسر جھیل پاکستان کی تیسری بلند ترین جھیل ہے۔ موسم صاف ہو تو اس میں نانگا پربت کا عکس نظر آتا ہے۔ اسے اندھی جھیل بھی کہا جاتا ہے۔ ادارہ وائلڈ لائف کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق دیوسائی میں ابتدا میں پندرہ ریچھ تھے جو اب بڑھ کر 65 ہو چکے ہیں۔ وائلڈ لائف والے ایک ہزار فی کس لے کر سیاحوں کو ریچھ دکھانے لے جاتے ہیں۔

واپسی پر دیوسائی میں مہنگی گاڑیوں کا رش تھا۔ گائیڈ نے بتایا کہ سب سرکاری گاڑیاں ہیں، حکومتی خرچے پر تھوڑی دیر کے لیے آتے ہیں وقت گزر کر واپس چلے جاتے ہیں۔ لیونڈر کے پھولوں کو بلتی میں لوشے کہتے ہیں۔ سوک ویلی کی مصنف نے بہت تعریف کی ہے۔ یہ نسبتاً گمنام وادی ہے۔ ایک جگہ مقامی ڈرائیور نے بتایا کہ یہاں پھل مفت کھائیں باغات کے مالکان برا نہیں مناتے۔ مقامی لوگ گانی بوٹی شوق سے کھاتے ہیں جو کھٹے میٹھے ذائقے کی حامل تھی۔

اپر کچورا جھیل کے راستے میں گاؤں میں گھروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ کہیں خوبانیاں اور شہتوت سکھائے جارہے تھے۔ ایک گھر کے باغ میں سبزیاں اگی تھیں۔ وہاں کے لوگ سیاحوں کے عادی تھے اس لیے متوجہ ہوئے بغر اپنے کاموں میں مگن رہے۔ ایک جگہ ڈرائیور نے گندم اٹھائے باباجی کا بوجھ پراڈو کی چھت پر پھینکا اور آگے جا کر اتار دیا۔ مصنف کے استفسار پر اس نے بتایا کہ اسے مدد کی ضرورت تھی نظر آرہا تھا اگر وہ پوچھ کر مدد کرتا تو اس کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوتا۔ اپر کچورا جھیل میں کشتی میں پانی کھڑا تھا پوچھنے پر کشتی بان نے بتایا کہ اگر اس میں پانی نہ ڈالیں تو لکڑی خراب ہو جاتی ہے۔ شنگریلا کو مصنف نے بلتستان کی پہچان قرار دیا ہے۔ وہاں داخلہ ٹکٹ 200 روپے فی کس تھی۔ وہاں جنگلے کے باہر لکھی حفاظتی تدابیر میں درج تھا کہ ڈرائیور حضرات کا داخلہ ممنوع ہے۔ جھیل کا مصنوعی پن مصنف کے ساتھیوں کو نہیں بھایا، اس نام کی وجہ تسمیہ اور اس سے منسلک ناول کی کہانی میں مماثلت کا ذکر مصنف نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

شگر بلتستان کا سب سے بڑا ضلع ہے۔ شگر تک کا علاقہ صحرائی ہے۔ سکردو کی جغرافیائی خصوصیات کے حوالے سے مصنف کا کہنا ہے:

"سکردو میں ہر ممکن جغرافیائی خصوصیات ہیں۔ یہاں پہاڑ بھی ہیں، صحرا بھی، سمندر نما شیر دریا بھی، گل و گلزار بھی، گرم مرطوب موسم بھی اور قطب شمالی نما بھی۔ ان علاقوں کے گلیشیرز قطب شمالی اور جنوبی سے باہر دنیا کے طویل ترین ہیں۔ یہ خصوصیات دنیا بھر میں بہت ہی کم مقامات پر ایک ساتھ نصیب ہوتی ہیں۔"[476]

اسکولے شگر کی آخری آبادی ہے۔ شگر سکردو روڈ پر ایک جگہ تھورگو معلق پل تھا۔ تھورگو کی جنگی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے مصنف بتاتے ہیں کہ ماضی میں جب بھی کشمیر اور لداخ سے بلتستان پر چڑھائی ہوتی تھی تو دشمن کی فوجیں یہیں سے سکردو میں داخل ہوتی تھیں۔ سکردو کے باسی یہاں جمع ہو کر دشمنوں پر سنگ باری کرتے رہے۔[477] تھوڑی دیر تک سڑک بہت اچھی حالت میں رہی بعد میں عام سی ہو گئی۔ اس کی وجہ ڈرائیور نے یہ بیان کی کہ نیشنل جیوگرافک والوں نے کوئی فلم بنائی تھی تو تب بس اتنی سی سڑک کو صحیح کیا گیا تھا۔ شگر میں ایک قدیم مسجد امبورک ہے۔ شگر قلعہ ایک نئ نکور کوٹھی نما تھا۔ اس کے باہر پروالی چترالی ٹوپی پہنے حوالدار کا نام بہت طویل تھا۔ حوالدار حاجی حامد حسین حسرت شگر فورٹ انچارج۔ شگر فورٹ سرینا ہوٹل کی زیر نگرانی ہے۔ قلعے کو دیکھ کر فائیو سٹار ہوٹل کا گمان ہوتا تھا۔ قلعہ تراشیدہ پتھروں سے بنا تھا۔ قلعے کے گائیڈ کے مطابق شگر کی ہری بھری وادی باماہریل لنگے کی بدولت ہے۔ اس نے غلط انگریزی میں انھیں قلعے کی تاریخ بتانی شروع کی۔ اس قلعے کا مقامی نام فون کھر ہے۔ گائیڈ کے مطابق قلعے کی بحالی کا عمل 1999ء سے 2004ء تک رہا۔ اور یہ سیاحت کی نئی قسم ہے جس میں بین الاقوامی معیار کی رہائش اور آثار

قدیمہ ایک جگہ پائے جاتے ہیں۔ راجہ کی لائبریری کو اب باتھ روم میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ کمرے کا کرایہ گائیڈ کے بقول تیرہ ہزار اور سویٹ کا کرایہ چھبیس ہزار کے قریب تھا۔[478]

دیوسائی جانے والے گائیڈ علی سے مصنف کی دوبارہ ملاقات ہوئی اس نے بتایا کہ کئی میموں کو بلتی پورٹر پسند آجاتے ہیں وہ ان کے ساتھ شادی کر کے انھیں اپنے ساتھ لے جاتی ہیں اس طرح اس کے کئی دوست یورپی ممالک جا بسے۔ نین سکھ سکردو میں ایک آرگینک ویلج ہے جہاں سارے درخت، پودے، کھیت مصنوعی ادویات اور کھاد کے بغیر قدرتی حالت میں اگائے ہوئے ہیں۔ اس کا نام نین ژھوق ہے۔ کھرپوچو قلعے کی طرف جاتے ہوئے ایک مقامی شخص نے انھیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی جس کا پورانام وزیر محمد علی چیف راجپوت سورج بنسی ٹھاکر تھا، وہ پولو کھلاڑی رہا تھا۔ کھرپوچو کا مقامی تلفظ کھرپوچوئے ہے۔ قلعے کی داخلہ فیس پچاس روپے تھی۔ قلعے میں کوئی اور سیاح موجود نہیں تھا۔ اس میں ایک شکستہ حال مسجد، چند شکستہ کمرے تھے۔ کھرپوچوئے کا لفظی مطلب ہے قلعوں کا بادشاہ۔ اس کی جگہ جنگی لحاظ سے بہت اچھی ہے۔ قلعے سے واپسی پر مصنف کی ملاقات حسن صدپارہ سے ہوئی۔ وہ ہائی پورٹر تھا بعد میں اس نے پاکستان کی تمام آٹھ ہزار میٹر سے بلند چوٹیاں آکسیجن کے بغیر سر کیں بلکہ ماونٹ ایورسٹ بھی سر کی۔ اب اس کی سکردو بازار میں دکان تھی۔ اسے حکومت کی طرف سے تمغہ امتیاز مل چکا تھا۔ حسن صدپارہ کے کوہ پیمائی کے تجربات مصنف نے ان کی زبانی اپنی کتاب میں شامل کیے ہیں۔ سکردو میں ایک جگہ تین گھنٹے بجلی کی لوڈشیڈنگ کے خلاف احتجاج ہو رہا تھا۔

بستی بستی پربت پربت(۲۰۱۳ء)، عمران الحق چوہان

عمران الحق چوہان کا یہ سفر نامہ کالاش، چترال، وادی لاسپور، وادی غذر، یاسین، ترشنگ، دیوسائی، از موچھک اور خپلو کے سفر کی روداد پر مشتمل ہے۔ مصنف کے بقول یہ تین الگ الگ لیکن جغرافیائی طور پر مربوط سفر ہیں۔ کالاش کے لیے مصنف مردان سے تیمر گرہ کی ویگن پر بیٹھا۔ مصنف کا کہنا ہے مردان سے سوات تک کے علاقے میں شادی کے ہار بہت زیادہ بنائے جاتے ہیں۔ پانچ فٹ لمبائی اور تین فٹ چوڑائی کے ہاروں میں نیچے روایتی کاغذی دل کی جگہ گھڑی نصب ہوتی ہے۔[479] وہاں شاہد آفریدی بہت مقبول تھا دیر کے راستے کی دکانوں کے بورڈوں پر جابجا اس کی تصاویر تھیں۔ تیمر گرہ مصنف کو صفائی سے عاری، بے ربط ٹریفک، غیر معیاری کھانے اور جھگڑالو لوگوں کا شہر لگا۔ دیر میں ہوٹلوں کے بیرے اردو سے نابلد تھے۔ یہاں مرغی کی بجائے بڑے گوشت کو ترجیح دی جاتی تھی۔ دیر سے چترال جانے والی ویگن میں مقامی لوگ روایتی لباس میں ملبوس تھے۔ کھلی قمیض پر واسکٹ، کندھے پر چوگوشہ رومال، بڑے گھیر کی شلوار، پاؤں میں کھیڑی، سروں پر گول ٹوپی اور سبھی باریش تھے۔[480]

لواری کی سڑک کو کشادہ کرنے کا کام جاری تھا۔ نیا کوٹ سے مقامی سواریاں سوار ہوئیں۔ ان میں سے ایک بوڑھی عورت کا حلیہ بتاتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے:

> "۔۔۔ جن میں ایک بے حد عمر رسیدہ عورت بھی تھی جس نے روایتی شوخ رنگ کا بڑے گھیر کا لمبا وزنی فراک اور تنگ موری کی شلوار پہن رکھی تھی۔ سر پر چادر اوڑھ رکھی تھی۔ ٹھوری پر تین تل گدے تھے جن کی سیاہی پھیل کر سرمئی ہوگئی تھی اور جھریوں بھرے گورے چہرے پر خواب آسا دنوں کی یادگار تھے۔ ماتھے پر مینڈھیاں گندھی تھیں اور دونوں ہاتھ مہندی کے گہرے رنگ سے شرابور تھے۔"[481]

درہ لواری جون سے دسمبر تک کھلتا تھا۔ دروش بہت گرم علاقہ ہے اس لئے دروش آتے ہی مقامی سواریوں نے رومالوں اور چادروں سے سر منہ لپیٹنے شروع کر دیے۔ ایون کے مرکزی قصبے کا نام صحن تھا جو کم آباد اور خاموش بستی تھی۔ رنگور کی چیک پوسٹ کے ارد گرد ہوٹلوں کے اشتہاری بورڈوں پر کالاشی لڑکیوں کی رنگین تصاویر بنی تھیں۔ فی کس بیس روپے داخلہ فیس لے کر مسافروں کو گزرنے دیا گیا۔ مصنف نے آگے نظر آنے والی مقامی کالاشی بچیوں اور لڑکیوں کے ملبوسات کی تفصیل بیان کی ہے۔ یہاں متعدد ہوٹلوں کے نام الیگزینڈر اور الیگزینڈرا تھے۔ اس سال وہاں ایک غیر ملکی کے قتل کے بعد تمام غیر ملکیوں کے کالاش داخلے پر پابندی تھی۔ تب وہاں گرمی تھی مقامی لوگوں کے بعد سہ پہر کے بعد موسم ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ مصنف نے کالاش وادیوں اور آبادی کے بارے میں مفصل معلومات فراہم کی ہیں۔ کافر کالاشی عورتوں کی باہر چہل پہل تجارتی مقاصد کے لیے ہوتی ہے کہ سیاح تصویر اتاریں تو وہ دام وصول کر سکیں۔ کالاشیوں کے مقامی گھروں اور ان کے تعمیری مراحل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ایک کالاشی گھر بلندی پر بنا تھا اسکی سیڑھیوں کی جگہ ایک درخت کا تنا تر چھا رکھا تھا۔ مصنف کو کالاشی مردنان کمرشل اور خواتین کمرشل مزاج کی لگیں۔ ایک مقامی نوجوان کا نام "بزرگ" تھا۔ کالاشیوں کے رہن سہن پر مصنف نے جزئیات کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ان کے رسم ورواج کا احوال بھی بتایا ہے۔ ایک مقامی گھر میں مصنف نے شراب بنانے کے لیے سیاہ گلے ہوئے انگوروں کا ڈھیر دیکھا۔ اسے ڈیہہ کہتے ہیں اور یہ جشن کے موقع پر سب پیتے ہیں۔ شہتوت کی شراب مہنگی ہوتی ہے اور پانی ملا کر پی جاتی ہے۔[482]

برف کے شہر (2013ء) قمر علی عباسی

قمر علی عباسی نے 2013ء کے موسم سرما میں گلگت بلتستان کا سفر کیا۔ کتاب کے تعارف میں گلگت بلتستان کے مقامی لوگوں کے بارے کہتے ہیں کہ یہ صرف ایک علاقہ نہیں بلکہ مخصوص تہذیب، تمدن روایات کا نام ہے۔ لوگ زندگی اور توانائی سے بھرپور ہیں موسموں سے لڑتے اور حالات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ مصنف نے یہ سفر ریڈیو پاکستان کے رسالے آہنگ کے تمام سٹیشنوں کے لیے خصوصی شمارے شائع کرنے کی غرض سے کیا۔ اس لیے شدید سردی میں سکردو اور گلگت گئے۔ سکردو میں ہر طرف برف پڑی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف برف کے ڈھیر تھے اور درمیان

میں تھوڑا سا راستہ تھا۔ ریڈیو پاکستان سکردو میں سٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے میں آتشدان میں لکڑیاں سلگ رہی تھیں۔ مصنف کی تواضع خشک میوہ جات اور قہوے سے کی گئی:

"سکردو میں قہوہ پینے کا بہت رواج ہے جو زیادہ تر بغیر دودھ کی کم پتی والی چائے ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے دودھ کی بچت ہو جاتی ہے جو بر فباری میں مہنگا ہو جاتا ہے۔"[483]

ہوٹل میں اس وقت بجلی نہیں تھی۔ لالٹین کی روشنی میں کمرے تک پہنچے۔ وہاں آتشدان نہیں تھا مگر گیس کا چولھا جلایا گیا۔ سردیوں میں دریا ست روی سے بہنے کی وجہ سے جما ہوا تھا۔ شنگریلا میں کمرے چینی انداز میں سرخ اور مڑے کونوں والی چھتوں والے تھے۔ یہاں اپنی اڑان کی مدت پوری کر جانے والے جہاز کو ریستوران کی شکل دی گئی ہے۔ وہاں چڑیا گھر بھی موجود ہے۔ مصنف کو وہاں سخت کھانا کھانے کا تجربہ ہوا کیونکہ بلندی کے باعث چیزیں گلتی نہیں تھیں۔ مارخور کے بارے میں مصنف نے مفصل معلومات دی ہیں اس کے سینگ سے سانپ کاٹے کی دوا تیار کرتے ہیں۔

مصنف یاک سے پولو کھیلنے کا سن کر بہت حیران ہوئے۔ سکردو کوہ پیمائی کا صدر دروازہ ہے کیونکہ تمام مشہور پہاڑوں تک جانے والے یہیں سے جاتے ہیں۔ سکردو میں بلتی، کشمیری اور تبتی لوگ ساتھ رہتے ہیں۔ تین بازاروں میں نیا بازار، پرانا بازار اور کاظمی بازار ہیں۔ سرد موسم میں خشک کیے جانے ولے پھل بازاروں میں فروخت ہوتے تھے۔ سکردو میں پہاڑ جمے ہونے کے باوجود زندگی رواں تھی۔ مصنف سکردو کو اچھا شہر قرار دیتے ہیں اور یہاں کے باشندوں کے تپاک سے ملنے اور خوش ہونے کو سراہتے ہیں۔[484]

سکردو پر ٹریکنگ کے اثرات پر قمر علی عباسی اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

"اسکردو میں معیشت میں ٹریکنگ ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔ دنیا بھر کے جو لوگ یہاں آتے ہیں وہ اپنے ساتھ زبان، روایات، کھانے بھی لاتے ہیں۔ اسکردو کے کتنے ہی مقامی باشندے ان کے ساتھ ٹریکنگ پر جاتے ہیں جب وہ لوٹ کر آتے ہیں تو ان کے کھانے کا بندوبست کرتے ہیں یوں دنیا بھر کے مختلف ملکوں کے مختلف کھانے پکانا سیکھ لیتے ہیں اور جو لوگ باہر سے آتے ہیں انھیں کسی حد تک زبان اور کھانے کی پریشانی نہیں ہوتی۔"[485]

دریائے سندھ تبت کی جھیل مانسرور سے نکلتا ہے جو بیک وقت بدھ مت، جین مت اور ہندو مت کے ماننے والوں کے لیے متبرک ہے۔ کھرپوچو قلعے کی مختصر تاریخ کے ساتھ مصنف نے بلتستان میں سیاچن گلیشیر کے بارے میں معلومات دی ہیں۔ یہاں ایک مقامی آدمی نے انھیں گلیشیر کی قسموں نر اور مادہ کے بارے میں بتایا کہ برف مونث ہے اور نر گلیشیر پگھلتا نہیں۔ پانی کی ضرورت پڑے تو اس کے ایک حصے پر برف ڈال کر پگھلاتے ہیں۔[486] سیاچن بلتی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے سیاہ گلاب کی سرزمین۔ مصنف نے سیاچن جنگ سے ماحول کو پہنچنے والی آلودگی کی بھی نشاندہی کی ہے۔

سکردو میں ایک مقامی ریڈیو پروڈیوسر غلام عباس کی زندگی کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ سکردو سے دور ایک گاؤں پھوار میں پیدا ہوئے۔ وہ روزانہ پانچ کلو میٹر پیدل چل کر پرائمری سکول سے تعلیم حاصل کرنے جاتے۔ مڈل کے لیے خپلو گئے۔ غلام عباس بعد میں ریڈیو کے بڑے عہدے کنٹرولر سے ریٹائر ہوئے۔ انھوں نے بلتستان کی ثقافت، روایت اور زبان کی بہت خدمت کی اس لیے جس طرف سے گزرتے لوگ محبت سے سلام کرتے۔ غلام عباس نے مصنف کو سکردو میں موجود پاگل چوک اور پریشان چوک کے بارے میں بتایا۔

مصنف نے پولو کے آغاز کے بارے میں بتایا ہے کہ پانچویں صدی قبل مسیح سے اس کا آغاز ایران سے ہوا۔ سکردو والے پولو کو بلتی زبان کا لفظ کہتے ہیں جس کا مطلب ہے گیند۔ بلتستان اور پولو لازم وملزوم ہیں۔ مقامی شاعری میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ ابو العباس شگری نے اپنی نظم میں پولو کے کھلاڑی عبد الکریم کا ذکر کیا ہے۔ مصنف دریائے سندھ کے بارے میں معلومات دیتے ہیں کہ چین میں دو فیصد، بھارت میں پانچ فیصد اور پاکستان میں ترانوے فیصد بہتا ہے۔ دریائے سندھ نے ہی سندھو اور ہندو کا نام دیا۔ بلتستان کی داستان گوئی کی روایت کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں کہ ان کے لیے خصوصاً مشہور داستان گو عبد الرحمٰن کو بلایا گیا۔ اس دن خاص اہتمام سے بلتستان کے روایتی کھانے بنائے گئے۔ خاص محفلوں میں پکایا جانے والا مارخور کا گوشت بھی پکایا گیا۔ دیگر روایتی کھانوں میں مرزن اور پراؤ تھے۔ مرزن خشک میوں اور آٹے سے بنائی گئی تھی۔ جبکہ کڑصا آٹے سے بنتی ہے بڑے تھال میں درمیان میں خوبانی اور اخروٹ کا تیل ڈال کر پیش کی جاتی ہے۔ کھانے کے بعد بھنی مونگ پھلی اور قہوہ پیش کیا گیا۔ پھر داستان گو نے کیسر داستان سنانی شروع کی۔

گلگت کے ہوٹل میں سرد موسم کے باعث مصنف اکیلے مہمان تھے۔ وہاں بجلی آتی کم جاتی زیادہ تھی۔ لالٹین کا انتظام تھا اور کمرے کو گرم رکھنے کے لیے آتشدان میں شہتوت اور اخروٹ کی لکڑی جلاتے تھے۔ ریڈیو پاکستان گلگت میں زبان، فن و ثقافت اور تمدن کی دنیا آباد ہے۔ جس میں صداکار اور فنکار بلتی، شنا، بروشکی اور اردو میں پروگرام نشر کرتے ہیں۔ وہاں کے میٹھے پھلوں کی باس وہاں کے رہنے والوں کے لہجے میں بھی جھلکتی ہے۔ ریڈیو نے اس علاقے میں لوگوں کی ذہنی تربیت کے لیے بہت کام کیا، انھیں لکھنے بولنے کی طرف راغب کیا۔ مصنف نے گلگت بلتستان کے بارے میں جغرافیائی ولسانی معلومات بھی دی ہیں۔ شہدائے جنگ آزادی کے بارے میں ایک یادگار بنا کر اس پر مارخور کا مجسمہ آویزاں کیا گیا ہے۔[487] بلتی معاشرے میں قدیم لوک کہانیاں لوگوں کے درمیان آج بھی موجود ہیں۔

ہنزہ میں ایک پن چکی کو دیکھ کر مصنف کو تعجب ہوا۔ انھوں نے پہاڑی علاقوں میں مقامی لوگوں کی اس خوبی کو سراہا ہے کہ لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک اطلاعات بھی پہنچا دیتے ہیں اور سامان بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ ہنزہ میں خوبانی بکثرت ہوتی ہے۔ جلدی خراب ہونے والے اس پھل کو خشک کیا جاتا ہے۔ روایتی طریقوں سے چھتوں پر

ڈال کر خشک کرنے کے ساتھ ساتھ چند لوگوں نے دکانوں اور گھروں میں خوبانی خشک کرنے کی مشینیں بھی لگائی ہیں۔ خوبانی کی گٹھلی سے نکلنے والا تیل خاصا مہنگا ہوتا ہے اور صرف خاص خاص کھانوں میں استعمال کرتے ہیں۔ یہاں اسماعیلیوں کی تعداد بہت ہے وہ زراعت، صنعت اور تجارت میں مصروف رہتے ہیں۔

"پرنس کریم آغا خان نے اس علاقے میں بہت کام کروایا ہے۔ کشادہ سڑکیں بنوائیں، بجلی پیدا کرنے کے لیے جنریٹر لگوائے، زراعت کی ترقی اور صنعت کے فروغ کے لیے اس علاقے کی بہت مدد کی۔ ہم نے اکثر ہوٹلوں میں پرنس کریم آغا خان کی رنگین تصویریں نمایاں جگہ پر لگی دیکھی ہیں۔"[488]

پرنس کریم آغا خان کے نام پر بلتت کا نام کریم آباد رکھا گیا۔ ادارے آغا خان کی تمام رفاہی عمارتوں کا رنگ دنیا بھر میں ایک جیسا ہوتا ہے۔ ہنزہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں کے باشندے طویل عمر پاتے ہیں اور صحتمند رہتے ہیں۔ مصنف کا خیال ہے کہ یہ پیدائش کا ریکارڈ نہیں رکھتے اور کوئی ذہانت کی بات کرے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے لمبی عمر کی وجہ سے یہ بات کی۔ یہ لوگ بیماریوں سے لاعلم ہی رہتے ہوں گے کہ اپنا معائنہ نہیں کراتے۔[489] خوبانیوں کا بچا حصہ سردی میں بطور ایندھن کام آتا ہے۔ مصنف نے بلتت قلعے کی تاریخ اور طرز تعمیر میں بدھ اور تبت اثرات نمایاں ہونے کا ذکر کیا ہے۔ مارکوپولو بھیڑ کی پہچان اس کے سینگوں سے ہوتی ہے۔ نر بھیڑ کی عمر کا اندازہ سینگوں سے لگاتے ہیں۔ مقامی زبان میں راکاپوشی کا مطلب ہے ڈھکا ہوا۔ مصنف نے قدیم شاہراہ سے ان علاقوں میں سیاحوں کی آمد کا ذکر بھی کیا ہے۔ چین سے فاہیان، زان زنگ، مارکوپولو وغیرہ شامل ہیں۔ بدھ مت بھی اسی راستے سے آیا اور دیگر خطوں میں پھیلا۔ گلگت کے بازاروں میں خاص کر کاغذی اخروٹ اور چلاس کا بڑا چلغوزہ فروخت ہوتا تھا۔

چند غیر ملکیوں کے قیام پاکستان کے تھوڑا عرصہ بعد کے لکھے ہوئے سفرناموں کے تراجم سے شمالی پاکستان کے اس دور کے حالات اور تہذیب و ثقافت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اس لیے ذیل میں ان سفرناموں کا ثقافتی حوالے سے جائزہ لیا جاتا ہے۔

سفرنامہ پاکستان (۱۹۵۹ء)، کیمی میرپوا

کیمی میرپوا (Kamy Mir Poya) نے پاکستان کے متعدد علاقوں کا سفر کر کے ان کا سفری احوال سلسلہ وار کالم میں لکھنا شروع کیا جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ محمد حسن نے اس کا ترجمہ کیا۔ انھوں نے شمالی علاقہ جات کا بھی سفر اس وقت کیا جب وہاں ذرائع آمد و رفت مخدوش تھے۔ کاغان کے سفر کی تفصیل میں انھوں نے ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والوں کے یہاں پہنچنے، گدھوں، بیلوں، اونٹوں، مچھلیوں کی بہتات کے تذکرے کے ساتھ بچوں کے سڑکوں پر پڑے اخروٹ اکٹھے کرنے کا بھی ذکر ہے۔ اہل شوگران کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ یہاں کے کسانوں کی رنگت سنہری ہے، پتلے، دبلے، لمبے اور صحتمند ہیں۔ سیاحوں کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہیں اور اجنبیوں کو تحفتاً خشک

پھل اور مکئی کی روٹی پیش کرتے ہیں۔ کاغان میں مقامی چائے خانے کا مالک سیاحوں کو آس پاس کے علاقے میں پائے جانے والے ریچھوں کے شکار کے بارے میں بتا رہا تھا۔ مقامی لوگ بھیڑ کی اون کے کپڑے پہنتے ہیں اور گائے کے چمڑے سے بنے جوتے۔ مہاندری کے لوگ طلے کے کام والے چمڑے کے جوتے بناتے ہیں۔[490] مصنفہ نے کاغان کے راستے میں نظر آنے والے پاؤندوں کی بہت تعریف کی ہے۔ ان کے بچے لڑکے لڑکیاں دونوں کوئی نہ کوئی زیور ضرور پہنتے ہیں۔ ان کے مرد چوغوں میں ملبوس اور خواتین رنگ برنگے شوخ ملبوسات پر بھاری زیورات پہنے الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔

سوات کے سفر کی ذیل میں قدیم تاریخ کا تذکرہ کیا ہے۔ تب سیدو میں صرف دو ہوٹل تھے۔ راستے میں مقامی لوگ مصنفہ کو اپنے سادہ گھروں میں مدعو کرنے اور چائے پلانے پر اصرار کرتے رہے۔ انھوں نے سوات میں بگھیاں بھی چلتی دیکھیں۔ گلگت کا ہر بچہ انھیں مچھلیاں پکڑنے کا ماہر لگا۔ گلگت بازار میں لومڑی کی کھالیں عام فروخت ہوتی تھیں کیونکہ شکار بہت کھیل جاتا تھا۔ گھڑ سواری یہاں بہت مقبول تھی۔ لوگ سحر خیز تھے۔ یہاں کے مقامی پیشوں کی بابت بتاتے ہوئے مصنفہ ڈاکیے کے کردار کے بارے میں بتاتی ہیں:

> "اس علاقے کے قدیم خطرناک دروں میں ڈاکیہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کا کام بے حد مشکل ہے۔ مضبوط توانا اور محتاط ڈاکیہ پہاڑیوں اور گھاٹیوں پر چڑھتا ہے دروں میں سے گزرتا ہے پانی میں چلتا ہے اور وقت پر اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے اس کا کام قوت برداشت ہمت اور ذاتی دلچسپی کا مظہر ہے وہ تمام اسکردو اور گلگت ایجنسی کو پاپیادہ طے کرتا ہے اکثر وہ چائے پینے اور لوگوں سے بات چیت کے لیے ٹھہر جاتا ہے اور انھیں پہاڑ کے دوسری طرف رہنے والے ان کے عزیزوں کی خیریت سے آگاہ کرتا ہے۔ ڈاکیہ کا ہمیشہ خیر مقدم کیا جاتا ہے۔"[491]

پنیال کے راجہ جان عالم کی رحمدلی اور عدل کو مصنفہ نے بہت سراہا ہے۔ پنیال میں مکئی کی موٹی کیک نما روٹی کھائی جاتی ہے۔ یہاں دودھ بہت گاڑھا ملتا ہے۔ پنیال میں دلہن کو جہیز دینے کی بجائے دلہا گھر والوں کو برتن اور کپڑے پیش کرتا ہے۔ بیشتر شادیاں کم عمری میں ہوتی ہیں۔ پنیال کے قبرستان میں ہر قبر پر ایک چارپائی بچھی تھی اور قبروں پر پھول بکثرت تھے۔ جس مہمان خانے میں مصنفہ کو لے جایا گیا وہاں ہر طرف پھول تھے، دیواریں، کارنس، کرسیوں کی پشت تمام پھولوں سے ڈھکے تھے۔[492] پنیال کا شمار بطور امیر ترین ہمالیائی ریاست کے ہوتا تھا۔ یہاں سے ہنزہ اور دیگر پہاڑی علاقوں کو گندم بھیجی جاتی تھی۔ یہاں بیشتر تقریبات زرعی زندگی کے گرد گھومتی ہیں۔ یہاں کے لوگ اپنے علاقے میں ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔

گوپس کو مصنفہ نے ازلی مسرت کی سرزمین قرار دیا ہے۔ یہاں پچھلے ایک سال کے دوران کوئی موت نہیں ہوئی تھی۔ مصنفہ نے راجہ کے دن کے اوقات کار کی تفصیل بھی بتائی ہے۔ یہاں مقامی طور پر تیار کردہ جوتوں کو بانس کی تیلی تیلیوں سے سجایا جاتا ہے۔ گوپس میں لوگوں کا دلپسند مشغلہ شکار کھیلنا تھا۔ یہاں لمبا فرغل نما لباس پہنا جاتا ہے جس کی

آستین دو گز لمبی ہوتی ہے۔ نیچے کی طرف چند انچ رہ جاتی ہے اور سرا ہتھیلی کے گرد لپیٹ لیا جاتا ہے جس سے انگلیاں آزادانہ حرکت کر سکتی ہیں اور گرمائش بھی ملتی ہے۔ یہاں لوگ عموماً بہت خوش تھے۔[493] ہنزہ کی جغرافیائی اہمیت بتاتے ہوئے مصنفہ نے اس کی قدیم تاریخ کا ذکر بھی کیا ہے۔ سکردو میں ہونے والے کامیاب زرعی تجربات، سکولوں، ہسپتال، مقامی لوگوں کی سماجی دلچسپیوں کا تذکر بھی کیا ہے۔ بلتی توانا اور کھلتی رنگت کے ہیں وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہیں تیز رفتار نہیں۔ اجنبیوں کا مسکرا کر خیر مقدم کرتے ہیں۔

کافرستان اور چترال، دیر، سوات کی سیاحت (1959ء)، محمود دانشور

ایرانی سیاح محمود دانشور نے پاکستان بننے کے تھوڑے عرصے بعد کافرستان، چترال، دیر اور سوات کی سیاحت کی اور اس پر مبنی سفر نامہ 1959ء سے پہلے لکھا۔ اس کا اردو ترجمہ کیا گیا۔ پشاور ہوائی اڈے پر چترالی مسافروں میں سے ایک نے مصنف کو سلام کیا تو مصنف کو حیرت ہوئی ان کا کہنا ہے:

"کیونکہ پاکستان کی سیاحت میں میں نے عام طور پر دیکھا ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کو سلام نہیں کرتے۔ تاوقتیکہ وہ ایک دوسرے سے شناسانہ ہوں۔"[494]

ان مسافروں کو دیکھ کر مصنف کو اندازہ ہوا کہ چترال میں فارسی بھی بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ موسم کی خرابی کے باعث جہاز پرواز نہ کر سکا جس کے کپتان کو فی سواری کے حساب سے 37 روپے جمع کرائے گئے تھے۔ اس لیے مصنف کو پیدل اور بس سے سفر کرنا پڑا۔ چارسدہ کے بارے میں مصنف نے بتایا کہ اس میں چار گاؤں ہیں اور بیس ہزار لوگ رہتے ہیں۔ پشتو بولی جاتی ہے۔ لوگ کاشتکار ہیں۔ گنا اور گندم زیادہ کاشت ہوتی تھی۔ تپ دق نزلہ زکام کی شکایت عام تھی۔ لوگ گدھی کے دودھ سے علاج کرتے اور نسوار کے عادی جا بجا تھوکتے تھے۔ چارسدہ سے مردان تک بس کے سفر میں انسانوں کے ساتھ جانور بھی نظر آئے۔ مالاکنڈ میں شکر کے کارخانے میں سفید کھاد دیکھ کر مصنف کو تعجب ہوا۔ بٹ خیلہ میں لوگوں کے رنگ زیادہ سرخ و سفید تھے۔ وہاں بازار میں دکانیں لکڑی کے ڈھانچوں یا مٹی کے ڈھیلوں سے بنی تھیں۔ چکدرہ میں عورتیں پابند تھیں کہ زنان خانوں سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ یہاں کے لوگ خرچ سے پرہیز کرتے ہیں مگر کھانے کے بعد نسوار ضرور کھاتے ہیں۔ ریاست دیر میں قبریں سڑکوں کے کنارے بنانے کی وجہ تھی کہ اس طرح زیادہ گزرنے والے لوگ فاتحہ خوانی کریں گے۔ 35 ہزار مربع میل ریاست دیر میں لکڑی بہت پیدا ہوتی۔ لوگ گرم پٹو بہت اعلیٰ بناتے۔ مرغ زریں اور نافہ آہو عام پایا جاتا تھا۔[495]

دیر میں ریاست کے نواب کے کتوں کے لیے ہسپتال موجود تھا مگر عوام کے علاج کے لیے ہسپتال نہیں تھا۔ چترال کے علاقے عشرت کے متعلق مصنف کا خیال ہے وہ عشرہ سے بگڑ کر بنا ہے۔ وہاں مدرسہ اور ہسپتال تھا۔ لوگ

خوش و خرم تھے اور سیاہ کی بجائے پھولدار چھینٹ کا لباس پہنتے تھے۔ دروش میں لوگ خوش حال اور خوش گفتار تھے، فارسی بولتے تھے، پولو کے شوقین تھے۔ دیر اور چترال کے ماحول میں مصنف کو نمایاں فرق نظر آیا۔

"یہاں پر تین چار ہسپتال بھی ہیں اور ہوٹل بھی ہم نے شفاخانے کو دیکھا۔ اس کا انتظام بہت اچھا تھا میں حیران تھا کہ ریاست دیر اور چترال کے چہروں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یہاں کے لوگ بہت ہی دلچسپ اور جوشیلے تھے۔"[496]

8800 مربع میل ریاست چترال میں چالیس پہاڑ تھے۔ ڈیڑھ لاکھ نفوس آباد تھے۔ عہد قدیم میں اسے کہورستان کہتے تھے۔ زرتشت روایات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد مہتروں کی حکومت کا ذکر کرنے کے ساتھ مصنف نے دیر اور چترال ریاستوں کی کشمکش کا ذکر کیا ہے۔ چترالی عورتیں دستکاری کی ماہر تھیں۔ لوگ سیاسی اعتبار سے بیدار تھے۔ بازار میں دکانیں لکڑی کی تھیں۔ جب بھی کوئی بڑا آدمی کسی لڑکی سے شادی کرتا تو اس کے لیے بازار میں ایک دکان بنا دیتا تھا جس کی آمدنی وہ وصول کرتی۔[497] مہتر چترال کی دستار بندی پر بہت خوشی مناتے ہیں۔ بڑے بڑے درباری دستار کی ایک ایک پیچ مہتر کے سر پر لپیٹتے باقی اکابر تبرکاً صرف دستار کو چھوتے۔ مستوج میں نوروز کے موقع پر آگ روشن کر کے آٹا چھڑکا جاتا اور گھروں میں آٹے سے بیل بوٹے بنائے جاتے ہیں، ہر گھر میں حلوہ پکایا جاتا۔ مستوج میں قدیم محرابوں پر انسانوں کی تصویریں کندہ تھیں۔ ان کی رسومات کے تذکرے کے بعد مصنف زبان کے بارے میں کہتے ہیں کہ بدخشاں اور کابل سے تجارت کے باعث لوگوں کو فارسی بولنی پڑتی ہے۔ چترال کے ایک تہہ خانے میں چھ سو سال پرانے ڈھانچے موجود تھے۔ یہاں معدنیات بہت ہیں۔ دریاؤں کے کنارے سونا جمع کرنے والے ریاست کو محصول ادا کرتے تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے یہاں سرمے کی کان میں کام ہوتا تھا جو بعد میں بند ہو گیا۔ عورتوں کی آزادی معنی نہیں رکھتی لڑکیوں کی خرید و فروخت کی جاتی۔ مہتر چترال کے زمانے میں یہاں سے لڑکی باہر لے جانے کا 600 روپیہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ بعض لوگ سرو کے پودوں کو جلا کر اور بعض پلائی کے پتوں کو جلا کر نسوار کے طور پر استعمال کرتے۔ اسماعیلی آغا خان کے نائب کو جھک کر ہاتھ پر بوسہ دیتے۔ اسماعیلی عورتیں پردہ نہیں کرتیں اور امداد باہمی کے لیے بہت کام کرتیں۔ آغا خان کے نائب نے ملاقات پر مصنف کو آلو کے پتے اور بیج کھانے کے لیے پیش کیے۔[498]

عیون میں عورتیں پردہ کرتی تھیں۔ پولو میں اتنی دلچسپی لیتی تھیں کہ اپنے خاوندوں کے ساتھ شرط لگاتیں کہ پولو میں ہارے تو طلاق لے لیں گی۔ چھوٹے چھوٹے بچے تیر کمان کے بہت شوقین تھے۔ لوگ زراعت سے وابستہ تھے اور کچھ دیسی قالین بناتے تھے۔ بمبوریت کافروں کا صدر مقام ہے وہاں جانوروں کے ناموں پر انسانوں کے نام رکھے جاتے۔ اژدھا نامی ایک شخص نے جھک کر وہاں کے رواج کے مطابق مصنف کو تعظیم دی۔ اس نے چیتے کی کھال پہن

رکھی تھی۔ معروف آدمیوں کی وفات پر جنگل میں ان کا لکڑی کا مجسمہ تیار کر کے سال بعد قبرستان میں کھڑا کرنے کی رسم کرتے ہیں۔ ایسے ایک جلوس میں موجود مقامی لوگوں کے لباس کی وضاحت اس طرح کی ہے:

"۔۔۔ درختوں کی اوٹ سے سفید سفید چیزیں نمودار ہوئیں۔ کافروں کا یہ ہجوم نمودار ہونے لگا۔ انھوں نے سر پر عجیب و غریب لباس پہن رکھے تھے۔ ان کی اوڑھنیوں پر بے شمار سمندری مہرے اور کوڑیاں ٹکی ہوئی تھیں اور ان میں سے چند لوگ اس عجیب و غریب لباس کے ساتھ آگے آگے ناچ رہے تھے اور ان کوڑیوں اور مہروں سے عجیب و غریب شور بپا ہو رہا تھا۔ عورتوں کی اوڑھنیوں کے ساتھ گھنگرو بندھے ہوئے تھے۔۔۔ مردوں نے اونی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں اور اس کے ساتھ بعض کافروں کے چغے بہت لمبے تھے۔"[499]

لکڑی کے مجسموں پر خوبانی اور خشک آلو کے ہار پہنائے جاتے تھے۔ پلاوند گاؤں میں نئے مہمان کے آنے پر خواتین کے خاص رقص کرنے کی روایت ہے۔ وہ سمجھتے ہیں دوسرے ملک کے مہمان کی آمد پر وادی میں بارش ضرور ہوتی ہے۔ کافرستان میں چھوٹے چھوٹے مکانات تین منزلہ ہوتے ہیں۔ ایک کمرے پر دوسرا اور دوسرے پر تیسرا۔ دھوئیں کے باعث سیاہ۔ تبرکاً ہر کمرے کے باہر بکرے کے سینگ اور پتے لگاتے ہیں اسے ہاتھ نہیں لگاتے۔ اس پر گھر والوں کی سلامتی کا انحصار سمجھا جاتا ہے۔ لکڑی کے مکانوں میں پتر بھی استعمال کرتے ہیں مہمانوں کی آمد پر روٹی اور پنیر سے تواضع کی جاتی ہے۔[500] کالاش معبد میں عورتوں کا جانا ممنوع ہے وہاں عورتیں نجس قرار دی گئی ہیں۔ مہتر چترال کے زمانے میں بیگار سے بچنے کے لیے لوگ صرف ایک وقت کا آٹا پیس کر کھاتے تھے تاکہ اس کے بندوقچی سے کہہ سکیں کہ ہمارے پاس آٹا نہیں۔ مصنف نے ان کے رسم ورواج، شادی، اور موت کی رسوم، تہواروں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مصنف کو کالاشیوں اور زرتشتوں کی رسوم میں مماثلت نظر آئی۔ یہاں نام رکھنے کا عجیب طریقہ تھا جب نومولود کو اس کی ماں دودھ پلانے بیٹھتی تو بڑی بوڑھیاں اس کے آباؤاجداد کے نام لیتیں جس نام پر پہنچ کر بچہ پہلا گھونٹ لے وہی اس کا نام رکھ دیا جاتا اس لیے وہاں نام بار بار دہرائے جاتے ہیں۔[501] تیر ناکافروں کے مذہب کا جزو ہے۔ لوگ نمک کے بغیر ہی کام چلاتے ہیں، عورتیں کاجل کی قسم کی سیاہی گالوں اور ماتھوں پر لگاتیں۔ قاتل کی سزا جلاوطنی تھی۔ کٹائی کے موقع پر سب مل کر کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے معاوضہ نہیں لیتے۔ مصنف نے ان کے دیوتاؤں سے منسوب قصوں کا بھی ذکر کیا۔ ان کے نزدیک کافر قدیم آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مہمان کی آمد پر پنیر پر خوب گرم گھی ڈالتے ہیں۔ ان کے شراب کشید کرنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ شام کے کھانے کے بعد یہ چارپائی نہیں ہلا سکتے۔ سرخ اور سیاہ کافروں کے فرق کی بھی وضاحت کی ہے۔

سوات کی ترقی کو دیکھ کر مصنف بہت خوش ہوئے۔ قدیم سوات کے بارے میں ان کا کہنا ہے:

"سوات خالص پٹھانوں کا علاقہ ہے اور وہاں ہر جگہ پشتو بولی جاتی ہے۔ ایک وقت تھا کہ یہاں دھاندلی مچی ہوئی تھی۔ دو پیسے کی خاطر انسان کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ کوئی قانون نہیں تھا۔ یہ سرزمین ڈاکوؤں کی آماجگاہ تھی۔ ہر

طرف لا قانونیت تھی۔ جہالت تھی۔ تباہی و بربادی تھی۔۔۔ لیکن اب میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ ریاست تمام ریاستوں سے زیادہ متمدن اور مہذب نظر آتی تھی۔"[502]

مصنف کے بقول سوات کو یوسف زئی ریاست بھی کہتے ہیں۔ اس کا قدیم نام اسود بھی تھا۔ چھ لاکھ آبادی میں سبھی کاشتکار ہیں۔ تمام پہاڑ سبزے سے ڈھکے ہیں۔ ساری ریاست میں عمدہ سڑکیں تھیں۔ لوگ دستکاری میں ماہر تھے۔ یہاں اعلیٰ تعلیم کے لیے طلبا کو ریاست کے خرچ پر لاہور اور پشاور بھیجا جاتا۔ سوات میں جمع کو لوگ والی سوات کو بقدر استطاعت نذرانے پیش کرتے یہ بہت قدیم رسم ہے۔ سوات کے ہر قصبے میں مصنف کو بلند معیار زندگی دیکھنے کو ملا۔ یہاں چار دن شکار تعطیل بھی دی جاتی تھی۔ فوجیوں کو تنخواہ غلے کی جنس کی صورت میں ادا کی جاتی۔ کالام کے خانہ بدوشوں کے بارے میں مصنف کہتے ہیں:

"۔۔۔ راستے میں میں نے دیکھا کہ کچھ خانہ بدوش اور دوسرے گلہ بان پیدل کالام کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ لوگ گرمی کے موسم میں کالام چلے جاتے ہیں۔ وہ گاتے بجاتے اور رقص کرتے ہوئے اپنا راستہ کاٹ رہے ہیں۔ ان کی زندگی بڑی دلچسپ تھی۔۔۔ ان کی عورتوں نے چاندی کے عجیب و غریب زیور پہن رکھے تھے۔"[503]

سوات میں ٹریفک کنٹرول کا نظام مصنف کو خاطر خواہ نہیں لگا۔ یہاں ٹینس بہت کھیلی جاتی تھی۔ ریاست سوات کی بہتری کے لیے مصنف نے تجاویز بھی اپنے سفر نامے میں شامل کیں۔

زنجبار سے پاکستان (1962ء)، علی غلام حسین زنجباری

افریقہ سے تعلق رکھنے والے علی غلام حسین زنجباری نے 1959ء سے 1962ء تک مختلف ممالک کا سفر کیا۔ وہ 1962ء میں چند ماہ پاکستان رہے اور پاکستان کے مختلف شہروں کے سفر کے حالات اپنی کتاب میں شامل کیے جو 1963ء میں شائع ہوئی۔ علی غلام حسین زنجباری نے مالاکنڈ میں پولیٹیکل ایجنٹ کی سرد مہری کا شکوہ کیا ہے جبکہ ایک دکاندار نے روایتی مہمانداری سے مصنف کو اپنے ہاں جگہ دی۔ ریاست سوات میں حسن انتظام سے بہت متاثر ہوئے اور والی سوات کی بہت تعریف کی۔ سوات کی مختصر تاریخ، اس کے قدیم ناموں سوتیا، سواستو کا بھی ذکر کرنے کے علاوہ بت کدہ میں بدھ مت کے قدیم آثار کی بابت بھی بتایا ہے۔

"اس جگہ سے سات سو کے قریب بت نکالے گئے ہیں۔ بت کدہ ایک بہت بڑی عبادت گاہ تھی جہاں چینی بدھ مت کے پیرو آیا کرتے تھے۔ اس جگہ ایک بہت بڑا سٹوپا ہے جو دو صد سے زائد چھوٹے چھوٹے سٹوپوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس عبادت گاہ کی تعمیر غالباً دوسری صدی سے آٹھویں صدی عیسوی میں ہوئی تھی۔"[504]

مینگورہ سے زمرد کی دریافت کا ذکر کرنے کے ساتھ سوات کے باشندوں کی خوب صورتی کے بارے میں بتاتے ہیں کہ سرخ و سفید ہیں خواتین پردہ نہیں کرتیں۔ یہاں کے لوگ اپنی لڑکیوں کو غیر ملکیوں اور پاکستانیوں سے شادی کی اجازت نہیں دیتے۔ والی سوات خود بازاروں کا دورہ کرکے عوام کی شکایات سنتے ہیں۔ بحرین سے کالام تک کے راستے کی

خطرناکی کی نشاندہی کی ہے۔کالام میں کوہستانی زبان بولی اور سمجھی جاتی تھی۔اس وقت وہاں کی ایک سرائے میں اردو اور انگریزی سے سب نابلد تھے۔[505]

ریاست دیر کے علاقے چکدرہ میں رامورانامی تاریخی قلعے کا ذکر کیا ہے۔قبائلیوں کی انگریزوں سے شکست کے بعد ان کے جرنیل نے قلعے کو مسمار کرنے کے لیے چاروں طرف بارود بچھایا مگر دھماکے کے باوجود قلعہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔بعد میں کھدائی سے پتہ چلا کہ اس کی بنیاد پندرہ فٹ زیر زمین سے اٹھائی گئی ہے اور عمرا خان نے تعمیر کرایا۔مصنف نے ایرانی سیاح محمود دانشور کی کتاب "کافرستان" میں ریاست دیر کے بارے میں فراہم کردہ معلومات کو غلط قرار دیا ہے۔[506]لواری ٹاپ کراس کر کے مصنف چترال کے علاقوں دروش اور عشرت گئے۔چترال کی جغرافیائی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔اس وقت چترال میں صرف ایک بازار تھا۔کافرستان کے بارے میں انھوں نے ایرانی سیاح محمود دانشور کی فراہم کردہ معلومات کو جھٹلایا ہے۔بودلک رسم کے بارے میں کہا ہے کہ یہ صرف پرانے وقتوں میں ہوتی تھی اب اس کا رواج نہیں۔کافرستان کی شادی، بیاہ اور موت کی رسومات، ان کے عقائد کا تذکرہ بھی کیا ہے۔عورتوں کے لیے مخصوص قیام گاہ کو مصنف نے بشی لوئی کہا ہے۔عیون میں مذہبی تعلیم حاصل کرنے والا تیرہ سالہ نوعمر لڑکا گسکورو گاؤں میں مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتا تھا۔[507]بمبوریت میں ڈسپنسری محض خالی عمارت تھی بنیادی دوائیوں کے نام پر بھی کچھ نہیں تھا۔کالاشی خواتین کا لباس پھٹ کر ہی ان کے جسم سے الگ ہوتا ہے۔یہاں کے لوگوں میں سیاحوں سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کا لالچ بڑھ چکا ہے۔مصنف کو کالاشیوں کے رقص نے مایوس کیا۔عیون کو مصنف نے مہذب ترین گاؤں قرار دیا ہے۔وہاں کے سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں سیاحوں سے کرایہ نہیں لیا جاتا۔وہاں لوگوں میں افغانستان سے نفرت کے جذبات پروان چڑھ رہے تھے۔

دیر کوہستان میں شیریں گل گاؤں میں تمام مکان لکڑی کے بنے تھے۔سکول کھولے گئے تھے مگر طالب علم نہیں تھے پتراک کے آگے گل کوٹ اخروٹوں، گھی، زیرہ، لوبیا، مکئی اور دیگر اشیا کی منڈی ہے۔ریاست دیر کے سابق نواب کے اجازت نامے سے لوگ اپنی من مانی قیمت پر اشیا کی تجارت کرتے تھے۔وہاں پہاڑوں کے نام عجیب تھے مثلاً جبرو، شیل، شترو، راتک، چیتورا، قمرات۔یہاں آدمیوں کے نام بھی دلچسپ تھے جیسے بجور، دریلی تھل، بیور، سلور، غلوروو غیرہ۔[508]

حواشی

1. مستنصر حسین تارڑ، ہنزہ داستان (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2002ء)، ص19۔
2. ایضاً، ص36۔
3. ایضاً، ص44۔
4. ایضاً، ص84-85۔
5. ایضاً، ص93۔
6. ایضاً، ص95۔
7. ایضاً، ص100۔
8. ایضاً، ص114۔
9. ایضاً، ص123۔
10. ایضاً، ص125۔
11. ایضاً، ص140۔
12. ایضاً، ص162۔
13. ایضاً، ص185۔
14. ایضاً، ص188-189۔
15. ایضاً، ص191۔
16. ایضاً، ص201۔
17. ایضاً، ص218۔
18. ایضاً، ص233۔
19. ایضاً، ص267۔
20. مستنصر حسین تارڑ، سفر شمال کے (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2001ء)، ص12۔
21. ایضاً، ص26-27۔
22. ایضاً، ص38-39۔
23. ایضاً، ص49-50۔
24. ایضاً، ص53۔

25. ایضاً، ص67۔

26. ایضاً، ص76۔

27. ایضاً، ص79-80۔

28. ایضاً، ص85۔

29. ایضاً، ص129۔

30. ایضاً، ص151۔

31. ایضاً، ص170۔

32. ایضاً، ص190۔

33. ایضاً، ص212۔

34. ایضاً، ص217۔

35. ایضاً، ص221۔

36. ایضاً، ص229-230۔

37. مستنصر حسین تارڑ، چترال داستان (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2012ء)، ص14۔

38. ایضاً، ص20-21۔

39. ایضاً، ص26۔

40. ایضاً، ص26۔

41. ایضاً، ص33۔

42. ایضاً، ص37۔

43. ایضاً، ص70۔

44. ایضاً، ص86۔

45. ایضاً، ص101۔

46. ایضاً، ص108۔

47. ایضاً، ص133۔

48. ایضاً، ص133۔

49. ایضاً، ص136۔

50. ایضاً، ص147۔
51. ایضاً، ص152-153۔
52. ایضاً، ص165۔
53. ایضاً، ص171۔
54. ایضاً، ص181۔
55. ایضاً، ص188۔
56. ایضاً، ص204۔
57. ایضاً، ص239۔
58. مستنصر حسین تارڑ، نانگا پربت بلتستان(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز، 2001ء)، ص12۔
59. ایضاً، ص17-19۔
60. ایضاً، ص23۔
61. ایضاً، ص28۔
62. ایضاً، ص38۔
63. ایضاً، ص42۔
64. ایضاً، ص45۔
65. ایضاً، ص58۔
66. ایضاً، ص60۔
67. ایضاً، ص66۔
68. ایضاً، ص69-70۔
69. ایضاً، ص74۔
70. ایضاً، ص101۔
71. ایضاً، ص120-121۔
72. ایضاً، ص137۔
73. ایضاً، ص209۔
74. ایضاً، ص225۔

75. ایضاً، ص234۔
76. ایضاً، ص250۔
77. ایضاً، ص257۔
78. ایضاً، ص267۔
79. ایضاً، ص318۔
80. ایضاً، ص347۔
81. ایضاً، ص366۔
82. ایضاً، ص368۔
83. ایضاً، ص379۔
84. ایضاً۔ ص408۔
85. مستنصر حسین تارڑ، کے ٹو کہانی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1995ء)، ص46۔
86. ایضاً، ص82۔
87. ایضاً، ص92۔
88. ایضاً، ص98۔
89. ایضاً، ص119۔
90. ایضاً، ص143۔
91. ایضاً، ص146۔
92. ایضاً، ص147۔
93. ایضاً، ص156۔
94. ایضاً، ص176۔
95. ایضاً، ص229۔
96. ایضاً، ص290۔
97. ایضاً، ص309۔
98. ایضاً، ص329۔
99. مستنصر حسین تارڑ، یاک سرائے (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2010ء)، ص45۔

100. ایضاً، ص72۔

101. ایضاً، ص81۔

102. ایضاً، ص90۔

103. ایضاً، ص90-94۔

104. ایضاً، ص129۔

105. ایضاً، ص168۔

106. ایضاً، ص185۔

107. ایضاً، ص205۔

108. ایضاً، ص252۔

109. ایضاً، ص313۔

110. ایضاً، ص329۔

111. ایضاً، ص353۔

112. ایضاً، ص362۔

113. ایضاً، ص409۔

114. مستنصر حسین تارڑ، سنو لیک (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2013ء)، ص11۔

115. ایضاً، ص17۔

116. ایضاً، ص75۔

117. ایضاً، ص95۔

118. ایضاً، ص117۔

119. ایضاً، ص128۔

120. ایضاً، ص133۔

121. ایضاً، ص172۔

122. ایضاً، ص197۔

123. ایضاً، ص361۔

124. ایضاً، ص393۔

125. ایضاً،ص407۔

126. ایضاً،ص408۔

127. ایضاً،ص452۔

128. ایضاً،ص465-466۔

129. ایضاً،ص474۔

130. ایضاً،ص496۔

131. مستنصر حسین تارڑ،دیوسائی(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2012ء)،ص10۔

132. ایضاً،ص29۔

133. ایضاً،ص37۔

134. ایضاً،ص82۔

135. ایضاً،ص105۔

136. ایضاً،ص139۔

137. ایضاً،ص152۔

138. ایضاً،ص159۔

139. ایضاً،ص169۔

140. ایضاً،ص222۔

141. ایضاً،ص252۔

142. ایضاً،ص306۔

143. مستنصر حسین تارڑ،شمشال بے مثال(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2000ء)،ص15۔

144. ایضاً،ص19۔

145. ایضاً،ص26۔

146. ایضاً،ص37۔

147. ایضاً،ص43-44۔

148. ایضاً،ص50۔

149. ایضاً،ص51۔

150. ایضاً، ص56۔

151. ایضاً، ص68۔

152. ایضاً، ص91۔

153. ایضاً، ص113۔

154. ایضاً، ص118۔

155. ایضاً، ص138۔

156. ایضاً، ص154۔

157. ایضاً، ص163۔

158. ایضاً، ص179۔

159. ایضاً، ص197۔

160. ایضاً، ص201۔

161. ایضاً، ص207۔

162. ایضاً، ص208۔

163. ایضاً، ص211-212۔

164. ایضاً، ص218-219۔

165. ایضاً، ص223۔

166. ایضاً، ص231۔

167. مستنصر حسین تارڑ، برفیلی بلندیاں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2012ء)، ص20۔

168. ایضاً، ص42۔

169. ایضاً، ص58۔

170. ایضاً، ص73۔

171. ایضاً، ص75۔

172. ایضاً، ص88۔

173. ایضاً، ص117۔

174. ایضاً، ص171۔

175. ایضاً، ص220۔

176. ایضاً، ص245۔

177. ایضاً، ص246۔

178. ایضاً، ص273۔

179. ایضاً، ص279۔

180. ایضاً، ص284۔

181. ایضاً، ص287۔

182. ایضاً، ص288۔

183. ایضاً، ص294۔

184. ایضاً، ص305۔

185. ایضاً، ص309۔

186. ایضاً، ص328۔

187. ایضاً، ص346۔

188. ایضاً، ص368۔

189. ایضاً، ص381۔

190. مستنصر حسین تارڑ، رتی گلی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2014ء)، ص21۔

191. ایضاً، ص36۔

192. ایضاً، ص45۔

193. ایضاً، ص65۔

194. ایضاً، ص83۔

195. ایضاً، ص89۔

196. ایضاً، ص99۔

197. ایضاً، ص102۔

198. ایضاً، ص104۔

199. ایضاً، ص111۔

200. ایضاً، ص135۔
201. ایضاً، ص167۔
202. ایضاً، ص181۔
203. ایضاً، ص185۔
204. ایضاً، ص192۔
205. ایضاً، ص225۔
206. ایضاً، ص250۔
207. مستنصر حسین تارڑ، راکا پوشی نگر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2015ء)، ص10۔
208. ایضاً، ص28۔
209. ایضاً، ص41۔
210. ایضاً، ص48۔
211. ایضاً، ص49۔
212. ایضاً، ص57۔
213. ایضاً، ص63۔
214. ایضاً، ص76-77۔
215. ایضاً، ص135۔
216. ایضاً، ص171۔
217. ایضاً، ص200-201۔
218. ایضاً، ص210۔
219. مستنصر حسین تارڑ، حرا موش نا قابل فراموش (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2017ء)، ص32۔
220. ایضاً، ص38۔
221. ایضاً، ص46۔
222. ایضاً، ص53۔
223. ایضاً، ص59۔
224. ایضاً، ص66۔

225. ایضاً، ص71۔

226. ایضاً، ص72۔

227. ایضاً، ص73۔

228. ایضاً، ص98۔

229. ایضاً، ص113۔

230. ایضاً، ص128۔

231. ایضاً، ص161۔

232. ایضاً، ص163۔

233. ایضاً، ص168۔

234. ایضاً۔ ص180۔

235. سلمیٰ اعوان، یہ میرا بلتستان(لاہور: الفیصل پبلی کیشنز، 2005ء)، ص11۔

236. ایضاً، ص17-18۔

237. ایضاً، ص21۔

238. ایضاً، ص22۔

239. ایضاً، ص28۔

240. ایضاً، ص30۔

241. ایضاً، ص37-40۔

242. ایضاً۔ ص84۔

243. ایضاً، ص96۔

244. ایضاً، ص99۔

245. ایضاً، ص102۔

246. ایضاً، ص108۔

247. ایضاً، ص113۔

248. ایضاً، ص144۔

249. ایضاً، ص157۔

250. ایضاً،ص163-166۔

251. ایضاً،ص185۔

252. ایضاً،ص216-219۔

253. ایضاً،ص234۔

254. سلمٰی اعوان،میرا گلگت و ہنزہ(لاہور:الفیصل پبلی کیشنز،2012ء)،ص24۔

255. ایضاً،ص27-28۔

256. ایضاً،ص35۔

257. ایضاً،ص42-43۔

258. ایضاً،ص50۔

259. ایضاً،ص56۔

260. ایضاً،ص63۔

261. ایضاً،ص67۔

262. ایضاً،ص73۔

263. ایضاً،ص102۔

264. ایضاً،ص108۔

265. ایضاً،ص110۔

266. ایضاً،ص117۔

267. ایضاً،ص121۔

268. ایضاً،ص137۔

269. ایضاً،ص173۔

270. ایضاً،ص186-187۔

271. ایضاً،ص217۔

272. ایضاً،ص226-227۔

273. ایضاً،ص245۔

274. ایضاً،ص317۔

275. سلمیٰ اعوان،میرا سندر چترال(لاہور:الفیصل پبلی کیشنز،2013ء)،ص27۔
276. ایضاً،ص30۔
277. ایضاً،ص40۔
278. ایضاً،ص42۔
279. ایضاً،ص48۔
280. ایضاً،ص52۔
281. ایضاً،ص56۔
282. ایضاً،ص57۔
283. ایضاً،ص59-60۔
284. ایضاً،ص63-64۔
285. ایضاً،ص66۔
286. ایضاً،ص82۔
287. ایضاً،ص84۔
288. ایضاً،ص86۔
289. ایضاً،ص91۔
290. ایضاً،ص113۔
291. ایضاً،ص119۔
292. ایضاً،ص146۔
293. ایضاً،ص147۔
294. ایضاً،ص158۔
295. ایضاً،ص169۔
296. ایضاً،ص223۔
297. ایضاً،ص227۔
298. ڈاکٹر عباس برمانی،کیلاش کتھا(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2002ء)،ص10۔
299. ایضاً،ص25۔

300. ایضاً، ص27۔

301. ایضاً، ص29-31۔

302. ایضاً، ص33۔

303. ایضاً، ص35۔

304. ایضاً، ص39۔

305. ایضاً، ص44۔

306. ایضاً، ص51۔

307. ایضاً، ص53۔

308. ایضاً، ص66۔

309. ایضاً، ص80۔

310. ایضاً، ص95۔

311. ایضاً، ص105۔

312. ایضاً، ص136۔

313. ڈاکٹر عباس برمانی، برف دریاؤں کے سفر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2005ء)، ص25۔

314. ایضاً، ص34۔

315. ایضاً، ص52۔

316. ایضاً، ص57۔

317. ایضاً، ص62۔

318. ایضاً، ص66۔

319. ایضاً، ص68۔

320. ایضاً، ص72۔

321. ایضاً، ص118۔

322. ڈاکٹر عباس برمانی، میرا سندھو سائیں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2001ء)، ص13۔

323. ایضاً، ص18۔

324. ایضاً، ص19۔

325. ایضاً، ص21۔

326. ایضاً، ص24۔

327. ایضاً، ص24۔

328. ایضاً، ص39۔

329. ایضاً، ص44۔

330. ایضاً، ص50۔

331. ایضاً، ص63۔

332. ایضاً، ص79۔

333. ایضاً، ص95۔

334. ڈاکٹر اقبال ہما، جہاں پریاں اترتی ہیں (لاہور: فکشن ہاؤس، 2011ء)، ص48۔

335. ایضاً، ص67-68۔

336. ایضاً، ص94۔

337. ایضاً، ص95۔

338. ایضاً، ص100۔

339. ایضاً، ص106-107۔

340. ایضاً، ص137۔

341. ایضاً، ص168۔

342. ایضاً، ص201۔

343. ایضاً، ص207۔

344. ایضاً، ص210۔

345. ایضاً، ص212-213۔

346. ایضاً، ص221۔

347. ڈاکٹر اقبال ہما، کے ٹو برفانی وادیاں (لاہور: فکشن ہاؤس، 2015ء)، ص37-38۔

348. ایضاً، ص42۔

349. ایضاً، ص58۔

350. ایضاً، ص63۔

351. ایضاً، ص98۔

352. ایضاً، ص113۔

353. ایضاً، ص119۔

354. ایضاً، ص146۔

355. ایضاً، ص157۔

356. ایضاً، ص158۔

357. ایضاً، ص242۔

358. ایضاً، ص246۔

359. ڈاکٹر محمد منیر مرزا، پھول دیوسائی کے (لاہور: سجاد پبلی کیشنز، 2014ء)، ص15۔

360. ایضاً، ص47۔

361. ایضاً، ص53۔

362. ایضاً، ص63۔

363. ایضاً، ص64۔

364. ایضاً، ص95۔

365. ایضاً، ص106۔

366. ایضاً، ص109۔

367. ڈاکٹر محمد منیر مرزا، پربتوں کا شیندور (لاہور: سجاد پبلی کیشنز، 2012ء)، ص15۔

368. ایضاً، ص19۔

369. ایضاً، ص24۔

370. ایضاً، ص30۔

371. ایضاً، ص39۔

372. ایضاً، ص41۔

373. ایضاً، ص54۔

374. ایضاً، ص55۔

375. ایضاً،ص74-75۔

376. ایضاً،ص88۔

377. ایضاً،ص96۔

378. ایضاً،ص113۔

379. ایضاً،ص119۔

380. ڈاکٹر محمد منیر مرزا،لداخ سے وادی مہران تک(لاہور: سجاد پبلی کیشنز،2015ء)،ص28۔

381. محمد خالد اختر،دو سفر (لاہور: مطبوعات،۱۹۸۴ء)،ص47۔

382. ایضاً،ص73۔

383. ایضاً،ص149۔

384. مسعود سلطان کھیسر،سینہء سنگ پر ریشم کا رستہ(لاہور: جودت پبلی کیشنز۱۹۷۹ء)،ص56۔

385. ایضاً،ص68۔

386. ایضاً،ص108۔

387. اشفاق احمد،سفر در سفر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،2013ء)،ص16۔

388. ایضاً،ص21۔

389. ایضاً،ص24۔

390. ایضاً،ص44۔

391. ایضاً،ص68۔

392. ایضاً،ص71۔

393. ایضاً،ص22۔

394. مختار مسعود،سفر نصیب(لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت،2012ء پندرھواں ایڈیشن)،ص19۔

395. ایضاً،ص24۔

396. ایضاً،ص29۔

397. ایضاً،ص43۔

398. ایضاً،ص67-68۔

399. ایضاً،ص70۔

400. ایضاً،ص73-74۔

401. ایضاً،ص76۔

402. ایضاً،ص88-89۔

403. ایضاً،ص103۔

404. ایضاً،ص109۔

405. ایضاً،ص117۔

406. پروین عاطف،کرن تتلی اور بگولے(لاہور:جنگ پرنٹنگ پریس،۱۹۸۷ء)،ص123۔

407. ایضاً،ص132۔

408. ایضاً،ص216۔

409. ایضاً،ص217-218۔

410. ڈاکٹر محمد عمران اسلم، لیڈی فنگر(لاہور:خزینہ علم وادب،2005ء)،ص67۔

411. ایضاً،ص70۔

412. ایضاً،ص83۔

413. ایضاً،ص86۔

414. ایضاً،ص100۔

415. ایضاً،ص116۔

416. ایضاً،ص118۔

417. ایضاً،ص187۔

418. ایضاً،ص281۔

419. اجمل سعید پراچہ،نانگا پربت کے حضور(لاہور:علم وعرفان پبلشرز،2003ء)،ص15۔

420. ایضاً،ص26۔

421. ایضاً،ص33۔

422. ایضاً،ص42۔

423. ایضاً،ص46۔

424. ایضاً،ص73۔

425. ایضاً، ص76۔

426. ایضاً، ص84۔

427. ایضاً، ص95۔

428. ایضاً، ص96۔

429. ایضاً، ص105۔

430. ایضاً، ص110۔

431. ایضاً، ص122۔

432. آغا سلمان باقر، دھماکہ لیک سوات (لاہور: مکتبہ عالیہ، 2008ء)، 37۔

433. ایضاً، ص53۔

434. ایضاً، ص61۔

435. ایضاً، ص100-105۔

436. ایضاً، ص113۔

437. ایضاً، ص124۔

438. ایضاً، ص142۔

439. ایضاً، ص151۔

440. ایضاً، ص211۔

441. ایضاً، ص239-240۔

442. ایضاً، ص258-259۔

443. ایضاً، ص290۔

444. مزملہ شفیق، سفرنامہء ا سکردو (لاہور: فیروز سنز، ۲۰۰۶ء)، ص29۔

445. ایضاً، ص46۔

446. ایضاً، ص83۔

447. مزملہ شفیق، نانگا پربت کے سو چہرے (کراچی: رنگ و ادب پبلی کیشنز، 2018ء)، ص44۔

448. ایضاً، ص77۔

449. جواد شیرازی، قراقرم کے برف زاروں سے (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2011ء)، ص23۔

450. ایضاً، ص34۔

451. ایضاً، ص36۔

452. ایضاً، ص41۔

453. ایضاً، ص44۔

454. ایضاً، ص57۔

455. ایضاً، ص148۔

456. ایضاً، ص152۔

457. عرفان الحق، کسے ٹو کہوں کہ چھگوری (لاہور: سجاد پبلی کیشنز، 2012ء)، ص37۔

458. ایضاً، ص39۔

459. ایضاً، ص44۔

460. ایضاً، ص49۔

461. ایضاً، ص55۔

462. ایضاً، ص59-60۔

463. محمد احسن، دیوسائی میں ایک رات (لاہور: فیکٹ پبلی کیشنز، 2013ء)، ص62۔

464. ایضاً، ص63۔

465. ایضاً، ص143۔

466. ایضاً، ص155۔

467. ایضاً، ص181۔

468. ایضاً، ص200۔

469. ایضاً، ص233۔

470. ایضاً، ص243۔

471. ایضاً، ص259۔

472. ایضاً، ص273۔

473. ایضاً، ص297۔

474. ایضاً، ص350۔

475. ایضاً، ص412۔

476. ایضاً، ص506۔

477. ایضاً، ص512۔

478. ایضاً، ص525۔

479. عمران الحق چوہان،بستی بستی پربت پربت(لاہور:بک ہوم،۲۰۱۳ء)،ص17۔

480. ایضاً، ص24۔

481. ایضاً، ص25۔

482. ایضاً، ص61۔

483. قمر علی عباسی،برف کے شہر (کراچی:ویلکم بک مارٹ،2014ء)،ص19۔

484. ایضاً، ص39۔

485. ایضاً، ص41۔

486. ایضاً، ص50۔

487. ایضاً، ص82۔

488. ایضاً، ص87۔

489. ایضاً، ص93۔

490. کیمی میرپوا،سفرنامہ ءپاکستان مترجم:محمد حسن(لاہور:بک ہوم،2005ء)،ص142-143۔

491. ایضاً، ص181۔

492. ایضاً، ص185۔

493. ایضاً، ص196۔

494. محمود دانشور،کافرستان اور چترال، دیر، سوات کی سیاحت،مترجم:خلیل احمد(لاہور: الفیصل ناشران،2006ء)،ص15۔

495. ایضاً، ص40۔

496. ایضاً، ص57۔

497. ایضاً، ص63۔

498. ایضاً، ص74۔

499. ایضاً، ص88۔

500. ایضاً، ص93۔

501. ایضاً، ص150-151۔

502. ایضاً، ص190۔

503. ایضاً، ص214۔

504. علی غلام حسین زنجباری، زنجبار سے پاکستان (لاہور: مکتبہ جدید پریس، 2015ء)، ص156۔

505. ایضاً، ص159۔

506. ایضاً، ص168۔

507. ایضاً، ص179۔

508. ایضاً، ص191۔

ماحصل

ماحصل

زیر تحقیق موضوع "شمالی پاکستان کے بارے اردو سفر ناموں کا تحقیقی و ثقافتی مطالعہ (قیام پاکستان سے پہلے اور بعد)" متقاضی تھا کہ جانا جائے شمالی پاکستان کی تاریخ اور جغرافیائی حقائق کیا ہیں؟ ثقافتی مطالعے کی غرض سے تہذیب و ثقافت کے نظری مباحث کیا ہیں؟ سفر ناموں میں تہذیب و ثقافت کی اہمیت و ضرورت کیا ہے؟ شمالی پاکستان کی تہذیب و ثقافت کیا ہے؟ قیام پاکستان سے پہلے اور بعد کے شمالی پاکستان کے اردو سفر ناموں میں مقامی تہذیب و ثقافت کو کس انداز میں اجاگر کیا گیا؟ قیام پاکستان سے پہلے اور بعد کے سفر ناموں میں مقامی تہذیب و ثقافت کی پیشکش میں کیا فرق ہے؟ ان تحقیقی سوالات کے جوابات کی تکمیل مرحلہ وار کی گئی۔ اس موضوع کے لیے یہ فرضیہ قائم کیا گیا کہ شمالی پاکستان کے اردو سفر ناموں میں تاریخی اور جغرافیائی معلومات کا تناسب تہذیبی و ثقافتی معلومات سے زیادہ ہے۔

شمالی پاکستان سے مراد گلگت بلتستان کے تمام علاقے، صوبہ خیبر پختونخواہ کے چترال، وادی سوات اور وادی کاغان لیے گئے ہیں۔ متنوع ثقافت کا حامل شمالی پاکستانی خطہ مخصوص محل وقوع کے باعث تاریخ کے ہر دور میں خصوصی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ مختلف ادوار میں دردیسا، دردستان، بروزہا، گلگتا، بلور، بلورستان جیسے ناموں سے موسوم رہنے والے اس خطے کی حدود وقت کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہی ہیں۔ بے شمار اہم درے ان علاقوں کو چین، روس، افغانستان، ایران، لداخ، کشمیر اور ہند کے اہم مراکز سے ملاتے تھے۔ انھی دروں سے گزر کر قدیم حملہ آور اقوام برصغیر میں داخل ہوئیں۔ دنیا کی قدیم ترین تہذیب کا آغاز ان خطوں سے ہوا۔ یہاں پتھر کے زمانے میں آبادکاری کے شواہد ملے ہیں۔ ان سنگی نقوش کا مطالعہ قدیم تہذیبوں کی دریافت کا اہم ذریعہ اور انھیں سمجھنے میں معاون ہے۔ شمالی پاکستان کے قدیم آبادکار کول، بھیل، گونڈ، منڈا، دڑاور، مگول تھے۔ پھر آریا آئے اور ان کے ساتھ مذہب کا تصور آیا۔ مجوسیت، زرتشت، بدھ مت اور بعد ازاں اسلام نے یہاں فروغ پایا۔ موروثی حاکمیت کے دور میں یہاں پلولو کی مستحکم سلطنت تشکیل پذیر ہوئی۔ تبتیوں کے تسلط کے بعد مختلف خاندان ظاہر ہوئے جن میں رئیسہ، آل تراخان، آل کٹور، آل مقپون، آل اماچہ اور آل بگو شامل ہیں۔ یہ خطے ماضی میں ہمیشہ کشمیر سے الگ رہے ہیں۔ برطانوی عہد میں کشمیر و گلگت کی جڑی اصطلاح سننے میں آئی جس کا سبب روسی برطانوی کھیل تھا۔ اس لیے کشمیر کو ڈوگرہ راجہ کے ہاتھوں فروخت کر کے شمالی خطے پر براہ راست حکومت کی بجائے کشمیری راجہ کو ترغیب دی گئی۔ مقامی چپقلشوں نے کشمیر کے تسلط کا امر آسان بنا دیا۔ گلگت، بلتستان، چترال میں مقامی حکمرانوں کی حکومت میں معاونت کے بہانے سکھوں نے مداخلت کی اور پھر مکمل قبضے کی راہ ہموار ہوئی۔

انیسویں صدی کے وسط سے یہاں خالصہ دوراور اینگلو دور کا آغاز ہوا۔ جس کے پس پشت روس کے توسیع پسندانہ عزائم کے پیش نظر برطانیہ کی خطے پر بالواسطہ تسلط کی خواہش تھی۔ گلگت ایجنسی کا قیام، اینگلو بروشو جنگ اور چترال کو گلگت سے الگ کر کے مالاکنڈ ایجنسی کا حصہ بنانا جیسے اقدامات اسی سلسلے کی کڑی تھے۔ڈوگرہ راج کے خلاف بغاوتیں بھی ہوتی رہیں۔ مسلح جدوجہد کے نتیجے میں پاکستان سے الحاق کے بعد یہاں مختلف ادوار میں انتظامی ڈھانچے میں تبدیلیاں آتی رہیں۔گلگت بلتستان کی آئینی حیثیت مسئلہ کشمیر کی وجہ سے ابہام کا شکار رہی۔ 2009ء میں ایک آرڈیننس کے ذریعے یہاں نیم صوبائی طرز حکومت کا نظام تشکیل دیا گیا۔شمالی خطے میں تنہائی کا شکار مختلف وادیوں کو مرکزیت اور وحدت شاہراہ قراقرم کی تعمیر نے دی۔

گلگت و ملحقہ علاقوں غذر، یاسین، پنیال، گوپس، اشکومن میں سومیری، دارا اول کے نمائندے، میری و فارسی قبائل، تبتی، تراخان، مقامی راجاؤں، سکھوں اور انگریزوں کی حکومت رہی۔ مہاراجہ کشمیر اور انگریزوں کی مشترکہ حکمرانی کا دور گلگت کی تاریخ کا تاریک ترین دور شمار ہوتا ہے۔ یہاں شین اکثریت میں ہیں، باقی آبادی مخلوط ہے۔ ہنزہ و نگر میں زیادہ تر واخی اور بروشو آباد ہیں۔چین سے قربت کے باعث ہنزہ بہت اہم رہا ہے۔ یہاں سومیری، ہن، پاٹلہ شاہی، تراخان، ایشور، مغلوٹ اور میر حکمران رہے۔ یہاں بروشکی، واخی، شینا اور ڈومکی بولی جاتی ہے۔ چلاس، داریل، تانگیر اور بابوسر کی تحصیلوں پر مشتمل ضلع دیامیر اور استور کی تاریخ گلگت کی تاریخ سے ملتی ہے۔ چلاس آثار قدیمہ کے حوالے سے خاص شہرت رکھتا ہے۔نانگا پربت دیامیر میں واقع ہے۔

سکردو، خپلو، کھرمنگ، روندو اور گلتری کی وادیوں پر مشتمل بلتستان دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو اور طویل گلیشئروں کے لیے مشہور ہے۔ ماضی میں اس کے کئی ممالک کے ساتھ بالواسطہ یا بلا واسطہ جغرافیائی، نسلی، لسانی، سیاسی و مذہبی تعلقات استوار رہے۔پلولو، بلور، بالتی یول اور تبت خورد کے ناموں سے موسوم رہنے والا بلتستان مختلف ادوار میں مختلف حملہ آوروں کی آماجگاہ رہا ہے۔ مقپون خاندان نے طویل عرصہ یہاں حکومت کی۔ علی شیر خان انچن کا دور حکمرانی احسن انتظامات کے لیے جانا جاتا ہے۔

منفرد لسانی و ثقافتی خطہ چترال صوبہ خیبر پختونخواہ میں مالاکنڈ ڈویژن کا صدر مقام ہے۔ قدیم شاہراہ ریشم چترال سے گزرتی تھی۔ یہاں ایرانی، چینی، کنشک مختلف ادوار میں حکمران رہے۔ پھر مقامی سرداروں ترکستانی رئیسہ اور کٹور خاندانوں کی حکومت رہی۔ کالاشی تاریخ میں سیاہ پوش کافر کے نام سے جانے جاتے رہے ہیں۔ کالاش دنیا بھر میں منفرد ثقافتی امتیاز رکھتا ہے۔ شاندار قدیم تاریخی آثار کا حامل سوات قدیم زمانے سے خوشحال اوراہم ہے۔ بدھ مت کو یہاں فروغ ہوا۔ آریائی، یونانی، ساکا، پارتھی اور کشن تہذیبوں کا نچوڑ گندھارا آرٹ ہے اور گندھارا تہذیب کا گہوارا سوات کو کہا جاتا ہے۔ سوات کی مقامی ثقافت بیرونی اثرات کے بغیر شاندار رہی۔ وادی کاغان کشمیر اور سندھ کی وادیوں

کے درمیان ہے۔ کاغان کے دروازے بالاکوٹ کو سید احمد شہید کی سکھوں سے لڑائی کی وجہ سے تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ ناران وادی کا مشہور قصبہ ہے۔ جھیل سیف الملوک کے لیے مشہور اس وادی میں گوجر، سواتی، سادات اور اعوان آباد ہیں۔ کاغان کی تاریخ ہزارہ سے متصل ہے۔ انگریز عہد میں یہاں جاگیرداری نظام رائج ہوا۔

شمالی پاکستان کے تاریخی و جغرافیائی حقائق جاننے کے بعد اگلا مرحلہ تہذیب و ثقافت کے نظری مباحث سے آگاہی تھا۔ معاشرتی اور سماجی اقدار کا نظام تہذیب ایک سماجی حقیقت ہے۔ یہ انسان کی نوعی انفرادیت ہے۔ معاشرت کی سماجی اقدار کے پیچھے صدیوں کی تاریخی روایات ہوتی ہیں۔ تہذیب کی کوئی واضح تعریف متعین نہیں۔ مختلف دانشوروں نے اس کے مختلف مظاہر پر روشنی ڈالی ہے۔ زیر نظر مقالے میں احمد ندیم قاسمی، حسن عسکری، زوار حسین، سبط حسن، سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر سلیم اختر، عارفہ فرید، ڈاکٹر عبارت بریلوی، علی عباس جلالپوری، فیض احمد فیض اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کلچر کے متعلق آرا کا جائزہ لیا گیا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے مطابق کلچر طریق حیات کا دوسرا نام ہے اور مسلسل تغیر پذیر ہے۔ اس کی صورت پذیری میں مذہب، آب و ہوا اور تاریخ اہم ہیں۔ شعر و ادب اور فنون لطیفہ کلچر کے باطنی مظاہر ہیں۔ کسی خطے میں وہاں کی قدیم ترین تہذیب کی جھلک لازمی ہو گی۔ قاسمی قومی کلچر کو ہمہ گیر بنانے کے لیے علاقائی کلچروں سے استفادے کے قائل ہیں۔ حسن عسکری کے خیال میں پاکستانی قومی کلچر کے چار بنیادی عناصر اسلام، ہند اسلامی کلچر کی روایت، مقامی کلچری روایتیں اور بین الاقوامی کلچر کا اثر ہیں۔ عسکری کے نزدیک اسلامی کلچر دنیا میں جہاں جہاں متاثر ہوا اس میں آئے گا۔ جمود کا شکار اسلامی کلچر مراد نہیں۔ ہند اسلامی کلچر دہلی کی مسلم سلطنتوں کے زیر سایہ پایا جانے والا کلچر ہے جس کے بڑے مظاہر مغل عمارات اور اردو زبان ہیں۔ مقامی کلچری روایت میں کئی وحدتیں مل کر نئی وحدت جنم دیتی ہیں۔ اب کلچری ضرورتیں عالمگیر ہونے کی وجہ سے بین الاقوامی کلچر کا اثر بھی گہرا ہے۔

سبط حسن کی رائے میں تہذیب انسان کا موجود سے ممکن کی جانب سفر ہے۔ معاشرے کی طرز زندگی اور طرز فکر و احساس کا جوہر تہذیب ہے۔ اس کے چار بنیادی عناصر: طبعی حالات، آلات و اوزار، نظام فکر و احساس اور سماجی اقدار ہیں۔ ہر زمانے کا نظام فکر و احساس سماجی شعور کے تابع ہوتا ہے جو سماجی حالات سے مطابقت رکھتا ہے۔ مذہب تہذیب کا جزو ہے کل نہیں۔ سبط حسن علاقائی تہذیبوں کو صنعتی تہذیب سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے خیال میں کلچر حال کا گریز پا لمحہ ہونے کے ساتھ ساتھ ماضی کے تہہ در تہہ تجربات کا امین اور مستقبل کے لیے سمت نما ہوتا ہے۔ قومی کلچر کی تشکیل میں مذہب، قومی فخر و ناز، جغرافیائی حالات، مخصوص ادوار کے سیاسی کوائف اہم ہوتے ہیں۔ اسلامی تہذیب کے داعی ہونے کے باوجود ہمارا کلچر مغرب سے مستعار شدہ ہے۔ علی عباس جلالپوری کے مطابق تہذیب تمدن میں شامل ہے۔ قدیم تمدن کا مطالعہ جدید تمدن کو سمجھنے میں معاون ہے۔ فن و ادب

کی اپنی مستقل روایات ہیں جن کا سلسلہ ماضی بعید کے لوک گیتوں، علم الاصنام اور اساطیر سے جا ملتا ہے۔ انھیں کسی مذہب کے فیض سے وابستہ کرنا درست نہیں۔ اہل مذہب نے اپنی عبادتوں کی رسوم میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے ادبیات اور فنون لطیفہ سے استفادہ کیا۔ محنت تمدنی ترقی کی بنیاد ہے۔

فیض احمد فیض کے خیال میں ثقافت کی ہمہ گیر اصطلاح ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ مذہب، تاریخ، جغرافیہ اسے نشو نما بخشتے ہیں۔ تہذیب کے تین پہلو ہیں اقدار، رہن سہن کے طریقے اور فنون۔ قوم اور تہذیب لازم وملزوم ہیں۔ تاریخ، جغرافیہ اور انداز معاشرت اضافی ہیں۔ معاشرے کے زندگی بسر کرنے کا مجموعی طریقہ کلچر ہے۔ اس کے باطنی حصے میں تمام مادی، اخلاقی و جمالیاتی قدریں اور عقائد کا اظہار شامل ہے۔ تاریخ کلچر کا طول، جغرافیائی حدود عرض اور معاشرے میں اس کی رسائی گہرائی ہے۔ داخلی طور پر اقدار کا نام اور ظاہری طور پر طریق زندگی کلچر ہے۔

تہذیب و ثقافت کے نظری مباحث سے آگاہی کے بعد اگلے مرحلے میں سفر ناموں میں تہذیب و ثقافت کی اہمیت کا جائزہ لیا گیا۔ سفر انسانی سرشت میں شامل ہے۔ اس اہم انسانی سرگرمی کی بنیاد حرکت ہے سفر انسانی تجربے کو وسعت دینے اور خیالات و افکار میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ دوسرے سیاحوں کے تجربات و مشاہدات سے استفادہ کرنے، ذوق سفر کی تسکین کے عوامی دلچسپی کے پہلو اور انسانی فطرت کے مطالبات نے انسان کو سفر نامے لکھنے پر اکسایا۔ براہ راست تجربے کے لیے سفر ناگزیر ہے۔ سفر نامہ سفر کے حالات و کوائف اور تاثرات و مشاہدات کا تخلیقی انداز میں مکمل و مربوط بیان ہے۔ اس صنف میں دوسری اصناف کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت ہے۔

سفر نامے کی صنف مربوط، دلچسپ اور خوشگوار بیانیہ مرتب کرنے کے لیے علم، تاریخ اور جغرافیہ سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ قدیم سفر نامے تاریخ و تمدن کا اہم ماخذ ہیں۔ انسانی تہذیب و تمدن اور معاشرت کی تاریخ سفر ناموں کی بدولت ہی دوسرے ملکوں میں پہنچی۔ سفر نامے اپنے عہد کی تاریخی و سماجی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے تہذیبی و تمدنی معلومات کا سفر نامے میں جگہ پانا لازمی امر ہے۔ کسی تہذیب کے مطالعے کے لیے اس کے جغرافیائی خدوخال اور تاریخ کی اہمیت سے مفر ممکن نہیں اس لیے سفر نامے میں تہذیبی و تمدنی کے ساتھ تاریخی و جغرافیائی معلومات بھی شامل ہوتی ہیں۔ قدیم سفر نامے معلومات کا خزانہ تھے، جدید سفر نامے مشاہدات و تجربات پر منحصر ہونے کے ساتھ جذبات کی شیرینی سے لبریز ہوتے ہیں۔ تخیل کی کارفرمائی جدید سفر نامے میں زیادہ ہے۔ جدید سفر نامے میں داخل اور خارج دونوں جہتیں شامل ہیں قدیم سفر ناموں میں خارجی جہت نمایاں تھی۔

سفر ناموں میں تہذیب و ثقافت کی اہمیت جاننے کے بعد اگلے مرحلے میں شمالی پاکستان کی تہذیب و ثقافت کا احاطہ کیا گیا۔ اس ضمن میں گلگت، ہنزہ، نگر، دیامیر، بلتستان، چترال، کالاش، سوات اور وادی کاغان کی معاشرت،

سماجیات، عقائد و ایمانیات، فنون لطیفہ، تمدن اور لسانیات کا جائزہ لیا گیا۔ معاشرت میں ان علاقوں کا رہن سہن، خوراک، لباس، حسن و زیبائش اور عادات و اخلاق؛ سماجیات میں پیشوں، دستکاریوں، رسم و رواج، کھیل تفریح، تعلیم و تربیت؛ عقائد و ایمانیات میں مذہبی عقائد، مذہبی رسوم اور افکار؛ فنون لطیفہ میں لوک ادب، شاعری، موسیقی اور رقص؛ تمدن میں فن تعمیر اور علم و فن اور لسانیات میں زبان کا مطالعہ کیا گیا۔

شمالی پاکستان متنوع ثقافت کا حامل خطہ ہے اور تہذیبی شکست و ریخت کے عمل سے گزرا ہے۔ باقی دنیا سے بہت عرصہ کٹے رہنے کے باعث یہاں پروان چڑھنے والی ثقافت بیرونی اثرات سے پاک رہی، مگر اب تبدیلی کی زد میں ہے۔ ایک طرز فکر، تخلیقی روایت اور طرز معاشرت کا نام ثقافت ہے۔ شاہراہ قراقرم کی تعمیر اور آغاخان فاؤنڈیشن نے یہاں تعلیمی، معاشرتی، اقتصادی اور سماجی انقلاب میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تواتر سے خاص مواقع پر انجام دیے جانے والے افعال رسم کہلاتے ہیں شمالی علاقوں کے مختلف حصوں میں مختلف رسوم و رواج ہیں جبکہ کچھ رسوم پورے شمال میں مشترک ہیں۔ اسی طرح کچھ کھیل انفرادی کچھ مشترک ہیں۔ ایک ہی لسانی خطے سے تعلق رکھنے والے علاقوں میں بھی روایتی کھانوں اور متعلقہ طرز بود و باش میں فرق پایا جاتا ہے۔ زبان اور معاشرے کا چولی دامن کا ساتھ ہے یہاں کے لوک گیتوں میں شمال کا صدیوں پرانا سرمایہ محفوظ ہے۔ گلگت، نلتر، حراموش اور بگروٹ میں بلتستان کے وسیلے سے شیعہ مسلک پروان چڑھا۔ ہنزہ، اشکومن، یاسین، گوپس پامیر و واخان سے متصل ہونے کے باعث اسماعیلیت کے فروغ کا سبب بنے۔ غذر، پنیال میں چترالی حکمرانوں کی وجہ سے کسی حد تک سنی مسلک پھیلا۔ چلاس، داریل، تانگیر میں سوات اور ہزارہ سے متصل رہنے کے باعث سنی مسلک پروان چڑھا۔ شمالی خطوں میں آبائی پیشوں کو اپنانے کا رواج اب بدل چکا ہے۔ 1990ء کے بعد یہاں کچھ حد تک صنعتی شعور آیا۔ اہم ذریعہ معاش سیاحت بننے سے ہوٹلوں کا کاروبار اور ملکی و غیر ملکی ٹیموں کے لیے پورٹر، گائیڈ اور باورچی کا کام بڑھا ہے۔

یہاں ہر چھوٹی ریاست میں بھی موسم کا ہر تہوار اہتمام سے منایا جاتا تھا جس کا آغاز و اختتام موسیقی پر ہوتا تھا۔ متعدد علاقوں کا روایتی پہناوا اب بدل چکا ہے۔ نئی نسل نے نئے انداز و اطوار کو تیزی سے اپنایا ہے۔ ذرائع آمد و رفت بہتر ہونے سے ملکی و غیر ملکی سیاحوں کی بکثرت آمد نے یہاں کی مقامی ثقافت کو متاثر کیا۔ تعلیم عام ہونے سے سماجی شعور بڑھا، جس سے توہم پرستی میں کچھ کمی آئی ہے۔ شادی بیاہ کی رسومات میں بھی بدلاؤ آیا ہے۔ پہلے جانوروں کو چرانے کے لیے گرمیوں میں بلند چراگاہوں پر بھیجا جاتا تھا۔ یہ عمل خاندان کے افراد سرانجام دیتے تھے۔ اب یہ کام گوجروں سے معاوضے پر کرا لیا جاتا ہے۔ ماضی میں فراغت کے باعث بچوں اور نوجوانوں کے مشاغل اب سے مختلف تھے۔ شمالی علاقوں کے دور دراز کے علاقے کم تبدیلی کی زد میں ہیں مگر بڑے شہر اور مین سٹریم میں شامل علاقوں میں تبدیلی کا عمل تیز تر ہے۔

گلگت میں ماضی میں بیگار کے نظام نے مشترکہ رہن سہن کو فروغ دیا۔ پچھلی صدی تک یہاں لکڑی کے برتن اور اس سے پہلے پتھر کے برتن استعمال ہوتے تھے۔ لوگ عمروں کا حساب مشہور واقعات کے حوالے سے رکھتے تھے۔ اشیا کے بدلے اشیا سے لین دین ہوتا تھا۔ اب اہم پیشوں میں گلہ بانی، کاشتکاری،، تجارت اور سیاحت شامل ہیں۔ ماضی میں تمام ضروریات مقامی سطح پر پوری کی جاتی تھیں مگر اب آبائی پیشے لوگ چھوڑ رہے ہیں۔ یہاں زیادہ تر فنون کشمیر سے آئے۔ ماضی کے متعدد تہوار زراعت سے منسلک رہے ہیں۔ اب جشن نوروز، سلک روٹ فیسٹیول، جشن آزادی پاکستان اور شینڈور میلہ اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ ماضی میں یہاں رقم لے کر لڑکی دینے کا رواج تھا جسے اب معیوب سمجھا جاتا ہے۔ شکار کا گوشت متبرک خیال ہوتا تھا۔ شنا بہت قدیم ہونے کے باوجود صرف بول چال کی زبان رہی۔ شنا شاعری شنا زبان جتنی ہی قدیم ہے۔ لوک داستانیں سننے کا رواج یہاں ہمیشہ سے ہے۔ پہلے پتھروں سے سادے مکانات بنائے جاتے تھے، چھت میں سوراخ ضرور رکھتے۔ ندی کنارے تھوڑا اونچا کمرا بناتے جس میں سے تھوڑا تھوڑا پانی گزرتا رہتا۔ اس میں کھانے پینے کی اشیا کو محفوظ کیا جاتا تھا۔ جانوروں کے لیے الگ پناہ گاہیں بنائی جاتی تھیں۔ دیامیر میں روایتی دشمنیوں کی وجہ سے مشترکہ رہن سہن کا نظام ضرورت بن گیا۔ استور میں قریبی عزیز کی وفات پر سات دن تک گوشت نہیں کھایا جاتا تھا۔ بیرونی حملوں سے بچنے کے لیے دفاعی حکمت عملی کے تحت دو تین منزلہ مکان بنائے جاتے تھے جو اب سٹور کا کام دیتے ہیں۔ یہاں صنف نازک کی شاعری دشمنوں کے خلاف اپنے قبیلے کا حوصلہ بڑھانے میں معاون ہوتی تھی۔

ہنزہ اور بلتستان کے درمیان قدیم عہد سے ثقافتی رشتہ استوار ہے اس لیے ان کے اکثر تہوار مشترک ہیں، نشست و برخاست کے طریقوں میں جزوی اختلاف ہے۔ ماضی میں اہل ہنزہ کو قزاق کے لقب سے جانا جاتا تھا۔ شاہراہ قراقرم کی تعمیر سے یہاں مادی، اقتصادی، معاشرتی تبدیلیاں سرعت سے رونما ہوئیں۔ عورتیں گھریلو کاموں کے علاوہ کھیتی باڑی کے کاموں میں مردوں کی مدد بھی کرتی ہیں۔ ہنزہ و نگر کے کھانے کم مصالحہ جات والے اور سفر میں ساتھ لے جانے کے قابل محفوظ رہنے والے ہوتے ہیں۔ حلوے کو یہاں شربت کہا جاتا ہے۔ ہنزہ و نگر کے قدیم پہناوے جمالیاتی ذوق سے عاری اور سادہ تھے۔ عورتوں کا لباس ہمیشہ سے ڈھیلا ڈھالا اور سادہ رہا ہے۔ عورتیں چادر کے ساتھ ٹوپی اوڑھتی تھیں جو اب کہیں نظر نہیں آتی۔ پہلے مردوں کے لیے ٹوپی لازمی تھی اب ننگے سر پھرنا معیوب نہیں رہا۔ روایتی مخصوص بروشو گھر میں چار منقش ستونوں پر چھت تعمیر کی جاتی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی جوتے رکھنے کی جگہ، درمیان میں چولھا، دائیں بائیں مردوں اور عورتوں کے بیٹھنے کی جگہ ہوتی تھی۔ ہنزہ کے لوگ محنت کے عادی ہیں۔ ماضی میں سینگوں، ہڈیوں اور کلہاڑیوں کی مدد سے قل کھود کر التر گلیشیر کا پانی رہائشی علاقوں تک لائے۔ ماضی میں یہاں یک جدی قبائل میں شادیاں ممنوع تھیں۔ قدیم دور میں ہر رسم و تہوار سے مافوق الفطرت قوتیں منسوب تھیں۔ یہاں

اسماعیلی فرقے کی کثرت ہے۔ یہاں بروشسکی، واخی، ڈومکی اور شنازبانیں بولی جاتی ہیں۔بروشسکی میں وسیع شعری سرمایہ ہے۔

بلتستان پر ماضی میں تبتی اور لداخی اثرات نمایاں تھے۔ چینی سماجی نظام بھی یہاں رائج رہا۔ بلتی تہذیب کئی تہذیبوں کے سنگم سے بنی ہے۔ زیادہ معاشرتی تغیرات مذہبی بنیاد پر ہوئے۔ بلتی دھیمے مزاج کے ہیں، دیر سے غصے میں آتے ہیں۔ پولو کو دنیا میں متعارف کرانے کا سہرا بلتستان کے سر ہے۔ تبتی جنتری بھی یہاں رائج رہی، خوراک سادہ تھی۔ لباس اونی گرم اور سادہ، مقامی روایتی لباس اب متروک ہو چکا ہے۔ لوئی کو مردوں کے لباس میں ہمیشہ اہمیت حاصل رہی۔ بلتستان میں لوک گیتوں کو بطور پیغام ارسال کرنے کا انوکھا طریقہ مروج تھا۔ یہاں کے حکمران کشمیری دستکاروں اور ہنر مند ماہرین کو خصوصی طور پر مدعو کرتے رہے۔ اب جدید فنون عام ہو رہے ہیں۔ گھروں کی تعمیر میں لکڑی کے کام کو بنیادی اہمیت حاصل رہی۔ پیدائش، شادی بیاہ اور موت کی مخصوص رسوم تھیں۔ اکثریتی آبادی کا تعلق شیعہ نوربخشی مسالک سے ہے۔ بلتی زبان تبتی کی شاخ ہے۔ یہاں کی قدیم شاعری میں مذہبی موضوعات نمایاں رہے۔ کیسر کی داستان بہت معروف ہے۔ رقص و موسیقی کو اہمیت حاصل رہی۔ موجودہ موسیقار یہاں ماضی میں رائج دھنوں میں سے صرف چند ایک ہی بجاسکتے ہیں۔ بلتستان کے گھر چھوٹی دیواروں اور نیچی چھتوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ بلتیوں کی تعمیر کردہ عمارات میں مغل، ایرانی اور کشمیری طرز تعمیر کی آمیزش تھی۔

چترال تہذیبی اقدار اور ثقافتی اعتبار سے خود کفیل معاشرہ تھا۔ یہاں کی اقدار نے یہیں جنم لیا اور یہیں فروغ پایا۔ خوش خوراکی اہل چترال کا خاصہ ہے۔ دودھ، گوشت، گھی اور آٹے سے تیار کردہ بیسیوں قسم کے کھانوں کو رواج دیا گیا۔ یہاں سینے پر ہاتھ باندھ کر پہلے سلام کرنا، مجلس میں آنے والوں کے لیے کھڑے ہونا اور مہمانوں کو عزت کی جگہ بٹھانا دیرینہ چترالی روایت ہے۔ روایتی طور پر یہاں کھانا اجتماعی عمل ہے۔ لباس میں سادگی اور پائیداری کو اہمیت دی جاتی ہے۔ چترالی ٹوپی اور چوغہ بین الاقوامی شہرت اختیار کر چکے ہیں۔ یہاں دس پیشے مروج رہے ہیں۔ خوش گاؤ، ہرن اور مارخور کے سینگوں سے خاص ڈیزائنوں کی انگوٹھیاں بنانا یہاں کی مخصوص صنعت رہی ہے۔ ہمسایہ ممالک کی نسبت چترال ماضی میں پر امن رہا ہے۔ یہاں بچوں، بڑوں کے کل کھیلوں کی تعداد 134 ہے۔ دنیا کے جدید کھیل سکی انگ، کرکٹ، فٹ بال، ہاکی چترال میں سامان اور طریق کار کے اختلافات کے ساتھ قدیم زمانے سے رائج تھے۔ قدامت پسند معاشرہ ہونے کے باعث یہاں توہمات وروایات کی کثرت ہے۔ آبادی کی مناسبت سے چودہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جن میں کھوار اکثریتی آبادی کی زبان ہونے کے ناطے رابطے کی زبان بھی ہے۔ چترال لوک گیتوں کا علاقہ ہے۔ اس کا روایتی ورثہ صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ منفرد طرز تعمیر کے باعث چترال کو ہندوکش میں الگ حیثیت رہی ہے۔ گھروں میں باغیچوں کا رواج یہاں قدیم عہد سے ہے۔

کالاش قدیم تہذیبی ورثے، عقائد، رسوم اور دلچسپ و عجیب تہواروں کے باعث دنیا بھر میں منفرد شہرت کا حامل ہے۔ کالاش مذہب کی جڑیں شمالی علاقی جات اور سوات کے رسم و رواج میں ملتی ہیں۔ کالاش ثقافت قدیم ایشیائی اور یورپی ثقافت کا آمیزہ ہے۔ بدلتے زمانے کے بعد بھی کالاشی اپنی رسوم پر سختی سے کاربند ہیں۔ ان کا روایتی پہناوا اب تک وہی ہے۔ خواتین کا مخصوص لباس سیاہ ہے۔ کمر تک لٹکی ٹوپی پر مونگے اور سیپیاں سجی ہوتی ہیں۔ پاؤں تک آتا کھلا گھیر دار فراک پہنتی ہیں، کمر کے گرد کمر بند استعمال کرتی ہیں۔ لوگ سادہ خوراک کھاتے ہیں۔ کالاشی بیک وقت بت پرست، اجداد پرست اور توہم پرست ہیں۔ کالاش مذہب میں عورت کو کمتر اور منحوس سمجھا جاتا ہے۔ معاشرتی ذمہ داریوں میں وہ بہت حد تک معاون ہے۔ رومان پسند کالاشی سارے تہوار بہت اہتمام سے مناتے ہیں۔ رقص ان کے لیے عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ کالاشیوں کی موت کی مخصوص منفرد رسوم ہیں۔ میت کے گرد رقص کیا جاتا ہے۔ کالاشی عجیب و غریب توہمات کا شکار ہیں۔ دردی گروپ میں شامل کلاشہ زبان کے لوک گیتوں میں قدیم مذہب اور رسم و رواج کے آثار ملتے ہیں۔

سوات قدیم عہد سے آباد ہے۔ یہ بدھ مت کا اہم مرکز رہا ہے۔ یہاں ہر دور میں خوشحالی رہی۔ سوات اونی شالوں کے لیے بہت مقبول ہے۔ یہ آثار قدیمہ کی فراہمی کے بڑے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ ماضی قدیم میں یہ آتش پرستوں اور جادوگروں کا ٹھکانہ رہا۔ سوات کا امن، انسان دوستی، مسافر نوازی قدیم زمانے سے یادگار ہے۔ اب یہاں سیاحت مستحکم صنعت بن چکی ہے۔ دیگر سیاحتی مقامات کے برعکس یہاں گاہک کو گاہک نہیں مہمان سمجھا جاتا ہے۔

کاغان کے تمام خاندان ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ ان کے لباس، چال ڈھال، رسم و رواج اور طور طریقے ایک جیسے ہیں۔ اکثریتی آبادی گوجروں پر مشتمل ہے۔ کچھ گوجر زراعت پیشہ اور زیادہ تر گلہ بانی سے وابستہ ہیں۔ نقل مکانی ان کا تشخص بن گئی ہے۔ کاغان کی عمدہ چیز شہد، دیسی گھی اور موٹی لذیذ مکئی ہے۔ گوجروں کے لباس کی تراش خراش دیگر اقوام سے مختلف ہے۔ گوجری دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔ عوامی ادب کے لحاظ سے گوجری زرخیز زبان ہے۔ اب اس کے قواعد بھی مرتب ہو چکے ہیں۔

شمالی پاکستان کی تہذیب و ثقافت سے شناسائی کے بعد اگلے مرحلے میں قیام پاکستان سے پہلے تک شمال کے سفر ناموں میں مقامی تہذیب و ثقافت کی پیشکش کا مطالعہ کیا گیا۔ اردو سفر نامے کی روایت کا جائزہ لیں تو ابتدا میں دیار غیر اور حج کے سفر نامے لکھے گئے۔ شمالی علاقہ جات کے متعلق قیام پاکستان سے قبل تک اردو سفر نامے نہیں لکھے گئے۔ اندرون برصغیر کے اردو سفر ناموں میں بھی شمالی خطوں کا احوال شامل نہیں۔ برطانوی عہد میں شمالی خطوں کا کشمیر سے الحاق تھا۔ اس دور کے کشمیر کے سفر ناموں میں شمالی علاقہ جات کا سرسری ذکر موجود ہے۔ متعلقہ اردو سفر ناموں کی عدم دستیابی کے باعث غیر ملکی زبانوں کے سفر ناموں کے تراجم پر اکتفا کیا گیا۔ قدیم عہد کے چند سفر ناموں میں ان علاقوں کا

تذکرہ ہے۔ برطانوی عہد میں چند انگریزوں نے بطور خاص ان علاقوں کا سفر کر کے اپنی سفری یادداشتیں مرتب کیں جن کا خلاصہ رشید اختر ندوی کی کتاب شمالی پاکستان میں موجود ہے۔

قدیم غیر ملکی سفر ناموں میں شمالی علاقوں کے بارے میں چیدہ چیدہ جغرافیائی، تاریخی اور تمدنی معلومات ملتی ہیں۔ قدیم چینی سیاحوں فاہیان اور ہیون سانگ نے بدھ مت کے آثار کی تلاش کے لیے زائر کی حیثیت سے یہ سفر کیے۔ فاہیان کا سفر نامہ چوتھی صدی عیسوی اور ہیون سانگ کا سفر نامہ ساتویں صدی عیسوی کے مذہبی حالات پر روشنی ڈالتا ہے۔ فاہیان نے راستے کی خطرناکی اور بدھ آثار سے منسوب روایات کے بیان تک خود کو محدود رکھا جبکہ ہیون سانگ نے بلتستان کے محل وقوع، پیداوار، سونے چاندی کی فراوانی، شدید موسم اور لوگوں کے کرخت اور غیر مہذب ہونے کا بھی بتایا ہے۔ اسے یہاں بدھ آشرموں میں رہنے والے بھکشوؤں میں علم کی لگن دکھائی نہیں دی۔ دریائے سوات کے گرد پھیلی آبادی کو اس نے نازک اور فریبی قرار دیا جو علم سے محبت کے باوجود اسے استعمال نہیں کرتے، جادو منتر کا استعمال بطور فن کرتے ہیں۔

فرانسس برنیئر کے سفر نامے میں اورنگ زیب کے عہد میں کشمیر سے ملحقہ علاقوں کا مختصر احوال ملتا ہے۔ کشمیر حکومت کی ان علاقوں میں مدد کی درخواست پر مداخلت اور بدلے میں سالانہ خراج کے مطالبے سے متعلق معلومات اس سفر نامے میں موجود ہیں۔ اس نے وہاں کی فصلوں، پیداوار، موسم اور مذہب کے بارے میں مختصراً بتایا ہے۔ کشمیر میں رنجیت سنگھ کی حکومت کے دوران کے حالات بیرن چارلز ہیوگل کے سفر نامے میں ملتے ہیں۔ اس نے تب سکھوں کی وجہ سے سکردو کے حکمران کو درپیش مشکلات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ سکردو کے لوگ دفاعی صلاحیت سے عاری تھے اور کھلے میدانوں میں سکھوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت سے محروم تھے۔ سکردو کا افلاس بہت عرصہ تک اسے لٹیروں کی دستبرد سے بچانے کا سبب بنا رہا۔

رشید اختر نے جن انگریز سیاحوں کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں کا خلاصہ بیان کیا ہے ان میں فریڈرک ڈریو، بڈلف، ای اولوریمر، ای ایف نائٹ، آر سی سچومبرگ اور بربرہ مونز شامل ہیں۔ ان کے سفر ناموں کا زمانہ انیسویں صدی کے آخر سے لے کر بیسویں صدی کے تیسرے عشرے تک محیط ہے۔ ان سفر ناموں میں ماضی کے سفر ناموں کی نسبت زیادہ معلومات ملتی ہیں۔ ان علاقوں کے بارے میں راستے کی مشکلات، جغرافیہ، محل وقوع، آب و ہوا، اجناس کی پیداوار، پھل، پیشے، لوگوں کا رہن سہن، لباس، عادات واطوار، مویشیوں، کھیتی باڑی کے طریقے، لوگوں کے خدوخال، ذاتوں کے حوالے سے تاریخی معلومات، لسانی معلومات، تہوار، مقامی لوگوں کی مشکلات، حکمرانوں کی تاریخ اور حملہ آوروں کی تاریخی تفصیلات ملتی ہیں۔ یہاں معاشرہ بیرونی دنیا سے کٹے رہنے کے باعث جمود کا شکار تھا۔ وسائل محدود تھے، سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ لوگ آبائی پیشوں تک محدود رہتے تھے۔

قیام پاکستان سے پہلے لکھے جانے والے سفر ناموں میں شمالی علاقوں کے بارے میں یکساں انداز نظر آتا ہے۔ فریڈرک نے ڈوم قبائل کو آریا کی آمد سے قبل ہندوستان میں بسنے والے اصلی باشندے قرار دیا۔ بڈلف نے مسلمان ہونے کے باوجود نگر استور کے لوگوں کے گائے کے گوشت سے پرہیز کی بنا پر ان کے ہندو الاصل ہونے کی نشاندہی کی۔ انگریز مہمان افسر کی حیثیت سے سفر کرنے والے ای او لوریمر نے علی آباد میں کھیتوں میں کٹ جانے والی فصل کو بوڑھوں بچوں سب کو پاؤں سے برابر کرتے دیکھا۔ ای ایف نائٹ کو بلتیوں میں یونانی اور منگولی مشابہت نظر آئی۔ آر سی سچومبرگ کو یہاں افلاس اور ناکافی تجارت پر دکھ ہوا۔ بربرہ مونز کو مقامی پیشوں سے متعلقہ افراد کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

قیام پاکستان سے قبل کے شمال کے سفر ناموں میں تہذیب و ثقافت کے مطالعے کے بعد اگلے مرحلے میں قیام پاکستان کے بعد کے اردو سفر ناموں میں مقامی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کا مطالعہ کیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد ابتدائی برسوں میں شمالی پاکستان کے بارے میں کم سفر نامے لکھے گئے۔ ان علاقوں سے متعلق اردو سفر ناموں کے رجحان میں اضافہ پچھلی صدی کی آخری دو دہائیوں میں ہوا۔ جبکہ اکیسویں صدی میں اس رجحان میں خاصی تیزی آئی۔

جدید عہد کے سفر نامہ نگاروں میں شمال کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ سر فہرست ہیں۔ مستنصر کو 1984ء سے 2016ء تک کے بتیس برسوں میں متعدد بار شمالی علاقہ جات جانے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے اس طویل مدت میں یہاں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو بنظر غائر دیکھا۔ اس دوران ان کے شمال کے 13 سفر نامے منظر عام پر آئے جن میں ہنزہ داستان، سفر شمال کے، چترال داستان، نانگا پربت بلتستان داستان، کے ٹو کہانی، یاک سرائے، سنو لیک، دیوسائی، شمشال بے مثال، برفیلی بلندیاں، رتی گلی، راکاپوشی نگر اور حراموش نا قابل فراموش شامل ہیں۔ مستنصر شمالی خطے کو پورے پاکستان میں متعارف کرانے کا سبب بنے۔ ان خدمات پر انھیں گلگت بلتستان کا غیر سرکاری سفیر قرار دیا گیا۔

مستنصر کے شمالی پاکستان کے سفر ناموں میں مقامی تہذیب و ثقافت کے متعدد پہلوؤں کی بہتر عکاسی ملتی ہے۔ بتیس برس کے دورانیے پر محیط سیاحت میں ان کا گزر کئی دفعہ ان پرانے مقامات سے بھی ہوا جہاں وہ پہلے بھی آچکے تھے اس لیے انھوں نے سفر ناموں میں جابجا اپنے پچھلے سفروں کے دوران یہاں کی ثقافت کی جھلک دکھا کر قدیم و جدید کا تقابل کیا ہے۔ وقت کے ساتھ رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر ان کے سفر ناموں میں بارہا ہوا ہے۔ مستنصر کے سفر ناموں میں احساس کی شدت زیادہ ہے۔ مقامی لوگوں کے مسائل کی متعدد مقامات پر نشاندہی کی ہے۔ سنی ہوئی باتوں کے تذکرے کی نسبت ان کا زور دیکھی ہوئی چیزوں کے بیان پر زیادہ رہا۔ تاریخی و جغرافیائی معلومات اس طرح سفر نامے کی زینت بناتے ہیں کہ بوجھل معلوم نہیں ہوتیں۔ دلچسپ تخلیقی اسلوب ان کے سفر ناموں کی جان ہے۔ مختلف شمالی علاقوں کے لوگوں کی باہمی چپقلش کو بھی انھوں نے سفر ناموں میں اجاگر کیا ہے۔ بدلتے وقت کے ساتھ

ہنزہ وناران کاغان کے لوگوں کے احساس سے عاری کمرشل رویے پر تاسف کا اظہار کیا ہے۔ روایتی طور پر مقامی لوگوں کو مستنصر نے ملنسار، وضع دار اور مددگار پایا۔ چند مقامات پر قدیم روایات کو تخیلی اور افسانوی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مستنصر قدیم انداز معاشرت کا تذکرہ بطور خاص کرتے ہیں۔ وہ قدامت کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ یہ رجحان ان کے ابتدائی دور کے سفر ناموں سے لے کر آخری سفر نامے حرا موش ناقابل فراموش تک برقرار ہے۔ ماضی میں یہاں کے باشندوں کی مذہبی رواداری کے مستنصر معترف رہے ہیں۔ گزشتہ کچھ برسوں میں یہاں انتہا پسندی کی بڑھتی لہر پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ مستنصر کو جہاں مقامی ذائقوں سے روشناس ہونے کا موقع ملا اس خوراک کی تفصیل بیان کی ہے۔ دیگر سفر نامہ نگاروں کی نسبت مستنصر مہمات کے دوران مقامی پورٹروں کے رویے، عادات واطوار کا زیادہ باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ مددگار پورٹر ان کے سفر ناموں میں اہم کردار کے طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

تیزی سے بدلتی ثقافتی قدروں کی نشاندہی کے ساتھ کھو جانے والی قدروں پر دکھ کا اظہار مستنصر کے سفر ناموں میں نظر آتا ہے۔ مقامی ہیروز کی بے قدری پر متاسف نظر آتے ہیں جو بہت اہم چوٹیاں سر کر کے ریکارڈ بنانے کے باوجود معاشی مجبوریوں کے ہاتھوں عام پورٹر اور دکاندار کے طور پر کام کرنے پر مجبور ہیں۔ مستنصر کو جن تہواروں میں شرکت کا موقع ملا ان کی تفصیل دی ہے۔ مقامی کرداروں کی زبانی مقامی رسم ورواج کی تفصیلات بھی کچھ جگہ موجود ہیں۔ انھیں جہاں جہاں مقامی گھروں میں جانے کا موقع ملا انھوں نے جزئیات کے ساتھ اندر کا نقشہ کھینچا ہے۔ سخت موسم کا مقابلہ کرنے کے لیے تیاری، سبزیاں پھل خشک کرنا، گوشت ذخیرہ کرنا، ندی کے پانی میں اشیائے خوردنی ٹھنڈا کرنا، یہاں کی جنگلی حیات، پھلوں، آثار قدیمہ، فن تعمیر، مقامی موسیقی، رقص، لوک داستانوں، لوک گیتوں کا تذکرہ بھی ان سفر ناموں میں موجود ہے۔ ملکی وغیر ملکی سیاحوں کی طرف مقامی لوگوں اور پورٹروں کے رویے کے فرق کی نشاندہی بھی کی ہے۔ خوبصورت مناظر، حسین مقامات سے طاری ہونے والی کیفیت کو مستنصر بھرپور تاثرات کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر فینٹسی کا انداز نظر آتا ہے۔ مستنصر مقامی لوگوں کے عزم وحوصلے، اپنی مدد آپ کے جذبے اور اہم کارناموں کے معترف ہیں۔ وہ یہاں ماحولیاتی آلودگی، درختوں کی بے جا کٹائی اور سیاحوں کے غیر ذمہ دارانہ رویوں، اخلاقی پاسداری کا خیال نہ رکھنے پر تنقید بھی کرتے ہیں۔

مستنصر کے سفر ناموں کے مجموعی ثقافتی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے شمالی خطے کی ثقافت کے نقوش جا بجا اپنے سفر ناموں میں اجاگر کیے ہیں۔ تاریخی وجغرافیائی معلومات کے علاوہ سماجیات، معاشرت، عقائد وایمانیات، فنون لطیفہ، تمدن اور لسانیات کی معلومات ان کے سفر ناموں میں موجود ہیں۔ مشکل جغرافیائی وموسمی حالات میں بھی

یہاں کے بچوں کی علم کے لیے لگن کو مصنف نے سراہا ہے۔ واخی زبان کی ترقی کے لیے کوشاں ماسٹر حقیقت کا ذکر کیا ہے۔ فن تعمیر کا تذکرہ زیادہ ہے، کھیل تفریح کی معلومات نسبتاً کم ہیں۔

سلمیٰ اعوان کے تین سفر نامے یہ میرا بلتستان،میرا گلگت و ہنزہ اورمیرا سندر چترال ایک خاتون کے انداز نظر سے شمالی خطوں کی تہذیب و ثقافت کو دیکھنے کی کاوش ہے۔ انھوں نے یہاں کے تاریخی پس منظر میں جھانکتے ہوئے مسائل اور تہذیبی و تمدنی زندگی کو دلچسپی سے بیان کیا ہے۔ عورت ہونے کے ناطے سلمیٰ کی رسائی مختلف علاقوں میں گھروں کے اندر تک رہی اس لیے دیگر سفر نامہ نگاروں کی نسبت یہاں کے رسم و رواج، رہن سہن اور طرز زندگی کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ہوٹلوں کی نسبت ان کا قیام مقامی میزبانوں کے گھروں میں رہا۔ سلمیٰ نے باریک بینی سے اپنے مشاہدات کو سفر ناموں میں سمویا ہے۔ کچھ روایات کو کہانی کے انداز میں بیان کیا ہے۔ چند کرداروں کی زبانی ماضی سے حال کی طرف ہونی والی سماجی تبدیلیوں کو بیان کر کے قدیم معاشرت کی جھلکیاں قاری کے سامنے رکھی ہیں۔ مختلف علاقوں کا جنگ آزادی میں کرداراور مقامی ہیروز کی جراتمندانہ کاوشوں کو واضح کیا ہے۔ مقامی خوراک، لباس، طرز زندگی کی تفصیل دی ہے۔ چھوٹی چھوٹی رسموں اور تہواروں کی تفصیلات شامل کی ہیں۔ موسم کی صورتحال، شدید موسم کا مقابلہ کرنے کے لیے خواتین کی تیاری، دور دراز مقامات پر شمالی علاقوں کی خواتین کی مشکلات، کوششوں اور معاشرتی زندگی میں خواتین کے کردار کو واضح کیا ہے۔ مقامی لوک گیتوں اور داستانوں کو اپنے سفر ناموں میں جگہ دی ہے۔ تاریخی روایات کو بھی بیان کیا ہے۔ مجموعی طور پر سلمیٰ کے سفر نامے شمالی خطے کی تہذیب و ثقافت کی متعدد جہتوں کا احاطہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عباس برمانی کے شمالی خطے کے سفر نامے کیلاش کتھا، برف دریاؤں کے سفر اورمیرا سندھو سائیں ہیں۔ عباس نے اپنے سفر ناموں میں راستوں کی مشکلات، حکومتی عدم توجہی، مقامی لوگوں کو درپیش مشکلات، تاریخی و جغرافیائی معلومات، مقامی رہن سہن، رسم و رواج، تعلیم، تاریخی ورثے سے محکمہ آثار قدیمہ کی غفلت، ہوشے میں پولیس کی شائستگی، پورٹروں کی عادات، کچھ مقامات کے قدیم مذہب، شکار کے طریقوں اور مصنوعات کا ذکر کیا ہے۔ مچھلیوں اور دیگر جنگلی حیات کے بے دردی سے شکار پر تاسف کا اظہار کیا ہے۔

محمد منیر مرزا نے شمالی علاقہ جات کے بارے میں پھول دیو سائی کے اورپربتوں کا شیندور سفر نامے لکھے۔ جن علاقوں کا سفر منیر مرزا نے دوبارہ کیا وہاں کی تبدیلیوں پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ مقامی لوگوں کے توہمات، مقامی جگہوں کے مقامی ناموں کے پس منظر، فصلوں، سادہ طرز زندگی، عام مروج ناموں، پالتو جانوروں، موسیقی، تاریخ، موسم کی سختی کے باعث لوگوں کی مشکلات، کالاشیوں کے مذہبی عقائد، شیندور فیسٹیول کی رونقوں،

بڑھتی مہنگائی، لوک داستانوں اور بدھ آثار کے متعلق معلومات ان سفر ناموں میں موجود ہیں۔ چند مقامات پر ان کے سفر ناموں میں معلومات کی زیادتی کا تاثر ملتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال ہما کے سفر نامے جہاں پریاں اترتی ہیں اور کے ٹو برفانی وادیاں شمالی علاقوں کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے نلتر کے سفر کے دوران گلگت بازار کی تفصیل، نومل میں روشن خیالی پروان چڑھنا، گرمیوں میں آباد ہونے والی بکروال بستی کے بکروالوں کی کٹھن زندگی، تالنگ کے طرز تعمیر، مقامی لوگوں کے علاج کے طریقوں پر اپنے سفر ناموں میں روشنی ڈالی ہے۔ کنکورڈیا کے بارے سفر میں تاریخی و جغرافیائی معلومات زیادہ ملتی ہیں۔ مقامی ہیروز کی بے قدری پر شکوہ کیا ہے۔ کوہ پیمائی کی تاریخ اور بیشتر مقامات کے حوالے سے تفصیلی تاریخی معلومات ہیں۔ سیاحوں کی تعداد بڑھنے پر ہوشے کی تیز رفتار تبدیلیوں کا تذکرہ بھی ان کے سفر ناموں میں موجود ہے۔

مختار مقصود کی سفر نصیب کا پہلا حصہ ان کے کے ٹو کے ہوائی سفاری کے تاثرات و مشاہدات پر مبنی ہے۔ وہ مختلف اوقات میں جن شمالی خطوں میں گئے، جہاز سے وہ مقامات نظر آنے پر ان سفروں کی یاد تازہ کی ہے۔ صاحب اسلوب مختار مقصود نے قدیم راستوں، مقامی لوگوں کا زندگی کے بارے میں عمومی رویہ، بیشتر علاقوں میں وقت کے ساتھ ہونے والی سماجی تبدیلیوں اور بڑھتی ماحولیاتی آلودگی کا تذکرہ کیا ہے۔ مختلف پر سکون مقامات پر کمرشلزم کے باعث بڑھتی تعمیراتی تبدیلیوں کا احوال بتایا ہے۔ اشفاق احمد کا سفر در سفر ناران کاغان کے سفر کی روداد ہے مگر خارج سے زیادہ داخل کا سفر ہے۔ چند مقامات پر مختصر ثقافتی جھلکیاں دکھاتے ہیں جیسے گوجروں کا رہن سہن، مقامی بچے کا مرغی کو دم کروانا، مقامی قبروں پر لکڑیوں کے تعویذوں کی تفصیل دی ہے۔ محمد خالد کا سفر نامہ دو سفر بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے ناران کاغان اور سوات کی جھلک دکھاتا ہے۔ اس سفر نامے میں پنجاب سے متواتر موازنے کی فضا نظر آتی ہے۔ مقامی مسافروں کے حلیے، مینگورہ کے راستے میں نظر آنے والی خانہ بدوش عورتوں کے حلیے کی تفصیل، کاغان میں بسوں کے عملے کی شائستگی، مقامی افراد سے ملاقات، علاج معالجے کی سہولیات کا شدید فقدان اور لوگوں کی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔

مسعود سلطان کھیسر کا سفر نامہ سینہ سنگ پر ریشم کا رستہ شاہراہ قراقرم کی تعمیر مکمل ہونے کے فوراً بعد کے سفر کا احوال ہے۔ انھوں نے پتن کے مقامی افراد کی زبانی مقامی ثقافت، داسو میں جرائم کی تفصیلات، سڑک بننے سے زمین کی قیمتیں بڑھنے سے پیدا ہونے والے مسائل، شاہراہ قراقرم کے تعمیری مراحل کی تفصیل، ہنزہ کے پانی کی خصوصیات اور رسم و رواج کا مختصر ذکر کیا ہے۔ پروین عاطف کے سفر نامے کرن تتلی اور بگولے میں دو باب پاکستانی شمال کے بارے میں ہیں جن میں چترال، کالاش اور سوات کے سفر کا احوال ہے۔ چترال میں پولو کھلاڑی

سے ملاقات، کالاش رسم و رواج، قدیم معاشرت، لباس، کالاشیوں کے مسائل، حکومت کی سیاحتی مقامات سے چشم پوشی، کالام کے مقامی گھر کا طرز تعمیر، شادی کی رسومات اور موسیقی کا ذکر کیا ہے۔

اجمل سعید پراچہ نے نانگا پربت کے حضور میں چلاس، دیامیر، بابوسر، داریل، تانگیر اور استور کے سفر کی تفصیل دی ہے۔ اس سفر نامے میں تاریخی معلومات کا غلبہ واضح ہے۔ ہر مقام کی تاریخ، جغرافیائی تفصیل دی ہے۔ آثار قدیمہ اور قدیم معاشرت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ چلاس سے بابوسر ذرائع آمد و رفت کم ہونے کے باعث مقامی لوگوں کی مشکلات بیان کی ہیں۔ نامساعد حالات اور قدیم زرعی آلات کے باوجود اناج، سبزیوں پھلوں کی فراوانی پر کسانوں کی ہمت کی داد دی ہے۔ داریل و تانگیر کے طرز تعمیر اور معاشرت کے فرق کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اس سفر نامے میں تاثرات اور محسوسات کی کمی ہے۔

آغا سلمان باقر کا سفر نامہ دھماکہ لیک سوات سوات کی تہذیب و معاشرت کے نئے زاویے سامنے لاتا ہے۔ اس سفر نامے میں سواتیوں کی عادات، رسم و رواج، قدیم تاریخ، سیاحوں سے سلوک، سڑکوں کی صورتحال، مقامی روایات کا بیان، جھیل کے حادثاتی طور پر وجود میں آنے اور اس کے علاقے پر اثرات کا بیان ہے۔ واپسی پر جیپ خراب ہونے کے باعث اتفاقاً ایک گمنام بستی میں رات گزارنے، وہاں کے رہن سہن، میزبانی کے انداز، طرز تعمیر، کاشتکاری، رسم و رواج، تعلیم کے لیے لگن، بستی تک رسائی کا واحد پل رسے کا ہونے سے مشکلات، چشموں کا پانی گھروں تک پہنچانے اور اس کی صفائی کا خیال رکھنے کی معلومات دلچسپ انداز سے سفر نامے میں پیش کی ہیں۔

عرفان الحق کے سفرنامے کے ٹو کہوں کہ چھگوری میں معلومات کا وافر ذخیرہ ہے۔ راستوں کی مشکلات، قدم قدم پر تاریخی معلومات، ہوشے کے نئے راستے کی دریافت اور مقامی ہیرو لٹل کریم کے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ تہذیب و ثقافت کی جھلک اس سفر نامے میں بہت کم ہے۔ جواد شیرازی کے سفر نامے قراقرم کے برف زاروں سے میں مہم جوئی کی تفصیل ہے۔ مقامی ہیروز کی ناقدری، شگر میں واضح سماجی تبدیلی، مقامی ڈرائیوروں کا رویہ، اسکولے کے حالات، مختلف علاقوں کے پورٹروں کا فرق، شمشال کے رواج، یاک ریس، نایاب جانوروں کے شکار، شمشالیوں کی ہمت کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر محمد عمران اسلم کے ہنزہ و التر گلیشیر کے سفر نامے لیڈی فنگر میں وافر جغرافیائی معلومات، تھاکوٹ کے مقامی افراد کا نماز کے دوران بھی اسلحہ ساتھ رکھنا، ذوکھر میں ایک ہوٹل کے معیاری سستے کھانے کی تعریف اور کھلے قدرتی ماحول میں مارخور دیکھنے کا ذکر ہے۔

مزملہ شفیق کا سفر نامہ اسکردو اکیلی خواتین کے بلتستان کے سفر کی تفصیلات پر مبنی ہے۔ قدم قدم پر مقامی لوگوں کے تعاون کو مزملہ نے سراہا۔ مختلف مقامات کی جغرافیائی معلومات، بلتیوں کے دھیمے مزاج، مقامی لوگوں کے بوقت ضرورت مختلف پیشے اختیار کر لینے، چند اشیا و مقامات کے مقامی نام، مقامی خوراک، بقیہ شمال سے بلتیوں کے

مختلف ہونے، نمک مرچ کے کم استعمال اور اہل ہنزہ کی خوش لباسی کا ذکر ہے۔ دوسرے سفر نامے نانگا پربت کے سوچہرے میں مز ملہ نے مختلف مقامات سے نانگا پربت کی جھلک نظر آنے پر اپنے تاثرات بیان کیے ہیں۔ اس سفر نامے میں ثقافتی معلومات نہیں ہیں۔

محمد احسن کے سفر نامے دیوسائی میں ایک رات میں خارج کے ساتھ داخلی جہت نمایاں ہے۔ اکثر مقامات پر معلومات کی زیادتی بوجھل لگتی ہے۔ محمد احسن نے بلتیوں کے خدوخال میں وسط ایشیائی افراد سے مماثلت، راستے کے ہر مقام کی مفصل تاریخی وجغرافیائی معلومات، سکر دو بازار کا احوال، دہشت گردی کے واقعات کے باعث غیر ملکی سیاحوں کی عدم موجودگی، مقامات کے بلتی نام، دیوسائی کے مختلف راستوں کی تفصیل، سکر دو کے جغرافیائی تنوع، شگر کی تعمیرات، شگر کے قلعے کی کمرشل بنیادوں پر بحالی میں تاریخی روایت سے چشم پوشی، شنگریلا کا مفصل پس منظر اور دیوسائی کے بارے میں مفصل ارضیاتی معلومات اپنے سفر نامے میں شامل کی ہیں۔

قمر علی عباسی کا سفر نامہ برف کے شہر موسم سرما کے دوران گلگت بلتستان کے سفر کی تفصیل پر مبنی ہے۔ برفباری کے باعث راستوں کی بندش، مارخور اور مارکو پولو بھیڑ کا تذکرہ، سکر دو کی کوہ پیمائی کا صدر دروازہ ہونے، سکر دو پر ٹریکنگ کے اثرات، سیاچن جنگ سے ہونے والی ماحولیاتی آلودگی، کیسر کی داستان سننے، گلگت میں لوگوں کی ذہنی تربیت اور زبان کی خدمت میں ریڈیو کے کردار، ہنزہ میں خوبانی خشک کرنے، پرنس کریم آغا خان کی علاقے کے لیے خدمات، قدیم راستوں اور خشک میوہ جات کا ذکر اس سفر نامے میں موجود ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ابتدائی برسوں کے شمالی پاکستان کے اردو سفر نامے کم لکھے گئے۔ کچھ غیر ملکیوں کے تب کے سفر ناموں کے تراجم موجود ہیں۔ امریکی سیاح کیمی میرپوا، ایرانی سیاح محمود دانشور اور علی غلام حسین زنجیاری کے سفر ناموں میں اس دور کے شمالی خطے کی معاشرت کی جھلک موجود ہے۔

شمالی پاکستان کے سفر ناموں کے ثقافتی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے کے سفر ناموں میں قدیم عہد کے سفر ناموں میں شمال کے بارے میں کم معلومات ہیں۔ برطانوی عہد کے سفر ناموں میں نسبتاً زیادہ معلومات ہیں اور وہ شمالی خطے کی معاشرت اور تہذیبی حالات کی بہتر تصویر پیش کرتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد کے ابتدائی دور کے شمالی پاکستان کے سفر ناموں میں مقامی تہذیب و ثقافت کی عکاسی زیادہ تفصیل سے نہیں ہے۔ 80 کی دہائی میں اور بعد میں منظر عام پر آنے والے سفر ناموں میں تہذیب و ثقافت کی نمائندگی زیادہ نظر آتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اور سلمٰی اعوان کے سفر ناموں میں مجموعی طور پر تہذیبی و ثقافتی معلومات زیادہ ملتی ہیں۔ اکیسویں صدی میں شائع ہونے والے مختلف لوگوں کے سفر ناموں میں تاریخی و جغرافیائی معلومات کی فراوانی ہے مگر تہذیب و ثقافت کی عکاسی کم ہو گئی ہے۔ محمد احسن، عرفان الحق، عمران اسلم، محمد منیر مرزا، اقبال ہما، اجمل سعید پراچہ، مز ملہ شفیق کے سفر ناموں میں تاریخی و

جغرافیائی معلومات کا توازن تہذیبی و ثقافتی معلومات سے زیادہ ہے۔ آغا سلمان محمد باقر کے سفر نامے میں سوات کی تہذیب و ثقافت کی بہتر عکاسی ملتی ہے گو تاریخی و جغرافیائی معلومات بھی سفر نامے کا حصہ ہیں۔

شمالی علاقوں کے حوالے سے سفر ناموں میں پچھلی صدی کے آخر اور موجودہ صدی کے آغاز میں تہذیب و ثقافت کی عکاسی کے رجحان میں تبدیلی کی ایک وجہ ماضی میں سیاحوں کی کم تعداد کا شمال کا رخ کرنا ہے۔ ماضی میں سیاحوں کی کم تعداد میں موجودگی کے باعث انھیں رہائشی علاقوں میں گھومنے پھرنے کی سہولت تھی۔ وہ مقامی تہذیب و ثقافت کا قریب سے مشاہدہ کر سکتے تھے۔ اب سیاحوں کی کثرت کے باعث اکثر مقامات پر رہائشی علاقوں کو باڑ لگا کر سیاحوں کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ اس لیے ان کے سفر ناموں میں ٹریکنگ کے حوالے سے ذاتی تجربات اور تاریخی و جغرافیائی معلومات زیادہ ہوتی ہیں۔ مقامی معاشرت سے ان کا واسطہ کم پڑتا ہے۔ البتہ مستنصر کے اس صدی میں منظر عام پر آنے والے سفر ناموں میں بھی مقامی تہذیب و ثقافت کی عکاسی ہے۔

قدیم سفر نامے تاثرات سے عاری، صرف حالات و واقعات کے سادہ بیان پر مبنی ہونے اور جدید سفر نامے میں احساسات کے شامل ہونے کی بات شمالی پاکستان کے قدیم و جدید سفر ناموں پر بھی صادق آتی ہے۔ ایک ہی مقام کا سفر نامہ لکھتے وقت مختلف سفر نامہ نگاروں نے تہذیب و ثقافت کی مختلف جہتوں پر توجہ مرکوز رکھی۔ اکیسویں صدی میں شمالی علاقوں کی سیاحت میں تیزی آنے سے یہاں کے متعلق سفر نامے لکھنے کا رجحان بھی بڑھا۔ پہلے پہل پاکستانی ان علاقوں کا رخ نہیں کرتے تھے۔ اکا دکا پاکستانیوں کے پہنچنے پر مقامی لوگ حیرت کا اظہار کرتے تھے کہ وہ اپنے علاقوں میں صرف غیر ملکی سیاح دیکھنے کے عادی تھے۔

مستنصر حسین تارڑ کے شمال کے سفر ناموں میں دوسرے سفر نامہ نگاروں کی نسبت مقامی تہذیب و ثقافت کی زیادہ عکاسی کی وجہ یہ ہے کہ مستنصر نے الگ الگ محدود علاقوں پر توجہ مرکوز کر کے سفر نامے لکھے جبکہ دیگر سفر نامہ نگاروں کے ہاں ایک ہی سفر نامے میں زیادہ علاقوں کے سیاحتی تجربات سمونے کا رجحان بھی ہے۔ مستنصر کو رجحان ساز سفر نامہ نگار قرار دیا جا سکتا ہے، نئے سفر نامہ نگاروں نے ان کے رنگ کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ تحقیقی نتائج کسی حد تک تحقیق کی ابتدا میں قائم کردہ مفروضے کی تائید کرتے ہیں کہ شمالی پاکستان کے اردو سفر ناموں میں تاریخی اور جغرافیائی معلومات کا تناسب تہذیبی و ثقافتی معلومات سے زیادہ ہے۔ البتہ سب سفر نامہ نگاروں پر یہ بات لاگو نہیں ہوتی۔ شمالی پاکستان کے سفر ناموں میں جغرافیائی معلومات زیادہ ہونے کی وجہ عام لوگوں کو راستوں کے بارے میں معلومات کم ہونا ہیں اس لیے سفر نامہ نگار قاری کی رہنمائی کے لیے راستے میں آنے والے اہم، غیر اہم مقامات، ٹریک وغیرہ کی تفصیلات شامل کرتے ہیں۔ شمالی پاکستان کے سفر ناموں کو شمالی تہذیب کو جاننے کا کلی ذریعہ سمجھنا درست نہیں ہو گا۔ مقامی تہذیب و ثقافت کی جزوی عکاسی سفر ناموں میں ملتی ہے مگر سفر نامہ نگار زیب داستان کے لیے بھی آنکھوں

دیکھی اور کانوں سنی باتوں کو بڑھا دیتے ہیں اس لیے شمال کے سفر ناموں پر شمالی خطے کی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے مکمل انحصار کرنا درست نہیں۔ سفر نامہ نگار کی آنکھ سے کسی علاقے کی تہذیب کے بہت سے گوشے اوجھل رہ جانا بھی ممکن ہے۔

زیر نظر تحقیقی مقالے میں شمالی پاکستان کے اردو سفر ناموں کا تحقیقی و ثقافتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ آئندہ تحقیق میں شمالی پاکستان کے اردو سفر ناموں کے دیگر علاقائی سفر ناموں سے امتیازات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ثقافتی حوالے سے زرخیز کسی ایک مخصوص علاقے کے تمام سفر ناموں کا ثقافتی موازنہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

کتابیات

کتابیات

ابن بطوطہ۔سفر نامہ ابن بطوطہ۔مترجم رئیس احمد جعفری۔کراچی: نفیس اکیڈمی،۱۹۶۱ء۔

احسن، محمد۔دیوسائی میں ایک رات۔لاہور:فیکٹ پبلی کیشنز،2013ء۔

احمد، اشفاق۔سفر در سفر۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2013ء۔

اختر، محمد خالد۔دو سفر۔لاہور:مطبوعات،1984ء۔

اختر، سلیم۔ادب اور کلچر ۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2001ء۔

اسلم، شیخ نوید۔پاکستان کے آثار قدیمہ ۔لاہور:بک ہوم،2012ء۔

———— شمالی علاقہ جات اور پاکستان۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2013ء۔

اسلم، محمد عمران۔ لیڈی فنگر۔لاہور:خزینہ علم وادب،2005ء۔

اعوان، سلمٰی۔میرا سندر چترال۔لاہور:الفیصل پبلی کیشنز،2013ء۔

———— میرا گلگت و ہنزہ۔لاہور:الفیصل پبلی کیشنز،2012ء۔

———— یہ میرا بلتستان۔لاہور:الفیصل پبلی کیشنز،2005ء۔

اعوان، محمد سرور خان۔وادئ سون سکیسر ۔اسلام آباد:لوک ورثہ،2002ء۔

اکرام، شیخ محمد۔پاکستان کا ثقافتی ورثہ، مترجم افتخار احمد شروانی۔لاہور:مکتبہ جدید پریس،2000ء۔

امجد، یحیٰی۔تاریخ پاکستان (قدیم دور سے زمانہ قبل از تاریخ)۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز، 1997ء۔

امرتسری، حافظ عبدالرحمان۔سیاحت ہند۔لاہور:نور مطبع رفاہ عامہ،۱۹۰۹ء۔

باقر، آغا سلمان۔دھماکہ لیک سوات۔لاہور:مکتبہ عالیہ،2008ء۔

بانو، لعل۔"خشک مغز و خشک تار و خشک پوست، خطہ شمال کی موسیقی"۔مشمولہ شمالی پاکستان کی تاریخ و ثقافت مرتب نوین غلام حیدر علی۔لاہور:فکشن ہاؤس،2015ء۔

بخاری، سید اطہر حسین۔پاکستان ٹورسٹ گائیڈ۔لاہور:ادبستان،2012ء۔

برچہ، شیر باز علی خان۔"بروشال، ہنزہ، نگر"۔مشمولہ پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا شمالی علاقہ جات (جلد اول) مرتب سید محمد علی۔اسلام آباد:لوک ورثہ،2004ء۔

————عکس گلگت بلتستان ۔گلگت:نارتھ بکس،2013ء۔

برق، غلام جیلانی، ڈاکٹر۔ ہماری عظیم تہذیب ۔لاہور: الفیصل ناشران، 2014ء۔

برمانی، عباس۔ برف دریاؤں کے سفر ۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2005ء۔

———— کیلاش کتھا۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2002ء۔

———— میرا سندھو سائیں۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2001ء۔

برنیئر، فرانسس (Bernier, Francois)۔ برنیئر کا سفرنامہ ہند۔ مترجم خلیفہ سید محمد حسین۔لاہور: تخلیقات، ۲۰۰۰ء۔

بریلوی، عبادت۔ پاکستان کے تہذیبی مسائل ۔لاہور: ادارہ ادب و تنقید، 1971ء۔

پراچہ، اجمل سعید۔ نانگا پربت کے حضور۔لاہور: علم و عرفان پبلشرز، 2003ء۔

پوا، کیمی میر (Poya, kamy Mir)۔ سفرنامہ ءپاکستان۔ مترجم محمد حسن۔لاہور: بک ہوم، 2005ء۔

تارڑ، مستنصر حسین۔ برفیلی بلندیاں۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2012ء۔

———— چترال داستان۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2012ء۔

———— حراموش نا قابل فراموش۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2017ء۔

———— دیوسائی۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2012ء۔

———— راکا پوشی نگر۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2015ء۔

———— رتی گلی۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2014ء۔

———— سفر شمال کے۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2001ء۔

———— سنولیک۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2013ء۔

———— شمشال بے مثال۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2000ء۔

———— کے ٹو کہانی۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1995ء۔

———— نانگا پربت۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2001ء۔

———— ہنزہ داستان۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2002ء۔

———— یاک سرائے۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2010ء۔

جان، محمد۔ سرزمین غذر۔ گلگت: نارتھ پبلی کیشنز، 2012۔

———— وادی اشکومن۔ تاریخ کے آئینے میں۔ گلگت: نارتھ پبلی کیشنز، 2010ء۔

جلالپوری، علی عباس۔ تاریخ کا نیا موڑ۔لاہور: تخلیقات، طبع چہارم، 2005ء۔

ــــــــــــــ روایات تمدن قدیم ۔جہلم: خرد افروز، 1991ء۔

ــــــــــــــ روحِ عصر۔لاہور: تخلیقات، طبع پنجم، 2002ء۔

ــــــــــــــ کائنات اور انسان ۔لاہور: تخلیقات، 2000ء۔

Jettmar, Karl. "Northern Areas of Pakistan-An Ethnographic Sketch". In *History of Northern Areas of Pakistan (Upto2000 AD)*. edited by Ahmed Hassan Dani. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2007.

چراغ، محمد علی۔تاریخ پاکستان ۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2012ء۔

چرچل، ونسٹن(Churchill, Winston) ۔جنگ مالا کنڈ، مترجم: ملک اشفاق۔لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، 2009ء۔

چوہان، امر سنگھ، ڈاکٹر۔تاریخ گلگت، مترجمین: عظمٰی سلیم، ڈاکٹر، شیر باز علی خان برچہ۔لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، 2012ء۔

چوہان، عمران الحق۔بستی بستی پربت پربت۔لاہور: بک ہوم، ۲۰۱۳ء۔

حسرت، محمد حسن۔"بلتستان"۔مشمولہ پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا، شمالی علاقہ جات (جلد اول) مرتب سید محمد علی۔اسلام آباد: لوک ورثہ، 2004ء۔

ــــــــــــــ بلتستان تہذیب و ثقافت ۔راولپنڈی: بی ایس پرنٹرز، 1995ء۔

حسن، سبط۔پاکستان میں تہذیب کا ارتقا ۔کراچی: مکتبہ دانیال، طبع ہشتم، 1989ء۔

ــــــــ ماضی کے مزار۔کراچی: مکتبہ دانیال، طبع ہفتم، 1986ء۔

حسین، زوار۔تہذیب۔ملتان: بیکن بکس، 2000ء۔

دانشور، محمود۔کافرستان اور چترال، دیر، سوات کی سیاحت، مترجم: خلیل احمد۔لاہور: الفیصل ناشران، 2006ء۔

دانی، احمد حسن۔شاہ رئیس خان کی تاریخ گلگت ۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2000ء۔

ــــــــــــــ "شمالی علاقہ جات کی حیثیت"۔مشمولہ شمالی پاکستان کی تاریخ و ثقافت مرتب نوین غلام حیدر علی۔لاہور: فکشن ہاؤس، 2015ء۔

Dani, Ahmad Hasan, Dr. *History of Northern Areas of Pakistan (Upto 2000 AD)*. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2007.

دکھی، جمشید خان۔ "گلگت، غذر، دیامر"۔ مشمولہ پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا، شمالی علاقہ جات (جلد اول) مرتب سید محمد علی۔ اسلام آباد: لوک ورثہ، 2004ء۔
ڈیورانٹ، ول (Durant, Will)۔ ہیروز آف ہسٹری (تہذیب کی مختصر کہانی، قدیم سے جدید دور کی ابتدا تک)۔ مترجم: یاسر جواد۔ لاہور: نگارشات پبلشرز، س ن۔
رضوی، سجاد باقر۔ تہذیب و تخلیق۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 1987ء۔
زنجباری، علی غلام حسین۔ زنجبار سے پاکستان۔ لاہور: مکتبہ جدید پریس، 2015ء۔
سائی، ماجد فرید۔ مناظر پاکستان۔ کراچی: فضلی سنز، 2006ء۔
سانگ، ہیون (Xuanzang)۔ ہیون سانگ کا سفرنامہ ہند، مترجم: یاسر جواد۔ لاہور: تخلیقات، ۲۰۰۶ء۔
سحاب، منصف خان۔ وادیٔ کاغان: تاریخ، لوگ، ثقافت، سیاحت۔ لاہور: مکتبہ جمال، 2011ء۔
سدید، انور۔ اردو ادب میں سفرنامہ۔ لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء۔
سلیم، عظمیٰ۔ شمالی علاقہ جات میں اردو زبان و ادب۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 2008ء۔
سواتی، خائستہ محمد۔ "نقش گندھارا بر سنگ سوات"۔ مشمولہ شمالی پاکستان کی تاریخ و ثقافت مرتب نوین غلام حیدر علی۔ لاہور: فکشن ہاؤس، 2015ء۔
شاہ، نیت۔ "ہنزہ سیاسی تاریخ اور تحریک آزادی"۔ مشمولہ شمالی پاکستان کی تاریخ و ثقافت مرتب نوین غلام حیدر علی۔ لاہور: فکشن ہاؤس، 2015ء۔
شاہین، محمد پرویش۔ دیر کوہستان: تاریخ، لوگ، ثقافت، سیاحت۔ لاہور: مکتبہ جمال، 2011ء۔
———— سوات کوہستان۔ لاہور: مکتبہ جمال، 2011ء۔
———— کالام سے کافرستان تک۔ لاہور: فکشن ہاؤس، 1993ء۔
———— کافرستان: تاریخ، نسل، زبان، ثقافت اور سیاحتی جائزہ۔ لاہور: مکتبہ جمال، 2014ء۔
———— کافرستان کے رسم و رواج۔ لاہور: مکتبہ جمال، 2014ء۔
———— مشرق کا سوئیٹزر لینڈ وادیٔ سوات۔ لاہور: مکتبہ جمال، 2009ء۔
شفیق، مزملہ۔ سفرنامہ اسکردو۔ لاہور: فیروز سنز، ۲۰۰۶ء۔
———— نانگا پربت کے سو چہرے۔ کراچی: رنگ و ادب پبلی کیشنز، 2018ء۔

شگری، جعفر۔ "گلگت بلتستان سیلف گورننس آرڈر 2009ء اور اس کے تحت ہونے والے انتخابات کا ایک جائزہ"۔ مشمولہ شمالی پاکستان کی تاریخ و ثقافت مرتب نوین غلام حیدر علی۔ لاہور: فکشن ہاؤس، 2015ء۔

شیرازی، جواد۔ قراقرم کے برف زاروں سے۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2011ء۔

عاطف، پروین۔ کرن تتلی اور بگولے۔ لاہور: جنگ پرنٹنگ پریس، ۱۹۸۷ء۔

عباسی، قمر علی۔ برف کے شہر۔ کراچی: ویلکم بک مارٹ، 2014ء۔

عبدالرحمٰن، پروفیسر۔ چترال چترال ہے۔ اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، 2009ء۔

عرفان الحق۔ کسے ٹو کہوں کہ چھگوری۔ لاہور: سجاد پبلی کیشنز، 2012ء۔

عزیز الدین، منشی محمد۔ تاریخ چترال۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1991ء۔

عسکری، محمد حسن۔ مقالات محمد حسن عسکری جلد دوم، مرتب: شیما مجید۔ لاہور: علم و عرفان پبلشرز، 2001ء۔

علی، عثمان۔ خطہ قراقرم زبانیں اور معاشرہ۔ لاہور: مقبول اکیڈمی، 1996ء۔

——— قراقرم کے قبائل۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2000ء۔

——— گلگت کا انقلاب 1947ء۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2012ء۔

——— گلگت کی روگ کہانی۔ لاہور: مقبول اکیڈمی، 2004ء۔

——— گلگت، نظریہ اور آزادی۔ لاہور: مقبول اکیڈمی، 1995ء۔

علی، مبارک۔ تاریخ اور فلسفہ تاریخ۔ لاہور: فکشن ہاؤس، 1993ء۔

——— "کلچر اور سماجی تبدیلی"۔ تاریخ لاہور شمارہ 23 (2004ء)۔

عمر، غلام۔ چترال کی لوک کہانیاں۔ اسلام آباد: لوک ورثہ اشاعت گھر، طبع دوم، 1987ء۔

فاطمہ، صدف، ڈاکٹر۔ خواتین کے اردو سفرناموں کا تحقیقی مطالعہ۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، 2011ء۔

فاہیان (Faxian)۔ فاہیان کا سفرنامہ ہند۔ مترجم: یاسر جواد۔ لاہور: تخلیقات، ۲۰۰۰ء۔

فرید، عارفہ۔ پاکستانی کلچر کی روایات۔ کراچی: رائل بک کمپنی، 1993ء۔

فیض، فیض احمد۔ فیض احمد فیض اور پاکستانی ثقافت۔ مرتبہ شیما مجید۔ کراچی: پاکستان سٹڈی سنٹر، 2006ء۔

فیضی، عنایت اللہ۔چترال۔اسلام آباد:لوک ورثہ اشاعت گھر،1989ء۔
———— "چترال"۔مشمولہ پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا، شمالی علاقہ جات(جلد اول)مرتب سید محمد علی۔اسلام آباد:لوک ورثہ،2004ء۔
Fussman, Gerrad. "Language as a source of History". In *History of Northern Areas of Pakistan (Upto2000 AD)*. edited by Ahmed Hassan Dani. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2007
قاسمی، احمد ندیم۔تہذیب و فن (جلد اول)۔لاہور:پاکستان فاؤنڈیشن،1975ء۔
قریشی، قدسیہ۔اردو سفرنامے انیسویں صدی میں۔نئی دہلی:مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،1987ء۔
کرناہی، میاں کریم اللہ قریشی۔پہاڑی اور اردو ایک تقابلی جائزہ ۔راولپنڈی:مقتدرہ قومی زبان، 2007ء۔
لکھنوی، حشمت اللہ خان، مولوی۔تاریخ جموں ۔میرپور:ویری ناگ پبلشرز،1991ء۔
لکھیسر، مسعود سلطان۔سینہء سنگ پرریشم کا رستہ۔لاہور:جودت پبلی کیشنز،۱۹۷۹ء۔
محمود، خالد۔اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ۔نئی دہلی:مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،2011ء۔
مرزا، محمد منیر۔پربتوں کا شیندور۔لاہور:سجاد پبلی کیشنز،2012ء۔
———— پھول دیوسائی کے۔لاہور:سجاد پبلی کیشنز،2014ء۔
———— لداخ سے وادی مہران تک۔لاہور:سجاد پبلی کیشنز،2015ء۔
مسعود، مختار۔سفر نصیب۔لاہور:مکتبہ تعمیر انسانیت،2012ء۔
منظر، شہزاد۔محمد حسن عسکری تنقیدی مطالعہ۔کراچی:اورنگ پبلی کیشنز،2012ء۔
مودودی، ابوالاعلیٰ، سید۔اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی۔لاہور:اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ،1966ء۔
میکن، جارج۔شمال مغربی پاکستان اور برطانوی سامراج، مترجم:انور رومان۔کوئٹہ:نسا ٹریڈرز، طبع دوم،1988ء۔
ندوی، رشید اختر۔شمالی پاکستان۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2002ء۔
———— ارض پاکستان کی تاریخ ۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز، جلد دوم،2009ء۔
نسیم، محمد قاسم۔گلگت بلتستان اور مسئلہ کشمیر۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2007ء۔

ہاشم، اے ایل۔ ہندوستان کی تہذیب کی داستان، مترجم: ایس ایم غلام سمنائی۔ لاہور: نگارشات پبلشرز، 2008ء۔

ہما، اقبال۔ جہاں پریاں اترتی ہیں۔ لاہور: فکشن ہاؤس، 2011ء۔

——— کے ٹو برفانی وادیاں۔ لاہور: فکشن ہاؤس، 2015ء۔

ہنزائی، عبداللہ جان۔ ہنزہ کے قدیم تہوار اور رسوم و رواج ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2000ء۔

ہیوگل، بیرن چارلز (Hugel, Baron Charles) ۔سیاحت نامہ کشمیر و پنجاب۔ مترجم محمد حسن صدیقی۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۰ء۔

وثیر، فرحت۔ 1990ء سے 2004ء تک کے سفرناموں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ۔ (غیر مطبوعہ) گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، 2005ء۔

وہاب، مہر اختر۔ اردو میں اسلامی ادب کی تحریک۔ اسلام آباد: پورب اکیڈمی، 2010ء۔